اشفاق احمد

عرضِ مصنف

اشفاق احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

370 Ishfaq Ahmed
Arzay Musannif/ Ishfaq Ahmed.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2006.
432pp.
1. Islam - Spiritualism.
I. Title.

2006
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1788-1

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ادیب برادری کے نام
محبت کے ساتھ

ترتیب

ریڈیو کالم

اردو اور اس کے مسائل

کلچر اور ثقافت

عرضِ مصنف

جس طرح ہوا بادلوں میں پتوں، پھولوں، گھاس پر کھلے کواڑوں کے اندر باہر غرضیکہ ہر جگہ غیر محسوس طریقے سے رابطے بناتی چلی جاتی ہے، خاں صاحب ایسے ہی بڑے قدرتی فطرتی انداز میں لوگوں سے رابطے بنانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ خدا جانے وہ کسی کی فیس ویلیو (face value) سے ناطہ جوڑتے تھے یا اُس کے اندر گہرائیوں تک جانے کا فن جانتے تھے۔ لیکن ایک بات عیاں ہے کہ اُنہیں کبھی کسی مشقت سے نہ گزرنا پڑتا۔ روم میں السانڈرو باؤسانی سے سٹاف روم کی ملاقات ہو یا کسی موچی سے جوتا مرمت کرانے کا وقفہ ہو، خلیفے سے ڈاڑھی ٹرِم کرانے کا مرحلہ ہو یا..... نیلم ویلی میں کسی گڈریے سے کچھ لمبے راستہ پوچھنے کا مقام ہو، وہ بے ساختہ پہچان سے گزر کر ایک گہرا رابطہ قائم کر لیتے اور دیر تک اس ملاقات کو سینت کر رکھتے۔

ایسے ہی اُنہیں ادیبوں، دانشوروں، نئے اور پرانے لکھاریوں سے ملنے ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ کسی کتاب کی رونمائی ہو، فلیپ لکھنا ہو..... کتاب میں دیباچہ شامل کرنا ہو۔ کسی ادیب کو کتاب پر بدھائی دینا ہو..... اُن کے چہرے پر ہمیشہ مسرت ہوتی۔ وہ یہ کام اپنا سمجھ کر کیا کرتے۔ اب وہ چلے گئے ہیں تو مجھے یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن مجھ میں یہ اضطراب بھی پیدا کرتے ہیں اور بے چینی بھی۔ میں اسے ہوم ورک سمجھ کر کیا کرتی ہوں اور بے سکونی کا شکار ہو جاتی ہوں۔ لیکن یہی تو اصل اور نقل کا فرق ہوا کرتا ہے۔

ادیب برادری سے قلبی محبت کرنے والا تو گیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، جب جس کی شام ہوا بند ہو جاتی ہے تو باغوں کی کیا حالت ہوا کرتی ہے! میں اپنے آپ سے ہی سارے ادیبوں کا اندازہ لگا رہی ہوں۔ خدا جانے کچھ لوگ مجھ سے مختلف بھی سوچتے ہوں۔

(بانو قدسیہ)

عرضِ مصنف

صوفی ازم

مجھے افسوس ہے کہ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ بات لمبی ہے اور مضمون مشکل ہے۔ ساری باتیں آسانی سے نہیں ہوسکتیں۔ اس کے لیے بہت سی ملاقاتوں اور مضمونوں کی ضرورت ہے۔ صوفی لوگ کہتے ہیں کہ اگر صوفی ازم کا علم حاصل کرنا ہو تو صوفیوں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ کتابوں سے اور بات چیت سے اور لیکچروں سے یہ علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ محبت کرنے کے لیے ایک محبوب ہونا چاہیے۔ ایک محبت کرنے والا چاہیے۔ کتاب کے ذریعے آپ محبت کا سبق نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی' حساب اور اکنامکس گرائمر اور زبان دانی دماغ سے تعلق رکھنے والے علم ہیں۔ یہ کتاب کے ذریعے یا سمعی اور بصری (Audio visual aids) آلات کے ذریعے حاصل ہوسکتے ہیں۔ لیکن دل کی باتیں دل کے ریسیور پر ہی موصول کی جاسکتی ہیں اگر ان کو جاننے کے لیے دماغ کا آلہ (Apparatus) استعمال کیا جائے تو Short circuit ہوجاتا ہے۔ پھر انسان کے اندر ایسا اندھیرا ہوجاتا ہے کہ بڑی سے بڑی روشنی بھی وہاں اجالا نہیں کرسکتی۔

میں صوفی ازم کا ایک چھوٹا سا اور معمولی سا طالب علم ہوں۔ آپ کی طرح میں نے بھی اس مضمون پر کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور اس کو دماغ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ ناکام رہا ہوں لیکن آپ کے مقابلے میں میں ذرا سا زیادہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے چند صوفیوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی توجہ سے اور ان کی محبت کی وجہ سے اس Frequency کو کسی حد تک محسوس کرنے لگا ہوں۔ گو یہ محسوس کرنا اور یہ جاننا علم کی حد سے آگے نہیں جاسکا۔ کیا میں اس تجربے اور مشاہدے کو کبھی دل سے محسوس کرسکوں گا؟ کیا میں ان کیفیات کو سچ مچ پاسکوں گا؟ کیا یہ محسوسات کبھی میری قسمت کا ایک حصہ بن سکیں گے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو پہلے مجھے پریشان کرتے تھے اب نہیں کرتے۔ میں وہ خوش قسمت کلر بلائنڈ ہوں جو کوئی رنگ نہ دیکھ سکے لیکن اس کا پورا ایمان ہو اور پختہ یقین ہو کہ واقعی اس دنیا میں رنگ بھی ہوتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا اور لوگ تو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ کلر بلائنڈ نیس دور ہو جائے تو بڑی خوشی کی بات ہے اگر نہ ہو سکے تو کوئی گلہ نہیں'

کوئی شکوہ نہیں، کسی پر کوئی زور نہیں۔

آپ کہیں گے یہ عجیب بات ہے۔ ہم کسی ایسے علم کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ہماری عقل میں نہ آ سکے۔ جس کو ہم نہ سمجھ سکیں جس کو ہم محسوس نہ کر سکیں۔ میں کہوں گا آپ بچے ہیں۔ ایسے بچے جس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں اور جو اس بات پر ضد کر رہا ہو کہ میں نہیں مانتا کہ Sexual pleasure (شہوت) بھی کوئی چیز ہے۔ اگر ہے تو مجھے کتاب میں سے پڑھ کر سمجھایئے۔ ڈایاگرام بنا کر اس کی تفصیل بتایئے۔ سلائیڈ دکھا کر اس کی لذت بتایئے۔ میں کہوں گا پیارے بچے جب تم چودہ سال کے ہو جاؤ گے تو میرے بتائے بغیر میرے سمجھائے بغیر کوئی کتاب پڑھے بغیر یہ بات تمہاری سمجھ میں خود بخود آ جائے گی۔ لیکن اس دور کا ہر پڑھا لکھا اور سیانا آدمی تعلیم یافتہ انسان خاص طور پر مغرب کا آدمی اس بچے کی طرح ضد کر رہا ہے اور وہ اپنے میں وہ Frequency پیدا کیے بغیر اس سگنل کو Receive کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی انٹینا موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے لوگ خاص طور پر امریکہ کے لوگ ان یوگیوں، جادوگروں، مداریوں اور بازی گروں کا شکار ہو رہے ہیں جو روحانی کرتب دکھا کر سادہ لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور صاف دل لوگوں کو ٹھگ رہے ہیں۔ لیکن صاف دل لوگوں کا درجہ ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب سادہ لوگ اور صاف لوگ جیت جائیں گے اور یوگی اور جادوگران سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ بہت ہی اہم ہے کہ تصوف یا صوفی ازم اور روحانی طاقت یا Spiritualism دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ایک کا دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً جو آدمی کرامتیں دکھائے، عقل کے خلاف Uncanuf واقعات عمل میں لائے ضروری نہیں کہ وہ صوفی بھی ہو۔ لیکن اس کے الٹ ہر پورے صوفی میں کرامتیں دکھانے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کرامتیں دکھائے یا نہ دکھائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تصوف یا صوفی ازم ہے کیا چیز اور اس کا انسان سے یا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے..... مختصر طور پر یہ جان لیجیے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا موضوع ہے کہ ان طاقتوں اور ہستیوں کی حقیقت معلوم کی جائے جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو دیکھے بغیر اور جن کا ثبوت دیے بغیر ہم پر فرض ہے کہ ہم ان کو مانیں۔ وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں اللہ فرشتے، الہامی کتابیں، رسول، قیامت کا دن اور حیات بعد الموت، لیکن اگر اصل طریقے پر دیکھا جائے تو صوفی ازم کی بنیاد ایک ہی بات پر ہے کہ اللہ کیا ہے۔ کس طرح کا ہے اور مخلوق سے اس کا کیا تعلق ہے۔ قرآن میں وہ اپنے ہاتھ، آنکھ، کان، روح اور نفس کا ذکر کرتا ہے تو یہ سب کیا ہے۔ اس سے اللہ کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کے ہاتھ کان آنکھ اور روح و نفس ہماری طرح کے ہیں یا کسی اور طرح کے۔ اگر ہماری طرح کے ہیں تو پھر وہ ایک جسم رکھتے ہوئے ہر جگہ حاضر و ناظر کس طرح سے ہو سکتا ہے؟

جس طرح آپ کو دنیا کا علم سیکھنے کے لیے سب سے پہلے لکھنا اور پڑھنا سیکھنا پڑتا ہے اور ایک

پہلوان یا ایتھلیٹ بننے کے لیے ورزش کرنی پڑتی ہے' اسی طرح صوفی ازم کا علم حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو اپنی زندگی ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانی پڑتی ہے۔ ہر طرح کی گندگی سے خواہ وہ اندرونی ہو یا بیرونی دور ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اپنے اخلاق اور اپنے کردار سے ہر طرح کا میز ھاپن دور کرنا پڑتا ہے یعنی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جتنی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دور ہوں اور جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں۔ اس کام کے لیے کچھ ریاضت اور کچھ مجاہدہ (Exercise, drill and struggle) کرنا پڑتا ہے۔ جب ان چیزوں میں پختگی اور پکا پن پیدا ہو جاتا ہے تو پھر علم الٰہی کی جھلکیاں ملنے لگتی ہیں یا عرفان حاصل ہونے لگتا ہے۔

تصوف یا صوفی ازم اور دوسرے علموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اور علم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تصوف عین اس کے الٹ ہے۔ اس میں پہلے عمل کیا جاتا ہے اور پھر علم حاصل ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ صوفی ازم میں پہلا حکم سننا ہے پھر اس پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے بعد عمل کرنا ہے اور اس عمل کے دوران جاننا خود بخود وارد ہونے لگتا ہے۔ علم خود بخود حاصل ہونے لگتا ہے۔

لیکن یہ باتیں بہت لمبی ہیں۔ یہ تو ایک سمندر ہے۔ ایک عمر میں سمندر کے اوپر اوپر کی سیر نہیں ہوسکتی۔ اس کے اندر کا کیا پتہ چل سکتا ہے بھلا؟

مشرق کے لوگ اور مشرق کے ملک بڑے خوش قسمت ہیں کہ رات کی تاریکی اور رات کے اندھیرے کے بعد سب سے پہلے ان کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مشرق میں اجالا ہوتا ہے۔ جب بھی ''روشنی ہو جا'' کا حکم ہوتا ہے تو سب سے پہلے مشرق روشن ہوتا ہے۔ مشرق اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ اس کے دامن میں سارے پیغمبر پیدا ہوئے ہیں۔ انہی پیغمبروں نے ساری دنیا کو دین' دھرم' خدا اور اس کی کائنات کا تصور دیا ہے۔ پنجاب بھی مشرق کا ایک حصہ ہے اور چونکہ یہ علاقہ سپاٹ ہے۔ میدان ہے' چٹیل ہے اس لیے اس پر روشنی آسانی سے اور خوبی سے پھیلتی ہے۔ اس روشنی نے پنجاب کو بڑے صوفی' بڑے سنت سادھ' بڑے بزرگ اور بڑے مرشد دیئے ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کی روحانی اور ایمانی زندگی تروتازہ ہو رہی ہے بلکہ ان کو دنیا اور دین کے کاروبار میں بھی بڑی بلندیاں ملی ہیں۔

پنجاب کا صوفی عالم فاضل' فلسفی' منطقی نہیں۔ وہ مذہب اور دین کی باریکیوں اور خدا کے وجود اور اس کے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تعلیم نہیں دیتے۔ وہ اس کے ساتھ عشق کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترکیب بھی بتاتے ہیں۔ سب سے آسان ترکیب سادہ ہے اور موٹی موٹی پنجابی میں انہوں نے اپنے علاقے کے لوگوں کو یہ بتائی ہے کہ تم جیسے کیسے بھی ہو' جس حالت میں بھی ہو جتنے گندے بھی ہو اس کی پروا نہ کرو۔ بس خدا کے ساتھ لگ جاؤ۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے پہلو کے بل لیٹے ہوئے اس کے نام کا ذکر کرو

اور اس کو اپنے ساتھ سمجھو۔ وہ تمہاری خرابیاں اور تمہارے گند اور برائیاں خود دور کرے گا اور تمہارے لیے خود ہی کوئی راہ مقرر کر دے گا۔ مولوی' پنڈت' پادری' پریچر' یا مسٹر صوفی کے الٹ تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے پاک صاف ہو۔ نیک ہو۔ بااخلاق ہو۔ moral ہو۔ شریف ہو۔ be a good baby۔ اس کے بعد تم اس قابل ہو گے کہ تم خدا کے حضور میں جا سکو اور اس کے ساتھ ملاپ کر سکو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نیک اور شریف بننے کی کوشش میں انسان ساری زندگی گزار دیتا ہے لیکن اپنی مرضی اور پریچر کی کسوٹی کے مطابق کبھی بھی نیک نہیں بن سکتا۔ اس کی اپنے خالق سے دوری ہی رہتی ہے اور وہ اس راز کو پانے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کے لیے اس کی روح بے قرار ہے۔ وہ اس کے درشنوں سے دور رہتا ہے جس کے لیے اس کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔

جب پنجاب کے سیدھے سادے لوگوں نے اپنے صوفیوں سے پوچھا کہ ہم خدا کے پاس جا کر کہاں بیٹھیں ہمیں تو اس کا ایڈریس معلوم ہی نہیں' نہ ہی ہم اس کا ٹیلی فون نمبر جانتے ہیں کہ اس سے Appiontment حاصل کر سکیں تو صوفیوں نے بتایا کہ اس تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک گائیڈ کی ضرورت ہے اور رہنما کی ضرورت اور اس رہنما کو مرشد کہتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اتنے بڑے درجے پر اور اتنے بلند مرتبے پر مرشد ہی کے ذریعے پہنچے ہیں تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''ضرور۔ بے شک۔ یقیناً۔ بے شبہ'' اور سلطان باہو نے کہا:

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلن پر آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جس ایہہ بوٹی لائی ہو

اللہ کا نام۔ اللہ کا اسم۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں میرے مرشد نے بویا۔ جس طرح باغبان چنبے کی بوٹی زمین میں بوتا' پھر اس بوٹی کو نفی اثبات کا پانی ملا اس کی ہر ہر رگ میں اور ہر ہر پتے میں اور جب وہ بوٹی اس پانی سے پھلنے پھولنے پر آتی اور اس کے اندر ہزاروں پھول نکلے تو میرے اندر خوشبو کا ایک طوفان مچ گیا۔ خدا بھلا کرے میرے مرشد کا خدا سلامت رکھے اس کو جس نے میرے اندر یہ بوٹی کاشت کی۔

پھر کہتے ہیں۔

ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد ویکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجاں ہو
ایہناں ڈٹھیاں دی صبر نہ آوے فیر ہور کسے ول بھجاں ہو
مرشد دا دیدار اے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو

اے کاش میرا یہ سارا جسم آنکھیں بن جائے اور ہر وقت ہر گھڑی اپنے مرشد کو دیکھتا رہوں۔ میرے ہر ہر مسام کے نیچے ایک ایک آنکھ ہو۔ کبھی اس کو کھولوں کبھی اس کو بند کروں اور حیرت کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے۔ اگر اس قدر دیکھنے سے اور مسلسل دیکھنے سے بھی مجھ کو صبر نہ آئے قرار نہ آئے چین نہ آئے تو پھر میں اور کس طرف بھاگوں۔ لیکن نہیں مجھے اور کسی طرف بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو اپنے مرشد کا دیدار ہی لاکھوں اور کروڑں حجوں سے زیادہ ہے۔

بابا بلھے شاہ کہتے ہیں:

آؤ عنایت قادری جی چاہے میرا
میں اڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

اے میرے مرشد اے شاہ عنایت میں کب سے آپ کے انتظار میں ہوں اور بالکل رہ گیا ہوں۔ کبھی مجھ پر کرم کرو۔ میری طرف بھی آؤ۔

یا پھر:

پیر پیراں بغداد اساڈا مرشد تخت لہور
ایہو ای تسیں وی آکھو آپ گڈی آپ ڈور
میں دساں آں تسیں پکڑ لیاؤ
بلھے شاہ دا چور..میری بکل دے وچ چور

کہتے ہیں کہ پیروں کا پیر حضرت عبدالقادر جیلانی سے سب بڑا پیر ہے۔ مرشد میرا لاہور میں رہتا ہے۔ اگر تم غور سے دیکھو تو پتنگ بھی وہی ہے اور ڈور بھی وہی ہے۔ یعنی اوپر چڑھا ہوا بھی وہی ہے اور اوپر چڑھانے والا بھی وہی ہے۔ میں بتاتا ہوں۔ اگر تم مجھ پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو میرے چور کو پکڑ لاؤ۔ اس نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مجھے بہت رلایا ہے۔ وہ میرا مرشد ہے۔ شاہ عنایت ہے۔

یا پھر:

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور
شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک چھپ کھچ دا ڈور
نی میری بکل دے وچ چور

پیغام تو آسمانوں سے آتا ہے لیکن سنا لاہور میں جاتا ہے۔ شاہ عنایت نے میرے مرشد نے میرے دل کو ایک ماہی گیر (Angler) کی طرح ڈوری ڈالی ہوئی ہے۔ میرے دل کو تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح کھینچتا ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ میں کیا کروں میں کدھر جاؤں۔

شاہ حسین بھی یہی کہتا ہے کہ جس نگری وچ ٹھا کرنا ہیں اوہ کا کرکو کر بستی ہے۔ یعنی جس بستی میں جس شہر میں کوئی مرشد نہیں ہادی نہیں وہ بستی کتوں اور مرغوں کی بستی ہے۔ جو خواہ مخواہ بھونکتے رہتے ہیں خواہ مخواہ بانگیں دیتے رہتے ہیں۔ اک شور مچا رہتا ہے۔ آوازوں کی Polution سے بھرا رہتا ہے۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ ایک آدمی پر اس قدر اعتبار کر لینا۔ اس کے حوالے اپنا سب کچھ کر دینا۔ اس پر پورا ایمان لے آنا۔ اس کے آگے دم نہ مارنا۔ اس کے حکم کی تعمیل کرنا۔ یہ کہاں تک جائز ہے۔ اس سے تو اپنی شخصیت کی اپنی خودی کی نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن پنجاب کا صوفی کہتا ہے کہ نال شرابیں رنگ مصلا جے گرآ کھے تینوں..... اگر تمہارا گرو تمہارا مرشد تم سے یہ کہے کہ اپنے مصلے کو اپنے جائے نماز کو اور اپنی نماز پڑھنے والی جگہ کو شراب میں غسل دے دو۔ شراب میں ڈبو دو۔ تو ایسا ہی کرو کیونکہ گرو تم سے بہتر جانتا ہے۔ گرو تمہارا بھلا چاہتا ہے۔ گرو تمہیں منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

آپ کی آسانی کے لیے ایک مثال سے واضح کر دوں تاکہ آپ کو اچھی طرح سے سمجھ آ جائے کہ گرو کی اہمیت کیا ہوتی ہے اور آپ میں سے سب لوگ گرو کو کس قدر اہم جانتے ہیں۔ جب آپ کا گرو آپ سے کہتا ہے The fasten your seat belts تو آپ فوراً اپنی پٹیاں باندھ لیتے ہیں۔ اس وقت کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ گرو نے ایسا کیوں کہا۔ یہ میری شخصیت کے خلاف ہے۔ میں نے ابھی کھانا کھایا ہے۔ میرا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ یہ معدے کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ نہ ہی آپ میں سے کوئی پائلٹ کیبن میں جا کر اس سے بحث کرنے لگتا ہے کہ میں پیٹی نہیں باندھوں گا۔ میں کوئی بکری ہوں کوئی جانور ہوں۔ میں انسان ہوں پھر آواز آتی ہے۔ Please extingish you cigraettes۔ آپ فوراً اپنا سگریٹ بجھا لیتے ہیں حالانکہ آپ نے ابھی سلگایا تھا۔ ابھی مزا آنے لگا تھا لیکن گرو نے آرڈر دے دیا کہ بجھا دو۔ آپ نے بجھا دیا۔ کیوں؟

اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ پائلٹ آپ سے بہتر علم رکھتا ہے۔ بلندی کا بھی اور پستی کا بھی۔ پرواز کا بھی اور گھومنے کا بھی۔ چڑھنے کا بھی اور اترنے کا بھی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہمارے فائدے کے لیے کہتا ہے۔ اس لیے آپ بیسویں صدی میں ہونے کے باوجود اور اس قدر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اس کی ہر بات مانتے ہیں۔ یہ جسم کو بچانے کے لیے ہے۔ زندگی برقرار رکھنے کے لیے ہے لیکن جب روح کا مسئلہ آتا ہے تو ہم میں سے ہر پڑھا لکھا آدمی یہی کہتا ہے کہ مجھے اپنی روح کی پرواز کے لیے کسی پائلٹ کی ضرورت نہیں۔ یہ کام میں خود کر لوں گا کتاب پڑھ کر کر لوں گا۔ How to fly with out fear..... لیکن ایسے کبھی نہیں ہوتا۔ کیا آپ ایئر پورٹ پر جا کر کسی ایسے پائلٹ کے جہاز میں بیٹھنا پسند کریں گے جو یہ کہے میں نے فلائنگ پر دو درجن کتابیں پڑھی ہیں اور میں نے اپنے کمرے میں ہر ہوائی جہاز کا ڈایا گرام لٹکایا ہوا ہے لیکن میں نے آج تک کسی جہاز کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ ہی کبھی کاک پٹ میں بیٹھا ہوں۔ نہ ہی

اس کو اڑایا ہے۔

اگر ہم روحانیت کی بات چھوڑ دیں اور صوفی ازم کی اونچی اور اعلیٰ حقیقت پر بھی بات چیت نہ کریں تو میں کہوں گا کہ صوفیوں کی بدولت پنجاب کے رہنے والوں نے معاشرتی اور سماجی طور پر بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ صوفی لوگ جو ہمارے گاؤں میں بستیوں میں قصبوں میں شہروں میں ہوئے اور جو اب بھی ہیں یہ اپنے اپنے علاقے کی آبادی کے لیے Psychiatrist کا کام دیتے ہیں ان کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں سائیکوانلسٹ کا کوئی کاؤچ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی Analysis بھی نہیں کرتے۔ یہ اپنی توجہ سے اپنے سلوک سے اپنے برتاؤ سے اپنی نرمی سے لوگوں کو ذہنی پریشانیوں اور دماغی بیماریوں سے دور رکھتے ہیں اور رکھتے چلے جاتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ ذہنی طور پر اور دلی طور پر بڑے پرسکون اور فارغ البال ہیں۔ وہ غریب ہیں۔ ان کے پاس روپے پیسے اور اناج کی کمی ہے۔ ان کے یہاں بھوک ہے۔ بیماری ہے۔ لیکن ان کے یہاں بے چینی نہیں۔ اضطراب نہیں۔ بے صبری نہیں۔ خدا سے دوری نہیں..... جن لوگوں سے آپ روز ملتے ہیں جو آپ کو پڑھانے آتے ہیں جو آپ کو لیکچر دینے آتے ہیں یہ پنجاب کے اصل لوگ نہیں ہیں۔ یہ educated Warktoriented لوگوں کا ایک گروہ ہے۔ اور ان کو وہ ساری بیماری چمٹی ہوئی ہیں جو مغربی دنیا میں عام پائی جاتی ہیں۔ اب ہمارے یہاں بھی دماغی امراض میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ ہم بھی بے چین ہو گئے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طبقہ بھی تھری آرز کا شکار ہو گیا ہے۔ Reading, writing, routing۔ ہمارا ٹریفک بھی بدتمیز اور گستاخ ہو گیا ہے۔ ہم بھی مادی تقاضوں کے پیچھے بھاگنے لگے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی روح اور روح کی آسودگی اور اس کے سکون کو بڑے سستے داموں فروخت کر دیا ہے۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ سے بات کہاں سے شروع کروں اور ایک ہی مضمون میں کیا کیا کچھ بتادوں۔ محسوس کرنے والی چیز کو حصوں میں اور چیپٹروں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ شاعری پر تنقید یا اس کی خوبیاں اور حسن بیان کرنا بڑی احمقانہ بات ہے۔ شاعری یا تو دل کو لگ جاتی ہے یا نہیں لگتی۔ جو لگ جاتی ہے وہ شاعری ہے جو نہیں لگتی وہ تماشا ہے..... تو آپ آج کی ملاقات سے تمہید کے طور پر دیباچے کے طور پر preface سمجھ کر ایک بات کو سوچنے کے لیے رکھ لیجیے کہ تصوف کے میدان میں اور صوفی ازم کی دنیا میں ایک رہنما کی ایک ہادی کی ایک مرشد کی ایک گرو کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے بغیر آپ صوفی ازم کے صحافی اور کالم نگار تو بن سکتے ہیں لیکن اس علم سے یا اس دنیا سے خود لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ باقی کی باتیں انشاء اللہ پھر کبھی ہوں گی۔ وہ کون کرے گا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن آپ کے ملک میں آپ کے شہر میں آپ کی بستی میں آپ کے اردگرد اس کا ذکر ضرور ہوگا۔ ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ۔ اور پھر یہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہوتا ہی رہے گا۔ اس وقت آج کی نشست کو یاد کیجیے گا۔ آنے والی باتیں اسی محفل کی ایک کڑی ہوں

گی۔ اسی کا ایک سلسلہ ہوگا۔ میں اور آپ پھر قریب ہوں گے اور قریب ہی رہیں گے۔ انسان انسان سے اتنی جلدی جدا نہیں ہوتا' اتنا دور نہیں ہوتا۔ اس قدر فراق میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہماری روحیں تو ہمارے رب کا امر ہیں۔ اس کا حکم ہیں۔ پھر ہم اس کے حکم سے پرے کیسے جا سکتے ہیں۔ روحانی طور پر ہم ساتھ ساتھ ہی رہیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ..... ہمیشہ۔

بابا بلھے شاہ دا مسلک

اُنج تے ہر صوفی بزرگ تے گل کردیاں بڑے حوصلے دی لوڑ ہندی اے پر بابے بلھے شاہؒ ہوراں دی بابت کُش عرض کرن لگیاں کسے وڈھے سہارے دینی سہارے تے شرع شریف دے آسرے دی ڈاہڈی لوڑ پے جاندی اے۔ اک عام انا ڑی سدھا پدھرا بھولا بندا روزدہاڑے دکھاں دا ماریا حالات دا ستایا تے سنگی ساتھی عزیزاں رشتہ داراں دا ڈنگیا ہویا ایسی خشندی چھاں لبھدا رہندا اے جتھے لک کے او اپنے بھجے مٹے بڈ گوڈیاں نوں بھورا رتی ارمان دے سکے تے جھٹ کو بہہ کے سکھ دی ساہ لے سکے تے نالے اوہناں دکھاں شکویاں گلے گزاریاں دا الاپ کرسکے جیہڑے اوہدے اندر بھانبڑ مچائی رکھدے نیں۔ ایہہ اوکھیایاں اوکڑاں تے گلے گزاریاں دا کسے خاص عہد خاص دوریاں کسے خاص صدی دے اگڑ پچھڑ نال کوئی تعلق نہیں ہندا۔ ایہہ وراثت بندا اپنے نال لے کے ای آندا اے تے ساری عمر کوکراں مار کے نال ای لے جاندا اے۔ کوئی اٹھارہویں کوئی انی ویں کوئی ویہہ ویں صدی دے حالات دی شرط نئیں ہندی۔ نہ ای کسے تاریخی ساجی اقتصادی ماحول نے اوہدا کڑا کڈھیا ہندا اے۔ اوہ تاں بس انسان ہون دے پاروں اپنا کڑا کا نال ای لے کے آندا اے تے اپنے ہنجو پونجھن نوں اپنی صافی اپنی زندگی دے موہڈے تے پہلاں ای رکھ کے ٹردا اے......

صوفی لوک نرم دل وی ہندے نیں تے نال چالاک وی ڈاہڈے ہندے ایں۔ ایسی کنڈی پا کے بندوں نوں اپنے ول کھچ دے نیں کہ اوہ غریب ہاریا ہنا دکھاں دا ماریا مویا مڑا اُوہناں دے بوہے جا کھلوندا اے تے بابے ہوراں دے ہتھ وچ پھڑ دے کے سر نال سر ملا کے جلی پان ڈیہہ چیندا اے جی!

بھٹ نماز تے چکڑ روزے کلمے تے پھری سیاہی
بلھے شاہ شوہ اندر ملیا بھلی پھرے لُکائی......

یاں

اپنیاں وچ الفت ناہیں کیا چاچے کیا تائے
پیو پتراں اتفاق نہ کائی دھیاں نال نہ مائے ......

یاں

بچیاں نوں پئے ملدے دھکے' جھوٹے کول بہائے
اگلے ہو کنگالے بیٹھے' پچھلیاں فرش پوائے
چل بلھیا چل اوتھے چلیئے جتھے سارے ہوون انھے
ناں کوئی ساڈی ذات پچھانے نہ کوئی سانوں منے......

یاں

جد میں سبق عشق دا پڑھیا مسجد کولوں جیوڑا ڈریا + ویہڑے جا ٹھاکردے وڑیا جتھے وجدے ناد ہزار......عشق دی نویوں نویں بہار

پھوک مصلے بھن سٹ لوٹا' نہ پھڑ تسبیح عاصی سوٹا + عاشق کہندے دے دے ہوکا ترک حلالوں کھا مردار۔ عشق دی نویوں نویں بہار......

بلھیا پی شراب تے کھا کباب ہیٹھ بال ہڈاں دی اگ + چوری کر تے بھن گھر رب دا اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

دکھی بندا۔ تھکیا ٹٹیا۔ حالوں بے حال زمانے دے ہتھوں ستایا جدوں بابے بلھے شاہ نوں اپنے دل دی گل اوچی واج وچہ کہندے سن دا اے تے بہت خوش ہندا کے لے بئی اک بابا میرے حال نوں سیان دا اے تے میرے دکھاں نوں جان دا اے تے میرے زخماں نوں پچھاندا اے۔ ایہ سوچ کے ہتھ بابے ول ودھاندا اے تے بابا ایسی ہشیاری نال کھیچ مار کے ہتھ ودھان والے نوں اپنے ڈیرے تے سٹ لیندا اے کہ پھیر اوتھوں اوہدا نکلنا ہمش واسطے مشکل ہو جاندا اے۔ پتہ اودوں چلدا اے جدوں بابے بلھے شاہ جہا بے پرواہ تے بے فکرا' شوخ' چھبیلا تے منہ پھٹ قلندر فاذکرونی اذکر کم (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا کروں گا) دا ترجمہ ذاہ کے پھسے ہوئے طالب نوں اتے بہاوندا اے تے آکھدا اے:

کر کتن دے ول دھیان کڑے
کر کتن دے ول دھیان کڑے
نت متیں دیاں ولّی نوں
اس بھولی' کملی' جھلی نوں
جد پوی وخت اکلی توں۔ تد بابا کرسی جان کڑے۔ کر کتن دے ول دھیان کڑے۔
توں سدا نہ پیکے رہنا اے۔ نہ پاس امڑی دے بہنا اے
بھا ئانت وچھوڑا سہنا اے۔ وس پئیں گی سس ننان کڑے۔ کر کتن دے ول دھیان کڑے۔
اک او کھا ویلا آوے گا۔ سب ساک سین بھج جاوے گا

کر مدد پار لنگھاوے گا۔ اوہ بلھے دا سلطان کڑے۔ کرکتن دے ول دھیان کڑے...... یاں شوہ بلھا' ساتھیں وکھ ئیں۔ بن شوہ دے دوجا لکھ ئیں۔ پر ویکھن والی اکھ ئیں۔ تاں جان جدائیاں سہندی اے۔ مڑ آئی گل نہ رہندی اے۔ یاں پھیر...... اٹھ جاگ گھوراڑے مارنہیں۔ ایہہ سون ترے درکار نہیں۔

جو کجھ کریں سو کجھ پالیں۔ نہیں توں اوڑک پچھتاسیں

سنجی کونج وانگوں کرلاسیں' کھنباں باجھ اڈار نہیں۔ اٹھ جاگ گھوراڑے مارنہیں ایہہ سون ترے درکار نہیں۔

ملاں تے فیروی بچ وچلے رب دی یاد دا ئیم نبیل دے کے چھٹی کر دندا اے۔ پر ایہہ صوفی لوک ایہہ شاہ حسین' ایہہ بلھے شاہ' ایہہ میاں محمد بخش' مولوی غلام رسول عالم پوری' حضرت خواجہ فرید ایہہ تے چووی گھنٹے دی ٹنگلی تے کس دندے نیں۔ آپسی پیار محبت تے انسان نال عشق کرن دا آرڈر کر دیندے نیں تے ذکر اذکار تے عبادت دا چرخہ چلاان چپنا چھڑن روں منجسن تے کسنزا اچنن دا وکھ حکم دیندے نیں۔ بھولے لوک ایناں دے شعر سن کے بڑے خوش ہندے نیں کہ اتھارنی نوں چنگا کھڑ کایا اے تے ساڈا دل چوکھا خوش کر یا اے۔ پر جے کدھرے' کار قضا اوایناں شعراں دی راہے صوفیاں دی کنڈی وچ پھس جاندے نیں تے فیر ساری حیاتی لک نہوں نہوں کردے ای لنگھ جاندی اے۔

بلھے شاہ ہوراں دی بابت ڈاکٹر ترلوچن لکھدے نیں کہ بلھے شاہ کوئی ویدانتی نیں سی سگوں اوہ اپونا پونا سچے اسلام دا عاشق قادری صوفی سی۔ اسلام دے معنی نیں ''اپنا آپ رب نوں ارپن کرنا'' ایسیں کر کے بلھے شاہ اخیر دم تیکر مسلمان صوفی رہیا تے قادری صوفی بزرگاں دے اصولاں تے عملاں تے چلدار ہیا۔ کئی سکھ عالماں نے بلھے شاہ نوں گورو تیغ بہادر تے گورو گوبند سنگھ ہوراں دی گوربانی توں متاثر دکھیدے اوہنوں سچ دھاری سکھ بناون دا جتن کیتا تے ڈاکٹر لاجونتی' راما کرشنا تے کجھ ہور سکالراں نے اوس نوں لنگوٹی چوٹی والا ویدانتی چیلا بنان دا جتن کیتا۔ پر ایہہ دوئیں جتن بے معنی نیں۔ کیوں جو بابے بلھے شاہ دے گرو حضرت عنایت شاہ قرآن دی تعلیم دے بڑے ماہر سن تے اوہناں اپنے چیلے دی تعلیم اسلامی اصولوں تے قرآن شریف دیاں وچاراں دے مطابق کیتی۔

ڈاکٹر ترلوچن سنگھ ہوری بالکل ٹھیک کہندے نیں۔ اصل وچ صوفی شاعراں نے اج توں کئی سو سال پہلے اپنے اپنے ڈیریاں تے ایسے گرامر سکول کھولے ہوئے سن جتھے اوہ دین تے شرع شریفوں بھجے ہوئے سکولیاں نوں گدا پاکے تھیا تھیا نچ کے تے جھومر پا کے پھڑ لیندے سن تے جدوں اوہ قابو آ جاندے سن تے اوہناں نوں اوہ میٹرک پاس کراندے سن جیدھا کورس دین اسلام نے پہلاں توں مقرر کیتا ہندا سی۔

ماننے سے جاننے تک

اب تک علم حاصل کرنے اور علم عام کرنے کے لیے انسان نے مختلف تجویزیں اور کئی ذرائع استعمال کیے ہیں اور یہ ذریعے اپنے اپنے دور میں اپنی افادیت کے اعتبار سے یکساں مفید رہے ہیں۔ جب انسان کی بولی حرف غاؤں غاؤں اور غنر غنر تک محدود تھی اس وقت پدر کا علم پسر نے ہاتھوں کے اشاروں اور جسموں کی حرکات وسکنات سے ازبر کیا۔ جب وہ بولنے لگا تو چیلا گرو سے زبانی کلامی درس لینے لگا اور استاد کی ہر بات کو اپنے ذہن میں جگہ دینے لگا۔ پھر انسان مٹی کے گیلے تختوں پر کیڑی کاڑا لکھنے لگا اور عقیدت مندان گیلی سلیوں کو سکھا سکھا کر اپنے غاروں میں جمع کرتے رہے۔ پھر درختوں کی چھال جانوروں کی کھال اور مچھلیوں پر علم کے خزانے جمع ہوتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد بھوج پتر کا دور آیا اور علم کے سکرول بننے لگے۔ اس کے بعد کاغذ ایجاد ہوا اور علم عطا کرنے والوں اور علم حاصل کرنے والوں کے درمیان بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ اب الیکٹرونکس کا عہد ہے اور علم عام کرنے کے لیے اس ذریعہ سے مدد لی جارہی ہے۔ یہ تو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس وقت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو علم اور ادب کے انحصار کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جارہا اور اسے اس وجہ سے مطعون کیا جارہا ہے کہ اس نے ادبی اقدار کو پامال کر دیا ہے لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہڑپہ میں جب علم کے خزانوں کو چکنی مٹی کی بڑی بڑی سلوں پر کندہ کر کے انہیں بھٹی میں پکا کر محفوظ کیا جاتا تھا تو ہڑپہ کے مودی خانے کے ایک منشی زادے نے مچھلی کے چانے اتار کر اور اس کی چکنی جلد سونت کر بھلاوے کے پھل کا سیاہ عرق نکال کر اس پر گورو کی باتیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس نے تین جملوں پر اتنا کچھ لکھ لیا تھا جو ہڑپے کی کال پٹی کے سردار اوس کے بیٹے عوگو کی باسٹھ سلوں پر بھی محفوظ نہ تھا۔ حالانکہ عوگو خود شاعر تھا اور قرینہ اشعار کہنے اور واسوخت لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ عوگو کی تین بہنوں نے سارے علاقے میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا ''ویروترا اے دسکا برے سے منگھیر وغار چہ پاٹ پاٹ پاٹ۔'' کہ ویر کے پاس علم کے جو خزانے ہیں وہ مضبوط اور مستحکم ہیں اور منشی کے بیٹے کا علم کمزور اور پھٹ جانے والا ہے اور دیوتاؤں کی قدروں پر پورا نہیں اترتا۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ریڈیو ٹیلی ویژن یا فلم اصل علم یا ادبِ عالیہ کی تخلیق کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور اس کا معیار لپیٹ کر دیا ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کے علم اور آج کے ادب کی شکل وصورت اور روح پہلے زمانے کے علم اور ادب سے مختلف ہوگئی ہے۔ جس طرح خوبصورتی کے معیار وقت کے ساتھ ساتھ اور جغرافیائی خطوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اسی طرح علم وادب کی شکل وصورت اور روح میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی وقتی ہو یا دیرپا اس سے بحث نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ رونما ضرور ہوتی ہے۔ اگر آپ کاغذ پر لکھے جانے والے علم اور کاغذوں اور کتابوں میں لکھنے والے ادیبوں کو ادیب کہتے ہیں تو میرے ساتھ نیچے چلئے اور کسی بھی بک شاپ کے کسی بھی میز کے سامنے رک جائیے۔ پیپر بیک کے ایک ملے جلے انبار پر جھکئے اور دونوں بازوؤں کو پھیلا کر کتابوں کا ایک بچھا بھر لیجیے۔ آپ کے حصے میں چھتیس سے بیالیس تک کتابیں سمٹ آئیں گی۔ پھر ان کتابوں کو ایک کونے میں لے کر بیٹھ جائیے اور ان کی علمی اور ادبی حیثیت جانچنے کے لیے تین چار لمبی دوپہریں ان پر صرف کیجیے۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ ان کتابوں کے مندرجات کس صورت میں ریڈیو ٹیلی ویژن کے بیہودہ پروگراموں سے بہتر ہیں اور ان کتابوں کے مصنفوں نے قاری کا اور اپنا دونوں کا وقت کیسے ضائع کیا ہے؟ چنانچہ یہ طے پایا کہ اچھی چیز چاہے وہ صنائی کاغذ پر چھپے یا آرٹ پیپر پر ریڈیو کی لہروں پر اچھالی جائے یا ٹی وی کے سگنل وساطت سے اچھی ہی رہے گی۔ بانگ دھل اگر سہ رنگی طباعت میں آفسٹ کے ذریعے چھاپی جائے تو نہ بانگِ درا بن سکے گی نہ نقشِ فریادی/ بانگ دھل ہی رہے گی۔ میرا ایک افسانہ یا ڈرامہ اگر اچھا ہوگا تو کتابی صورت میں بھی اچھا ہوگا اور نشر ہونے پر بھی اچھا ہوگا۔ اگر اس کے برعکس ہوگا تو دونوں صورتوں میں برا ہوگا۔ اب آتی ہے ہڑپہ کی کالی پٹی علاقے کے سردار زادے گوگو کی بہنوں کی بات کہ یہ ہوائی ادب دیرپا نہیں ہے۔ ختم ہو جانے والا ہے اور اس کی اشاعت نہیں ہوسکتی تو اس ضمن میں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام بک سیلر اب کتابوں کے ساتھ ٹیپ اور کیسٹ ٹیپ بھی فروخت کرنے لگے ہیں جہاں آپ کو اپنی پسند کا ادب کتابی صورت میں بھی مل سکتا ہے اور ریکارڈ کی ہوئی صورت میں بھی۔ ڈیپا سے سارتر کا دی ورڈز نکالا اور سن لیا آرتھر ملر دی ڈیتھ آف اے سیلز مین ریکارڈر میں فٹ کیا اور ہم تن گوش ہوگئے۔ ذہن بدھ ازم پر ایلن واٹس' سوزوکی اور میرڈ کی ڈسکشن سنی اور غور سے سنی جہاں سے سمجھ نہ آیا Rewind کیا اور پھر سن لیا۔ ماہرین روحانیات کا خیال ہے کہ سننے سے دماغ کے جس حصے پر امیج بنتا ہے وہ سوچنے والے حصے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور آپنگ وژن والا حصہ سوچ والے منطقے سے قدرے دور ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ ایک طویل داستان ہے جس پر پھر کسی وقت بحث ہوگی۔ آج کی جنریشن سی ڈی روم' ٹیپ' ویڈیو اتنی کثرت سے سننے اور دیکھنے لگی ہیں کہ اب ان کی قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں رہی۔ یہ بات الگ ہے کہ باہر سے ادیبوں اور عالموں کے بھرے بھرائے کیسٹ ٹیپ منگوانے میں ابھی اتنی آسانیاں پیدا نہیں ہوئیں اور کسٹم کا محکمہ خاصا تنگ کرتا ہے لیکن آپ کسی آنے جانے والے کے ہاتھ آسانی سے چند کتابیں

لیسٹ کی صورت میں منگوا سکتے ہیں۔ کیسٹ بک میں مطلوبہ صفحہ نکالنے کی بھی آسانی ہوتی ہے ریکارڈر کی کھڑکی میں نمبر چلتے رہتے ہیں اور آپ کو کیٹلاگ شیٹ سے علم ہوتا رہتا ہے کہ نمبر 46 تیسرے باب کی ابتدا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہمارے یہاں ابھی الیکٹرونکس کے ذریعے عام کیے جانے والے ادب کے فروغ کا انتظام نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہاں بھی جلد ہی ایسے پبلشر پیدا ہو جائیں گے جہاں سے آپ ''ماورا'' چاہے مصنف کی آواز میں چاہے سلطان غازی کی آواز میں خرید سکیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ ریڈیو اور ٹی وی پر لکھنے والے ایک ادیب کو کاغذ پر لکھنے والے ادیب 'ادیب' کیوں نہیں سمجھتا یا اگر سمجھتا ہے تو کیوں بار بار کہتا ہے کہ جب کاغذ پر لکھتا تھا تو زندہ تھا لیکن جب سے لہروں پر لکھنے لگا ہے مر گیا ہے تو اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شہرت عام کے سلسلے میں وہ کاغذی ادیب سے معروف تر ہوتا ہے اور یہ بات ذرا مشکل ہی سے گوارا ہوتی ہے۔ دوسرے غالباً اس کی یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ ہر ذریعہ اظہار کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کسی سے ایک پورا ہو جاتا ہے کسی سے دوسرے ذرائع پر کوئی بھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً میں تحقیقی اور تدقیقی مضمون نہیں لکھ سکتا۔ میرا ایک ہم عمر ریڈیو ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔ ہمارا ایک اور ساتھی شاعری نہیں کر سکتا اور یہ محرومی ہمیں ہر وقت جواز کے لنگڑے گھوڑے پر لیے پھرتی ہے اور ہم اس محرومی کی چھڑی سے دوسروں کے بلیک بورڈ کی غلطیاں دکھاتے رہتے ہیں۔

اچھا لکھنا اچھا ہوتا ہے اور برابر ا۔ اس میں ذریعے کی کوئی قید نہیں..... 53ء میں شیخوپورے سے کسی نے ایک ادبی پرچہ نکالا اور مجھے لکھا کہ ہمیں معلوم ہے آپ ایک افسانے کے پچاس روپے لیتے ہیں لیکن ہمارا کام نیا نیا ہے اس لیے مہربانی فرما کر ہمیں ستاراں اٹھاراں روپے والا کوئی کمزور سا افسانہ بھیج دیجیے۔''

نشریات کی ساری چیزیں بھی محفوظ کرنے کے قابل نہیں ہوتیں یہ تو پک اینڈ چوز کا معاملہ ہے۔ نسخہ حمیدیہ اور دیوان غالب والا قصہ ہے' اس لیے زیادہ بے چین اور بے قرار ہونے کی ضرورت نہیں۔ الیکٹرونکس بھی اظہار کا بہت ہی موثر ذریعہ ہے اور علم پھیلانے اور محفوظ کرنے کا ایک منفرد طریقہ ہے۔

''روحِ تصوف''

اردو کے علاوہ صوفی ازم پر میں نے انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی میں بھی کافی کتابیں پڑھ لیں۔ ان کو جانچا پرکھا، ان کے بارے میں سوچا بھی۔ انہیں پسند بھی بہت کیا لیکن چوٹ قلب پر نہ پڑی۔

اس وقت ساری دنیا میں جو اپنی مرضی کے خلاف مادے کی لپیٹ میں آ گئی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی مشقت میں مبتلا ہو گئی ہے اپنی رہائی کے لیے نالہ و شیون کر رہی ہے۔ اس کی بلبلاہٹ اور آنسو دیکھے نہیں جاتے لیکن دردناک منظر یہ ہے کہ جب بھی تصوف اس کی زنجیریں کاٹنے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور اس کو محبت سے پکارتا ہے تو یہی پابندِ سلاسل دنیا کو گالیاں دینے اور اس کے دست گرہ کشا میں اپنے دانت گڑونے کے لیے جھیاں لے لے کر اس کی طرف لپکتا ہے۔

ایک مرتبہ ہم اپنے سکول کی طرف سے ایک ملیریا زدہ گاؤں میں کونین کی گولیاں تقسیم کرنے گئے تھے تو بخار میں مبتلا مرد اور عورتوں نے ہمیں گھیر کر گنوں سے اتنا مارا تھا کہ ہم سارے نیک دل مضروب طالب علم دس دن تک سکول نہیں جا سکے تھے۔ پھر بھی سائنس دانوں کا اندازہ ہے (میں Technologists کی بات نہیں کر رہا۔ سائنس دانوں کی کہہ رہا ہوں) کہ اس دنیا کو آسانی، آزادی اور سکھ کے لمحے اسی وقت میسر آ سکیں گے جب وہ اپنا تعلق مادے سمیت روح سے جوڑے گا۔ خود بھی روشن ہوگا دوسروں کو بھی راہ دکھائے گا اور ماحول میں بھی روشنی کے ساتوں رنگ بھر دے گا لیکن ابھی تک سائنس دانوں اور Technologists میں اسی طرح کی جنگ جاری ہے جیسی صوفی اور ملّا کے درمیان ازل سے چل رہی ہے۔

سائنس دان بھی حکم کا بندہ ہے علم کی جوتیاں سیدھی کر رہا ہے اور آپ جانتے ہیں نیوٹن کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کیے بغیر کوئی آئن سٹائن پیدا نہیں ہوتا۔ فرائیڈ کو مانے بغیر یونگ ابھر نہیں سکتا۔ یوں لگتا ہے کہ ماننے والے سائنس دان کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور اس کی تقویت کے لیے ایسا مواد بہم ہونے لگا ہے جس کی اس بلکتی ہوئی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑے حسن اور سلیقے کے ساتھ تصوف کا تعارف کرایا ہے اور پھر قاری کو اس کی انگلی پکڑ کر قدم قدم اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ بہت سے مشکل مقام جو

قاری پر پہلے اتنی آسانی کے ساتھ کھلتے نہیں تھے اس کتاب میں خودبخود وا ہونے لگے ہیں۔ وہ مشکل اصطلاحات اور پیچیدہ رموز جو بڑی ریاضت کے بعد بھی واضح نہیں ہو پاتے اس کتاب کے مطالعے سے کم از کم مفروضے کی حد سے آگے نکل جاتے ہیں اور پڑھنے والا خود ان پر غور کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ میں اسے ایک ابتدائی کتاب بھی نہیں کہتا کہ یہ انتہا کے سارے اشارات اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اور اس کو نامانوس ساتھی بھی نہیں سمجھتا کہ اس کا چہرہ ہمارا جانا پہچانا اور اس کا لمس مانوس ہے۔ جیسے ماں کا وجود ہوتا ہے کہ ابتدا کے اندر انتہا کی خبر بھی رکھتا ہے۔ کچھ ویسی ہی کیفیت اس تحریر کی ہے۔ ایسی ہی شفقت اس بیان کی ہے اور ایسا ہی لمحہ اس ذکر کا ہے۔

اس کتاب میں گیلانی صاحب کا اندازِ تخاطب کہیں کہیں ذرا ساسخت بھی ہوگیا ہے لیکن صرف ان مقامات پر جہاں فقیر خاموش ہوجاتا ہے اور ایک عالم گفتگو شروع کرتا ہے۔ آخر سید صاحب نوجوان ہیں اور علم کا ماحول سخت گیر ہوتا ہے۔ جہاں علم بولے گا وہاں تھوڑی سی تختی تو ہوگی ہی۔ علم آخر بنا کس لیے ہے؟ جب آدمی خالی خولی ہِمو سے ڈر سکتا ہے تو علم تو انسان کا کلیجہ ہلا کے رکھ سکتا ہے؟ روحِ تصوف چونکہ شدید اعتراضات کا جواب دینے اور صوفی ازم کے بارے میں کچھ اشکال کو دور کرنے کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس میں علمی سطح پر بات کرنے کی ضرورت اشد تھی۔ گیلانی صاحب کی اگلی کتاب "جانِ تصوف" ایسے مباحث سے مبرا ہوگی۔ اس میں صرف تصوف اور تصوف کی زندگی کے انگ کا بیان ہوگا کہ حکم ماننے والے حکم کے آگے کس طرح سرنگوں رہتے ہیں اور انبیاء کی سنت سے کیا سیکھتے ہیں۔ حکم ہوا کہ تم پر مصیبتیں آئیں گی تم صبر کرو گے۔ عرض کیا" حاضر۔" فرمایا تن میں کیڑے پڑیں گے۔ بدن گل جائے گا منہ سے ایک لفظ نہیں نکالنا۔ عرض کیا" حق سائیں" دوسرے سے فرمایا" رونا پڑے گا۔ آہیں بھرنی ہوں گی۔" عرض کیا" جو حکم۔" فرمایا "آنکھیں گل جائیں گی۔ سونا نہیں ہے بے چین رہنا ہے۔ نالہ کرنا ہے۔" عرض کیا" حق سائیں۔" فرمایا بیٹے کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونا ہے۔ اس کا ادب کرنا ہے۔" عرض کیا" جو حکم جیسا ارشاد" فرمایا اپنی کشتی کے اندر بیٹھ کر بیٹے کو ڈوبتے دیکھنا ہے غرق ہوتے ہوئے" عرض کیا" حق سائیں جو ارشاد۔"

اور یوں ان ماننے والوں سے تسلیم و رضا کی ایک ایسی رسم چلی کہ ایک خاص گروہ نے انبیا کی خاکِ پا کو اپنے ماتھے کا صندل بنالیا۔ یہ ماننے والا گروہ روزِ ازل سے انکار کرنے والے کے سامنے اب بھی ایستادہ ہے۔ پہلے بھی تھا آئندہ بھی رہے گا۔ اس گروہ کی پاور ایک مخصوص طریقے پر آگے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ پاور کنکشن سب کو ایک ہی گرڈ سٹیشن سے ایک جیسی وولٹیج کا ملتا ہے۔ آگے واٹس مختلف ہوسکتے ہیں۔ کوئی ساٹھ کا کوئی سو کا کوئی پانچ سو کینڈل پاور کا کوئی پندرہ واٹ کا لیکن روشن سب ہیں۔ روشنی سب سے ملتی ہے۔ رستہ بھی اجاگر کردیتے ہیں۔ اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان ہمہ صفت اور ہمہ حسن ایسے بابے ہیں جو اپنی تسلیم کی روشنی میں ہم کو بہت آگے تک لے جاسکتے ہیں۔ سید خورشید احمد گیلانی ہم سب کے شکریے کے مستحق

ہیں کہ انہوں نے ''روح تصوف'' کے روپ میں ہمیں روشنی کا وہ سگنل عطا کر دیا جس سے میرے جیسے لوگ بھی آسانی کے ساتھ ٹیک آف کر سکتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ گیلانی صاحب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اصولِ النغمات

یوں تو موسیقی کے موضوع پر اردو زبان میں "معارف النغمات" اور "منقار موسیقار" جیسی وقیع اور بلند پایہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کے اردگرد اور بھی بہت سی اہم کتابوں کا میلہ موجود ہے لیکن تاج نسیم اسدی صاحب کی "اصول النغمات" اس اعتبار سے توجہ طلب ہے کہ یہ آسان زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کے مفاہیم اور مطالب آج کے روزمرہ کے عین مطابق ہیں۔

دوسری اہم بات اس کتاب کی یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس کی حیثیت ایک "ہینڈ بک" یا "مینوئل" کی سی ہے جسے سامنے رکھ کر آپ موسیقی کی مشکل ترین بندشوں اور پیچیدہ ترین بناوٹوں سے ایسے ہی آگہی حاصل کر سکتے ہیں جسے اناٹومی کی کتاب دیکھ کر ایک سرجن جسم کے پراسرار حصوں سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہمارے فن موسیقی پر مغربی نوٹیشن کے حوالے سے کوئی کتاب اردو میں دستیاب نہیں۔ اکا دکا اخباری مضمون یا دو ایک منحنی سی کتابیں انگریزی میں ضرور موجود ہیں لیکن ان میں ایسی وضاحت نہیں جو اسدی صاحب کے اصول النغمات میں ہے۔

فنی اعتبار سے تو یہ ایک مکمل اور جامع کتاب ہے ہی کہ تاج نسیم صاحب کے پرکھوں سے لے کر خود ان تک کسب کمال کا ایک گہربار سلسلہ ہے لیکن مجھے سب سے زیادہ ان کے انداز تحریر نے متاثر کیا جو کتاب کے اولین حصہ میں حقائق پر مبنی ایک خوبصورت داستان کے روپ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اصل میں یہی وہ حصہ ہے جس نے پہلی نظر میں مجھے گرفتار کیا اور پھر ساری کتاب میری نظروں سے گزار دی۔

یہ کتاب پڑھ چکنے کے بعد میں نے اسدی صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اس کا دوسرا حصہ لکھنے سے پیشتر پچھلی صدی میں موسیقی اور موسیقاروں پر گزرنے والے واقعات واردات اور کیفیات پر ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے ہمیں اس عہد کی ثقافت کے اس اہم حصے سے روشناس کرائیں۔ انہوں نے وعدہ تو کر لیا ہے لیکن دیکھیں یہ وعدہ کب پورا ہوتا ہے۔

اُردو سائنس بورڈ

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

اس خوشی کے موقع پر کہ مرکزی اردو بورڈ کا دفتر اپنی ذاتی عمارت میں منتقل ہو رہا ہے، میں آپ کی تشریف آوری کو ایک نہایت ہی نیک شگون خیال کرتا ہوں اور آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ اپنی مصروفیات کے باوجود اپنا دستِ شفقت ہمارے کندھے پر رکھنے کے لیے یہاں تشریف لائے۔

جنابِ والا! ہر اچھے، معزز، اہم اور ارفع سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں کی طرح ہم بھی آج تک کرائے کی عمارتوں میں گزر بسر کرتے رہے اور مالکان مکان کے سامنے گھگھیاتے یا ان سے دست و گریبان ہوتے رہے..... ایک بڑی رقم سال بہ سال کرائے کے طور پر ادا کرتے رہے اور اپنے سامان اور اپنے مال کی حفاظت اس طرح سے نہ کر سکے جس طرح اپنے گھر میں رہنے والا اپنا مال پیش عرب رکھتا ہے..... کبھی جو اپنا دفتر بنانے کا خیال بھی آیا اور اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی بھی کی تو مطلوبہ رقم حاصل نہ ہو سکی۔ قومی زبان کے بارے میں حکومتوں کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ رہا اور شفیق انسان چونکہ عام طور پر مخیر نہیں ہوتا اس لیے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

میں اپنے عملے کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کا احسان مند ہوں اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ خدا انہیں دین و دنیا میں سرخرو کرے جنہوں نے ایک دن ایک وفد کی صورت میں میرے کمرے میں آ کر اپنا یہ فیصلہ مجھ پر مسلط کر دیا کہ ہم اپنی بلڈنگ خود بنائیں گے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کریں گے۔

میں نے ان مجذوبوں کی اس بڑ کو بڑے مشفقانہ انداز سے سنا اور ان کے جذبے کی مربیانہ طور پر داد دے کر انہیں رخصت کر دیا۔ لیکن اگلے روز وہ صبح سویرے پھر میرے کمرے میں موجود تھے۔ جس طرح نااہل اور کام چور سٹاف کے ساتھ کام کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح مستعد اور کارکن عملے کے ساتھ چلنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اپنے اخراجات میں بچت کریں گے۔ دفتری اوقات کے بعد بھی کام کریں گے

اور اپنی مطبوعات کو فروخت کرنے میں انفرادی کوششوں سے بھی کام لیں گے لیکن اپنی بلڈنگ ضرور بنائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں خوفناک ارادے دیکھ کر تو مجھے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ استفسار پر طاہر صاحب نے بتایا کہ انہوں نے پچھلے تین سال میں کتابوں کی فروخت سے تین لاکھ روپے سے زائد کمایا ہے اور اس رقم پر کچھ سود بھی جمع ہو گیا ہے۔ طاہر صاحب ہمارے دفتر میں مطبوعات کی فروخت کے انچارج ہیں۔ ڈائریکٹر کے پی اے کے فرائض بھی یہی سرانجام دیتے ہیں اور بورڈ کے لائبریری کے لائبریرین بھی یہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ذمہ سٹور کیپری کا بھی کام ہے۔ اپنی تنخواہ مہتمم اشاعت کی حیثیت سے لیتے ہیں' باقی کام اعزازی کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ دلبر صاحب دوسرے گرمجوش داعی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ اپنی بلڈنگ بنانا مشکل کام نہیں۔ دلبر صاحب بنیادی طور پر ریکارڈ کیپر ہیں لیکن شام کے وقت ہماری درسگاہ میں اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کا درس بھی دیتے ہیں۔ پھر یہ سٹیشنری اور دوسری روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کے سٹور کیپر بھی ہیں اور مصنفوں سے مسودات کی خبر لانے اور لے جانے کا کام بھی انہی کے سپرد ہے۔ پچھلے پانچ سال اپنی سٹیشنری کی مد میں بچت کرنے کو انہوں نے ایک ایک پنسل کے لیے جس طرح ہمیں ترسایا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اس وقت تقریباً سارا عملہ ان سے ناراض ہے اور ابھی تک ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

فضلی صاحب لکھائی چھپائی جزبندی' جلدی سازی' کاغذ کے حصول' پروفوں کی آمدورفت اور کتابوں پر تبصرے کروانے کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی کتابوں کو پیپر بیک بنانے اور گردوپیش کو سستا چھپوانے کا پروگرام بنایا تھا۔ کاغذ' پٹیاں اور بکس بورڈ وغیرہ حاصل کرنے کے لیے کچھ کباڑیوں سے بھی پینگی یارانہ گانٹھ لیا تھا اور مصر تھے کہ اپنی عمارت ہونی چاہیے۔

اشفاق انور ہمارے دفتر کے معاون یعنی اسسٹنٹ ہیں۔ لیکن یہ پروف بھی پڑھتے ہیں۔ مسودے بھی دیکھتے ہیں۔ لغتوں کے کارڈ بھی مرتب کرتے ہیں۔ ٹائپ بھی کر لیتے ہیں۔ وقت پڑے تو اکاؤنٹینٹ کا ہاتھ بھی بٹا سکتے ہیں۔ دفتر کا سائین بورڈ پرانا ہو جائے تو دوبارہ لکھ دیتے ہیں۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی پینٹ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی بچت سکیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کو ہاتھ کھڑا کر دیا۔ اکرام چغتائی ہمارے دفتر کے ایک عالم فاضل نہایت شریف اور مرنجاں مرنج قسم کے کارکن ہیں جن کے تبحر علمی کی شہرت کسی حد تک ملک سے باہر بھی ہے۔ ہم سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں کیونکہ دفتر سے باہر کی دنیا میں ہماری ساری نیک نامی اور عزت انہی کی وجہ سے ہے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ تحریک تعمیر عمارت میں ان کا عطیہ سب سے معمولی ہوگا لیکن پتہ اس وقت چلا جب حضرت بازنطینی اور مراکشی اور اندلسی طرز تعمیر کی کتابیں آگے پھیلائے ہونے والی بلڈنگ کے نقشے وضع کرتے ہوئے پائے گئے۔ تاکہ وقت آنے پر آرکیٹیکٹ کی مدد کر سکیں اور ایوان اردو کو ایسی چھب عطا کر سکیں جو اپنی جدیدیت کے باوجود مشرقی ہو۔ پھر انہوں نے اس کی تعمیر کے لیے سب سے بڑا امدادی چندہ اس طرح سے دیا کہ صبح وقت پر دفتر آنا شروع کر دیا اور تعجب ہے کہ عمارت بن چکنے کے بعد اب

تک باقاعدگی سے آ رہے ہیں۔ فیض اللہ صاحب اردو کے ٹائپسٹ ہیں اور ہم سب سے سینئر ہیں۔ یہ بورڈ کے قائم ہوتے ہی یہاں ملازم ہو گئے تھے اور اب تک ہر معاملے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے ٹائپ کے ایک ایک ربن کو بری طرح سے کوٹا ہے اور ایک ایک کاربن کو بری طرح سے گھسایا ہے۔ ان کے ساتھ رزاق صاحب ہیں جو انگریزی کے ٹائپسٹ ہیں۔ انہوں نے بٹر پیپروں پر ٹائپ کا نیا اسلوب نکال کر وینڈا ایک چھپائی میں ہماری طباعت کے بل کو تین چوتھائی سے بھی کم کر دیا۔ ان ہی کے ساتھ جمیل صاحب اردو ٹائپسٹ ہیں جن کی مدت ملازمت گو کم ہے لیکن بچت سکیم میں وہ بھی برابر کے حصہ دار رہے۔

جناب والا! یوں تو منصرم کا کام انتظام و انصرام ہوتا ہے لیکن ہمارے نسیم صاحب نے عمارت کی تعمیر میں دن رات ایک کر کے دکھا دیا۔ میں نے ایسا باہمت محنتی اور ایماندار شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ سیمنٹ کا حصول' بھٹوں کے چکر' موقع پر کھڑے ہو کر کام کروانا اور پھر رقم کم ہونے کے وقت تقاضا کرنے والوں کو کچھ اس طرح سے تسلی دینا کہ خود ان کی آنکھ میں آنسو آ جائیں' نسیم صاحب ہی کا کام تھا۔ گو یہ صوبائی آڈٹ کی طرف سے ہمارے یہاں مہمان کارکن ہیں لیکن اس مہمان نے میزبانی کے سارے فرائض کمال محبت سے سرانجام دیے اور آج بھی چائے کے معاملے میں یہی آپ کے میزبان ہیں۔ اکاؤنٹ سیکشن کے آغا ہمایوں اور محاسب اکرم میاں اپنی تہی دامانی کو بڑے سلیقے سے نبھاتے رہے اور سفید پوشی کا بھرم بھی رکھتے رہے۔ گو آج دوپہر کے وقت بھی چند قرض خواہ اپنے بل اٹھائے ان کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن ان کو میزوں کے پیچھے ڈوبنے اور ابھرنے میں کمال حاصل ہے۔

پھر ہمارے قاصد حضرات ہیں۔ ربانی طبیعت کا سخت' زبان کا کڑوا مگر دل کا اچھا ہے۔ گزشتہ تین سال اس نے صابن کی ایک ٹکیہ کو چار حصوں میں کاٹ کاٹ کر کام چلایا۔ ہاتھ تو خیر دھل جاتے تھے لیکن سکھانے مشکل تھے۔ چھ آدمیوں کے درمیان پندرہ دن تک ایک ہی تولیہ کب تک چل سکتا لیکن ربانی نے چلوایا۔ محمد علی گیسٹنر Gestetner آپریٹر ہیں لیکن دفتری کا کام بھی کرتے ہیں۔ کتابوں کی پنیاں بھی یہی بند کرتے ہیں۔ فارغ اوقات میں پرانے لفافے الٹ کر نئے بنا دیتے ہیں۔ پنسل کے ٹوٹنے پیچھے کاغذ لپیٹ کر اسے بڑا کر دیتے ہیں۔ محمد سلیم فرینکلن کے پرانے کارکن ہیں۔ یہ ہم کو امریکی طریق کار کے رموز سمجھاتے ہیں اور باہر کے دفتروں میں اپنی ذاتی سائیکل پر ڈاک لاتے لے جاتے ہیں۔ پھر یاسین ہے جس کے خوف سے رمضان شریف میں کوئی ملازم بظاہر روزہ نہیں چھوڑ سکتا۔ انہوں نے اور سلیم نے تعمیر کے دوران دن رات اس بلڈنگ کی تعمیر کی نگہداشت کی۔ نذر محمد نیا ہے لیکن تگڑا آدمی ہے۔ بوجھ اٹھانے میں اور سیمنٹ کی بوریاں لدانے میں اس نے مزدوری کے اخراجات میں کمی کی۔ رمضان مالی نے نہ صرف اپنا کام کیا بلکہ مزدوروں کے ساتھ بھی کام کرایا۔ مشکور خان ڈرائیور اور ان کی سوزوکی وین نے سامان ڈھونے میں ایک پل کی کوتاہی نہ کی اور کسی ٹھیکیدار کو سامان کے حصول کے لیے گھنٹہ بھر بھی انتظار نہ کرنا پڑا۔ سراج مسیح یوں تو صفائی کا کام کرتے

ہیں لیکن اس عمارت کی تعمیر میں ان کا پسینہ بھی بہا ہے اور ایک چوٹ لگ جانے سے خون بھی۔ سراج مسیح مشکور خان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی چلاتے تھے۔ سریا بھی لدواتے اور مشکل آ پڑے تو پنجابی کے محاورات اور ضرب الامثال کی وضاحت بھی کر دیتے تھے۔ بابو خان چوکیدار نے پرانے دفتر بھی ڈیوٹی دی اور نئے دفتر میں بھی چوکیداری کی۔ باوجود اس کے تیرہ جون کو آدھی رات کے وقت بابو خان کو اسی ہال میں ایک جن کا سایہ بھی نظر آیا تھا اور جن نے اپنا پاؤں فرش پر مار کر اسے دہکایا بھی مگر وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے سے باز نہ آیا اور عملہ اردو بورڈ کی اس تحریک کے ساتھ وابستہ رہا کہ اپنا دفتر اور.....اپنی مدد آپ۔

مرکزی اردو بورڈ کا عملہ پورے تین برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک اپنی دھن میں کسی صلے اور ستائش کی تمنا کے بغیر اپنی مہم میں لگا رہا۔ سب لوگ شہد کی کارکن مکھیوں کی طرح کام میں مصروف تھے۔ ایک صرف میں تھا جو آرام سے کرسی پر بیٹھ کر کسی کا ہاتھ بٹائے بغیر' یہ انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں یہ چھوٹے لوگ اتنا بڑا کام کس طرح سے سرانجام دے سکتے ہیں اور کیونکر ایک عمارت اپنے زور بازو پر اٹھا لیتے ہیں.....آج میں ان لوگوں کے سامنے شرمندہ ہوں کہ انہوں نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا لیکن میں اس مہم میں ان کے ساتھ برابر کا شریک نہ ہو سکا۔ اور یہ ساری مدت ایک تماشائی کی حیثیت سے گزار گیا۔ شاید یہ لوگ بھی اپنی تمام تر جسمانی محنت اور ذہنی کاوش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکتے۔ اگر ان کے پیچھے مرکزی اردو بورڈ پشاور برانچ اور حیدر آباد برانچ کے عملے اور ان کے نگرانوں مولانا افضل معبود اور نیاز حسین ہمایونی کی دعائیں نہ ہوتیں' جو بار بار ہر خط میں پوچھتے تھے' ہماری اپنی بلڈنگ کب مکمل ہو رہی ہے اور ہم کب اس میں منتقل ہو رہے ہیں۔

جناب والا! 2 کنال 13 مرلے اور 131 فٹ رقبے پر محیط ہے۔ زمین کی قیمت تین لاکھ چونتیس ہزار آٹھ سو اٹھاسی روپے ادا کی گئی جو ہم نے اپنی مطبوعات کی فروخت سے حاصل کی.....جنوری 78ء میں ہم نے اس پر تعمیر کا کام شروع کیا۔ اب تک ہم اس پر نو لاکھ ستاون ہزار پانچ سو تہتر روپے خرچ کر چکے ہیں اور تقریباً نوے ہزار کے بل واجب الادا ہیں۔ یعنی اس عمارت پر اس صورت میں کل 10,47,573 روپے کا خرچ اٹھا۔ اس عمارت کا مسقف رقبہ یعنی کورڈ ایریا 11 ہزار مربع فٹ ہے۔ گویا اس تعمیر پر 95/23 فی مربع فٹ کے حساب سے لاگت آئی ہے۔

جناب صدر' دسمبر 78ء میں جب آپ کام کے دوران تعمیر کی رفتار کا معائنہ کرنے یہاں تشریف لائے تھے تو آپ کو از خود ہماری مشکلات کا احساس ہوا تھا اور آپ نے کمال مہربانی سے اسلام آباد جا کر ہمارے لیے 4,24,222 روپے کی رقم عمارت کی تزئین و آرائش کے لیے اور نیا فرنیچر اور دوسرا ضروری سامان خریدنے کے لیے مرحمت فرمائی تھی۔ یہ پنکھے اس رقم سے خریدے گئے ہیں۔ یہ بتیاں بھی آپ کی عطا کردہ ہیں۔ یہ تینوں ایئر کنڈیشنر بھی آپ کا تحفہ ہیں اور اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کی کلاس کا فرنیچر بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ بچی ہوئی رقم سے ہم واجب الادا بل کی ادائی کریں گے اور آڈیٹوریم کے لیے کرسیاں خریدیں

گے۔ سردیاں آنے سے پہلے کھڑکیوں پر پردے بھی ہوں گے۔ فرش بھی ڈھک جائیں گے اور گیس کے الاؤ بھی روشن ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

جناب والا! یہ بلڈنگ آپ کی ہے۔ وفاقی وزارت تعلیمات کی ملکیت ہے۔ پاکستان کا سرمایہ ہے اور پاکستانی قوم کا ایک امتیازی نشان ہے.....اردو بورڈ کا عملہ اپنی پوری کوشش' انتھک محنت اور گہری لگن کے باوجود اس عمارت کو کبھی بھی مکمل نہ کر سکتا اگر اس کو بورڈ کے معزز اراکین کا تعاون اور رہنمائی حاصل نہ ہوتی۔ اگر ملک کے ادیبوں' صحافیوں اور دانشوروں نے قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی اور اس کی ہمت نہ بڑھائی ہوتی۔ اگر ہمارے مصنفوں' چھاپہ خانہ والوں اور دفتریوں نے بروقت ہماری امداد کر کے ہماری مطبوعات سرعت کے ساتھ بازار میں نہ پہنچائی ہوتیں۔ (اس وقت بورڈ کی مطبوعات کی تعداد ایک سو پینسٹھ ہے۔ متعدد کتابوں کے چھٹے اور ساتویں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اب تک بورڈ اپنی .... مطبوعات پر مختلف ادبی انعامات حاصل کر چکا ہے۔ پاکستان کا کوئی سرکاری یا غیر سرکاری اشاعتی ادارہ اب تک اتنے ادبی انعام حاصل نہیں کر سکا۔ بورڈ ہر سال ڈھائی سے دو لاکھ ساٹھ ہزار کی مالیت کی کتابیں فروخت کرتا ہے۔) ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس دور میں ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کے بھی سپاس گزار ہیں جنہوں نے فہمائش کی اور سخت سست کہا۔ یہ سب محبت کے اور تعلق ہی کے روپ ہیں۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے عملے کے ارشاد کے مطابق اس عمارت کے آرکیٹیکٹ رفیع رحمانی صاحب کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے موعودہ وقت سے زیادہ وقت اور مطلوبہ توجہ سے بہت زیادہ توجہ اس عمارت کی تعمیر پر دی۔ پھر جناب منیر صاحب ٹھیکیدار اور صادق صاحب ٹھیکیدار آب رسانی اور اسلم صاحب ٹھیکیدار بجلی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ واپڈا نے بجلی واسا نے پانی اتنی جلدی فراہم کیا کہ اگر میں عرض کروں گا تو آپ مبالغہ سمجھیں گے۔ ایک ٹیلی فون کی تبدیلی میں دیر ہوئی لیکن وہ سراسر ہماری کوتاہی تھی.....آخر میں میں اور میرے تمام شرکاء کار تہہ دل سے اپنی پرانی بلڈنگ کی مالکہ مکان محترمہ مسز جہنداراکا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے کمال مہربانی سے نہایت ہی معمولی کرائے پر ہمیں اپنے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے دیا۔ ہم آج بھی ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آئندہ بھی زندگی بھر ان کے شکر گزار رہیں گے۔

تلقین شاہ پروگرام کی سالگرہ

آواز کی دنیا کے دوستو!

اس وقت آپ کا نیاز مند اشفاق احمد آپ سے مخاطب ہے اور پروگرام تلقین شاہ کے حوالے سے آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ پروگرام انتخاب کی دسویں سالگرہ نے آج ہمیں ایک دوسرے کے قریب ہونے کا موقع عطا کیا ہے اور اللہ گواہ ہے کہ ہمیں لحہ بہ لحہ ایک دوسرے سے باخبر ہونے کے لیے ریڈیو پاکستان وہ واحد سہارا ہے جو ہمارے درمیان لمبے سے لمبے فاصلے کو گھٹا کر ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے.....میرا تلقین شاہ کا فیچر بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر ہفتے آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔اسی پیش کار انتخاب کے سہارے! آپ اسے جس طرح سے پسند کرتے ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں اس کے بارے میں میں تو کچھ عرض نہیں کروں گا البتہ ایک حقیقت بیان کیے بغیر نہ رہ سکوں گا کہ تلقین شاہ سب سے پہلے انتخاب پروگرام میں براڈ کاسٹ ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرے سٹیشنوں سے نشر کیا جاتا ہے۔گویا آپ کا تلقین شاہ "انتخاب" کے لیے ہے اور انتخاب صرف آپ کے لیے کہ یہ سب آپ ہی کا انتخاب ہیں۔

تلقین شاہ لکھنے کے لیے مجھے ہفتہ بھر تک ادھر ادھر نظریں دوڑانی پڑتی ہیں۔ دور نزدیک کی آوازوں کو کان لگا کر سننا پڑتا ہے۔ پھر کچھ نتیجے اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ قصے گھڑنے پڑتے ہیں۔ کچھ بولیاں بولنی پڑتی ہیں۔ کچھ زخم کھانے پڑتے ہیں۔ گویا ایک لمبا عمل ہوتا ہے جو لمبا لمبا ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ پندرہ منٹ کا ایک مسودہ تیار کرنے کے لیے سات سے نو گھنٹے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر اسے خوش خط لکھا جاتا ہے۔کاپنگ پنسل یا بال پوائنٹ سے نہیں سیاہ قلم سے۔ پھر اس کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں تیار ہوتی ہیں۔ایک ہدایت اللہ کے لیے جو بڑا ہی مخلص بہت محبت والا اور کریم النفس انسان ہے جس کی بدولت تلقین شاہ اور اس کا گھر قائم ہے۔جس کے سہارے تلقین شاہ زندہ ہے۔ وہ ایک ڈھال ہے۔ ہدایت اللہ ایک پروٹیکشن ہے جس نے تلقین شاہ کو ہر حملے سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسری سادی صاحبہ ہیں جن کا وجود بدیسی سوچ ولایتی لیکن روح مشرقی ہے اور جو ابھی تک کسی چیز کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پائیں.....اور پھر سلیمان صاحب

ہیں.....لیکن اب نہیں ہیں۔ ماضی قریب میں تھے۔ جب تک معمولی انسان تھے اپنوں کے درمیان موجود تھے جب سے صاحب ثروت اور صاحب حیثیت ہوئے ہیں اپنوں سے ناتہ توڑ چکے ہیں۔ جغرافیائی حدیں عبور کر چکے ہیں اور اب اپنے آپ سے بھی کٹ کر اور دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کو واپس لانا مشکل ہے۔ گو پروگرام میں کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ بولتے بھی ہیں' کلام بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا مکالمہ بھی رہتا ہے لیکن وہاں ہوتے نہیں جہاں پہلے ہوا کرتے تھے یعنی قریب.....ساتھ ساتھ.....میل جول رکھنے والے.....اچھا یہ بتائیے آپ کو آج سے کئی سال پہلے کا کوئی تلقین شاہ یاد ہے.....ضرور ہوگا.....کیونکہ آپ اکثر اس کے حوالے دیا کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ آج کے اور دس سال پہلے کے تلقین شاہ کی آواز میں کیا فرق رونما ہو چکا ہے.....ذرا ٹھہریئے.....

میرا چونکہ آواز کی دنیا سے تعلق ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آواز کی تبدیلی انسان کی زندگی اور اس کی شخصیت پر سب سے نمایاں اثر ڈالتی ہے۔ گو کہنے والے اور سننے والے کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اچھا ٹھہریئے۔ میں آپ کو تلقین شاہ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور سناتا ہوں.....

اس ٹکڑے میں یہ سب آوازیں میری تھیں' یعنی سوال بھی میرے تھے جواب بھی میں ہی دے رہا تھا۔ پوچھ بھی میں رہا تھا اور بتا بھی میں رہا تھا۔ اس میں تو آپ نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ یہ تلقین شاہ آج کا تلقین شاہ نہیں ہے۔ صرف آواز کے اعتبار سے۔ فلسفہ وہی ہے سوچ وہی ہے۔ حرکت ویسی ہے۔ ندامت وہی ہے لیکن آواز کچھ مختلف ہے۔ یہ اختلاف۔ یہ فرق۔ یہ تفاوت۔ Paradex۔ یہی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ زندگی مادے اور غیر مادے کے اختلاف پر استوار ہوتی ہے لیکن چھوڑیئے یہ الجھی باتیں۔ ذرا مسکرائیے اور اگلی بات سنیئے.....

نئی تہذیب اور معاشرے کے مسائل

جناب والا! میں آپ کا' اس انجمن کا اور اس شہر کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے ساتھ شامیں منوا کر بہت خوش ہوتا ہوں اور اس کا میری انا اور میری نفسیاتی زندگی پر بہت خوشگوار اثر پڑتا ہے اور چند دن کے لیے میرے گھر والے میرے گرویدہ اور میری بیوی بچے میرے کہنے کار ہو جاتے ہیں اور مجھے اپنے سے کچھ بہتر چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ میں اکثر اپنے ملنے والوں اور ادبی انجمنوں کے کار پردازوں کو نظروں ہی نظروں میں اپنے ساتھ شام منوانے کی ترغیب دیا کرتا ہوں لیکن افسوس میری نگاہوں کی اس بولی کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں اور آئے دن میری نظروں کے سامنے دوسروں کے ساتھ شامیں مناتے رہتے ہیں۔ جہاں میں اپنے ساتھ منائی جانے والی شام دیکھ کر خوش ہوتا ہوں وہاں مجھے دوسروں کے ساتھ منائی جانے والی شام بے حد ناگوار گزرتی ہے۔ اس معاملے میں میں پورا سیاسی لیڈر ہوں اور مجھے دوسری پارٹی زہر لگتی ہے۔ خواہ اس میں شربت روح افزا کا دور کیوں نہ چل رہا ہو۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ آپ پھر بھی مجھے زحمت دیں گے اور میرے ساتھ وہی شہنشاہی سلوک کریں گے جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔

جناب والا! شہر قصور کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میں اس مختصری محفل میں انہیں ایک ایک کر کے گنوا نہیں سکتا لیکن ان میں سے دو ایسے ہیں جن کا ذکر اس وقت نہ کرنا میرے نزدیک غداری سے کم نہ ہوگا۔ ایک تو یہ کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دسہری آم یہیں دیکھا اور یہیں کھایا اور دو سیر پختہ دسہری آموں کا لفافہ لے کر ستلج پار کر کے اپنے شہر لے گیا۔ یہ بھید آپ پر کھل ہی چکا ہے کہ میں ضلع فیروز پور کے ایک پسماندہ قصبے کا نیم خواندہ فرد ہوں۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ تحصیل مکتسر کے دو اعلیٰ مقام نائب تحصیلدار اور سب پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرح وہاں کے دو پھل بھی مشہور تھے۔ ایک پھل جس کی آمد کا ہم سارا سال انتظار کیا کرتے تھے پیلو تھا اور دوسرا ڈیلا تھا جس کا اچار پڑتا تھا اور جسے ہمیں اپنے مختصر سے معصوم علم کے باوجود پھل کہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان دونوں پھلوں سے کام و دہن کی مدارات کرنے کے بعد جب میں فیروز پور کالج

میں داخل ہوا تو قصور کے میرے ایک ہم درس ریاض احمد قصوری تھے (جنوں نے اب کسی مصلحت کی بنا پر اپنا نام ریاض احمد چودھری رکھ لیا ہے اور قصوری کا لقب اپنے ایک اور ساتھی کو عطا کر دیا ہے) ریاض نے لالہ نند کشور اگروال کی کلاس میں مجھے بڑے راز دارانہ لہجہ میں بتایا کہ ان کی منڈی میں ایک آم دسہری کے نام سے آتا ہے اور بڑے بڑے رئیسوں کے گھر جاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو دیکھنے کا خیال ایک دم میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا اور میں نے قصور جانے کا ارادہ کر لیا۔

ہمدانی صاحب کی فارسی کلاس گول کر کے ہم نے تین تین آنے کے ٹکٹ خریدے اور قصور پہنچ گئے۔ ریاض کے والد بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ وہ پرانی وضع کے سادہ سے بزرگ تھے اور ان کے چہرے پر مہمان نوازی کے وہ سارے آثار موجود تھے جو عام طور پر اپنے والدین کے چہروں پر مفقود ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے دسہری آم کاٹ کاٹ کر ہمیں کھلائے اور جاتے ہوئے کوئی دو سیر پختہ آموں کا لفافہ میرے ساتھ کر دیا۔ یہ آج سے پچیس چھبیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت قصور ریلوے سٹیشن پر ریاض نے ادھر ادھر دیکھ کر مجھے ایک خفیہ بات بتائی جو مجھے اب تک یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اچھے دسہری آم کی پہچان یہ ہے کہ کھانے کے بعد اگر اس آم کی گٹھلی اچھی طرح دھو کر لفافے میں ڈال کر پوسٹ کر دی جائے تو لفافہ بیرنگ نہ ہونے پائے۔ فیروز پور پہنچ کر میں نے وہ آم بڑی محبت اور رغبت کے ساتھ کھائے اور ہر دوست اور عزیز کے نام ایک ایک گٹھلی پانچ پیسے کے لفافے میں ڈال کر روانہ کر دی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ سارے لفافے بیرنگ ہو گئے اور محکمہ تار و ڈاک نے اس بات پر مہر لگا دی کہ وہ دسہری قسم اول کے نہ تھے لیکن یہ ناسپاس گزاری ہو گی اگر میں اس حقیقت کا اعتراف بھی نہ کروں کہ وہ آم شیریں بھی تھے اور خوش ذائقہ بھی اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ قصور میں کھائے تھے۔

دوسرا احسان اس شہر کا اس سے بھی زیادہ کیف آور ہے اور اس کے ساتھ جوانی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں لیکن اس کا تذکرہ میں یہاں نہیں کر سکتا' کیونکہ اس مجمعے میں میری بیوی بھی موجود ہے اور وہ یہ مضمون سن رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں اور یقیناً آپ بھی اس خواہش میں میرے برابر کے شریک ہوں گے کہ اب ہماری ازدواجی زندگی خوشگوار ہی رہے تو بہتر ہے۔

جناب والا! آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر جب پروفیسر صاحب نے لاہور میں میرے ساتھ اس تقریب کی جزئیات طے کیں تو انہوں نے دعوت نامہ چھپوانے کی غرض سے اس عنوان کی تمنا بھی کی جس پر میں ہرزہ سرائی کرنے والا تھا تو میں نے عرض کیا کہ قصور نوابوں' رئیسوں اور پٹھانوں کا شہر ہے اور اس کا سب سے بڑا حاکم میرا مہربان ہے اور کبھی کبھی یہ کافر دل تمام دنیوی آلائشوں کے باوجود اس کی یاد میں تھیا تھیا کر کے ناچنے بھی لگتا ہے اور کبھی کبھی میری بغل کا وہ چور مجھے سانجھ سویرے اپنے آستانے پر بلا بھی لیتا ہے' مجھے جو میرے جی میں آئے کہہ لینے دیجیے۔

لیکن وہ اپنی تمام تر برخورداری کے باوجود مصر رہے کہ پھر بھی اس گفتگو کا کوئی موضوع تو ہونا چاہیے۔ آپ اپنے پروگرام میں معاشرے کے کمزور پہلوؤں پر انگشت نمائی کرتے رہتے ہیں۔ کچھ اس کے بارے میں ہی ہونا چاہیے۔ میں نے اس وقت تو ہامی نہ بھری لیکن پھر سوچا کہ چلو نئی تہذیب اور ہمارے مسائل کے بارے میں جس اکھڑی اکھڑی سوچ کے ساتھ ذہن گھروندے بناتا اور مٹاتا رہا ہے۔ ویسی ہی اکھڑی اکھڑی باتیں یہاں بھی ہو جائیں تو حضور والا عرض یہ ہے کہ معاشرے کے مسائل اس وقت بھی تھے جب معاشرے نے آفرینش کی گود سے تازہ تازہ جنم لیا تھا اور اب بھی ہیں۔ جب دوسری معاشرتوں نے اپنے مسائل صلیب بنا کر ہمارے کندھے پر دھر دیئے ہیں اور اس وقت بھی ہوں گے جب معاشرہ گل سڑ چکا ہوگا اور اس کوڑے کے ڈھیر پر سرسبز و تر و تازہ مسائل تھوہر اور زقوم کی طرح ایستادہ ہوں گے۔

یہ میری، آپ کی، ہماری اور ابن آدم کی برات ہے اور ہم اپنے آپ کو اس ترکے سے عاق نہیں کر سکتے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماضی میں ہمارے مسائل ہمارے اپنے ہوا کرتے تھے اور ہمیں جی جان سے عزیز تھے، آج کل کے مسائل ایجاد بندہ نہیں ہیں بلکہ کیش کم بونس سکیم پر باہر سے امپورٹ ہوتے ہیں اور جس جس طرح سے ان کی حیثیت عرفی باہر کی منڈیوں میں نشیب و فراز کی غمازی کرتی ہے، اسی طرح ہمارے یہاں اندر کے بردہ فروش ان کی قدر و قیمت میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ ان کے دلال اور ملک التجار ہیں اور اپنی جانوں کے ساتھ ساتھ ہماری جانوں پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے آپ کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ہر ملک اور معاشرے کے کچھ مسائل ہوتے ہیں جو اس ملک اور اس معاشرے کے افراد کی توجہ کا مرکز اور ان کی سوچ کا محور بنے رہتے ہیں لیکن ایک مرتبہ جب مجھے اپنے پروگرام ''تلقین شاہ'' کے سلسلے میں لاہور کے ایک قریبی گاؤں کا دورہ کرنا پڑا تو مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ ایک ہی معاشرے کے دو مختلف اور متضاد مسائل بھی ہو سکتے ہیں..... یہ برسات کی ایک بھیگی ہوئی شام کا ذکر ہے جب آسمان سے چھاجوں مینہ برسا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر یہاں وہاں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں اپنا دستی ٹیپ ریکارڈ موٹی بشرٹ کے دامن میں چھپائے لاہور سے اٹھارہ میل دور ایک گاؤں کی سرحد پر کھڑا تھا اور اندھیرا دور دور تک پھیل چکا تھا۔ سامنے کے بڑے دروازے میں ایک لالٹین جلتی دیکھ کر میں نے زور سے آواز دی۔ ''بھائی کوئی ہے؟'' اور اس کے جواب میں ایک بزرگ آواز نے لوٹ کر کہا۔ ''آ جا بھائی سبھی ہیں'' میں نے کہا۔ ''آؤں کیسے۔ راستے میں کیچڑ ہے۔ آسمان پر اندھیرا ہے۔ آنکھوں پر عینک ہے اور ہاتھ میں قیمتی مشین ہے۔'' آواز نے کہا۔ ''بسم اللہ کر کے آ جاؤ۔'' میں بسم اللہ پڑھتا بکری کی طرح گلی کے چشموں سے بچتا۔ اپنے ریکارڈ کو سینے سے دباتا بڑی مشکل سے ڈیوڑھی میں پہنچا تو وہاں کل تین آدمی موجود تھے۔ ایک چودھری دو اس کے ساتھی اور ایک دہکتا ہوا حقہ۔ میں نے علیک سلیک اور آداب و نیاز کے بغیر شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''چودھری صاحب عجب آپ کا گاؤں اور بے طرح آپ کی گلی ہے۔ ہزار

کوشش کے باوجود گھٹنے گھٹنے کیچڑ میں دھنستا آیا ہوں۔ نہ بوٹ سلامت رہے ہیں نہ پتلون نہ جسم میں جان باقی رہی ہے۔ نہ چال میں توانائی۔ اس بارش نے تو تباہی مچادی۔

چودھری صاحب نے کہا۔ ''بابو جی شہر سے آئے ہو تو آپ کے پاس ایک ڈائری اور ایک چھوٹی سی پنسل بھی ہو گی کیونکہ شہری لوگ یہ چیز تمباکو کی پوٹلی کی طرح ہر وقت اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا۔ تھیلے میں موجود ہے۔ فرمانے لگے تو پھر اس کا کوئی صاف سا ورق نکال کر لکھ لیجیے کہ یہ بارش کسان کے لیے سونا ہے آپ تو ابھی اس بارش میں گھٹنے گھٹنے کیچڑ میں دھنسے ہیں اگر کنپٹیوں تک بھی غرق ہو گئے ہوتے تو ہمیں خوشی ہوتی۔ کسان اس بارش کے لیے بڑی دعائیں کرتا ہے اور بڑی درگاہوں پر دیئے جلاتا ہے۔ لکھ لیجیے شاید زندگی میں کسی دیہاتی بھائی سے ہی ملاقات ہو جائے اور اس سے اس کی کھیتی باڑی کے بارے میں ہی پوچھنا پڑ جائے..... زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ ایک اور مسئلے کا چوزہ بھی انڈے کا خول ٹھکور کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایوب خان نے ملک کو آئین دیا تھا اور چاروں طرف بنیادی جمہوریت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے بے تکلفی کا انداز اختیار کر کے چودھری صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''چودھری اب ملک میں جمہوریت قائم ہو گئی ہے۔ اب سب مسائل حل ہو جائیں گے۔'' انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بابو جی جمہوریت کا مطلب کیا؟'' میں نے کہا۔ ''واہ بادشاہو یہ تو بچہ بھی جانتا ہے۔ جمہوریت کا مطلب ہے عوامی راج۔ اکثریت کی بادشاہی۔ جنتا کا راج۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ لوگ ہماری آبادی کا پچاس فیصد ہیں۔ اس لحاظ سے اب حکومت آپ کی ہو گی۔'' چودھری صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''لے یار گاگو آج سے بابو صاحب پر ہمارا راج ہو گیا۔ واہ رے سبحان اللہ۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''بابو جی یہ ویسے آپ کی محبت مہربانی اور عنایت ہے کہ آپ ہم جیسوں سے اپنے آپ پر راج کروا رہے ہیں لیکن حقیقت میں ہو گا وہی جو کراچی ڈھاکہ اور لہور کہے گا۔ پچاس فیصد کی کیا مجال ہے کہ چوں کر جائے۔'' میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب یہ آپ کا خیال ہے۔ جمہوریت میں یوں نہیں ہوتا۔ وہ تو چونکہ ان بڑے شہروں میں اسمبلیوں کی عمارتیں بن چکی ہیں یہاں ذرائع آمدورفت اور وسائل حمل و نقل کی آسانی ہے اس لیے کارروائی کے لیے یہ جگہیں مخصوص کر دی گئی ہیں ورنہ یہاں وہی مسائل حل کیے جاتے ہیں جن کا آپ کی اور آپ کی اجتماعی زندگی سے تعلق ہے۔'' چودھری نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''ناں جی بابو صاحب معاف کرنا۔ آپ کے مسائل اور۔ ہمارے مسائل اور۔ نہ آپ کا ہمارے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہمارا آپ کے مسائل سے کوئی رشتہ۔ پھر بڑے شہروں کی بڑی بلڈنگوں میں ہمارے مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''حضور ہم ایک ہی ملک اور ایک ہی معاشرے کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے نیچے ایک ہی زمین اور ہمارے سروں پر ایک ہی آسمان ہے۔ پھر آپ مسائل میں دوئی کس طرح سے ڈال سکتے

ہیں۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔ ''باؤجی ہمارا مسائل تو یہ ہے کہ زمینوں کا اشتمال ہو اور جلدی ہو۔ ولایتی کھاد ملے اور کھلے بازار میں ملے۔ کلر نے جو زمین چاٹ لی ہے اس کا کوئی علاج ہو اور آپ کا مسائل یہ ہے کہ پتلون کا پائنچہ چودہ گرہ ہونا چاہیے یا سولہ گرہ۔ چھوٹے قد کی لڑکیوں کو کس طرح کے بال رکھنے چاہئیں اور ٹھنڈی سڑک کے درخت کاٹے بغیر اسے کس طرح سے چوڑا کیا جائے۔ ہمارا مسائل اور آپ کا مسائل اور۔ کیوں یونہی خواہ مخواہ بارش کیچڑ میں اپنے آپ کو پریشان کرتے پھرتے ہیں۔ آرام سے بیٹھیے۔ روٹی کھایئے اور حقہ پیجیے۔'' میں نے چودھری صاحب کے یہاں روٹی بھی کھائی حقہ بھی پیا اور یہ بھی سیکھا کہ ترقی پذیر ملکوں کے مسائل ایک نہیں ہوتے بلکہ عوام الناس اور خواص الناس کی طرح طبقوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان دو مختلف النوع مسائل کو حل کرنے پر وہ گروہ مامور ہوتا ہے جس کا ان دونوں مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

جناب والا! نئی تہذیب نے گزشتہ برسوں میں ہمیں جو کچھ عطا کیا ہے میں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ اس کی جذئیات کو آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن میرے شہر میں یا اس کے ساتھی شہروں میں جب کبھی ثقافت کے حوالے سے بات ہوتی ہے یہ بحث ضرور چل نکلتی ہے کہ پاکستان کی ثقافت کیا ہے اور اس کی کس طرح سے نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس بحث پر کئی کئی دن اور کئی کئی شامیں صرف ہوئی ہیں۔ کئی کتابیں اور بہت سی رپورٹیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ابھی تک اس امر کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ پاکستان کی ثقافت ہے کیا؟ جب انسان اپنے رہن سہن اپنے رسم و رواج اور اپنے مذہب و مسلک کے بارے میں محجوب ہو جاتا ہے تو اس پر یہی کیفیت گزرتی ہے اور وہ دوسری ثقافتوں کے دسترخوان سے قحط زدہ بچے کی طرح بھورے چورے چن کر اپنی تلی بڑھانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت میرے آپ کے ہمارے ملک کی ہے۔ ہم نے اپنی اس بڑھی ہوئی تلی پر ریشم و کمخواب کے اتنے بنے سجا لیے ہیں کہ اب تن لاغر ان کے بوجھ اور ان کی حدت کا متحمل نہیں ہوتا.....روم میں یونیورسٹی روم کے سامنے ہر روز بس پکڑتے ہوئے جب مجھے دائیں بائیں سے دھکے کھاتے ہوئے اور Peresso, Permesso کی صدائیں سنتے ہوئے تین مہینے گزر گئے تو میں نے اپنے ایک ساتھی پروفیسر سے پوچھا کہ تم بس سٹاپ پر کیو کیوں نہیں لگاتے اور آرام سے بس میں سوار کیوں نہیں ہوتے تو اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''کیوں بھائی ہم کیو کیوں لگائیں۔ ہم کوئی انگریز ہیں۔ دھکے دینا' شور مچانا' دبڑم گھسڑم بس میں سوار ہو جانا ہمارا قرینہ ہے۔ ہم کیوں اپنی بات چھوڑ کر کسی اور کا طریق اپنائیں۔ اس وقت مجھے پروفیسر سیرالوئی کی یہ بات بڑی بے ہنگم اور نہایت احمقانہ معلوم ہوئی تھی لیکن جب مجھے اپنے دیس واپس پہنچ کر اپنی ساری پرانی قدریں ایک ایک کر کے گھائل ہوتی دکھائی دیں تو مجھے احساس ہوا کہ پروفیسر سیرالوئی کس قدر ٹھیک کہتا تھا۔ وہ دھکے دینے والے' شور مچانے والے اور سڑکوں پر بابا کرنے والے اطالوی کس قدر خوش نصیب ہیں کہ اپنی اقدار (اچھی یا بری) گھائل ہونے نہیں دیتے اور اپنا ثقافتی ورثہ نسل در نسل

ترکے کے طور پر چھوڑتے جاتے ہیں۔

حضور والا! میں مشینوں اور کل پرزوں کے خلاف نہیں ہوں۔ میں اپنے ان خدمت گاروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن جب بھی ہمارے ملک کی سرحد کے اندر باہر سے کوئی مشین ایک فرد کی ملکیت بن کر آتی ہے تو اس کے ساتھ غیر ملکی ثقافت کے بہت سے جراثیم خود بخود آ جاتے ہیں۔ یہ جراثیم آپ کے جذبہ تفخر کو دیمک کی طرح چاٹنے لگتے ہیں اور آپ اپنے آپ پر اپنوں پر اور اپنی چیزوں پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جب ہمارے میرپور کا رہنے والا ولایت سے ایک ٹیپ ریکارڈر لاتا ہے تو وہ خالی ٹیپ ریکارڈ آواز بھرنے اور سنانے والی مشین نہیں لاتا۔ اس کے ساتھ باہر کی تہذیب کا ایک پھندنا بھی ساتھ لاتا ہے۔ جب میرے گھر میں فریج آتا ہے تو خالی پانی ٹھنڈا کرنے والی مشین نہیں آتی' اس کے ساتھ اور بہت سے لازمے بھی آتے ہیں جو مجھ کو اپنے ہم چشموں میں بالشت بھر اونچا کر دیتے ہیں۔ جب میرا پڑوسی نئے ماڈل کی کار خریدتا ہے تو میرا زانو خود بخود اس کے سامنے تہہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ خود میرے پاس اس میک کی ایک سال پرانی کار موجود ہے۔ جب ہمارے گھر میں ویسٹرن میوزک بجتا ہے تو میں بلا جبر و اکراہ سیف الملوک سے دور ہو جاتا ہوں۔ ہم جب رشین سیلڈ کھاتے ہیں تو نان قورمہ کھانے والے خود بخود ہم سے دور ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ایک ہی معاشرے میں رہنے والے مختلف جزیروں میں بٹ جاتے ہیں تو یہ دھری ٹھیک کہتا ہے ہمارا مسائل اور تمہارا مسائل اور جمہوریت کی رسی کچی ڈور ہے۔ ہم کو آپس میں باندھ نہ سکے گی۔

جناب والا! میں اگر مذہب کے رشتے سے بات کروں گا تو یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ میں Practicing مسلمان نہیں ہوں اور نام کا مسلمان بننا بھی میں نے 65ء کی جنگ کے بعد سیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ڈور کتنی بھی پرانی کیوں نہ ہو بڑی مضبوط اور پائیدار ڈور ہے۔ میں تاویلوں والے Justification والے اور Modern Interpretiaetion والے اسلام پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں نے اسلام کو فزکس' کیمسٹری' فلکیات اور خرد حیاتیات کی تھیوریوں کی صداقت کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ میرا مذہب ایک ملّا کا مذہب ہے۔ بالکل کٹ حجت دقیانوس اور متعصب ملّا کا مذہب۔ میں اس کو نفسیات یا فلسفہ کے حوالے سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ملّا دریدہ حال پریدہ رنگ' بھوکا' حریص' کبڑا' Femished ملّا میرا ہیرو ہے کیونکہ وہ اپنی چال ڈھال اپنی وضع قطع اپنی تراش خراش' اپنی شکل وصورت سے اپنی تہذیب کا نمائندہ ہے اور اس تہذیب کی ٹمٹماتی ہوئی قندیل کو اپنے ناتواں جسم کی اوٹ میں چھپائے چل رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس غریب پریشان حال پائمال اور کم علم ملّا نے اسلام کو Qualitatively کچھ عطا نہیں کیا لیکن آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ میرے اس ہیرو نے Quantitatively اسلام کو بڑی تقویت عطا کی ہے۔ 1857ء کے بعد سخت ابتلا کے دور میں بھی ملّا نے ہی اسلام کی کشتی کا پھٹا ہوا بادبان تھاما اور ملّا نے ہی مناظرے کے میدان میں اتر کر پادریوں کی یلغار سے گاؤں قریوں اور قصبوں کو مرتد ہونے سے بچایا۔ میں آپ

کے ساتھ مل کر اس کی ہیئت کذائی پر ہنس لیتا ہوں لیکن ایمانداری کا ہاتھ دل پر رکھ کر کہتا ہوں کہ میں اس کے احسانات کو بھلا نہیں سکتا.....

کوئی پون صدی ادھر کی بات ہے آسام کے ایک دورافتادہ گاؤں میں ایک ملا جا نکلا۔ یہ گاؤں ہندوؤں اور بودھوں کا تھا۔ اور گاؤں کے کنارے پر ایک گھر مسلمان جولاہوں کا تھا۔ جنہوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ وہ مسلمان ہیں لیکن وہ جانتے نہیں تھے کہ مسلمان رہ کر انہیں کرنا کیا ہے۔ ملا جی نے ان کے گھر کے قریب ایک مسجد تعمیر کی اور پانچ وقت انہیں وہاں نماز پڑھانے لگے۔ وہ سات جولاہے بزرگ ادھیڑ اور جوان منہ سے کچھ پڑھے بغیر ملا جی کے پیچھے نماز گزارتے رہے اور ملا جی کو ایک وقت کی روٹی دیتے رہے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد ملا جی گرفتار کروا دیے گئے اور جیل بھیج دیے گئے۔ جیل جانے سے پہلے جب وہ جولاہے ان سے ملے تو انہوں نے رو کر کہا' اب ہمیں کون نماز پڑھائے گا۔ تو ملا جی نے کہا۔" سرکار کے حکم سے مسجد کے دروازے پر قفل ڈال دیا گیا ہے اور اس میں داخل ہونے کی مناہی کر دی گئی ہے۔ تم یوں کرنا کہ پانچوں وقت جا کر مسجد کے قفل پر ہاتھ لگا کر بسم اللہ شریف پڑھ لیا کرنا اور واپس گھر آ جایا کرنا۔ لیکن اس کام میں ناغہ نہ کرنا۔ حاضری تمہاری پانچوں وقت وہاں ہونی ضروری ہے۔"

پتہ نہیں اس ملا پر کیا بیتی اور اس کا خاتمہ کس طرح سے ہوا لیکن جولاہوں کا خاندان اسی طرح نماز گزارتا رہا اور جب پاکستان بنا تو جولاہوں کے اس خانوادے نے مسلمان پاکستان کے لیے ہاتھ کھڑا کیا اور رائے شماری میں اضافے کا باعث بنے.....

جناب والا! مجھے اعتراف ہے اور میں اس Statement میں آپ کے ساتھ شامل ہوں کہ اس ملا نے Qualitatively اسلام کو شاید کچھ نہیں دیا لیکن Quantitatively (آپ بھی تسلیم کریں گے) ہمیں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت لے کر دی ہے۔ یہ سلطنت ہمیں فرماں روایان آل تیموری نے عطا نہیں کی بلکہ چھوٹے' تھڑدلے' حریص' کمزور' کم علم اور دربدر سوکھی روٹی مانگنے والے ملا کا برگ سبز ہے جو اس نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ ہمارے کلاہ میں ٹانگ دیا ہے۔ کیا ہم اس چنار کے پتے کو اپنی دستار سے محض اس لیے اتار کر پھینک دیں کہ اب کارنیشن کا زمانہ ہے اور جو کارنیشن کی بات نہیں کرتا وہ Uncultured سمجھا جاتا ہے اور جو Uncultured ہے وہ قابل تحقیر ہے اور تحقیر کا خوف ایک قابوس بن کر ہماری اجتماعی زندگی پر محیط ہو گیا ہے اور ہم Quantitatlively اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اور احساس کمتری سے بچنے کے لیے سرسبز و شاداب چنار کے پتے کو چھوڑ کر پلاسٹک کا کارنیشن قبول کرنے پر تیار ہیں۔

حضرات' ہمارے مسائل کچھ ایسے پیچیدہ کچھ ایسے ہولناک نہیں۔ ہم اپنے پالنے سے نکل کر ابھی ابھی بین الاقوامی راک این رول کے فلور پر آئے ہیں۔ ابھی ہماری تہذیب نے پورے طور پر ہمارا دودھ نہیں چھڑایا۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم باہر کی تہذیب اور مغرب کی ثقافت پر اپنی سرحدیں سربمہر کر لیں۔ اپنی طرح

جنئیں اور اپنی جلا کر سینکیں۔ ہماری مجوبیت کم ہو اور ہمارے اندر تفخر کا کملایا ہوا یودا نئی شاخوں اور نئے شگوفوں کے ساتھ تناور درخت بنے۔ کوئی میرے اندر ہر وقت پکار پکار کر کہتا ہے اپنے گھر کے دروازے باہر کی تہذیب اور باہر کی ثقافت پر مضبوطی سے بند کرلو۔ اپنے اندر جیو اپنی گردش اور اپنی دھڑکن کے ساتھ جیو اور جب تمہارے احساس کمتری کی راکھ سے ایک نیا تنفس جنم لے تو اپنے دروازے ساری دنیا کے لیے کھول دو۔ اس وقت تک تم ایک ایسی ڈور میں بندھ چکے ہوگے جو یقیناً پرانی ہے لیکن مضبوط بہت ہے۔ یہ آواز ہر وقت میرے ذہن کے دریچوں سے ٹکراتی رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ میرے ہیرو ملا کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی آواز نہیں کیونکہ وہ ایسے خوبصورت فقرے ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن یہ ہے اس کے وجود سے وابستہ وہ جب بھی شام کو اپنا کھانا لینے باری والے گھر پر جاتا ہے گلی میں اس کی بجتی ہوئی سوٹی کے ساتھ ساتھ یہ فقرے اچک اچک کر میرے دریچوں پر دستک دینے لگتے ہیں۔

میں آپ سے کیا عرض کروں کہ نئی تہذیب نے ہمارے معاشرے کے ساتھ کیسی اُکھاڑ پچھاڑ کر رکھی ہے۔ آپ تو خود اس کے ہاتھوں خون پسینہ ہو چکے ہیں۔

تنقید ڈرامے ٹیلی ویژن

جس زمانے میں رچرڈ برٹن ایک خصوصی تفتیش کے لیے سندھ کے اندرونی علاقے سے چل کر کراچی پہنچا کرتا تو وہ اپنی بیرک میں بیٹھ کر دو کام کیا کرتا تھا۔ ایک تو گوراشاہی سپاہیوں کے تیزی سے گرتے ہوئے اخلاق کی تحقیق اور دوسرے بندروں کی ''زبان'' کو ان کی حرکات سے ہم آہنگ کر کے ''خی خی خوخو'' کو معنی عطا کرتا..... مجھے برٹن کی اس سرکاری رپورٹ کے بارے میں تو کوئی علم نہیں کہ اس وقت کہاں ہے البتہ اس کی ''بندروں کی زبان اور اس کی گرامر'' کے مسودے کا حال معلوم ہے جو اس کی بیوی نے برٹن کے فوت ہوتے ہی اس کے سارے ''گندے اور واہیات'' مسودوں کے ساتھ جلا دی تھی اور پھر عزیز و اقارب کو اطلاع دی تھی کہ ''رچرڈ فوت ہو گیا ہے اور میں اس وقت سیاہ لباس پہن کر اس کی میت کے سرہانے بیٹھی ہوں۔''

پرانی وضع کی اسی قسم کی ایک بیرک لاہور کی الحمرا آرٹ کونسل کے ایک پہلو میں موجود تھی جس کی چھت کڑیوں بالوں اور سرکیوں سے بنی تھی' دیواریں پکی اینٹوں کی ہونے کے باوصف گوبری سے لپی ہوئی تھیں اور جس میں تقریباً اتنی ہی کھڑکیاں تھیں جتنی رچرڈ برٹن کی بیرک میں ہوں گی اور یہی دو دروازے ہوں گے جو اس میں تھے۔ فقط اس کی چھت سرخ کھپریل کی تھی اور اس کے نیچے لگے ہوئے پنکھے کا پنکھا قلی باہر برآمدے میں بیٹھا تھا اس کی چھت کہگل کی تھی اور اس کے دونوں پنکھے اندر کھڑے ہوتے تھے جو دائیں سے بائیں گھوم کر ہوا کے بلے بیرک کے چاروں کونوں میں بڑے زور سے پھینکتے تھے اور میزوں پر رکھے ہوئے کاغذ سنگ مرمر کے ٹکڑوں' ریت سے بھرے پیالوں اور موٹے شیشے کی خالی دواتوں کے نیچے بھی پھڑ پھڑاتے رہتے تھے۔

اس بیرک کے سامنے آرٹس کونسل کے کھلے لان میں چیڑھ کے وہ دو بلند و بالا درخت تھے جن کا قد بُت ان کے اپنے پہاڑی عزیزوں سے بھی دو ہاتھ اوپر تھا جو مری اور تھیا گلی کی اونچائیوں میں پرورش پا رہے تھے۔ ان درختوں کے نیچے آرٹسٹ' تماشائی' کلرک' کینٹین والے اور سائیکل کا نمبر دینے والے بیٹھا کرتے تھے لیکن ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اونچے پہاڑوں کے برفیانی علاقے کے وہ درخت اپنی برادری سے

بغاوت کر کے لاہور جیسی گرم اور چٹیل زمین پر آ کر لگ گئے ہیں اور اتنا لگ گئے ہیں کہ سارا سر پیچھے پھینک کر بھی ان کی چوٹیوں کو اچھی طرح سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

ہمیں ریڈیو سٹیشن پر کسی نے اطلاع دی کہ لاہور میں ٹیلی ویژن لگ رہا ہے اور اس کے پروگرام تیار کرنے کے لیے جو چارلڑ کے کراچی سے آئے ہیں۔ وہ الحمرا کی بیرک میں بیٹھتے ہیں۔ کاغذوں پر کچھ لکھتے ہیں پھر پھاڑتے ہیں پھر لکھتے ہیں پھر پھاڑتے ہیں اور جب انہیں کچھ سمجھ نہیں آتی تو باہر نکل کر چیڑھ کے درختوں تلے گھومنے لگتے ہیں اور گھومتے گھومتے رک کر ایک دوسرے کو دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی مرضی سے باری باری واپس بیرک کے اندر چلے جاتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ صرف پائپ پیتے ہیں اس لیے انہیں کھانا کھاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔

ان میں سے اسلم اظہر کو ہم نے اپنے کالج میں ڈرامے کرتے دیکھا تھا۔ ان کے انگریزی مباحثے بھی سنے تھے اور ان کے ساتھ ہلکی سی شناسائی بھی تھی۔ فضل کمال ہمارے بہت اچھی طرح کے جانے پہچانے ریڈیو صداکار تھے اور خوش باش قسم کے نوجوان تھے جو ملازمت کو ناپسند کرتے تھے اور ٹھیکے پر آواز لگاتے تھے۔ ذکا درانی کچھ مانوس سے تھے لیکن یاد نہیں آتا تھا کہ کون ہیں البتہ نثار حسین وہ واحد شخصیت تھی جس سے لاہور میں کوئی بھی متعارف نہ تھا۔ بتانے والے یہ بتاتے تھے کہ وہ ایران ٹیلی ویژن کے ساتھ وابستہ رہے اور فارسی پروگراموں کی تربیت و تشکیل میں حصہ لیتے رہے ہیں..... یہ چار نوجوان لاہور میں ''ابتدائی' تجرباتی ٹیلی ویژن'' لگانے پر مامور تھے اور انہی کے ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن کے مستقبل کی امیدیں وابستہ تھیں۔ ہم سب کو اچھے پاکستانیوں کی طرح اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا اور ٹیلی ویژن والی بیل یہاں کبھی بھی منڈھے نہ چڑھ سکے گی۔ کیونکہ جب ہندوستان میں ابھی تک ٹیلی ویژن کا تصور نہ پہنچ سکا تھا اور وہاں کے لوگوں نے ٹیلی ویژن سیٹ کو کبھی تصوروں میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ گول ہوتا ہے یا چپٹا۔ پھر ہمارے یہاں کس طرح سے یہ پودا پروان چڑھ سکتا ہے!

ریڈیو پاکستان لاہور کے لیے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں ایک چھوٹی سی چوکور بیرک اور تیار ہو رہی تھی اور اس کے پہلو میں نئے ٹرانس میٹر کا بہت ہی اونچا مینار ابھار رہا تھا۔ ہم ادھر جا کر دیکھتے تو کچھ اور ہی باتیں سننے میں آتیں۔ نئے الفاظ ہوتے۔ نئی اصطلاحات' نئی سوچ' نیا تکبر' نئی چھوت چھات سارے میں کچھ انجانا پن سا تھا ایسا کہ نہ پہلے کبھی دیکھا نہ سنا۔ ہم ریڈیو کے لوگ کچھ مرعوب مرعوب سے تھے۔ جو سوچ سمجھ رکھتے تھے وہ فکرمند تھے اور جو سنکی تھے وہ ''خوش'' تھے کہ یہ سب ہوا ہے' دکھاوا ہے' ڈھکوسلا ہے..... ٹیلی ویژن یہاں کہاں!

لاہور کے کچھ پرامید لوگوں نے پیش بندی کے طور پر اپنے عزیز رشتے داروں سے باہر سے ٹیلی ویژن سیٹ بھی منگوا لیے تھے اور انہیں ہر رات لگا لگا کر دیکھتے بھی تھے مگر وہاں سوائے افقی لہروں کے اور

کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بڑے پر اسرار دن تھے اور بڑی دوست دار راتیں تھیں۔ ہمارے یہاں اکتوبر کا مہینہ یوں بھی بڑا خوشگوار اور پر بہار ہوتا ہے۔ اب ٹیلی ویژن کے اجتماعی خواب نے اس مہینے کو اور بھی تابدار کر دیا تھا' لیکن اس حیرت کدے سے کوئی واضح چیز برآمد نہ ہوتی تھی۔

ایک شام جمیلہ اختر ہانپتی کانپتی تھوڑی سی خوش اور بہت ساری خوفزدہ ہمارے گھر پہنچی اور بانو سے کہنے لگی کہ اس نے خود اپنے ٹی وی سیٹ پر ایک آدمی کو چلتے پھرتے اور ان کی چھت کو گھورتے ہوئے پکڑا ہے۔ اس کے موٹی سی عینک لگی ہے۔ بڑا سا چہرہ ہے۔ کبھی شیر کی طرح چھلانگ مار کر آگے آ جاتا ہے اور کبھی دور پیچھے جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ تو ٹیلی ویژن لیکن ڈر بہت آتا ہے۔ گورنمنٹ کو مناسب نہیں تھا کہ ابھی سے ٹیلی ویژن شروع کر دیتی ابھی تو ہمارے بچے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔

میں اور میری بیوی یہ خبر سن کر ننگے پاؤں جمیلہ اختر کے ساتھ اس کے گھر کی طرف بھاگے۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں اور جمیلہ کی والدہ باہر برآمدے میں خوفزدہ سی کھڑی تھیں۔ ایک مرد کو عورتیں کے ساتھ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ میں لپک اور لپک کر ایک جانباز کمانڈو کی طرح ان کی بیٹھک میں داخل ہوا تو سامنے سکرین پر انیس احمد (جو بعد میں ڈیڈی کے نام سے موسوم ہوا) اپنی دبیز عینک کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنا خوفناک ہاتھ اوپر اٹھا کر کہہ رہا تھا" یہاں لائٹ دو...... ہارڈ کرو...... اور کرو...... تھوڑی سی سافٹ...... زوم کرو......" اور جونہی نثار کیمرہ زوم کرتا ڈیڈی چھلانگ مار کر اپنا بدن تو وہیں چھوڑ جاتا اور اپنا جبڑے دار شیلڈ جیسا چہرہ لے کر سکرین پر یوں حملہ کرتا جیسے کسی نے بیلچہ گھما کر آپ کا راستہ روک لیا ہو۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"مبارک ہو بانو قدسیہ! ٹیلی ویژن آ گیا۔"

تصویر بڑی دھندلی' پھیکی اور سرمئی سی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا جیسا موم کا بت آتش کدے میں رکھا ہے۔ کبھی ادھر ڈھلک گیا کبھی ادھر لوٹ گیا۔ کبھی کھڑا کھڑا پگھلا اور پگھلے پگھلے شکلیں بدلنے لگا۔

26 نومبر 64ء کی سہ پہر۔ پیلی پیلی جاتی دھوپ۔ لمبے لمبے سائے۔ ٹی وی سٹوڈیو کے سامنے لان پر مہمانوں کی نشستیں۔ نشستوں کے ارد گرد سولز سکوپ اور بیم لائٹیں۔ ہر لائٹ کے ساتھ ایک برقنداز۔ سٹیج کے اوپر ایک بوم' روسٹرم پر بہت سے مائیکروفون۔ آج دونوں کیمرے بڑی شان کے ساتھ سٹوڈیو سے باہر نکل آئے تھے اور ان کی موٹی موٹی کیبلیں چھوٹے چھوٹے کیبل بوائز اٹھائے ہوئے معتبر سے بنے پھرتے تھے۔ اور بڑے بڑے مضبوط چیڑاسیوں نے اونچے اونچے تالیاں بجا کر سارے پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے نکال دیا تھا۔ اور سامنے سڑک پر ہر طرح کا ٹریفک روک کر سناٹا کر دیا گیا تھا اور مہمان خواتین اپنی ہلکی گرم چادریں کندھوں پر کھینچتی جا رہی تھیں۔ گورنمنٹ ہاؤس سے صدر کے پائلٹ کی موٹر سائیکل سٹارٹ ہو چکی تھی اور گھگھو بولنے لگا تھا۔

جب مائیکروفونوں کے کان کھلے اور کیمروں نے چشم ما روشن دل ما شاد کہا تو قاری علی حسین نے اس

افتتاحی تقریب کی تلاوت کلام پاک سے ابتدائی کی۔ پھر صدر ایوب خان کو ایک وضاحتی خطبے کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا اور آخر میں صدر مملکت نے اپنا خطبہ صدارت موجود اور ناموجود ناظرین کی خدمت میں پیش کیا۔ ابھی ان کے خطبے کے آخری دو پیرا گراف باقی تھے کہ دونوں میں سے ایک کیمرہ بڑی صفائی کے ساتھ سٹوڈیو میں پہنچا دیا گیا اور ایک کیمرہ صدر پر بدستور مرکوز رہا۔ جونہی صدر کی تقریر کا آخری فقرہ نیلی کاسٹ ہوا اور انہوں نے اپنی تقریر کا کاغذ اپنے اے ڈی سی کے حوالے کیا' سٹوڈیو میں پہنچائے ہوئے کیمرے نے فوراً اپنی آنکھ کھولی اور اپنے سامنے کھیلی جانے والی ٹیبل ٹینس کی ٹیم کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

ٹیبل ٹینس کا کھیل کوئی آدھ گھنٹہ تک جاری رہا اور باوجود اس کے کہ نگاہوں پر بار تھا اور دیکھنے والوں کی طبیعتیں مالش کرنے لگی تھیں' کوئی بھی ادھر سے توجہ نہیں ہٹاتا تھا کہ نیا تماشا تھا' نیا اظہار تھا اور نرالی سی بات تھی کہ تصویر بھی ہوا میں تحلیل ہو کر گھر وگھر جا رہی تھی اور بینائی کے راستے یقین کے دل میں اتر رہی تھی۔

ٹیبل ٹینس کے بعد لاہور ٹیلی ویژن کا سب سے پہلا معلوماتی پروگرام ''بوجھو تو جانیں'' شروع ہوا۔ تین تین اہل دانش خوبصورت گدے دار کرسیاں ایک دوسرے کے سامنے ڈالے اپنی گھبراہٹ کے تنبو کو وقار کی طنابوں سے مضبوط باندھے بیٹھے تھے اور مسکرانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کمپیئر بالکل اناڑی تھا اور اس کے لیے کیمرے کے سامنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ آواز میں اناؤنسروں جیسی گھن گرج نہیں تھی اور تلفظ میں بڑی خرابیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ہاتھ میں مائیکروفون تھا۔ اس کے ساتھ لمبی تار بندھی تھی۔ پسینہ آنے کی وجہ سے ہاتھ بار بار بدلنا پڑ رہا تھا۔ کئی الفاظ حلق کے اندر ہی رہ جاتے تھے۔ اس ''اندرونی گراوٹ'' کی وجہ سے کمپیئر کو بار بار اپنی ایڑیاں اوپر اٹھا کر اپنے سارے وجود کو ابھارنا پڑتا تھا اور دونوں کیمرہ مین اپنی اپنی مشینوں کے پیچھے سے ہاتھ ہلا ہلا کر کمپیئر کو منع کر رہے تھے کہ وہ اس اوپر نیچے ہونے والے ہنڈولے کو روک لے۔ لیکن ہنڈولا روکنا کمپیئر کے بس کی بات نہیں تھی.....

سوال بوجھنے والوں میں دو خواتین تھیں اور چار مرد..... سبھی مہمان بڑے خوش پوش اور خوش اطوار تھے اور ان کے بات کرنے کا طریق بھی بڑا خوشگوار تھا جس قدر گھبراہٹ کمپیئر نے سارے میں بکھیر رکھی تھی اس سے دو چند بلکہ دہ چند مسکراہٹوں سے مہمانوں نے اس پروگرام کو گلزار بنا رکھا تھا۔ جب نتیجے کا اعلان ہوا اور اول' دوم اور سوم انعام ناظرین کی نگاہوں کے سامنے بٹے تو سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اول انعام ایک قیمتی کلاک تھا۔ دوم انعام ہلکی چینی کا ایک کافی سیٹ تھا اور سوم انعام لکڑی کا ایک سگریٹ سٹینڈ تھا جس کے دو طلپے سگریٹوں سے بھرے ہوئے تھے اور جن کے قریب ہی لیٹی ہوئی ستار ایش ٹرے کا کام دیتی تھی۔

اس پروگرام کے خاتمے پر طفیل نیازی اور اس کی پارٹی اور پھر سائیں اختر نے پنجابی لوک گیت لہک لہک کر سنائے اور سماں باندھ دیا۔ ان لوک گیتوں کو پنجاب کی ظرف مکانی عطا کی گئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ کھیس اور مجنوں لٹک رہے تھے۔ سامنے گتے کے کٹ آؤٹس پر چنگیریں اور چھابے ٹنگے ہوئے تھے۔ لکڑی کی

ایک چوکور تھی پر دیہاتی زندگی کے مؤقس بنے ہوئے تھے۔ پھر ایک اچھا خاصا لمبا پروگرام "ہوائی جہاز خود بناؤ" تھا جس میں ایک ہابسٹ بالسا لکڑی سے ہوائی جہاز بنانے کی ترکیب بتا رہا تھا اور اپنے پہلے بنائے ہوئے جہازوں کو الٹ پلٹ کر دکھا رہا تھا کہ ان کو کس طرح سے جوڑا جاتا ہے اور ان کے پروں کو کس طرح سے "پرتول زاویے" عطا کیے جاتے ہیں۔

پاکستان کا ترانہ بجنے پر جب پہلے دن کا ٹی وی پروگرام اپنے خاتمے کو پہنچا تو ناظرین میں سے اکثر نے اپنے سیٹ اس وجہ سے بند نہ کیے کہ شاید پروگرام کرنے والوں کو پھر سے ان کے دلوں کا خیال آ جائے اور وہ پھر سے ایک نیا پروگرام شروع کر دیں جو صبح طلوع آفتاب تک جاری رہے جو لوگ اس راز سے واقف تھے کہ ترانے کے بعد کوئی نیا پروگرام شروع نہیں ہو سکتا' انہوں نے اپنے سیٹ اس وجہ سے کھلے رکھے کہ شاید ٹیسٹنگ کے دوران کوئی فلم کوئی گیت کوئی مکالمہ کوئی ہدایات اشارات ہی دیکھنے میں آ جائیں اور ان کے لطف دوبالا ہو جائیں.....لیکن افسوس یوں نہ ہوسکا اور ہر ایک کو اپنا اپنا سیٹ بند کر کے اس نوری ٹمکنے کو دیر تک دیکھتے رہنا پڑا جو سوئچ آف ہونے پر اور ساری لکیروں کے سمٹ جانے سے سکرین کے عین وسط میں نمودار ہو گیا تھا.....ہر گھر کو یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے آج پہلی مرتبہ ریڈیم دریافت کیا ہو اور اب یہ نوری نقطہ انہی کا ہو کر رہ گیا ہو۔

دوسرے روز یعنی 27 نومبر 1964ء سے ٹیلی ویژن کے باقاعدہ پروگراموں کا آغاز ہوا اور ٹیلی ویژن سکرین پر جو ڈرامہ سب سے پہلے ناظرین نے دیکھا اس کا نام "نذرانہ" تھا اور اسے محترمہ نجمہ فاروقی نے لکھا تھا۔ ڈرامے کے اختتام پر اس کی مصنفہ کی تلاش شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ نجمہ فاروقی ایک خاتون خانہ ہیں اور شوقیہ کہانیاں اور مضامین لکھتی ہیں۔ ان کے اس چلے کے بعد' جو پاکستان ٹیلی ویژن کا اولین ڈرامہ بن کر ہسٹری میں چلا گیا تھا۔ ناظرین کو ان کے اگلے ڈرامے کی طلب ہوئی لیکن اگلے ہفتے انور سجاد کا "رس ملائی" دیکھنے کو ملا تو پتہ چلا کہ ڈرامہ کہانی سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کے لوازمات داستان کے آڑے رخ پر ہوتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے جب اعجاز میر نے "کالا پتھر" لکھا اور پھر اس میں خود بھی ایک رول کیا تو لاہور میں ٹی وی ڈرامہ مضبوط بنیادوں پر اٹھنے لگا اور لوگوں کی توجہ بیشتر ادھر کو کھنچنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن سے کہ ابھی اس کی عمر پورے تین ہفتے کی بھی نہ ہوئی تھی ایک سیریز شروع ہوگئی۔ "یقین نہیں آتا"۔ یہ سیریز فنی اعتبار سے کچھ ایسی پختگی کی مظہر نہیں تھی۔ پھر اس میں کام کرنے والے بھی نئے تھے۔ نفس مضمون بھی کچھ عجیب سا تھا۔ وقت بھی کل بیس منٹ تھا لیکن یہ پورے تین مہینے تک بڑی باقاعدگی اور بڑی شائستگی سے چلتی رہی۔ یہ سیریز نہ تو ڈرامہ تھی' نہ ہی افسانہ اور نہ ہی فیچر' بلکہ ان تینوں کے درمیان کی ایک ایسی گم سم سی چیز تھی جس کو کوئی خاص نام نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس پر کسی قسم کا مان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سیریز کے گرد گھومنے والے ان ڈراموں نے دیکھنے والوں کو باندھ کے رکھ دیا جو "سٹوڈیو تھیٹر" کے عنوان

تلے ہر ہفتے باقاعدگی سے دکھائے جاتے تھے اور جن میں کام کرنے والے بڑی تیزی سے فن کی بلندیوں پر پہنچ رہے تھے۔ جب رفیع پیرزادہ کا ''ایک خط'' ٹیلی کاسٹ ہوا تو ادیبوں' شاعروں' مصنفوں نے ڈرامے کی طرف خصوصی توجہ دینا شروع کی۔

ٹیلی ویژن پر یہ ایک عجیب وقت تھا جب تماشائیوں سے ایک طرف ہو کر سوچنے والوں نے بڑی شدت سے اس بات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہمارے یہاں ڈرامے کی روایت کس طرح سے بار پا سکتی ہے اور توجہ طلب ڈرامے لکھنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ گو یہ سوچ انفرادی تھی اور ہر لکھنے والا اپنی دھن میں غرق تمثیلیں ڈھال رہا تھا لیکن اس انفرادیت نے کیسے بغیر جماعت کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ مصنف' ایکٹر' پروڈیوسر اور ڈیزائنر ایک جنت میں اترتے جا رہے تھے اور لوگوں کے سامنے ڈرامے کے روپ میں وہ وہ چیزیں ابھر رہی تھیں جو آج سے پہلے انہوں نے کہیں نہیں دیکھی تھیں۔

وہ لوگ جوان ڈراموں سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکتے تھے جنہوں نے اپنی جوانی کی راتیں تھیٹروں میں اور دن ریہرسلوں کے ارد گرد گزارے تھے۔ تھیٹروں کے پھٹے بھی اٹھاتے رہے تھے۔ ٹلی بھی کھڑکاتے تھے۔ پٹی بھی بجاتے تھے اور چھوٹے موٹے رول بھی کر لیتے تھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ اندر سے تو خوش تھے لیکن اوپر سے ناراض ناراض رہتے تھے۔ سن پینسٹھ کا ابتدائی دور بڑا ہی دلچسپ دور تھا۔ ہماری معاشرتی' ادبی' نمائشی اور ابلاغی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو رہی تھی جس کے دونوں ہی طرح کے اثرات تھے۔

''آج کا کھیل'' اور ''سٹوڈیو تھیٹر'' باری باری سے ہر ہفتے بہت ہی خیال انگیز ڈرامے پیش کر رہے تھے اور ایسے ڈراموں کی تخلیق میں وہ سبھی لوگ شامل تھے جن کو ڈرامے سے دلچسپی تھی اور جو زندگی سے پیار کرنا جانتے تھے۔

کمال احمد رضوی کی ساری زندگی ہی ڈرامہ تھی۔ ڈرامہ لکھنا' ڈرامہ بولنا' ڈرامہ کرنا اور ڈرامہ دکھانا اس کے رگ و پے میں اترا ہوا ہے۔ جون 65ء میں وہ الف نون کی سیریز لے کر آیا تو گویا بیابانوں میں بہار آ گئی۔ وہ لوگ جو ٹی وی سے ذرا دور دور رہتے تھے اس کے بالکل قریب آ گئے اور انہوں نے وہ سب کچھ غور سے دیکھا اور توجہ سے سنا جو وہ خود سنانا اور دکھانا چاہتے تھے۔ الن اور ننھے نے اپنے طنزیہ انداز اور بھول پنے کی ان کہیوں میں وہ کچھ کہا جو عام طور پر کہنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ناظرین کو ان کی یہ ساری باتیں ساری کہنیاں اور ساری کہہ مکرنیاں اپنے دلوں کے قریب محسوس ہوئیں۔ یہ سیریز بڑی دیر تک اور بڑی دور تک چلی اور جب بند ہوئی تو کچھ خالی خالی سا ہو گیا۔

اسی سیریز کے ساتھ پنجابی کی ایک سیریز بھی چلی' تاہلی تھلے'' نفسِ مضمون کے لحاظ سے تو یہ کوئی خاص چیز نہیں تھی لیکن اس کے کرداروں نے اپنی کارکردگی سے اسے بہت اونچا اٹھا دیا تھا۔ شہر والوں کو گاؤں کی

فضا سے اب ویسی آشنائی نہ رہی تھی اور شہر کے لوگ ان شخصوں کو تو بالکل ہی بھول گئے تھے جن کے درمیان سے نکل کر وہ ایک شام ادھر شہر کی طرف آئے تھے اور پھر اسی جگہ بس گئے تھے۔

یوں تو ٹی وی کے اور بھی بہت سے پروگرام تھے اور سبھی پر حسب توفیق زور لگایا جاتا تھا لیکن ڈرامہ امڈتے ہوئے سیلاب کی طرح ہر گھر کے دروازے ہر پہنچ کر دستک دے رہا تھا۔ ان گھروں میں بھی جہاں ٹی وی سیٹ تھے اور ان گھروں میں بھی جہاں نہیں تھے۔ جو گھر ٹی وی سیٹ کے بغیر تھے ان میں ٹی وی پروگراموں کا زیادہ ذکر ہوتا تھا اور اس ذکر میں زیادہ تذکرہ ڈراموں کا ہوتا۔ فلمی دنیا سے ہٹ کر آرٹسٹوں کا ایک نیا گروہ ابھر کر سامنے آ رہا تھا جن میں کمال احمد رضوی' رفیع خاور ننھا' نذیر حسینی' ایوب خان' قمر چودھری' محمد قوی' منور ا عجاز' انور سجاد' بیگم تمنا' خورشید شاہد' علی اعجاز' ثاقب شیخ' رشید عمر تھانوی بار بار سامنے آتے تھے اور بار بار داد پاتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک کھیپ ریڈیو کے اداکاروں کی تھی جنہوں نے اس نئے اظہار کے طریق کو ایسے اپنا لیا تھا گویا خاص اس مقصد کے لیے بنے تھے لیکن کیمرے کی آنکھ ان پر نہیں پڑی تھی اور اب لے کھیلے پھرتے تھے۔

جوں جوں ان ڈراموں کا طلسم بڑھتا جاتا تھا اور ان پر باتوں کا گھیر اوسیع تر ہو رہا تھا۔ تماشائیوں پر اچانک اپنی ایک نئی خصوصیت کا انکشاف ہوا۔ لوگ ان ڈراموں کی خوبیاں اور خرابیاں گنواتے وقت فن تنقید سے آشنائی حاصل کرنے لگے۔ ان میں ایک بڑی تعداد تو محض نکتہ چینوں اور بے بصیرت لوگوں کی تھی لیکن کچھ گروہ ایسے بھی وجود میں آئے یا کچھ فرد ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے ڈرامے کی باریکیوں سے شناسائی حاصل کر کے فن تمثیل پر اپنی رائے اور ٹی وی سے پیش کیے جانے والے ڈراموں پر اپنے ردعمل کا اظہار شروع کیا۔

تحریر میں تو اس فن پر تنقید کا کوئی قابل قدر ٹکڑا دیکھنے کو نہیں ملتا تھا' البتہ نجی محفلوں میں اور ادبی حلقوں میں کچھ کام کی باتیں ضرور ہو جاتی تھیں..... لاہور میں ٹی وی تماشائیوں کی ایک بزم بنی تھی جس کے ارکان مل کر ٹی وی پلے دیکھتے تھے اور پھر اس پر بحث کرتے تھے۔ ان لوگوں کی یہ بزم کچھ زیادہ دیر تک چل نہ سکی لیکن اس میں باتیں بہت زیرکی کی ہوتی رہیں۔ ان کی گفتگو سے صاف یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس خطے میں ڈرامے تھیٹر منڈوے کی روایت بہت پرانی ہے اور یہاں کے لوگ اس فن کے قدیم شناسا اور پرانے قدر دان ہیں۔

6 ستمبر 65ء کی صبح صادق لاہور کے بارڈر والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ دشمن نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور لاہور کے پورے طور پر بیدار ہوتے ہی سب کو پتہ چل جانے والا ہے کہ حملہ آور کے ارادے کیا ہیں..... کوئی نو ساڑھے نو بجے جب پاک فضائیہ کے ''ون او فور'' نے لاہور کے مین اور پر ساؤنڈ بیریئر توڑا اور دشمن کی سرزمین کی طرف لپکا تو اس کے پٹاخے کی گرج کے ساتھ ہی ذرائع ابلاغ کا رخ ایک ایسی سمت کو مڑ گیا جدھر کبھی اس کا رجوع ہوا ہی نہیں تھا۔ ٹیلی ویژن کے سارے پروگرام' جنگی ترانے' محاذ کی تفصیلات حفاظتی

تدابیر اور نئے عزائم میں تحلیل ہو گئے..... اس زمانے کا "یہ ہے بھارت" اپنی فنی خوبیوں کی بنا پر تو کچھ ایسا مشہور نہیں تھا' البتہ بھارت کے خوفناک ارادوں اور اس کے حاکموں کی بدنیتوں کی تشہیر بڑے حسن اور سلیقے سے کرتا تھا۔ ان ڈراموں کی تخلیق میں وہ بھی ڈرامہ نگار شامل تھے' جو ٹی وی کے لیے لکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ وہ دوسرے بھی آ کر شامل ہو گئے تھے جنہوں نے اب تک ٹی وی کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا تھا..... پھر ان دونوں کے ساتھ وہ بھی آ ملے تھے جن کا میدان نظم' غزل' ناول افسانہ تھا اور جنہوں نے پہلی مرتبہ اپنے وطن کی آبرو کے لیے اور اپنے ہم وطنوں کو تقویت عطا کرنے کے لیے ڈرامہ لکھنا شروع کیا تھا۔

"یہ ہے بھارت" اور پھر اس کے ساتھ "پیشکش پاکستان" اور ان دونوں کے بعد "عظمت کے نشان" نے اچھے اچھے ڈرامے اور بڑے بڑے ڈرامہ نویس پیدا کیے۔ اس وقت لکھنے والوں اور دیکھنے والوں کے درمیان ایک عجیب طرح کی مفاہمت پیدا ہونے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کی مشکلات' ایک دوسرے کی مجبوریوں اور ایک دوسرے کے سربستہ رازوں سے آشنائی حاصل کرنے لگے۔ ڈرامے والے اور ٹی وی ڈرامہ دیکھنے والے ایک دوسرے کے تقریباً اتنے ہی قریب آ گئے جس قدر قریب وہ سٹیج ڈرامے میں ہوا کرتے تھے۔ بڑی عجیب راتیں تھیں۔ بڑی طویل نشستیں تھیں۔ ہر ایک کا ڈرامے پر دم نکلتا تھا۔

65ء کی جنگ کے بعد چھوٹے سے ٹیلی ویژن سٹوڈیو میں نئے نئے تجربے ہونے لگے۔ دو کیمرے دو کیمرہ مین۔ ایک سیٹ ڈیزائنر توفیق اعجاز..... دو تین اس کے ساتھی..... ایک ترکھان' ایک کیبل بوائے ایک بوم والا اور ڈرامہ کر دیا نو سیٹوں کا۔ سٹوڈیو کے ہر کونے میں ایک سیٹ لگا ہے۔ سٹوڈیو سے باہر گیلری میں ایک سین اوپن ہوتا ہے۔ ٹی وی کے ملازم لاٹھیاں پکڑ کر بلڈنگ کے چاروں طرف کھڑے ہیں کہ کوئی قریب نہ آنے پائے اور کوئی بولے نہیں' کیونکہ پہلا سین سٹوڈیو کے باہر ہے۔ اردگرد کے درختوں سے سارے پرندے تالیاں بجا کر اور پٹاخے چلا کر سرِ شام ہی اڑا دیتے ہیں کہ عین وقت پر اپنی آوازیں فیڈ ان نہ کر دیں۔ جس بوتھ سے خبریں ہوتی ہیں اس کے اندر بھی ایک چھوٹا سا سیٹ لگا ہے۔ کریکٹر جلدی جلدی یہاں اپنا کام ختم کر رہے ہیں کہ کیمرہ گھوم کر سامنے والے کونے میں جائے جہاں ایک بڑی قذاق اپنے طوطے سے مٹھار مٹھار کے باتیں کر رہا ہے۔ نیوز بوتھ میں اپنا کام ختم کرنے والے اداکاروں کو ڈیزائن سیکشن کے مددگار گھیرے کھڑے ہیں کہ بھاء جی نیوز ہونے والی ہیں' سیٹ اکھاڑنے میں ہماری مدد کرو۔ بندے کم ہیں..... سیٹ جلدی جلدی اس لیے نہیں اکھاڑا جا سکتا کہ ہتھوڑی کی چوٹ زنبور کی کھینچ اور آری کی کاٹ سے شور ہوتا ہے اور سامنے دس فٹ کے فاصلے پر ڈرامے کا سین ہو رہا ہے۔ کردار ہاتھ بٹانے سے یوں عاری ہیں کہ آگے ان کا سین پھر آ رہا ہے۔ ساتھ ہی سیٹ ڈیزائن والوں کا دل بھی نہیں توڑا جا سکتا۔ ان کی مدد کرنی بھی ضروری ہے۔ چنانچہ بادشاہ سلامت اپنے سر پر تین پٹھے رکھ کر نیوز بوتھ کے سیٹ سے باہر نکل رہے ہیں۔ ملکہ نے پیتل کا مرتبان مع اس کے سٹینڈ کے اٹھا رکھا ہے۔ بوڑھی آیا نے سریش کی بدبودار بالٹی ڈنڈا

ڈولی کی ہوئی ہے اور نیوز والے شور مچا رہے ہیں جلدی کرو یا جلدی کرو۔ تین منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ نیوز ریڈر چکنا میک اپ کرا کے قریب ہی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کو ان ساری مصیبتوں کا کوئی علم نہیں۔ وہ مزے سے بیٹھے پان کھا رہے ہیں سگریٹ پی رہے ہیں اور ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ سین پر سین اور سیٹ پر سیٹ بدلتے دیکھ کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: ''ان ٹی وی والوں نے اور سٹوڈیو بنا لیے ہیں'' اور قریب ہی بیٹھے ہوئے علیم حالات بڑے یقین کے ساتھ کہتے ہیں تین نئے سٹوڈیو بنے ہیں۔ ایک بڑا' ہاتھی سٹوڈیو اور دو چھوٹے..... اور نیوز ریڈر ابھی بھی اپنے بوتھ میں کھڑی منتیں کر رہی ہے کہ خدا کے واسطے جلدی نکلئے جلدی..... صرف آدھا منٹ رہ گیا ہے۔ اور آدھے منٹ کے بعد ڈرامے والوں کا یا سیٹ ڈیزائن کا آدمی نیوز بوتھ سے پیٹ کے بل رینگ کر یوں نکل رہا ہے جیسے دشمن کے قبضے میں چلی جانے والی خندق کے چور کنارے سے ماہر سنائپر باہر نکلا کرتا ہے.....

اب تک جتنے بھی ڈرامے ہوئے تھے ان میں غالب اکثریت مزاحیہ اور طنزیہ ڈراموں کی تھی۔ سیریل تو خاص طور پر ہنسی مذاق سے بھرپور تھے۔ ''لاکھوں میں تین'' اس عہد کا ایسا ہی مقبول سیریل تھا جیسے آج کل ففٹی ففٹی ہے۔ لوگ اس سیریل کے معروف کرداروں کو ان کے اصل ناموں کے بجائے ڈاکٹر لیس' ڈاکٹر نو اور ڈاکٹر وہاٹ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ گھروں میں بچوں کی کھیلیں یکسر بدل گئی تھیں۔ اب کوئی کیڑی کاڑا' آپوشاپو' لوڈو کیرم نہیں کھیلتا تھا بلکہ وردیاں سی پہن کر ڈاکٹر لیس' نو اور وہاٹ بنے پھرتے تھے۔ پرانی وضع کے خاندانی لوگوں کو ٹی وی نے تین شکایتیں ایک ساتھ سجا کے دی تھیں کہ ٹی وی پروگراموں سے بچوں کے اخلاق پر برا اثر پڑ رہا ہے اور وہ گستاخ ہو گئے ہیں..... بچے پہلے کے مقابلے میں کھلنڈرے اور بے فکرے ہو گئے ہیں۔ اور امتحانوں میں ان کے نمبر کم آنے لگے ہیں اور تیسرے یہ کہ سب کے تلفظ خراب ہو گئے ہیں۔ تلفظ کی خرابی میں صرف بچے ہی موردالزام نہیں تھے بلکہ اس میں بڑے بھی شامل تھے بلکہ بڑوں کی تعداد بچوں سے زیادہ تھی۔

حیرانی کی بات تھی کہ بہت عظیم اور اعلیٰ درجے کی روایات کی حامل فلم سکڑنے لگی تھی اور ٹی وی سکرین پھیلنے لگی تھی۔ ایک اپنے ڈرامے کی وجہ سے رخصت ہو رہی تھی اور دوسری اپنے ڈرامے ہی کی وجہ سے ابھرنے لگی تھی۔ اور پھر جس طرح پہاڑ کی گولائی ختم ہونے پر اچانک سامنے نگر کی سرسبز وادی پھیل جائے اور بائیں ہاتھ ہنزا کی پھولوں بھری اونچائیاں شروع ہو جائیں اسی طرح اچانک ٹی وی پر ''کہانی کی تلاش'' کا نا نگا پربت نمودار ہوا۔ یہ بڑے قد آور' نہایت سنجیدہ اور غور طلب ڈراموں کی سیریز تھی جسے تین نوجوانوں نے مل کر' بیٹھ کر اور سوچ کر لکھنا شروع کیا تھا اور اس کی پروڈکشن میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ وہ لاہور ٹی وی کا ابتدائی دور تھا اور اس میں اپنے پرائے کی تمیز نہیں تھی۔ نہ ہی اس وقت انتظامی امور میں وسعت پیدا ہوئی تھی نہ ہی معاملات الجھے ہوئے تھے اور نہ ہی انا کی پیچیدگیاں بڑھی تھیں۔

"کہانی کی تلاش" نے اپنے بعد کے آنے والے تمثیل نگاروں کے لیے بھی سوچ کی نئی راہیں متعین کیں اور اپنے ہمعصروں کو بھی متاثر کیا۔ اس عہد میں گھروں سے لڑکیاں' کالجوں سے لڑکے' دکانوں سے مرد اور اکھاڑوں سے بوڑھے اپنی اداکاری کے طبعی جوہر دکھانے کو ٹی وی سٹوڈیو میں جمع ہونے لگے۔ ڈرامے کے میدان میں یمین ویسار تو پہلے سے ہی موجود تھے۔ اب ہراول دستہ بھی تیار ہو گیا۔

ٹیلی ویژن کا 70ء کا دور بڑا سنہری دور تھا۔ اس میں کہانی کی تلاش کے بعد "ایک حقیقت" اور "قلعہ کہانی" جیسی سیریز نے اور بھی آگے کا سفر اختیار کیا۔ لاہور کا قلعہ جو پہلے صرف سیاحوں اور لاہور باہر کے طالب علموں کے لیے ایک "ضروری اور مجبوری حاضری" کا مقام تھا' اب لاکھوں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ سینکڑوں برس بعد ٹی وی کی بدولت اس قلعے نے اپنی تاریخ کے اوراق پلٹے اور یہاں ہونے والی محبتوں' سازشوں' شورشوں اور یورشوں کی وہ کہانیاں بیان کیں جنہیں وقت کی گرد نے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

پھر پنجابی زبان کا وہ عظیم سیریل ہر ہفتے ناظرین سے خراجِ تحسین وصول کرنے لگا جس نے علاقائی زبانوں کے لیے بہت سے نئے اور خوش آیند راستے کھول دیے۔ "جزیرہ" کے منفرد کردار سب ہمارے جانے پہچانے اور دیکھے بھالے تھے لیکن ترقی کے مقام پر پہنچ کر ہم ان سے جدا ہو گئے تھے۔ اور اس سے پھر ملنے کی موہوم سی امید بھی باقی نہ رہی تھی۔ یہ کردار اپنی حرکتوں سے اور اپنی مخصوص سوچ سے ہی نہیں پہچانے جاتے تھے بلکہ ان کی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کا لہجہ اور ان کی گفتگو کا پینترہ تھا۔ آپ کو دن کے وقت "جزیرہ" کے کرداروں کے مختلف جملے اور مختلف تخن گلیوں بازاروں میں اور مدرسوں خانقاہوں میں بکھیلے ملتے تھے اور شام کے وقت جب ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو اظہار کے یہی ڈھنگ ہمارے دروازوں پر ہمارا استقبال کرتے تھے۔ "جزیرہ"' "جھوک سیال" اور "پ سے پہاڑ" لکھنے والے کی دلسوزی کے تمثال دار آئینے تھے۔

73ء کے شروع میں ایک نہایت دلچسپ اور اپنی طرز کی نرالی سیریل "سچ گپ" شروع ہوئی تو ساری جھنڈی لوٹ کر لے گئی۔ یہ ایسی انوکھی خوشی عطا کرنے والی سیریل تھی کہ اس کے سامنے بڑے بڑے خیال افروز ڈرامے ماند پڑ گئے اور جیسے انگریزی والے A programme by appointment کہتے ہیں یہ پروگرام پانچ سال سے پچاسی سال کی عمر تک کے دیکھنے والوں کے لیے ایک "برضرور" بن کر رہ گیا۔

اب تک تو ڈرامے کی اور تماشے کی دنیا میں لکھنے والوں کا پلا بھاری تھا لیکن صفدر میر کی سیریز "آخر شب" کے ساتھ پروڈکشن کا کمال بھی شریک سفر ہو گیا۔ ان تاریخی ڈراموں نے "قلعہ کہانی" کے پرانے جھول بھی درست کیے اور تاریخ کے نیڑھے میڑھے صفحوں کی سلوٹیں بھی دور کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروڈیوسر پہلے بھی جان مارتے تھے اور اپنے ذرائع کی کوتاہ دستی کے باوجود بڑے لمبے ہاتھ مار جاتے تھے لیکن اب ریکارڈنگ کی آسانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جانے لگا اور پروڈیوسر ایک مثبت اکائی بن کر اپنے

محاذ پر ڈٹ گئے۔ اس کی سب سے واضح مثال ''ایک محبت سو افسانے'' نامی سیریز میں ڈٹ کر سامنے آئی۔ ''ایک محبت سو افسانے'' سیریز کے ڈرامے بناوٹ' لکھاوٹ اور سوچ کے اعتبار سے بی کلاس ڈرامے تھے۔ ان سے بہت بہتر اور قدآور ڈرامے ٹی وی سٹوڈیو تھیٹر اور شب تمثیل میں ہو چکے تھے۔ پھر اس سیریز کے آگے اور پیچھے اور ساتھ ساتھ بہت ہی گہری سوچ والے ڈرامے ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے لیکن ''ایک محبت سو افسانے'' صرف اپنی پروڈکشن کے اعتبار سے اور اپنی پیشکش کے انداز سے ہر ہفتے مقبول ہوتے جا رہے تھے۔ تماشائی اب ڈرامے کی پیشکش پر بھی بڑی نپی تلی رائے کا اظہار کرنے لگے تھے اور وہ فن کی ان باریکیوں کو سمجھنے لگے تھے جو ابلاغ کی دنیا میں ایک معمولی چیز کو بہتر بنا کر بمال کی دنیا میں داخل کر دیتی ہیں۔ جس طرح مجسمے کا کمال پتھر کی ذات میں نہیں بلکہ مجسم ساز کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اسی طرح ڈرامے کا کمال اس کی تحریر میں کم اور اس کی پیشکش میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ایک نیا علم تھا جو لاہور ٹیلی ویژن کے ناظرین کو اچھی پروڈکشنوں کی بدولت حاصل ہوا' اور اچھی پروڈکشن میں اچھے اداکار بھی برابر کے شریک تھے۔

جب کراچی سٹیشن سے ''خدا کی بستی'' کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دنیا کے مشہور سلسلہ وار پروگراموں کی طرح پاکستان کا یہ سیریل بھی شہرت عام حاصل کر کے فنا کے چکر سے نکل کر لازوال ہو جائے گا۔ لوگوں کو اس کے ڈائیلاگ حفظ ہو جائیں گے اور جس روز اس کی قسط چلا کرے گی بڑے شہروں کی سڑکیں سنسان اور چھوٹے قصبوں کی زندگی سکوت میں تبدیل ہو جایا کرے گی۔ سینما گھروں کی روشنیاں ماند اور ٹی وی سیٹوں کے گرد چہروں کی حیائیں روشن تر ہو جایا کریں گی۔ لیکن ایسے ہی ہوا بلکہ اس سے سوا ہوا۔ اور محض ایک اس سیریل کے زور پر کراچی اپنے پورے زور سے ابھرا اور مختصر وقفے میں لمبی جست لگا کر بامِ عروج پر پہنچ گیا۔ اس سیریل نے کراچی کو بہت پیچھے سے بہت آگے لا کر کھڑا کر دیا اور اس کے بعد آنے والے دو بہت ہی نامور اور بے حد کامیاب تمثیل نگاروں حسینہ معین اور فاطمہ ثریا بجیا کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ یہ دونوں ڈرامہ نگار خواتین چونکہ ادب کے راستے ٹیلی ویژن میں نہیں آئیں اس لیے یہ خالص ٹی وی لیکھک ہیں اور ان کے ڈراموں میں وہ ڈرامائی عنصر بدرجہ اتم موجود ہے جو ڈرامہ لکھنے والے شاعروں' افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے یہاں اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

''خدا کی بستی'' کے بعد ٹی وی ڈرامہ بڑے دھیمے انداز میں چلا اور اس کی وسعت میں نئے نئے مضامین شامل ہونے لگے۔ مصنفوں کی ذیل میں یہاں انور سجاد' سلیم چشتی' سلیم احمد' حمید کاشمیری' منو بھائی' صفدر میر' امجد اسلام امجد' جمیل ملک اور یونس جاوید جیسے قدآور ڈرامہ نگار نظر آتے ہیں جنہوں نے اس صنفِ ادب کو بڑے سلیقے کے ساتھ ان لوگوں تک پہنچایا جو ڈرامے کی اصل روح سے ناواقف تھے۔ میں نے بھی اس عرصے میں کچھ ڈرامے لکھے۔ لیکن چونکہ وہ ڈرامے کی تکنیک پر اور اس کے اصل تقاضوں پر پورے نہیں اترے اس لیے انہیں اس قدر کامیابی نصیب نہیں ہوئی جس قدر کہ میرا خیال تھا۔

پھر اچانک 79ء کے اواخر میں پاکستانی ٹیلی ویژن میں ایک انقلاب آیا جس نے تمثیل کی دنیا میں اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے..... مجھے یاد ہے کہ ایک شام ہم کسی شادی پر گئے تھے اور گیندے کے ہار پہنے دولہا کے پیچھے پیچھے پنڈال میں داخل ہو رہے تھے کہ اچانک لڑکی والوں کی طرف سے کسی نے ہانک لگائی کہ ''وارث'' کی بارہویں قسط دکھائی جا رہی ہے اور ابھی اشتہار چل رہے ہیں۔ لڑکی کے والد جو دولہا سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے اپنے پھولوں کا انبار بڑے بھائی صاحب کو دے کر اور ''معاف کیجیے گا'' کہہ کر اندر بھاگ گئے۔ ان کے بڑے بھائی نے بمشکل دولہا کے گلے میں ہار ڈالے ہوں گے کہ دولہا بھی اپنے چھوٹے سالے کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلا گیا۔ ہم سب براتی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے اور جو لوگ عمر میں مجھ سے ذرا بڑے تھے وہ بہت ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ لڑکی کے ماموں نے کمال عقلمندی سے تارین' بکسیاں پھینک کر جلدی سے ایک ٹی وی سیٹ باہر لان میں لا کر لگا دیا اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑا سا پروگرام نکل گیا تھا اور تھوڑی سی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ سکرین چھوٹی تھی اور ہم لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ دوسرے ٹی وی رنگدار نہیں تھا اور حشمت خان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرنے میں وہ مزہ نہیں آ رہا تھا۔

''وارث'' کی بے پناہ مقبولیت نے ٹی وی ڈرامے کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا اور اگلے سیریل اسی انداز کے لکھے جانے لگے۔ خاص طور پر سندھی رائٹر اس سیریل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس موضوع میں چند اور حقیقتوں کا اضافہ کر کے اس اسلوب کو ٹی وی کے لیے مخصوص کر دیا۔ فلم کے پرانے رسیا جنہوں نے اب تک ٹی وی ڈرامے کو دل سے قبول نہیں کیا تھا ''وارث'' کی وجہ سے اس ذریعہ اظہار کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور پھر وہ ناظرین کی ایک بڑی برادری میں شامل ہو گئے۔

''وارث'' کی مضبوط ترین بنیاد اس کی کہانی تھی اور اس کے بعد آنے والی سیریز ''اور ڈرامے'' کا کمزور ترین پہلو اس کی کہانی تھا۔ پھر اس سیریز میں ڈرامے کی طے شدہ تکنیک سے بھی انحراف کیا گیا تھا۔ یہ سیریز اپنے نزاعی ہونے کی بنا پر دیکھی ضرور گئی۔ لیکن اس کو پسند نہ کیا جا سکا۔ ناظرین نے اسے ''بور ڈرامے'' کا نام دے رکھا تھا کیونکہ اس میں لمبے لمبے ڈائیلاگ ہوتے تھے اور ان میں پند و نصائح کی باتیں ہوتی تھیں۔ اس ''سرمنائزیشن'' سے ناظرین بہت تنگ تھے۔ وہ بیچارے غم و آلام کے مارے دن بھر کے تھکے ماندے شام کو تفریح کی غرض سے ٹی وی کھولتے تھے اور آگے سے ان کو ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا جن میں ان کی قطعی دلچسپی نہیں تھی..... پھر اس سیریز میں پیروں' فقیروں' گدڑیوں' خانساموں' ملاؤں' استانیوں' قصائیوں وغیرہ کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا تھا' اس لیے ناظرین ان سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے..... ''اور ڈرامے'' دیکھے ضرور جاتے تھے مگر لوگ مجبور تھے۔ جب اچھا پروگرام موجود نہ ہو تو ناظرین بیچارے کیا کرتے۔ ٹیلی ویژن جب ایک مرتبہ ''آن'' ہو جائے تو پھر اس کو بند کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پروگرام برداشت کیا جا سکتا ہے بند نہیں کیا جا سکتا!

ٹی وی کے طویل ڈرامے ایک مرتبہ پھر پاکستان کے سب سے پہلے ٹی وی سٹیشن سے پیش کیے جانے لگے تو ناظرین نے ایک مرتبہ پھر سوچا کہ اگر ان ڈراموں میں پانچ گانوں کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ پوری فلمیں ہیں! لیکن ان کا دھیان اس طرف نہ گیا کہ اپنے نفس مضمون اور موضوع کے اعتبار سے یہ فلموں سے مختلف ہیں اور ان میں ایسی خیال انگیز باتیں کہی جا رہی ہیں جن کی طرف فلم نے ابھی تک توجہ ہی نہیں دی۔ محض ان میں گانے شامل کر دینے سے یہ فلم نہیں بن جائیں گے۔ اپنی افادیت اسی طرح برقرار رکھیں گے۔ ٹی وی کے یہ طویل ڈرامے جو ڈرامہ اکیاسی' بیاسی' تراسی' چوراسی.....وغیرہ کے نام سے منسوب ہوئے اپنی طرز کے نرالے ڈرامے تھے.....ان میں وہ سب کچھ تھا جو ایک ڈرامے کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اور وہ سب کچھ بھی تھا جو ناظرین کی توجہ اپنی ہمہ گیر گرفت میں رکھتا تھا۔ کہانی' مکالمہ' سیٹ' لائٹنگ' کیمرہ ورک اور سب سے بڑھ کر پروڈکشن! اس سیریز میں "کانچ کا پل"' "رگوں میں اندھیرا" اور "دکھوں کی چادر" ایسے بڑے ڈرامے تھے جن کو آسانی کے ساتھ دنیا کے کسی بھی بڑے ٹی وی ڈرامے کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ اور ان پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا ٹی وی اپنے قریبی ممالک کے ٹی وی سلسلوں سے تو برتر ہے ہی مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ پی ٹی وی دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ بھی "کھے" کے چلتا اور ان کو کئی مقامات پر حیران اور ششدر چھوڑ جاتا ہے.....عمارت اردگرد کی دوسری عمارتوں سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔

پی ٹی وی ڈرامے کا مستقبل یوں بھی درخشاں نظر آتا ہے کہ اب اس کی مانگ باہر کے ملکوں میں بھی ہونے لگی ہے اور بدیش کے لوگ ہمارے بارے میں بہت کچھ جاننے کے خواہشمند ہو گئے ہیں۔ جب عرفان کا زمانہ تھا تو لوح اور قلم کی ضرورت تھی جب علم کا زمانہ آیا تو کتاب سہارا بنی اب اطلاع کا دور ہے اور ذرائع ابلاغ اہم ہو گئے ہیں۔ اور ان اہم تر ذرائع میں سے ٹیلی ویژن اہم ترین ذریعہ بن گیا ہے اور اس اہم ترین ذریعے کا سارا بوجھ "ڈرامے" کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ خبریں ڈرامہ مانگتی ہیں۔ واقعہ چاہتی ہیں.....میوزک ڈرامائی منظر تلاش کرتا ہے۔ سنجیدہ مباحثے ڈرامائی سیٹ کے طلبگار ہیں۔ بین الاقوامی مذاکرات ڈرامائی صورت حال میں ہوتے ہیں اور کھیل تماشے سپورٹس تو بجائے خود ڈرامہ ہوتی ہیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی ان ڈرامائی پیشکشوں نے جنہیں میں "پیشکش پاکستان" کہا کرتا ہوں ایک بہت بڑے بلکہ بہت ہی بڑے طبقے کو نقاد بنا دیا ہے۔ اب ہر گھر میں اور ہر لاؤنج اور ہر لابی میں اور ہر ایسے مقام میں جہاں ٹی وی دیکھا جاتا ہے ایک اچھی بھلی تعداد ان نقادوں یا نکتہ چینوں کی بھی ہے جو بڑی آزادی سے ہر پیشکش پر بلکہ ہر پیشکش کی جزئیات پر اور سامنے آنے والے کی ہیئت پر اس کی سکنات پر اس کی حرکات پر نکتہ چینی کرتی ہے اور اپنی پسند اور ناپسند کا کھل کر اظہار کرتی ہے.....اس کے دو بڑے فائدے ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کھل کر اظہار رائے کرنے کے مواقع میسر آئے اور دوسرے یہ کہ کام کرنے والوں کو اس رائے کی

روشنی میں اپنے اگلے کام سنوارنے کے مواقع ملے اور نقصان یہ ہوا کہ ساری قوم کی قوم نکتہ چینی کی طرف مائل ہو کر تخلیقی عمل میں داخل ہونے سے معذور ہوگئی۔ تیسری دنیا کے لوگوں کو جو مزا نکتہ چینی میں آتا ہے وہ کام کرنے یا کام سنوارنے میں نہیں آتا لیکن وہ بیچارے بھی کیا کریں ان کو گزشتہ کئی سو برسوں سے اظہار کی اجازت ہی نہیں تھی۔ نہ اچھے اظہار کی نہ برے کی۔ نہ محبت کی نہ غصے کی..... میں ڈرامے کے سنہرے مستقبل کا یوں بھی قائل ہوں کہ جب ہمارے ناظرین کا انبوہ کثیر نکتہ چینی کے عمل سے نکل کر مثبت عمل کی طرف نگاہیں پلٹائے گا تو اسی انبوہ میں سے بہت سے ڈرامہ نگار اور پروڈیوسر ایسے پیدا ہوں گے جن پر یہ ذریعہ اظہار ہی فخر نہیں کرے گا بلکہ یہ ملک بھی ناز کرے گا کہ عالمی شہرت کے مالک اس فنکار کو میں نے جنم دیا ہے۔ یہ میرا باشندہ ہے۔ میرا پاکستانی ہے۔

عجیب بادشاہ

اپنے افسانوں کے بارے میں کسی ایک کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے ایک بہت ہی مشکل بات ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنی ساری تحریریں بے معنی اور لایعنی سی نظر آنے لگتی ہیں کہ وہ ایک ایک کر کے ماضی سے متعلق ہو چکی ہوتی ہیں اور ان کا ورود ''حال'' پر نہیں ہوتا بلکہ ہو ہی نہیں سکتا.....

''عجیب بادشاہ'' ایک اچھا افسانہ ہے اور میری آرزو ہے جس طرح اپنے زمانے میں ہم نے اسے پڑھ کر لطف لیا تھا' آج کے قاری بھی اس سے لطف حاصل کریں۔ یہ میرے اسی زمانے کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا تھا۔ آج کی بابت کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پڑھ چکنے کے بعد مجھے (ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ کی معرفت) آپ کی رائے کا انتظار رہے گا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ماضی کا کتنا حصہ حال پر لایا جا سکتا ہے۔

گڈریا

اپنے افسانے گڈریے کے بارے میں کیا عرض کروں یہی کہ لکھا گیا اور دوسرے افسانوں کی طرح لکھا گیا اس کے لیے نہ کوئی خاص محنت کرنا پڑی نہ سوچنے کے لیے دماغ پر زور دیا۔ کاغذ قلم لے کے لکھنا شروع کیا اور پھر جب جب وقت ملا اسے تکمیل کی طرف لے جاتا رہا۔

گڈریے کا کردار ایک غیر مسلم اتالیق چنت رام کا ہے۔ یہ کچھ میرے تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے رہتے سہتے انسان کی کہانی ہے جو ہماری آپ کی زندگی میں اگر اب نہیں ہے تو رہا ضرور ہے۔ ہمارے زمانے میں فارسی اردو کے بہت سے استاد غیر مسلم ہوا کرتے تھے' جنہیں اسلامی تہذیب اور مسلم ثقافت سے بڑا پیار ہوتا تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز بات کرنے کا طریقہ اور زیست کرنے کا قرینہ بالکل اسلامی تہذیب کا علمبردار ہوتا تھا۔ وہ اپنے مذہب پر سختی سے کاربند ہوتے۔ اس کی روایتوں سے واقف ہوتے۔ ان رسومات سے بہرہ مند ہوتے جو ان کے گھروں میں ادا کی جاتی تھیں لیکن وہ طبعاً اور مزاجاً اس ثقافت کے رسیا ہوتے جو انہیں عربی فارسی کے عمیق مطالعے سے میسر آتی تھی۔

میری زندگی میں خاص کوئی استاد گڈریے کی نوعیت کا نہیں آیا لیکن میں نے ایسے بہت سے استادوں کو دور سے ضرور دیکھا تھا۔ ان پر لکھنے یا انہیں اپنے افسانے کا پیرہن بنانے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ سنا چون میں جب میں روم میں مقیم تھا' مجھ پر اچانک یہ کہانی لکھنے کا جنون سوار ہو گیا۔ اسی طویل کہانی مادہ پسندی اور مادہ پرستی کے منطقے میں لکھنا کافی مشکل کام تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب مجھے مغرب کی زندگی بہت ہی پسند آئی تھی اور میں آداب سحر خیزی کو لایعنی خیز سمجھنے لگا تھا۔

''گڈریا'' میں نے کوئی دس گیارہ مختلف نشستوں میں لکھی ہے اور نہایت ہنگامہ پرور ماحول میں لکھی ہے۔ تھوڑا حصہ اپنے کمرے میں لکھا' چند پیراگراف روم یونیورسٹی میں پروفیسر باوسانی کے کمرے میں لکھے۔ ایک آدھ صفحہ ریڈیو سٹیشن پر لکھا۔ کچھ سطریں Vatican سٹی کے سامنے والے ڈاکخانے کی سیل کا سہارا لے کر لکھیں اور چند صفحے اس کے چھوٹے سے لان میں پرانی وضع کے چوبی بنچ پر بیٹھ کے لکھے۔ میرے

دوسرے افسانوں کے برعکس یہ کہانی لکھتے ہوئے نہ تو کبھی تسلسل، نہ ہی مجھے کل کا چھوڑا ہوا فقرہ مکمل کرنے میں دقت محسوس ہوئی۔ میں غیر مرئی طاقتوں پر بڑا ایمان رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کہانی مجھ سے کسی صاحب ذوق اور صاحب علم چنت رام نے لکھوائی ہے جو اپنے استاد سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ لیکن ان کی یاد میں خود کوئی نوشتہ نہ چھوڑ سکے تھے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک خوبصورت اور مرصع قصہ میرے نام سے چھپوایا اور اس کی مقبولیت کے لیے بھی دعا فرمائی۔

پچھلے دنوں میں اپنے اس افسانے کے پروف پڑھ رہا تھا اور خودستائی سے مجبور ہو کر قدم قدم پر ہر فقرے کی داد دے رہا تھا تو میری بیوی نے ایک بات کہی تھی، جو اب بھی میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔

اس نے کہا۔ ''تم اس کہانی پر ناز تو کرتے ہو، یہ مقبول بھی بہت ہے اور مجھے بھی پسند ہے لیکن اس کی عمر عزیز کے صرف چند سال باقی رہ گئے ہیں..... یہ کہانی بہت بری طرح سے زمان و مکان کی حدوں میں محبوس ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے بچے جب جوان ہو کر اس کہانی کو پڑھیں گے تو وہ صوفی ازم کے تصور سے بہت دور ہوں گے۔ نہ انہیں اسلامی ثقافت کا پس منظر معلوم ہوگا..... نہ انہوں نے ایسے استادوں کا نام لینا ہوگا اور نہ ہی اُن پر علوم شرقیہ کے جذباتی اور شیر گرم لمس کا احساس ہوگا۔ پھر وہ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے اور کہیں گے ابو نے یہ افسانے لکھ کر کیا جھک ماری تھی۔''

اس کی یہ تلخ اور تیکھی بات ابھی تک میرے رستے کی پھانس بنی ہوئی ہے!

اردو نشریات میں علاقائی الفاظ اور محاورات کا استعمال

ہمارے ایک نہایت ہی عزیز دوست کے ایک ماموں ہیں جو لفظ تنازعہ کا مطلب نہ صرف غلط سمجھتے ہیں بلکہ اصل سے الٹ سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا مطلب صلح صفائی' راضی نامہ' باہمی دوستی اور تجدید ملاقات سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے دلچسپ اور چلتے پھرتے لطیفے ہیں کہ کسی نے انہیں آج تک اس لیے درست نہیں کیا کہ اگلا آدمی ان کی اس معنی آفرینی لطف سے محروم نہ رہ جائے۔ ایک روز انہوں نے ریڈیو سٹیشن آ کر اپنے بھانجے سے کہا۔" یار حمید پھپھو صغریٰ اور خالہ صفیہ کے درمیان جو کئی برسوں سے عداوت چلی آ رہی ہے یہ اب ختم ہونی چاہیے۔ دیکھو ناں اب کافی وقت گزر گیا ہے اور زندگی تھوڑی رہ گئی ہے میرے خیال میں ہمیں مل ملا کر ان کے درمیان تنازعہ کرا دینا چاہیے۔ کون جانے پھر ہم میں سے کسی کو وقت ملے نہ ملے اور یہ دونوں بہنیں آپس میں روٹھی روٹھی فوت ہو جائیں۔"

کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ سے یہ ساری دنیا یہ ساری کائنات پیدا ہوتی ہے اور ایک لفظ ہی کے اظہار سے ختم ہو جائے گی اور ان کی پیدائش اور خاتمے کے درمیان جتنا وقفہ ہوگا اس پر لفظ ہی حکمران رہے گا۔ لفظ ہی برے بھلے' حق و ناحق غلط اور صحیح میں تمیز کرے گا اور وہی لوگوں کو گروہوں اور ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کے انفرادی اور اجتماعی نام رکھے گا۔

اردو زبان شروع ہی سے شرفاء' ادباء اور شعراء کی زبان رہی ہے اس لیے اس میں غریب اور ہلکے الفاظ کو داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے اور اس کو شاہزادوں' شاہزادیوں نجیب الطرفین سوداگروں' خاندانی لوگوں اور ان کے وفا شعار ملازموں کی زبان کے طور پر پال پوس کر بڑا کیا گیا ہے۔ شرفاء چونکہ ہمیشہ بادشاہوں' سلطانوں حکومتوں اور وزارتوں کے ساتھ رہتے ہیں اس لیے وہ معاشرتی زندگی میں ایسا گروہ بنا کر رہتے ہیں جسے آجکل پریشر گروپ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس گروپ کے ذمے جہاں اور بہت سے کام ہوتے ہیں وہاں ایک اہم کام یہ بھی سپرد ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی بلائی سطح کی ادبی' ثقافتی' اخلاقی اور روحانی قدروں کو ایک مقرر سطح سے گرنے نہ دیں۔ وہ ایک خاص طرح کی زبان ایک خاص انداز کی موسیقی ایک خاص

طرز کے لباس اور ایک خاص طرح کی جسمانی حرکات اور مخصوص اخلاقی اقدار کے پابند ہوتے ہیں۔ جو شخص اس خاص طرز کے دائرے سے نکل جاتا ہے وہ کتنا بھی امیر اور پیسے والا کیوں نہ ہو پریشر گروپ سے نکل جاتا ہے اور پھر اس کی حالت دھوبی کے پالتو جانور کی سی ہو جاتی ہے۔

ہمارا ریڈیو اور پھر اس کے بعد ٹیلی ویژن بھی چونکہ شرفاء کے قبضے میں ہے' اس لیے ابلاغ کے ان دونوں ذریعوں کی زبان اور اظہار کا لہجہ اس کے سننے والوں اور دیکھنے والوں سے مختلف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں ذرائع ابلاغ نے عام لوگوں کی خوشنودی کے لیے کچھ پروگرام ایسے بھی رکھ دیئے ہیں جنہیں دیہاتی پروگرام' پنڈ دی پرھیا' لوک تماشا یا عوامی رقص وغیرہ کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں کے شرفا بھی اکثر اسی طرح کیا کرتے تھے کہ کسی مقررہ شام کو اپنے دھوبیوں' سائیسوں' ماشیوں اور شاگرد پیشوں کو بلا کر ان کے ناچ گانوں سے محظوظ ہوتے تھے اور برآمدوں میں کرسیاں ڈال کر ان کے فن کی داد دیا کرتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ریڈیو اور ٹی وی کا انداز بھی ویسا ہی مربیانہ قسم کا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جو مشترکہ زبان ریڈیو پاکستان کے مختلف سٹیشنوں سے براڈکاسٹ کی جاتی ہے وہ ہمارے انہتر ستر فیصد سننے والوں کو اچھی طرح سے سمجھ میں نہیں آتی اور سننے والے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے کسی پر یہ بھید کھلنے ہی نہیں دیتے کہ قولوا للناس حسنا ان کے پلے نہیں پڑتی۔

اس سلسلے میں میں نے اپنے طور پر کچھ تجربے کیے ہیں اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں جا کر ان لوگوں کی اردو کو ریکارڈ کیا ہے جو سرحد' بلوچستان' سندھ اور پنجاب کے دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں اور باقاعدگی سے ریڈیو پاکستان کے پروگرام سنتے ہیں۔ میری لائبریری میں اس وقت تقریباً ایک سو بیالیس ایسی ریکارڈنگ کے اردو نمونے موجود ہیں جن میں گفتگو کے دوران ان لوگوں نے بلا تکلف اپنی مادری زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ پھر بھی آپ ان کی گفتگو کو اردو کہنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس بات چیت میں بیشتر ان کے پیشوں اور ان کی موجودہ زندگیوں کے حالات کا مذکور ہے لیکن کہیں کہیں انہوں نے ملکی سیاست اور معاشرت کی باریکیوں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنا مقصد سمجھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کا انداز بیان محض علاقائی الفاظ کے استعمال کی وجہ سے ہی ریڈیائی اردو سے مختلف نہیں بلکہ فقروں کی ساخت اور روزمرہ کے الگ استعمال کی وجہ سے بھی مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً اردو روزمرہ کے خلاف ہر ایک نے یہی کہا ہے کہ ''وہاں جا کر اس کو کہنا کہ محمد دین تم کو بہت یاد کرتا ہے''...... یا...... ''میں نے کل داد و جانا ہے اس لیے آپ میرا ٹیپ ریکارڈ آج ہی بھر لیں۔'' بالکل اسی طرح جیسے آج سے تیس پینتیس سال پہلے ادھر کے ایک شاعر نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا ''تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے''۔ سرحد سے آلو بخارے اور قندھار سے سرخ انار کا ٹرک لے کر جب ایک سوداگر لاہور کی میوہ منڈی میں آتا ہے تو وہ اسی ساخت کے فقرے میں لاہوری آڑھتی سے بات کرتا ہے۔ سیالکوٹ کا ایکسپورٹر جب حیدر آباد سے شیشے والی جائنیں اور رلّی کی

چادریں لینے جاتا ہے تو وہ دونوں بھی اسی ساخت کے فقرے میں خرید و فروخت کرتے ہیں۔ بلوچستان سے سمگل کیا ہوا کپڑا لانے والی عورتیں بھی کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں جا کر اسی ساخت کی اردو بولتی ہیں اور اپنے مال پر نفع کما کر لاتی ہیں۔ پھر یہ سب لوگ ریڈیو پاکستان سے خبریں سنتے ہیں۔ خبروں پر تبصرہ سنتے ہیں۔ قرآن حکیم اور ہماری زندگی سنتے ہیں اور نیشنل ہک اپ کی نشریات سماعت فرماتے ہیں تو ان کو شرمندگی کا ایک پیارا سا احساس ہوتا ہے کہ وہ خفیف ہو کر کہتے ہیں "یار معاف کرنا ہمارا اردو بہت کمزور ہے۔"....."سائیں اردو پڑھی ضرور ہے پر بولی کی مشق زیادہ نہیں۔"

پچھلی گرمیوں میں میں نے ان لوگوں سے دو تین درجے کم اہلیت کے لوگوں کو جن کی تعداد ہماری آبادی کا تقریباً اسی فیصد حصہ کہلاتی ہے ساہیوال کے علاقے میں انٹرویو کیا۔ یہ بالکل ان پڑھ لوگ تھے اور ان کے پیشے کھیتی باڑی' گلہ بانی' ترکھانی رسہ گیری اور باغوں کی رکھوالی پر مشتمل ہے۔ پکی سڑک ایک گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر تھی اور باقی کے دو گاؤں سے سات اور ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر۔ ان سب کے پاس اپنے ذاتی ٹرانسسٹر تھے اور یہ سب لوگ بڑی توجہ کے ساتھ ہر پروگرام سنتے تھے۔ باقاعدگی سے پروگرام سن سن کر انہوں نے نشریاتی اردو کی ایک ذہنی ڈکشنری تیار کر رکھی تھی اور ہر براڈکاسٹ کا مفہوم بڑی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ گیارہ آدمیوں کی سامپلنگ میں سے چند نشریاتی الفاظ کے معانی آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ عازمین کا مطلب گیارہ کے گیارہ آدمیوں نے حاجی بتلایا۔ مراسلے کا مطلب پانچ نے سمن' طلبی اور پرچہ بتلایا۔ ایک نے چٹھی' ایک نے تار اور چار نے معذوری ظاہر کی۔ موقف کا مطلب ایک نے للکار۔ دو نے دعویٰ۔ ایک نے اولیاء اللہ کی درگاہ بتایا اور باقیوں نے خاموشی اختیار کی۔ لایعنی کا مطلب ایک نے بے وقوف دوسرے نے بری بات اور تیسرے نے بے فضول بتایا۔ باقی کے اس کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ نبرد آزمائی کا مطلب ایک نے پانسے کا کھیل بتایا جس میں نردیں ہوتی ہیں' باقی کے اس کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ افہام و تفہیم کے بارے میں تین نے کہا یہ عربی شریف کی آیت ہے۔ دو نے کہا آپس کا آخری اور سردھڑ کا مقابلہ جس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ ایک نے کہا اس کا مطلب ثالثی ہے اور باقیوں نے معذوری ظاہر کی۔ پارٹی کی مثالی تنظیم کا مطلب صرف ایک نے بتایا کہ وہ پارٹی جو تگڑی اور طاقت ور ہو جس طرح گھوڑے کو مسالا دے کر تگڑا کیا جاتا ہے اسی طرح مثالی تنظیم سے پارٹی کو تگڑا کیا جاتا ہے' لیکن ساتھ ہی اس نے وضاحت کی کہ یہ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے۔ پارٹی کو سچ مچ مسالا نہیں دیا جاتا۔ نامردگی کے معنی صرف دو ہی بتلا سکے۔ ایک نے کہا یہ گالی ہے دوسرے نے کہا مردمی قوت کی دوا ہے۔ اوکاڑہ شہر کی ایک پرائمری سکول کی معلمہ نے استحصال کے معنی مروڑ اور پیچش بتائے۔ ایک نیم خواندہ خاتون نے اس کے معنی استعمال بتائے اور باقی کی تین نے یہ لفظ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومی زبان کی نشریات اردو زبان اور اس کے علم و ادب کی خدمت کے

لیے مخصوص ہونی چاہئیں یا اس انداز پر ڈھالی جانی چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ سننے والے ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جہاں تک علم و ادب کی خدمت اور اردو زبان دانی کے بندھے ٹکے اصولوں کی نگہداشت کا تعلق ہے تو وہ کتابوں' رسالوں' جریدوں اور اخباروں کے دائرہ عمل کی چیز ہے لیکن جہاں تک اس زبان کے عام کرنے اور اسے رابطے کی واحد زبان بنانے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں پہلے ریڈیو اور پھر ٹی وی بھرپور خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس عظیم کام کو بلے کنڈھے لگانے کے لیے ریڈیو کے سربراہ سے لے کر چپڑاسیوں تک ہر ایک کو حوصلہ کر کے شرفاء کے گروہ سے نکل کر ان لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن کے لیے پروگرام تیار کیے جاتے ہیں اور جن سے اچھی بات کرنے کے لیے اس محکمے کے عملے کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ رہا پریشر گروپ کے دوسرے بھائی بندوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا سوال تو ان کے لیے یا تو کسی علیحدہ چینل اور الگ ٹرانسمیشن کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے یا روزمرہ پروگراموں میں دیہاتی بھائیوں کے پروگرام کی طرح معزز بھائیوں کا پروگرام یا شرفاء بھائیوں کا پروگرام جیسے پروگرام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو کی سب سے بڑی اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ دوسری بولیوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے کی ایسی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ الفاظ تھوڑی دیر کے بعد اسی کے ہو جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اس نے عربی فارسی کے علاوہ پرتگیزی' ترکی' انگریزی اور ولندیزی زبانوں کے الفاظ اس طرح اپنی کوکھ میں بٹھا رکھے ہیں کہ کسی کو شک ہی نہیں گزرتا کہ یہ بچے اصیل نہیں۔ اسی طرح اردو جب علم و ادب کے محل سے نکل کر عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرتی ہے تو اس کی شکل وہ نہیں رہتی جو کتاب میں ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں پنجاب میں ایسی اردو کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن میں سے اس وقت میں صرف تین نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ مال کے کاغذات میں پٹواری کی روداد ملاحظہ فرمائیے:

> ''تاریخ دس اکتوبر۔ اس وقت کرماں ولد ناماں ذات قصابانہ سکنہ دیہہ۔ پتی مہر شہابت نمبردار نے بہ موجودگی نمبردار مذکور بہ رفاقت مزارع خود بیان کیا کہ وہ چاہ تابلی والا۔ واقعہ دیہہ ہذا میں کھاتہ نمبر 85 کھتونی نمبر 94 میں بقدر 1/12 حصہ کا مالک ہے۔ مگر بروئے تقسیم خانگی وہ اپنے 1/12 حصہ پر قابض چلا آتا ہے۔ آج سے اندازاً چھ ماہ قبل اس کے مزارع نے ملحقہ نمبرات خسرہ میں بذریعہ بنہ شکنی تجاویز کر کے بہ علم و موجودگی مزارعاں شرکائے چاہ دس کنال رقبہ زمین بذریعہ کاشت فصل گندم اپنی اراضی زیرکاشت میں شامل کر لی تھی۔ کیونکہ دیگر شرکاء چاہ کے مزارعاں نے خفیہ طور سے میری ملکیہ اراضی کی حد شمالی کی جانب سے اس قدر رقبہ اپنی اراضی میں شامل کر لیا تھا۔ اب میرا قبضہ موقع پر موجود ہے اور اس پر فصل جوایستادہ ہے۔ لہٰذا موقع کاشت کی گرداوری کر کے خسرہ گرداوری میں بموجب حالات

موجودہ مناسب اندارج کیا جاوے۔"

اب پولیس کی رپٹ کا ایک نمونہ دیکھئے:

پرچہ علت نمبر 9 بابت سال 1910ء از تھانہ فوجدار پور وقوعہ بعد از وقت نصف شب درمیانی 13/14 جنوری 1910ء۔ رپٹ منجانب بکھو ولد لکھوریا۔ ذات وٹو سکنہ موضع پکاوہ تھانہ فوجدار پور۔

جرم 148/149-458-326-324 تعزیرات پاکستان

روانگی رپٹ از تھانہ بعد 12 بجے دن۔ منجانب پولیس کوئی توقف نہیں ہوا۔

جناب عالی! ہنگام الصدر و مسمی بکھو ولد لکھوریا ذات وٹو۔ سکنہ موضع پکاوہ داخلی علاقہ تھانہ ہذا نے بحالت مضروبی بسواری چارپائی ہمراہی مسمیان لبھہ ولد گبھہ ذات ڈھمکانہ۔ سکنہ موضع انمانہ و رجیہ ولد قطبہ ذات ڈھبہ سکنہ موضع مذکورہ ہمعہ چند دیگر مردمان دیہہ بحاضری تھانہ رپورٹ کروائی کہ شب گزشتہ میں ہمعہ بگھرو و برادر حقیقی خود جھگڑو و بھتیجا ام و چند دیگر مردمان سکنہ موضع صد کچھ جو بسلسلہ خرید مال مویشی بطور مہمان حویلی ملحقہ میں شب باش تھے۔ واڑہ مال مویشی ملکیتی خود میں حفاظت کناں سو رہے تھے۔ بفاصلہ چند کرم بھتیجا ام بحالت نیم خفتگی لیٹا ہوا تھا۔ نصف شب سے چوتھائی پہر بعد کا وقت ہوگا جبکہ چاند ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی صدا پر میں بیدار ہوا۔ دیکھا تو کتا واڑہ مویشی سے باہر بجانب غرب بھونکتا ہوا جا رہا تھا۔ ملحقہ حویلی کے موجودگان نے جو شب باش ہوئے تھے مشعل ہائے سرکنڈہ روشن کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجرمان واڑہ مال مویشی کے عقب سے داخل ہو کر دو راس بھینس ہمعہ کٹی یا ایک راس نرگاؤ۔ ایک عنان گھوڑی اور ایک مہار شتر سرقہ کر کے لے گئے ہیں۔ نشانات سراغ اگورا بجانب جنوب غرب رواں ہیں۔ چنانچہ کتے کے بھونکنے کی سمت پر سراغ اگورا رواں کر کے ہم سب تعاقب کناں بطرف مجرمان سرقہ کنندگان دوڑے۔ ستر اسی قدم کے فاصلہ پر پہنچے تو دیکھا کہ دس بارہ کس مجرمان لنگوٹا بند مسلح بہ ڈانگ ہائے بانس ہمارے مسروقہ مویشی ہانک کر جا رہے ہیں۔ جب ہم آٹھ دس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو مجرمان نے ڈانگ ہائے بانس سے ہم پر حملہ کیا۔ ہم نے بھی بچاؤ خود اور بازیافت مال مسروقہ کے لیے اپنی معمولی ڈانگیں جو بحالت تعاقب واڑہ سے اٹھالی تھیں استعمال کیں۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا مجرمان میں سے بھی کوئی ازدست

تعاقب کنندگان مضروب ہوا۔ وہاں سے مجرمان کھری کرتے بھاگ گئے۔ مویشی مسروقہ بحالت فرار چھوڑ گئے جو بعد میں کھیت ہائے ملحقہ سے بحالت آوارگی گھیر گھار کر واپس لائے ہیں۔ من رپٹ دہندہ و مسمی لبنا ہمراہی بحالت تعاقب و مقابلہ از دست مجرمان بلضرب بات ذاتگ مضروب ہوئے۔ مال مویشی واگذاشتہ مجرمان ہمراہ خود حاضر تھانہ لائے ہیں۔ موقع سرقیدگی وقوعہ وقوعہ لڑائی پر سراغ ہائے مجرمان پابرہنہ و جوتا پوش موجود ہے۔ جو برتن ہائے گلی سے ڈھانپے گئے ہیں اور قابل شناخت ہیں۔ مجرمان میں سے ہر کس دراز قد اور قوی ہیکل تھے۔ باقی متوسط القامت و جثہ تھے۔ چاندکی روشنی اور مشعل ہائے سرکنڈہ و نزدیکی مقابلہ سے مجرمان کو بخوبی دیکھ لیا تھا اور اب سامنے آنے پر شناخت کرلیں گے۔

مجرمان سینہ زور گروہ بندی رکھتے ہیں اور یہ واردات مسمی نامدار خان و علمدار خان ذات چوہان ذیلدار علاقہ بوگنڑ کاں کی انگیخت سے ہوئی ہے جو دو مہار شتر کی چوری کا شبہ ہم اقوام وٹو پر رکھتا ہے..... خواہان تفتیش ہیں حق رسی فرمائی جائے۔

نشان انگوٹھا مسمی بھکو رپٹ دہندہ
کمترین جھنڈے خاں محرر ہیڈ کانسٹیبل

اسی طرح چھاؤنی کے جوان صوبیدار ضابطے خان کی اردو ملاحظہ فرمائیے:

''او وہ سمجھ کرتو کہ ہمارے زمانے کی باتاں ہورہی ہوتی تھیں۔ موڈ ہے پر چنتی چڑھی ہوئی۔ پی ٹن کو کھڑیا ماری ہوئی۔ کبوتر کی پوچھل طراں جوان کا طرہ بس سمجھ کرتو پھیل۔ کھڑیا ہوتا تھا۔ بوٹ چمکا کے شیشو بنا کے جدھر سے مارچ بول دے دو جی پلٹنوں کے جوان ہالٹ ہوجاتے کہ ضابطے خاں جارہا ہے۔ کفتان صاحب کو ایڈی ملا کے پنجے کھول کے ایسا ایسا سلوٹ بولیا ہے کہ سب اخباروں میں مورتیں چھپ گیاں۔ انجھال کے مورچہ پرتن کمپنی کی گڈیاں کھوبے میں سمجھ کرتو کہ بالکل پھس گیاں۔ ہم نے اتر کر صاحب کو سلوٹ ماریا۔ بولیا ضابطے خاں کاشن بولو۔ ہم نے سلوٹ دے کر آرڈر لیا۔ کاشن دیا۔ تیل پانی بتی چیک کرو۔ اک گیئر پیچھے لاکے لو اشیاء چیک دوئیو۔ سٹارٹ! گڈیاں سی کہ بس ایک ہلے میں چھالاں مارتیاں شیرنیاں طراں فاوڈ بول گیاں۔ اب بھی ہمارے میں اتنا مورال پڑا ہے کہ دشمن کے دس آدمیوں کو سنن برین چھڈ کے سنگین سے ڈاون کراسکتا ہے۔ ہماری پنشن ہوگئی تو ہمارا کنسکشن

بالکل ملٹری سے سمجھ کرلو آؤٹ نہیں ہوگیا۔اب بھی ہمارے اندر ملٹری کا لہو اور ملٹری کا فیتھ فل ڈسپلن بول رہتا ہے۔آرڈرکی اڈیک میں ہم بوٹ پٹی چپکا کے سارا دن تیار بر تیار رہتا ہے۔فکر نہیں کا دن فرنٹ پر پورا ہوتا ہے۔''

ان تینوں نمونوں سے آپ پر کسی قدر واضح ہوگیا ہوگا کہ باوجود اس کے کہ زبان کا تانا بانا ولایتی ہے پھر بھی اس میں جگہ جگہ ایسے دیسی پھول نکلے ہیں کہ اس پھلکاری کے اندر سے مانوس آواز آتی ہے۔اس مانوس آواز کو مانوس تر کرنے کے لیے تانے بانے کو اور زیادہ دیسی اور زیادہ مقامی بنانے کی ضرورت ہے۔ہماری علاقائی زبانوں میں بے شمار الفاظ ایسے موجود ہیں جنہیں ادھار مانگ کر اردو کے کارخانے کو وسعت دی جاسکتی ہے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔تھوڑے عرصے بعد یہ ادھار بمعہ سود علاقائی زبانوں کو واپس لوٹایا جاسکتا ہے۔اس فیڈ بیک سسٹم سے صرف اردو ہی نہیں بلکہ علاقائی زبانوں کی آبیاری بھی آسانی سے ہوسکتی ہے اور دونوں زبانوں کے جہاز میں اضافہ ہوسکتا ہے.....

اردو میں لفظ کل آنے والے دن کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور جانے والے دن کے لیے بھی.....سندھی زبان میں جانے والے کل کے لیے کل ہے اور آنے والے کل کے لیے صبحانے استعمال کرتے ہیں۔سائیں میں کل لاہور آیا تھا۔آج کا دن دوستوں یاروں سے ملنے میں گزارا۔صبحانے شام کی فلائٹ سے پنڈی چلا جاؤں گا۔پنجابی اور سندھی میں مبادا کی جگہ متاں بولتے ہیں۔جیسے اس کے ساتھ ساتھ بھارت کو اس بات کا بھی خوف ہے متاں امریکہ اس سے بالکل ناراض ہوجائے اور ہر طرح کی امداد بند کردے۔ایک مرتبہ حیدرآباد سے کوئٹہ جاتے ہوئے ایک ہم سفر نے مجھ سے کہا۔''سائیں ہمارے باپ دادا تالپوروں کے زمانے میں ٹھٹھہ کے رہنڈز تھے لیکن ہمارے والد صاحب انگریزوں کے وقت میں کوئٹہ جا کر آباد ہوگئے۔''بلوچی زبان میں ناہ اس اخلاقی غلطی کو کہتے ہیں جس کا ازالہ ممکن نہ ہو۔موڈ کے لیے بلوچی میں ایک لفظ چاڑ بولتے ہیں۔جب ہم سردار کے ڈیرے پر گئے تو وہ بڑے چاڑ میں تھا اور ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔پھر ایک قاصد کسی کا خط لے کر آگیا۔سردار نے پڑھا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔پھر وہ ایسا بے چاڑ ہوا کہ نہ کسی سے بات کی نہ کسی کا حال پوچھا۔اٹھ کر اندر چلا گیا.....

بلوچستان کی پہاڑی اصطلاح میں رنگ راہ کم فاصلے اور مختصر ترین راستے کو کہا جاتا ہے۔اسے عام بول چال میں شارٹ کٹ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جیسے یہ سوال حل کرنے کی ایک رنگ راہ یہ بھی ہے کہ پہلے کو صفر کے برابر فرض کر لیجیے۔پشتو کا لفظ جرگہ مجلس عمل' نمائندہ مجلس' ایکشن کمیٹی اور اس قبیل کی دوسری ساری مجلسوں پر حاوی ہے۔اس کا فیصلہ یکساں قابل قبول اور واجب العمل ہوتا ہے۔اسی طرح پشتو کا حجرہ کمیون کے معنوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ڈکشنری میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔حجرہ وہ مخصوص مکان جو ایک محلے کے لوگ اجتماعی طور پر بناتے ہیں۔عموماً راستے کے کنارے ایک سادہ سی عمارت ہوتی ہے۔

اس کی حفاظت اور مرمت محلے والوں کے ذمے ہوتی ہے۔ شادی غمی کے اجتماعات..... آپس کے صلاح مشورے..... پولیس کا قیام اور رات کو نغمہ و سرود کی محفلیں یہیں لگتی ہیں.....

رندخور پشتو میں اس چوپائے کو کہتے ہیں جو رسی چبانے اور کپڑا کھانے کا عادی ہو۔ کالم نویس وندخور کا لفظ ایسے سیاسی لیڈر کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں جسے عوام کی حمایت حاصل نہ ہو لیکن پھر بھی وہ وندخوری سے باز نہ آئے۔ پنجابی میں خالہ زاد بھائی یا بہن کو مسیر اور ماموں زاد بھائی یا بہن کو میر کہتے ہیں۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا میری مسیر نے اپنے برقعے کا بند کھولا اور امی سے باتیں کرنے لگی۔ پھر میری توجہ کتاب پر نہ جم سکی..... صادق باجی کے ممیر نے ان کے لیے امریکہ سے ایک ہیئر ڈرائیر بھیجا ہے..... سردیوں میں بارش کے ساتھ چلنے والی تیز ہوا کو پنجاب میں پھانڈا کہتے ہیں۔ اپنے والدین کے شیر گرم آ لنے سے نکلنے کے بعد یہ پہلا پھانڈا تھا جس نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔ ان کی گفتگو میں علم کے اشارے ضرور تھے لیکن وہ محبت اور شفقت نہ تھی جو بزرگوں کی باتوں میں ہوتی ہے۔ وہ ساری عمر کوشش کرتے رہے لیکن سیاست کے کھوبے سے نہ نکل سکے۔

جہاں تک اردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا تعلق ہے تو ہماری نشریات میں صرف وہی محاورے اور ضرب الامثال باقی رہ جائیں گی جن کے مترادفات مقامی زبانوں میں موجود ہیں۔ الّو کی دم فاختہ' بچھیا کے باوا' آٹھوں گانٹھ کمیت' الٹے بانس بریلی کو' چونی بھی کہے مجھے گپی سے کھاؤ اور نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی اور من چنگا تو بغل میں گنگا اور ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا وغیرہ تو اب تحریروں میں بھی نظر نہیں آتیں۔ ریڈیو کی گفتگو میں کہاں ملیں گی۔

وہ اردو محاورے جو علاقائی جیسے ہیں یا ان کے قریب میں ہمیشہ قائم رہیں گے۔ مثلاً پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' ہاتھ کا سچا' نیو نیوز' پوبارہ' انیس بیس کا فرق' پیچ عیب شرعی' دانا بینا وغیرہ۔ اس وقت اردو کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ علاقائی اکھان ترجمہ کر کے اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دے اور اپنے اردو بازار میں فوراً ان کا سکہ چلا دے۔ دور دراز کے سننے والے ہر اس نشریے کو کام سے ہاتھ روک کر سنیں گے جس میں ان کے اکھان اور ان کے سیانوں کی کہی ہوئی باتیں ہوں گی۔ جیسے اپنا مارے گا تو چھاؤں میں تو پھینکے گا۔ ایک اندھا دوسرے دیواروں پر بھاگے۔ بیگانی چھاچھ پر مونچھیں منڈوانا۔ سوئے ہوئے بچے کا منہ چوما نہ بچہ راضی نہ اس کی ماں ٹوٹی ہوئی بانہیں گلے سے آ ملتی ہیں۔ تاپانی بھی آگ بجھا دیتا ہے۔ سایہ ساتھ تو چل پڑتا ہے پر ہاتھ نہیں پکڑتا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اور نہیں تو کم از کم نشریات کی سطح پر ایسی اردو کی بنا ڈالی جائے جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور جسے آسانی کے ساتھ رابطے کی زبان بنایا جا سکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس میں اس دیس کی بولیوں کی سوندھی مٹی گوندھی جائے اور پھر اس کھنکھناتے ہوئے گھڑے کو پانی

بھرنے والی کی ڈھاک پر چڑھا دیا جائے اور ہر محفل میں چمٹے اور الغوزے کے ساتھ بجا دیا جائے.... میری اس تجویز پر بہت سے سیانے بیانے پرانے پنڈت یہ کہیں گے کہ صاحب زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ کا رچاؤ وقت کے دھارے سے عمل میں آتا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی اور ثقافتی پروسیس ہے اور اس میں ارادتاً کچھ نہیں کیا جا سکتا اور زبانیں عمداً نہیں بنائی جا سکتیں۔ میں ان پنڈتوں کا ضرور ہم خیال ہوتا اگر یہ بات سکندر اعظم کے زمانے میں کی جاتی یا قلی قطب شاہ کے دور میں دہرائی جاتی یا کم از کم بہادر شاہ ظفر ہی کے زمانے میں کہی جاتی۔

یہ الیکٹرونکس کا دور ہے اور ریڈیو فلم اور ٹی وی نے اپنی آواز اور صورت کے ذریعے ہر ان پڑھ آدمی کو اپنی خواہش اور اپنے نصاب کے مطابق علم عطا کر دیا ہے۔ اور ہر شخص کو اس طرح سے میسمرائز کر دیا ہے کہ ماس میڈیا کا عامل اپنے ہر معمول سے ہر بات اپنی مرضی کے مطابق بہ آسانی کھلوا لیتا ہے اور اس کے ذہن پر پائیدار اور انمٹ نقوش چھوڑ دیتا ہے۔ اور معمول نہ صرف ان نقوش کو سنبھال کر رکھتا ہے بلکہ ان پر فخر بھی کرتا ہے.....دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کے عالموں اور قواعد دانوں نے بہ آواز بلند امریکیوں کو خبردار کیا کہ وہ ایسے بیہودہ اور لایعنی الفاظ انگریزی میں لانے کی کوشش نہ کریں جس سے زبان کے بے ڈھنگے اور بد وضع ہونے کا خطرہ لاحق ہو۔ اگر یہ کوشش کی گئی تو ایسے الفاظ اپنی موت آپ مر جائیں گے اور کوئی ان کی موت پر رونے والا بھی نہ ہوگا۔

زبان کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ایک خاصہ ہوتا ہے اس کی ایک گھٹی ہوتی ہے ایک سرشت ہوتی ہے۔ زبانوں میں لفظ عمداً نہیں گھسیڑے جا سکتے۔ خبردار ایسی کوشش نہ کرنا لیکن برا ہو زبان کا اس نے وائرلیس سیٹ کی بجائے لفظ ریڈیو کو پکا کر دیا۔ ریڈیو لوکیٹر کی بجائے ریڈار کا سکہ چالو کر دیا۔ براڈ کاسٹ کے بجائے ٹیلی کاسٹ کو بیہودہ اور مہمل اور بے معنی قرار دیا گیا۔ لیکن ٹیلی کاسٹ مونچھ پر تاؤ دے کر انسانی تماشا گاہ کا امام سی بن گیا۔ انگریزی کے پنڈتوں نے بہ آواز بلند کہا دوستو بچری۔ سلاٹر اور Massacre جیسے قدرتی الفاظ کے مقابلے میں تمہارا جینوسائیڈ نہیں چلے گا اس کے استعمال سے باز آ جاؤ۔ ایک۔ سٹرائیک۔ مارچ اپون جیسے شدہ الفاظ چھوڑ کر نہ اپناؤ یہ ٹکسال باہر کا لفظ ہے زبان زد عام نہیں ہوگا لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ یہ اور ایسے سینکڑوں الفاظ دندناتے ہوئے آئے اور جدید انگریزی کا ایک حصہ بن گئے۔ پرانے الفاظ ڈکشنری کی گود میں سو گئے اور نئے الفاظ زبان اور بیان کے تار پر سرکس کی لیڈی کی طرح اٹھلاتے ہوئے چلنے لگے۔ میں ٹھیک سے عرض نہیں کر سکتا کہ وہاں زبان کے پنڈتوں اور قواعد دانوں کا اب کیا حال ہے لیکن ادھر سے جو پرچے اور رسالے آتے ہیں ان میں اب زبان کے اپنے ایک مزاج اور ہسٹاریکل پروسیس کا اتنا بہت چرچا نہیں ہوتا۔

اصل میں ایک سادہ عام فہم اور آسانی سے سمجھی جانے والی زبان کو جنم دینا اب ان لوگوں کے

اختیار میں ہے جن کے قبضے میں الیکٹرونکس کی دنیا ہے اور جو ماس میڈیا کے مالک ہیں۔ ادیب شاعر، قواعد دان سکرپٹ رائٹر ایسے سکے ڈھال ڈھال کر تو دے سکتا ہے لیکن انہیں ایجاب وقبول کی منڈی میں چالو نہیں کروا سکتا۔ یہ کام ماس میڈیا والوں کا ہے اور ماس میڈیا کے پروہت اسی صورت میں عوام کو سمجھ میں آنے والی زبان عطا کر سکتے ہیں۔ جب انہیں اس بات کا خوف نہ رہے کہ عوام ان کی بات سمجھ کر اور ان کا علم سیکھ کر ان کے حاکم نہیں بن جائیں گے۔ بلکہ بدستور عوام ہی رہیں گے۔

میری بات آج تک کسی نے مانی نہیں اور مجھے اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کہ میری کوئی بات ماننے کے قابل ہوتی ہے لیکن آرزو کرنا تو آئین بندگی کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب کافی وقت گزر گیا ہے اور تھوڑی رہ گئی ہے اب اردو کے اور علاقائی زبانوں کے درمیان تازہ کرائی دینا چاہیے۔ کون جانے پھر ہم میں سے کسی کو وقت نہ ملے اور یہ بہنیں آپس میں روٹھی روٹھی فوت ہو جائیں۔

''عظمت کا راز''

محترمی پرنسپل صاحب' معزز اراکین سٹاف اور جوان ہمت طالب علموں!

جب مجھے آپ کے قادری صاحب نے لاہور پہنچ کر اس بات کا حکم دیا کہ میں ان کے کالج میں آؤں اور طلبہ سے خطاب کروں تو مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ میرے بچپن کی یادیں بہت تازہ اور بے حد خوشگوار ہیں اور اب انہیں بار بار یاد کرنے پر میں کچھ ایسی خفت محسوس نہیں کرتا کیونکہ میرے موجودہ سوشل سٹیٹس نے میرے والد کے چھوٹے سے پست قد کے سٹیٹس پر ایک بہت بڑا اور رنگدار تمبو تان رکھا ہے اور میں نے اپنے خاندان کے چھوٹے پن کو اپنی شخصیت کی آبشار سے کھینچ کھینچ کر ایک گلریز وادی میں منتقل کر دیا ہے.....آپ کو شاید تجربہ نہیں اور یہ بات شاید آپ کے مشاہدے میں بھی نہیں آئی کہ چھوٹے لڑکے اور کم عمر کاکے حجامت بنوانے سے بہت ڈرتے ہیں اور نائی کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگتے ہیں۔ اب بھی اگر آپ کبھی اتوار کے روز ہمارے گھر تشریف لائیں تو دیکھیں گے کہ لان میں ٹین کی کرسی پر نانسے کی قمیص پہنے ہماری علاقے کا نائی اخبار پڑھا کرتا ہے اور میری بیوی ہاتھ میں سرکنڈا لے کر اپنے بچوں کو تلاش کیا کرتی ہے جو حجامت بنوانے کے خوف سے پڑوسیوں کے گیراج میں جا چھپتے ہیں اور پڑوسیوں کی مرغیاں ان کی باڑوں میں کڑ کڑانے لگتی ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ہمارے پڑوسیوں کے پاس کار نہیں ہے اور ان کے گیراج میں ان کی بھوری بھینس کا بھوسہ اور بنولے رکھے ہوتے ہیں اور اس بھوسے میں ان کی مرغیاں انڈے دیا کرتی ہیں۔ جب میرے بچے حجامت بنوانے کے خوف سے اس گیراج میں جا چھپتے ہیں تو مرغیوں کو وہاں سے اسی طرح نکلنا پڑتا ہے جیسے محکمہ آبادکاری کے ایک نئے حکم کی رو سے احمد کا مکان محمود کے نام منتقل ہو جاتا ہے.....جب میں چھوٹا تھا تو ہمارے گاؤں میں کلو نائی جمعہ کے جمعہ ہم بھائیوں کی حجامت بنانے آیا کرتا تھا اور اپنے دونوں زانوؤں میں فرداً فرداً ہمارے سر داب کر کند چھری سے ہمیں ذبح کیا کرتا تھا اور میرے والد چمنے سے منڈھے ہوئے ایک بڑے مونڈھے پر بیٹھ کر اپنے جگر گوشوں کو کلو نائی کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ وہ خوش اس لیے

ہوتے تھے کہ ان کے دل کی دبی ہوئی حسرتیں کلو نائی کے ہاتھوں پوری ہوتی تھیں اور ہمارے سامنے آ کر اس لیے بیٹھتے تھے کہ ہماری والدہ کا حکم تھا کہ جب تک بچوں کی حجامت بنا کرے وہ مونڈھے پر بیٹھے رہیں اور ابا مرحوم چونکہ والدہ سے بہت ڈرتے تھے اس لیے یہ ڈیوٹی دینے پر مجبور تھے۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ میری ماں نے اپنے سسرال میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ خان صاحب بہت سخت طبیعت کے آدمی ہیں اور ان کے غصے کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ ویسے میرے ننھیال اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کی بٹی کا خاوند کہنے کار اور تابع فرمان ہے..... خدا کا شکر ہے کہ دونوں خاندان ساٹھ باسٹھ برس تک ایک طویل غلط فہمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت ہی خوش رہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم سب بھائیوں کو کلو نائی سے بڑی نفرت تھی اور ہم اپنے اپنے طور پر اسے قتل کرنے کی مناسب اور سہل ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ مجھے حجامت بنوانے سے اس قدر چڑ نہ تھی جس قدر حجامت ہو چکنے کے بعد کلو نائی کے ہاتھوں ذلیل ہونے کا قلق تھا۔ وہ حجامت بنا چکنے کے بعد ایک چھوٹا شیشہ میرے ہاتھ میں دے کر ایک بڑا شیشہ میری گدی کے پیچھے خود تھامتا اور پھر کہتا۔ ''میاں جی ذرا اپنے چھوٹے شیشے میں بڑے شیشے کا عکس دیکھئے اور ملاحظہ فرمایئے کہ اب آپ کے سر کی گولائی کیسی نکلی ہے۔''

مجھے جب بھی اچھی طرح سے معلوم تھا اور اب بھی معلوم ہے کہ میرے سر کی ساخت میں کلو نائی کو کوئی دخل نہیں تھا لیکن مجھے اس کے آئینہ دکھانے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ نہ میں آئینہ دیکھنے کا خواہش مند تھا نہ مجھے اپنا سر دیکھنے کی آرزو تھی نہ مجھے گولائی ناپنے کی تمنا تھی پھر بھی وہ آئینہ لے کر کھڑا رہتا تھا اور مسکرائے جاتا تھا۔ ہر ہفتے مسلسل اپنا سر دیکھ دیکھ کر مجھے کدو سے ایسے نفرت ہوئی کہ اب تک مجھے اس سبزی سے گھن آتی ہے۔

چنانچہ جب آپ کے قادری صاحب کا حکم ملا کہ مجھے آپ سے خطاب کرنا ہوگا تو میں سوچ میں ڈوب گیا کہ میں ایک پڑھی لکھی ذہین فطین اور تعلیم یافتہ نئی جنریشن کے سامنے جا کر کیا کہوں گا یا کیا کہہ سکوں گا..... میں نے بیوی سے مشورہ کیا تو اس نے رائے دی کہ اس کے سٹیج پلے کا کوئی اچھا سا ٹکڑا لڑکیوں کو سنا دیا جائے۔ میں اپنے خوف کے مارے اس کے سامنے تو کچھ نہ بولا لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ لڑکیوں کو دو دونی کا پہاڑہ سنا دوں گا پر اس کی لکھی ہوئی چیز کا حوالہ نہیں دوں گا۔ دراصل میری بیوی بھی کلو نائی کا دوسرا روپ ہے۔ وہ اپنے ڈراموں کا آئینہ لے کر ہر وقت میرے چہرے کے آگے پیچھے رکھ کر میرے نتھنوں میں دھواں دیا کرتی ہے کہ ذرا ان میں اپنا عکس ملاحظہ کیجیے۔

کل میں نے شہر کے اخباروں کو بغور دیکھا کہ شاید ان میں سے کوئی رمز ایسی مل جائے جس سے آج کی تقریر کا ڈول ڈالا جا سکے لیکن ان میں سوائے اسلامی زندگی اختیار کرنے اور اسلامی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے علاوہ اور کوئی تلقین نہ تھی۔ ہر شخص دوسرے شخص سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم اسلامی طریق کو اپنا لو تو تمہارا بیڑا پار ہو جائے گا اور اس ملک کی حالت سنور جائے۔ میں نے بھی آپ کے لیے دو صفحے کی تقریر اسلامی طرز پر

تیار کی اور تاریخ اسلام لائبریری سے نکلوا کر اس میں سے چند واقعات نوٹ کر کے اپنے مضمون کو چمکایا۔ جب میرے پی اے نے مجھے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ اس قدر انہماک سے کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بہت متاثر ہوا اور اپنے شوق سے تین کتابیں اور لائبریری کی الماری سے نکال لایا۔

ان کتابوں کے ساتھ اس نے میری پاس بک بھی میرے سامنے پیش کی کہ ابھی ابھی بینک سے آئی ہے۔ آپ اسے دیکھ لیجیے۔ پھر میں اسے سیف بکس میں رکھ لوں گا۔ میری پاس بک میں دو ہزار سات سو چھیالیس کی رقم جمع تھی۔ اس کے آگے پینتیس روپے بہتر پیسے مزید کریڈٹ ہوئے تھے۔ یہ پیسے میں نے ہرگز جمع نہیں کرائے تھے خود بخود میرے نام جمع ہو گئے تھے۔ بینک والوں کی اس بے وقوفی پر میں جی ہی جی میں بہت خوش ہوا اور اپنے پی اے سے کہا" شریف الدین غور سے دیکھو یہ بینک والے بھی کیسے جاہل ہیں کسی اور کی رقم میرے نام کریڈٹ کر دی۔" اس نے پاس بک کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "نہیں سر یہ غلطی نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کے پیسے ہیں۔ پچھلے سال کی سود کی رقم ہے جو آپ کے حساب میں جمع ہوئی ہے۔" میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ "اچھا بابو ٹھیک ہے تم جا کر اپنے کمرے میں ٹیلی فون پر بیٹھو۔" وہ چلا گیا تو میں نے اپنے مضمون کو دیکھا جو میں نے آپ کے لیے لکھا تھا۔ آخری فقرہ تھا جب تک ہم اسلام کی بتائی ہوئی راہ پر نہیں چلیں گے اور حضورؐ کے ارشادات کی پیروی نہیں کریں گے اس وقت تک ہماری حالت وہی ہوگی جو دھوبی کے کتے کی تھی کہ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا..... چونکہ اس وقت میرے کمرے میں اور کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے زیادہ نیک نیتی سے سوچنا شروع کیا۔ میری زندگی میں اور سب کچھ ہے لیکن اسلامی شعار کا نشان تک نہیں۔ میرے قول اور فعل میں اپنے مذہب کا تصور دور دور تک نظر نہیں آتا۔ میری سوچ میں اسلامی آئین کا کوئی دخل نہیں۔ اگر مجھے اس مذہب سے کوئی مناسبت ہے تو فقط اتنی ہے کہ میرا نام مسلمانی طرز کا ہے۔ بس اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ میں نے آج تک مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پیشتر مزدوری نہیں دی' حتی الوسع یہی کوشش کی ہے کہ اس کی مزدوری بھی نہ دوں اور کسی نہ کسی طرح سے باتوں کی پھونکیں مار مار کر اس کا پسینہ بھی خشک کر دوں۔ جس کوٹھی میں میں رہتا ہوں اس کا سرونٹس کوارٹر میں گڑگانواں کے مہاجر بستے ہیں۔ میرا اپنے ہمسائیوں سے محبت کا بس یہی سلوک ہے کہ جب میرے لان میں پانی لگایا جاتا ہے تو ان کے نلکے سے سوں سوں کی صدا نکلنے لگتی ہے۔ میرے لان میں دن رات پانی لگتا ہے اور گڑگانواں کے مہاجروں کے نل سے دن رات آہیں نکلتی رہتی ہیں۔ سال میں دو نمازیں ایک بڑی عید اور ایک چھوٹی عید کی پڑھتا ہوں۔ وہ بھی اسی وجہ سے کہ عید کے بعد کچھ بڑے بڑے لوگوں سے گلے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے اس سے تعلقات بڑھنے کا امکان ہے۔ پھر کچھ چپڑاسی مالی اور چوکیدار قسم کے لوگ بھی عید گاہ میں آئے ہوتے ہیں۔ ان سے گلے مل کر دوسروں پر اچھا اثر پڑتا ہے کہ اتنا بڑا افسر ہو کر غریبوں سے بھی کس خلوص سے ملتا ہے۔ روزہ رکھنے کی توفیق مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ پچھلے سال ڈائٹنگ کی غرض سے میری بیوی نے زبردستی گیارہ روزے رکھوا دیے تھے۔ نہ وزن کم ہوا نہ ثواب ملا.....

میرے اور میرے ہم وطنوں کے درمیان دوری کی ایک بڑی گہری اور بے حد چوڑی خلیج واقع ہے۔ میں نے اسے کبھی عبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا لارڈ کلائیو ہوں۔ سونیٹوز کے ملک میں خوش فکری کے چند ایام بسر کرنے آیا ہوں..... ہاں اگر اپنی اس زندگی میں میں نے کوئی نیکی کی ہے تو ایک یہی کہ میں نے وہ مضمون پھاڑ دیا جو میں نے آپ کو اسلامی شعار اور اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کے طور پر لکھا تھا۔

میں آپ سے کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ نہیں۔ میں ماضی کا ایک کانوں بھرا لیکر ہوں اور آپ مستقبل کے سرسبز و شاداب سرو سمن ہیں۔ آپ کے ساتھ میری اور میرے ساتھیوں کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی جب میں آپ کو ٹیڈی لباس پہنے اور ہپی کی طرح بال بڑھائے دیکھتا ہوں تو آپ کے بزرگوں کی طرح آپ پر تنقید نہیں کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں ایک مخلص اور گرم رفتار دل دھڑکتا ہے اور آپ کے دل میں پاکستان کے لیے وہ محبت اور عقیدت موجود ہے جو ہم جیسے لوگوں کا مقدر نہ بن سکی۔ جب تک چھ ستمبر کے دن آپ اپنے اسی لباس میں شیر کی طرح دھاڑ سکتے ہیں اور برق کی طرح لپک سکتے ہیں۔ میں آپ سے کم تر ہوں۔ آپ سے چھوٹا ہوں اور آپ سے گھٹیا ہوں۔ خواہ میں سر پر عمامہ پہنوں کندھے پر خانے والا رومال رکھوں سارے جہاں کی بولیاں بولوں اور اپنی آنکھوں میں جادو کا سرمہ لگا کر ہر ایک کے ساتھ مٹکاتا پھروں۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے اور میں تحادمت حماد ماغ آپ کے سامنے خالی فقرے اور تھوتھے الفاظ کے گھنگھرو لے کر آ گیا ہوں۔

میں آپ سے کیا کہوں۔

لیکن ایک بات ہے.....اور وہ بات کرنے سے پہلے مجھے دوسری بات کر لینے دیجیے کیونکہ ہر دوسری بات پہلی بات سے اچھی ہوتی ہے اور اس سے پہلی بات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک بی بی پسرورن رہتی ہیں.....ساٹھ سال سے تین چار سال اوپر ان کی عمر ہو گی۔ بڑے تن و توش اور ٹھسے کی بزرگ خاتون ہیں۔ سر کے سارے بال سپید ہیں.....سفید رنگ کا لباس پہنتی ہیں۔ آنکھوں پر موٹا چشمہ..... ہاتھ میں چھڑی لے کر صبح و شام سیر پر نکلا کرتی ہیں۔ ان کے لڑکے لڑکیاں سب پڑھے لکھے اور اونچے عہدوں پر سرفراز ہیں۔ پوتے مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ پوتیاں کالجوں میں پڑھتی ہیں شاید ایک دو یہاں بھی ہوں..... بی بی جی ان کے درمیان یوں رہتی ہیں جیسے چوروں کے درمیان گندھی ہوئی کلغی والی مرغی.....میں ان کو سیر کرتے دیکھتا ہوں تو موٹر روک کر انہیں سلام ضرور کرتا ہوں.....وہ دعا دیتی ہیں۔ میرا اور میرے بیوی بچوں کا حال پوچھتی ہیں اور پھر میری ذہانت اور قابلیت کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ میرا ابھی انہیں سلام کرنے کا بیشتر مقصد یہی ہوتا ہے کہ ذرا ان کے منہ سے اپنی تعریف سنوں.....ابھی چند دنوں کی بات ہے انہوں نے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا: ''بیٹا یہ ویٹ کا نگ کون ہیں

اور جنوبی ویت نامی کون ہیں۔ اور کون اپنے ملک کی آزادی کے لیے جنگ کر رہا ہے اور سارا چکر کیا ہے۔ میں اپنے مقصود سے اس لیے نہیں پوچھتی کہ وہ میرا مذاق اڑائے گا کہ بی بی جی پچھلے چھ سال سے باقاعدہ اخبار پڑھ رہی ہیں لیکن ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ویت نام کی جنگ کا پس منظر کیا ہے اور پیش منظر کیا؟'' مجھے ان کی بات سن کر بے انتہا خوشی ہوئی..... میری کتنی ہی بھانجیاں اور بھتیجیاں کالجوں سکولوں میں پڑھتی ہیں لیکن کسی نے آج تک مجھ سے ایسا سوال نہیں پوچھا۔ میں نے جلدی جلدی ہند چینی کی تاریخ پر مختصر سی روشنی ڈالی۔ بی بی جی کو ان کے سوال کا مختصر سا جواب دیا اور ان کی تسلی ہو چکنے کے بعد اپنے دفتر چلا آیا۔ ان کے اس ایک سوال نے اور بہت سے سوال میرے ذہن کی جھولی میں لا ڈالے اور میں سوچنے لگا اس سے اس قدر مرعوب ہوں وہاں اس پود سے مجھے ایک شدید شکایت بھی ہے اور وہ یہ کہ معلومات عامہ میں ان کا دامن بالکل خالی ہے اور انہوں نے بی بی جی کی طرح کبھی اپنا دامن بھرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دولڑکے اور ان کے دو دوست اور ان کے ساتھ ان کے تین چار اور دوست پہروں ایک دوسرے کے ساتھ سوٹوں کی سینما آرٹسٹوں کی اپنے محبوبوں کی گفتگو کر سکتے ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن ان کی گفتگو میں پل بھر کو بھی اپنے ملک اپنے ملک کے باشندوں اور اپنے ملک کے حالات اپنے ملک کی معیشت اور دنیا کے دوسرے انسانوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ کسی لڑکے کے دل میں وہ جذبہ نہیں ہے جو بی بی پسرورن کے عمر رسیدہ دل میں موجود ہے۔ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں سطحی طور پر پڑھتے ہیں اور جس قدر علم حاصل کرتے ہیں بس یونہی تفریحاً حاصل کرتے ہیں۔ آپ کے علم کے اور آپ کے گردوپیش کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اگر کبھی آپ ایک سامع کی حیثیت سے کسی درسگاہ کے طالب علموں کو غور سے سنیں تو صبح سے شام تک اس گفتگو میں آپ کو کوئی ایسی بات سنائی نہیں دے گی جس کا ہماری تہذیب سے..... ہماری تہذیب کے پرانے سوتوں سے ہمارے حال سے اور ہمارے مستقبل سے کوئی تعلق ہو۔ یہ بڑے قلق کی بات ہے۔

یاد رکھیے کسی ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا دارومدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس ملک کا مالیہ کس قدر ہے یا اس کے ریونیو میں ہر سال کیونکر اضافہ ہوتا ہے۔ نہ کسی ملک کی برتری کا راز اس کی فوجی اور عسکری طاقت میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی کسی ملک کی خوبصورت بلڈنگوں اور دلکش باغوں سے اس کے عظیم ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کی برتری خوشحالی اور عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس کی اکثریت زیادہ تعلیم یافتہ' زیادہ تربیت یافتہ اور زیادہ صاحب دماغ لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کے درمیان استادوں' علم کی دولت عام کرنے والوں صاحب سیرت اور صاحب کردار لوگوں کے گروہ زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ آپ بڑے شوق سے تنگ پتلونوں' کھلے کفوں' لمبے بالوں' پریشان زلفوں' ایکٹروں کے دنوں ایکٹرسوں کی راتوں اور اپنے دولت مند ماموؤں اور اپنے افسر چچاؤں کی باتیں کیجئے' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک نظر اندرون شہر کی ان گلیوں پر بھی ڈال لیا کیجیے جہاں میرے اور آپ کے والدین پیدا ہوئے تھے۔

جہا ہماری نانیاں اوردادیاں سوت کاتا کرتی تھیں اورازار بند بنا کرتی تھیں۔ جہاں اب بھی انسان بستے ہیں اور حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کررہے ہیں۔ جن کے رہن سہن جن کے طرز زیست اور ہمارے رہن سہن اور طرز زیست کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہے۔ جو ہم میں سے ہیں لیکن اب ہمارے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی جب آپ کو اخبار دیکھنے کا موقع ملے تو مینی شو اور منڈے سپیشل شو کے اشتہار دیکھنے پر ہی اکتفانہ کیجیے۔ تیسرے صفحے کے مضامین یا کم ازکم ان کی سرخیاں ہی دیکھ لیا کیجیے۔ اگر کوئی خبر ساؤتھ ایسٹ ایشیا اور مشرق اوسط میں اسرائیلی جارحیت سے متعلق ہوتو اس کو بھی ایک نظر پڑھ لیا کیجیے۔ آپ کو کم ازکم اس قدر تو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے بھائی' آپ کے ماموں یا آپ کے ابو نے ولایت کے جس پرچے کے لیے سالانہ چندہ بھیجا تھا اور جو پرچہ ماہ بہ ماہ ان کو مل جایا کرتا تھا اور جس میں آپ فیشن شو کی تصویریں اور ہیئر ڈرائر کے اشتہار دیکھا کرتی ہیں وہ پرچہ اب تین تین مہینے تک کیوں نہیں پہنچتا۔ آپ کو اس تاخیر کی وجہ تو معلوم ہونی چاہیے کہ اب ولایت کی ڈاک کیپ آف گڈ ہوپ کا چکر کاٹ کر آتی ہے کیونکہ نہر سویز بند ہے اور نہر سویز اس لیے بند ہے کہ اس کے ایک کنارے پر اسرائیل کی بکتر بند فوجیں موجود ہیں اور اسرائیل ایک مصنوعی ملک ہے جسے مغربی ملکوں نے سرپر ایک خونی خنجر دے کر بٹھا رکھا ہے۔ اور اس خنجر بکف ملک نے چاردن کی یلغار میں عربوں سے ان کا سینائی ڈیزرٹ چھین کر ان کی شہ رگ یا سویز رگ پر اپنے دانت گڑ وادیئے ہیں۔ آپ کو یہ تو پتا ہونا چاہیے کہ عرب بہت کمزور ہیں اور مغرب بہت شہ زور۔ اور یہ کمزوری اور شہ زوری کیوں ہے اور آپ کے ابو یا بھائی یا ماموں کی ولایت سے آنے والی ڈاک اب کیوں اس قدر دیر سے آتی ہے۔

آپ کے یہاں اتنے بڑے وسیع و عریض کالج میں اور اس کی خوبصورت بلڈنگ کے اندر اور اس کی دلآویز لانوں میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے یا دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے یا گھاس پر لیٹے ہوئے کبھی کبھی آپ کی گفتگو کا دھارا اس رخ بھی بہنا چاہیے کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور اس کو اپنی خوراک کی ضرورت پوری کرنے کے لیے باہر سے اناج منگوانا پڑتا ہے اور اب اپنی زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کی جارہی ہیں اور میکسی پاک گندم کی ایک قسم ہے جس کا جھاڑ زیادہ ہے جس کا پودا چھوٹا ہے اور جس کی بالیں دانوں سے بھرپور ہیں جو تیز ہواؤں اور تند جھکڑوں کا مقابلہ آسانی سے کر لیتا ہے۔ جب آندھیاں چلتی ہیں تو میکسی پاک کا چھوٹے قد کا پودا کھیت میں لیٹ نہیں جاتا اور اس کے دانے ضائع نہیں ہوتے اور جب اس کے دانے ضائع نہیں ہوتے اور اس کا جھاڑ دوسری گندم سے دوگنا ڈھائی گنا ہے تو ہمارے یہاں خوراک کا مسئلہ کسی حد تک حل ہونے کی امید بندھتی ہے یا نہیں بندھتی۔ اور اس کے بارے میں آپ کی خالص آپ کی سوچ کیا کہتی ہے۔

میری آرزو ہے کہ کبھی کبھی آپ کی گفتگو کی کشتی بھٹک کر اس موضوع کے کنارے پر بھی آلگا کرے کہ کالا باغ میں لوہے کا جو عجوبہ ملا ہے وہ کس نوعیت کا ہے اور اسے فولاد بنانے میں ہمیں کن کن مشکلات کا

سامنا کرنا پڑے گا۔ تربیلا ڈیم پر کس قدر لاگت اٹھے گی۔ یہ منصوبہ کب پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ اس کا ٹھیکہ لینے میں جرمن اور اطالوی فرموں کو کس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دینا پڑا اور ان کی اس شراکت کے پیچھے اور کس بڑے ملک کے مفادات پوشیدہ ہیں۔

میری تمنا ہے کہ آپ نٹ بال کھیل کر یا ٹینس کے دو سیٹ اگا کر یا والی بال کی گیم کے بعد پسینے میں شرابور گھاس پر بیٹھ کر اپنے اردگرد بھی نگاہیں دوڑائیں اور اپنے کسی دوست اسلم، مسعود، اقبال، رفیق یا نوردین سے یہ بھی پوچھیں کہ یہ سارا کاروبار کیسے چل رہا ہے۔ ہم کہاں ہیں۔ ہمارے مستقبل میں سیاہ بادل کہاں ہیں اور روشنی کی لکیریں کس طرف ابھرنے والی ہیں اور ہمارے ملک میں.....ہمارے ملک کے اندر اور ہمارے ملک کے اردگرد.....لیکن معاف کیجیے گا شاید یہ ساری باتیں مجھے آپ سے اس دیدہ دلیری کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے تھیں.....میں معذرت چاہتا ہوں اور آپ سے شرمندہ ہوں کہ میں بھی کلونائی کی طرح آئینہ لے کر آپ کے کالج میں آ گیا ہوں۔

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کی پرنسپل صاحبہ کو آئندہ پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ مقررین کو اپنے کالج میں بلانا چاہیے۔ مجھ جیسے کلونائی کو نہیں.....اگر آپ کے کالج میں آج کلونائی آ گیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں آپ کی پرنسپل صاحبہ کا ہے۔ میرے چلے جانے کے بعد ان سے جواب طلبی کیجیے اور میرے آنے پر شدید احتجاج کیجیے..... مجھے بڑی خوشی ہوگی.....شکریہ.....

آپ شوق سے ٹیوٹنگ کیجیے۔ ہنگاموں میں حصہ لیجیے۔ جلسے آراستہ کیجیے۔ اپنے کالج کے سارے شیشے توڑ دیجیے بلکہ میں تو کہتا ہوں میری کار چھوڑ کر پاکستان میں لگے ہوئے سارے شیشے توڑ دیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن بھیڑ نہ بنئے۔ گلے میں شامل ہو کر دوسری بھیڑوں کے ساتھ ممیانے کی کوشش نہ کیجیے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ خدا نے آپ کو سمجھ دی ہے۔ درسگاہ نے آپ کو علم سے نوازا ہے۔ ہر معاملے کی پڑتال کیجیے۔ تین گھنٹے اس کا بغور مطالعہ کیجیے۔ سارا مواد اکٹھا کیجیے۔ اس کو ایک ایک کر کے ذہن اور نگاہ کی چھلنی سے نکالیے۔ پھر کسی سے کہیے چلئے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں بھی اس ہنگامے میں حصہ لیتا ہوں کیونکہ میں نے اس کو جانچ آ تک لیا ہے اور پرکھ لیا ہے۔

خالق اور مخلوق کی شکر گزاری

شکر گزاری کے موضوع پر بات کرنے کے لیے خاص طور پر رحمت اور عنایت سے لبریز ان دنوں میں کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو شفقت اور محبت میں رچا ہوا اور دلنوازی کے سلیقے میں بندھا ہوا ہوتا لیکن بعض اوقات چھوٹے لوگوں سے بڑی توقعات بھی وابستہ ہو جاتی ہیں اور اگر خدا کی مدد شامل حال ہو تو یہ توقعات پوری بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن اس عہد کے محقق مدقق اور نکتہ آفرین اور نکتہ چیں شخص سے شکر گزاری کی توقع رکھنا ایک بہت ہی بڑی توقع اور بہت ہی انہونی سی بات ہے' کیونکہ وہ اس نعمت سے کٹی کاٹ کر خود ہی دور ہو گیا ہے۔

سامعین کرام اور حاضرین گرامی! اگر آپ مجھے زبان و بیان اور عربی ذخیرہ الفاظ کا دریچہ کھولنے کی اجازت دیں تو میں یہ نئی اور انوکھی بات آپ کی خدمت میں پیش کروں گا کہ شکر کی ضد کفر ہے۔ جس طرح دن کا الٹ رات اور اندر کا الٹ باہر اور کڑواہٹ کا الٹ مٹھاس ہے اسی طرح شکر کا الٹ کفر ہے۔ جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں۔ اب نعمت کو یا نعم کو یا مہربانی کو بھلا دینے والا یا اس کو چھپانے اور پوشیدہ رکھنے والا یا اس کا ذکر نہ کرنے والا کس کیٹیگری سے متعلق ہوا یہ ایک بہت ہی دل بوجھل کرنے والی بات ہے جس کا ذکر ایسے بابرکت دن میں کرتے ہوئے اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے۔

آج کا دن چونکہ خوشیوں شادمانیوں' مسرتوں اور روشنیوں اور خوشبوؤں کا دن ہے' اس لیے آج کے حوالے سے ہم شکر گزاری کی وادی میں بروق گھاس کی طرح زندہ رہیں گے اور بقیہ زندگی اس کی چاکری میں گزاریں گے جس نے ہم کو شکر گزار ہونے کا علم عطا کیا اور شکر گزاری کے طریقوں سے آشنا فرمایا..... کہتے ہیں بروق ایک خاص قسم کی صحرائی گھاس ہوتی ہے جو ہلکی سی بارش سے بلکہ ذرا سی نمناک ہوا قریب سے گزر جانے پر ہری بھری ہو جاتی ہے اور لہرا لہرا کر جھوم جھوم کر ہلکی سی برکھا اور بے نام سی نمی کی کرپا پر رقص مروت میں مصروف ہو جاتی ہے اور اپنی چند روزہ زندگی کو مجسم شکر گزاری بن کر گزار دیتی ہے۔ عرب ممالک کے پرانے لوگ اب بھی کسی کی حد درجہ تعریف کرتے وقت جب اسے برتری اور عظمت کا آخری سرٹیفکیٹ دیتے ہیں تو یہ

ضرور کہتے ہیں کہ "وہ شخص بروق گھاس سے بھی زیادہ شکرگزار ہے" وہ تو لہرا لہرا کے اور جھوم جھوم کے اور اعلان کرکر کے اپنے محسن کا شکرادا کرتا ہے۔

خواتین وحضرات! جس کسی قوم یا معاشرے میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو سب سے پہلے وہ قوم شکرگزاری کے جذبات سے عاری ہوجاتی ہے۔ وہ زبانی طور پر "تھینک یو" مہربانی۔ شکریہ سے لے کر عملی طور پر کسی دوسرے کے احسان اور کرم کا بدلہ چکانے سے محروم ہوجاتی ہے اور زندگی کی سرسبزیوں میں کلر اور سیم جیسے کوڑھ اتارنے لگتی ہے۔ معاشرہ ناشکرگزاری کی ترشی سے دودھ کی طرح پھٹنے لگتا ہے اور لوگ گو جغرافیائی طور پر ایک ہی خطے کے اندر رہتے ہیں لیکن ان کے درمیان یگانگت محبت مودت اور مروت نہیں رہتی اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ اتنے سارے دشمنوں کا ایک ہی مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر قریب ہوکر بسنا کس قدر خوفناک ہوسکتا ہے اس کا اندازہ آپ آسانی کے ساتھ لگا سکتے ہیں.....اور یہ بات تو آپ مجھ سے بہت بہتر طور پر جانتے ہیں کہ جب شیطان نے خدا سے یہ کہا تھا کہ تیرے بندے تیرے حکموں کی نافرمانی کریں گے اور تیرا کہا نہیں مانیں گے تو اس نے یہ کہا تھا "اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا".....اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جزا دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ

"ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے"

یا

"اور جب تمہارے پروردگار نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر شکر کروگے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکرگزاری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔"

یا یہ کہ

"اگر ناشکری کروگے تو خدا تم سے بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر شکر کروگے تو وہ اس کو تمہارے لیے پسند کرے گا۔"

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔"

پھر فرمایا:

"کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔"

ارشاد ہوا:

"اور خدا کو قرض حسنہ دو۔"

اور خدا کو قرض حسنہ دینے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا طریق یہ سمجھایا گیا ہے کہ:

"تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی

سے بے قرار ہے۔"

اب اللہ جب اپنی بھلائی کے عوض بھلائی کا طلب گار ہوتا ہے تو وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی کا متمنی ہے۔

اور جب وہ ہم سے قرض حسنہ مانگتا ہے تو اپنے بندوں کے لیے طلب فرماتا ہے اور بزرگان دین کہتے ہیں کہ جب کسی محتاج کو کچھ دو تو اس کا شکریہ ادا کرو اور اس کی مہربانی کی علی الاعلان توصیف کرو کیونکہ یہی تو وہ شخص ہے جس نے آن واحد میں تم کو ایک معمولی انسان سے داتا بنا دیا ہے ایک عام آدمی کو سخی بنا دیا۔ اصل میں جب تک انسان کا شکریہ ادا نہیں ہوگا' خدا کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ زبانی کلامی انسان کا شکریہ تو ادا ہو جاتا ہے لیکن خدا کا نہیں ہو پاتا۔ خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے اس کی نعمت کو Share کرنا ضروری ہے۔ بندے کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کا دل راضی کرنا ضروری ہے۔ اس کو یہ تقویت عطا کرنا ضروری ہے کہ وہ ہمارا لگتا ہے اور ہمارے بہت ہی قریب ہے اور ہم اس کی اس مہربانی پر حال میں بھی خوش ہیں اور مستقبل میں بھی اس کے شکرگزار رہیں گے۔ ہم اس کی بدولت آسانی سے ہمکنار ہوئے ہیں اور ہمیں اس کی وجہ سے سہولت میسر آئی ہے اور جس طرح سے اس نے ہمارے ساتھ بھلائی کی ہے' ہم بھی اس کے لیے بھلائی کے طلب گار ہیں۔

دراصل نیکیوں کی بنیاد اور نیکیوں کا منبع شکرگزاری اور آئین دلنوازی ہے۔ جن لوگوں میں شکرگزاری کا جذبہ ہوتا ہے وہ عظیم لوگ ہوتے ہیں اور انہی عظیم ہستیوں کا فرمانا ہے کہ اگر انسان کا ارادہ شکرگزار ہونے کا ہو تو وہ یقیناً ہو سکتا ہے اور جس بستی میں شکرگزاری کی رسم چل نکلتی ہے اس بستی کے لوگ خدا کو قرض حسنہ بھی دینے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ بھلائی بھی کرنے لگتے ہیں..... میرے بچپن کے زمانے میں ہمارے قصبے کے اندر ایک بابا نمدارا ہوا کرتا تھا جو سرسوں کے تیل کی ایک کپی بھر کر کوچہ و بازار میں گھومتا رہتا اور جہاں کوئی چیختا چلاتا' خشکی زدہ دروازہ یا مشکل سے کھلنے والی کھڑکی دیکھتا' وہ اس میں اپنی کپی سے تیل کے چند قطرے ڈال کر اسے چالو کر دیتا اور مسکرا کر صاحب خانہ کو ایک مجذوبانہ سلام کر کے جھومتا جھامتا وہاں سے چل دیتا۔ اس کا بس یہی کام تھا..... ایک دن ہم سکول کے لڑکوں نے اس سے اس انوکھی کارگزاری کی وجہ پوچھی تو ہنس کر کہنے لگا' بالوکو! سوکھائی اور آسانی کا تیل ہر قسم کی چیخ چنگھاڑ بند کر دیتا ہے اور مہربانی کے دو قطرے ہر طرح کے جھگڑے جھیڑے اور احتجاج کو بند کر دیتے ہیں۔ شکریہ ادا کرو شکریہ ادا کرو۔ بندوں کا شکریہ ادا کرو۔ انسانوں کا شکریہ ادا کرو۔ خدا کا شکر آپ ہی ادا ہو جائے گا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارے قصبے کا کوئی گڈا' ریڑھا' ریڑھی یا بمبوکاٹ چلتے وقت آواز نہ دیتا تھا اور انہیں کھینچنے والے جانور بھی کچی راہوں پر آسانی کے ساتھ گزرتے تھے اور ہوا سے باتیں کرتے تھے۔ یہ بابا کہا کرتا تھا پہنے تیز تیز قدم اٹھا کر "رحمۃ اللعالمین! رحمۃ اللعالمین" کی مدھر آواز میں گونجتا ہوا چلتا اور

یوں لگتا جیسے کسی بڑے سے گنبد میں بہت سے خمرے ایک ساتھ ورد کر رہے ہوں۔ کسی گفتگو یا کسی دعوے کے بغیر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈوبے ہوئے اس جیسے شخص کو میں نے آج تک کہیں اور نہیں دیکھا۔

خواتین وحضرات! اس وقت ہماری ذاتی مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا شکریہ ادا کرنے سے محروم ہو گئے ہیں اور اس بتلائی ہوئی راہ سے ہٹ کر ہم خالق اکبر کے شکر کی ادائی سے بھی بے بہرہ ہو گئے ہیں۔ یہ محرومی ناامیدی اور نامرادی کی طرف لے جانے کا ایک کھلا نشان اور کھلا راستہ ہے۔ میں آپ کے کمال تجزیہ کاری اور آپ کے فن نکتہ چینی کا دل سے قائل ہوں اور بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ آپ دلائل سے اعداد وشمار کی فراہمی سے اپنی بات بالکل صحیح طریق پر منوا سکتے ہیں لیکن ایسی شدید نکتہ چینی اور ایسی کڑی تنقید اور ایسا خوفناک احتساب جو ہم اپنے ساتھیوں اور اپنے ہم وطنوں پر روا رکھے ہیں اس نے ہم کو شکریے کے جذبے سے کاٹ کر علیحدہ پھینک دیا ہے اور ہم سب اپنی اپنی اکائی میں منقسم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ہمیں دیئے گئے درس کے بالکل الٹ ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں بے خیالی میں ہم نے اپنے نیچر تبدیل کر لیے ہیں اور خدانخواستہ ہم ایک اور ہی راہ پر چل نکلے ہیں یا پھر ہم نے کوئی ایسا ڈائریکٹ راستہ تلاش کر لیا ہے جہاں ہم خدا کو قرض حسنہ دیئے بغیر اور اس سے بھلائی کیے بغیر اور اس کے بندوں کو اپنے ساتھ شریک کیے بغیر اس تک بلاواسطہ پہنچنے کا راز جان گئے ہیں اور ہم نے شکرگزاری کے تعلق کو کچھ ایسا مفید نہ جان کر اس ربط اور سلسلے کو منقطع کر دیا ہے۔

کل میں اس بڑے شہر کے بہت پرانے اور بہت ہی بڑے ہسپتال کے درمیان کھڑا تھا جہاں سینکڑوں مریض مختلف دروازوں سے داخل ہو کر اپنی اپنی ضرورت کے شعبوں میں جا رہے تھے۔ آنے والوں اور جانے والوں میں سے ہر کسی کی زبان پر شکوے کی ایک لمبی داستان تھی۔ میں خدانخواستہ یہ نہیں کہتا کہ وہ لوگ غلط تھے یا بے صبرے تھے یا ضبط ونظم کے خلاف تھے اور شکوہ کناں تھے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایسا ادارہ بے فیض ہو اور یہاں سے کسی کو خیر نہ پڑتی ہو تو پھر لوگ ادھر کا رخ ہی کیوں کریں۔ پچھلے ایک سو سال سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس کی طرف کیوں رجوع کر رہے ہیں اور کیوں اس کو بے مصرف جان کر چھوڑ نہیں دیتے.....

میں خدانخواستہ اس منفیانہ پروگرامنگ پر تنقید نہیں کر رہا ہوں جو ہماری روح کے اندر کمپوٹ ہو چکی ہے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی ایسا چھوٹا سا گروہ اس بڑے سے شہر میں پیدا ہو سکتا ہے جو شکر کے ہار اور شکرگزاری کی قندیلیں لے کر ان کارندوں کو تقویت عطا کر سکتا ہے۔ جو اس ہسپتال میں کام کرتے ہیں اور احساس کمتری احساس ندامت اور احساس جرم میں گھرے رہتے ہیں یا گھیر کے رکھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کام ہم جیسے طنز نگاروں، کالم نگاروں، حقیقت نگاروں اور حق پرستوں کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو بابے نمدارے جیسے لوگ ''رحمتہ اللعالمین! رحمتہ اللعالمین'' کی مدھر گونج میں ڈوبے ہوئے ہی کر سکتے ہیں۔ وہی کریں گے اور

انشاءاللہ جلد کریں گے۔ بڑے لوگوں سے احتجاج شکوہ شکایت اور تیخ چنگھاڑ نکل جائے گی۔ اور بڑے نمانے لوگوں کو تقویت عطا ہوگی۔ انشاءاللہ۔

ہم شکر گزاری اور سپاس گزاری کے دائرے سے وقتی طور پر نکلے ضرور ہیں لیکن میں رحمتوں والے کی رحمت سے کبھی بھی ناامید نہیں ہوا۔ ہم سب کو جو کچھ ہے اسی خزانے سے تو مل رہا ہے۔ یہی تو ہماری دنیا ہے اور سارے عالموں کو رحمت عطا کرنے والے کا نقش کف پا ہی تو ہماری کل کائنات ہے۔ شکریہ۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

وطن، وطن، وطن

مٹی کی خوشبو (I)

جو موضوع آپ نے لائل پور سے تجویز کر کے میرے لیے بھیجا ہے اور جس کے جواب میں میں آپ کی خدمت میں لاہور سے یہاں حاضر ہوا ہوں اس نے مجھے بڑی مصیبتوں میں گرفتار کر رکھا ہے۔ کچھ بلائیں تو ٹل گئی ہیں لیکن ابھی بہت سی ایسی باقی ہیں جن سے چھٹکارا پانا میرے اپنے بس کا روگ نظر نہیں آتا۔

حضور والا! جب آپ کا حلیم الطبع' شریف النفس اور شیریں گفتار نمائندہ لائل پور سے لاہور پہنچا تو میں ملیشیے کی شلوار اور قمیص پہنے اور اپنا گیدڑ کوٹ کندھوں پر ڈالے ساگ روٹی کھا رہا تھا۔ (میرا گیدڑ کوٹ کوئی انوکھی چیز نہیں بھورے رنگ کی سنہرے ڈورے والی پٹی کا کوٹ ہے جسے میں نے 54ء میں سلوایا تھا۔ اور اب میں اسے گھر کے اندر ہی پہنتا ہوں۔ بچوں نے اس کا نام گیدڑ کوٹ رکھ چھوڑا ہے اور یہ اب صرف میری ملکیت نہیں رہا بلکہ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس کی ایک جیب میں میری بیوی کی ہیر پنیں ہوتی ہیں دوسری میں بچوں کے انٹا چلی کھیلنے والے کاٹھے اخروٹ کھانڈ والی الماری کی چابی پرانے بجلی کے بل' میرے پھٹے ہوئے موزے' اندر کی جیب میں بچوں کی امی کی گہرے رنگ کی پرانی لپ اسٹک جو وہ ہونٹ پھٹنے پر لگاتی ہیں۔ باہر جانے والی لپ اسٹک دوسری ہے اس کا رنگ ہلکا گلابی اور پن رکھنے والی جیب میں اسپرو' کیموکوئین اور اینٹروو ائیوفارم کی گولیاں اور اندر کی چھوٹی سی نکٹ پاکٹ میں ماچس کی ڈبیا۔ جب رات کے دس بجے واپڈا والوں کی بجلی فیل ہو جاتی ہے تو اندھیرے میں چاروں طرف سے آوازیں آتی ہیں ابا کا گیدڑ کوٹ لاؤ۔ ابا کا گیدڑ کوٹ لاؤ) جس وقت آپ کا حلیم الطبع شریف النفس اور شیریں مقال نمائندہ لائل پور سے ہمارے گھر لاہور پہنچا تو میری بیوی نے کہا کہ کم از کم گیدڑ کوٹ تو کندھوں پر سے اتار جائیے وہ دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں لائل پور والوں کو کیا پتہ ہے کہ گیدڑ کوٹ اور شیر ببر کوٹ میں کیا فرق ہے۔

جب آپ کے نمائندے نے مجھ سے یہ کہا کہ مجھے اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرنا ہوگا تو مارے خوشی اور حیرت کے میری ایک چیخ نکل گئی لیکن وہ چیخ میں نے کمال چابکدستی سے اپنے سینے کے اندر چھپالی جس طرح یونین کونسل کے انتخابات میں پہلی مرتبہ کامیاب ہونے والا ممبر اپنی خوشی کا نعرہ دل ہی دل میں چھپا جاتا ہے۔

جب آپ کے حلیم الطبع، شریف النفس اور شیریں گفتار نمائندے نے مجھ سے یہ کہا کہ مجھے ''میں اور میرا فن'' کے موضوع پر پیپر پڑھنا ہوگا تو میں سکتے میں آ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے بیوی بچے، عزیز و اقارب، بوڑھی ماں سب کے سب تیزی سے گھوم گئے اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ لوگ عام طور پر کسی فنکار یا قلم کار سے اس کے اور اس کے فن کے بارے میں اس وقت استفسار کرتے ہیں جب وہ اپنی عمر کے آخری حصے کو پہنچ چکا ہو اور اب اس کے زیادہ دیر زندہ رہنے کی امید نہ ہو۔ میں آپ کے نمائندے سے معذرت طلب کر کے اندر گیا۔ وٹامن بی 12 کے دو بڑے تیچ اندر انڈیلے۔ مچھلی کے تیل کا ایک ٹی سپون فل حلق میں ڈالا اور اپنا چہرہ جوانی کی سرخی سے گلنار گوں کر کے پھر اس کے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے خدا خبر میرے چہرے کی طرف دیکھا یا نہیں۔ میرے پاؤں کی آہٹ میں شباب کی کھڑک ،وڑک کو محسوس کیا یا نہیں۔ لیکن مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اس موضوع پر کچھ لکھنے کی فرمائش نہیں کرے گا۔ انہوں نے سر جھکا کر کہا، لائل پور کے لوگ آپ کے اور آپ کے فن کے بارے میں جاننے کی بڑی آرزو رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہماری یہ درخواست رد نہیں کریں گے۔ میں نے بڑا حوصلہ نکال کے اور اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا، حضور والا مجھے آپ کی یہ دعوت قبول ہے۔ میں اسی موضوع کا کھڑاگ لے کر وقت مقررہ پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنے پانچ برس کے ناکام وفادار انشورنس ایجنٹ کو فون کیا کہ فوراً چلے آیئے۔ میں بیس ہزار روپے کی انشورنس ابھی لینے کو تیار ہوں۔ اس نے کہا اتنی رات گئے؟ میں نے کہا، میاں زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ لوگ مجھ سے میرے فن کی بابت تقریریں کروانے لگے ہیں۔

حضور والا! ہر شہر کا ایک اپنا مزاج اور ہر شہر کی ایک اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ آپ کے شہر لائل پور کا مزاج دسوتی کی طرح مستقل اور ململ کی طرح ملائم ہے اور آپ کے شہر کی خوشبو مرغ پلاؤ کی خوشبو سے ملتی جلتی ہے لیکن آپ کے شہر کا ایک نقشہ ایسا بھی ہے جو اسے پاکستان کے دوسرے تمام شہروں سے ممیز کرتا ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ لائل پور آیا تو میں نے محسوس کیا کہ لائل پور اس شہر کو کہتے ہیں جس کے گھر کے ہر دروازے پر یا کم از کم تین چار گھروں کے ایک دروازے پر سیاہ یا بھورے رنگ کی ایک بھینس بندھی ہو۔ خواتین وحضرات میں بھینس سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس کی ایک دم ہوتی ہے جو بلاٹنگ پیپر کی طرح ہر طرح کی رطوبت چوس سکتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب ہماری آنکھوں کا نور ہماری نیت عم دوا بے پر نقل مکانی کر کے لائل پور آ گئی تو ہم گارڈن ٹاؤن لاہور میں کشن لال بانزہ 9 کی کوٹھی سے لوٹی ہوئی کچے ریشم کی سفید بشرٹ پہن کر اس سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں جعلی رشک فیر کی خوشبو عام دکانوں پر دستیاب تھی۔ جب ہم اڈہ لاریاں سے اپنا خوبصورت چرمی بیگ اٹھا کر جان تمنا کے کوچے میں پہنچے تو ان کے گھر کے سامنے سردار کا

ہن سنگھ آ ہلووالیہ کی لوٹی ہوئی سیاہ بھینس بندھی تھی۔ وہ بڑے آرام کے ساتھ سیلی زمین پر بیٹھی جگالی کر رہی تھی اور محبت بھری نظروں سے اپنے گنجے کٹے کو دیکھ رہی تھی۔ ہمیں لیلیٰ کے گھر کی یہ بھینس بہت ہی اچھی لگی اور ہم نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی رفتار ذرا سست کر لی۔ جونہی ٹیڈی گرل کے بالوں کی طرح اپنی دم کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور پھر اپنے کٹے کی طرف دیکھنے لگی میں نے بھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے محبت بھری نظروں سے اس کے گنجے کٹے کی طرف دیکھا اور پھر میرے قدم رک گئے۔ کچے ریشم کی سفید دودھیا بشرٹ آرٹ کا ایک دلکش نمونہ بن چکی تھی اور میری ٹھوڑی پر سے آخری قطرہ زمین پر ٹپک پڑا تھا۔ میں نے اپنے سر میں انگلی لگا کر اسے سونگھا تو جعلی رشک فیر کی خوشبو غائب ہو چکی تھی۔ میں وہیں سے اپنا چرمی بیگ جھلاتا ہوا واپس اڈہ الاریاں پہنچ گیا۔

حضور! میں اپنے فن کے بارے میں کیا عرض کروں۔ یہ جھوٹا سچا فن ناکام کوششوں اور ناتمام آرزوؤں کا ایک لولا لنگڑا اپاہج سا رشتہ دار ہے جسے میں اپنا اس لیے نہیں سکتا یہ مفلوج ہے اور چھوڑ اس لیے نہیں سکتا کہ لوگ کہیں گے کیسا بے دید انسان ہے اپنے عزیز سے منہ موڑ لیا۔ ابتدائے ایام میں میں نے افسانے لکھنے شروع کیے۔ کئی سال تک اس فن کی دشت نوردی کرتا رہا۔ کہیں کہیں ایک آدھ نخلستان بھی ملا لیکن زیادہ تر سراب ہی میرے حصے میں آئے اور میں نے مایوس ہو کر اس میدان سے اپنا قدم نکال لیا۔ بات یہ تھی کہ کہی جانے والی اور کہنے کی باتیں بہت تھیں اور مجھے کہنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ میرے شوق کی بلندی کو میری ہمتوں کی پستی بار بار اور ہر مقام پر گائی مارتی تھی اور میری آرزو کا پتنگ بار بار کٹ جاتا تھا۔ جس طرح قصہ سنانے والے ہر داستان گو کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ سننے والے میسر آئیں اسی طرح میری بھی ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ مجھ کہانی کہنے والے کو زیادہ سے زیادہ سامعین ملیں۔ وہ محبت سے میری بات سنیں۔ نفرت سے میرا منہ چڑائیں۔ نکتہ چینی کی لمبی جھڑیوں سے میری بات کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیں اور اس اڑتی ہوئی دھند میں خوب خوب میرا ٹھٹھا اڑائیں لیکن مجھ سے دور نہ رہیں۔ مجھ سے لاتعلق نہ رہیں۔ مجھ سے اپنا رشتہ نہ توڑیں..... افسانہ نگاری کی دنیا میں یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ کوئی ہزار بارہ سو قاری ملے..... ان میں طالب علم بھی تھے نوکری پیشہ لوگ بھی تاجر بھی اور ایک آدھ انس بھی۔ گھوم پھر کر انہی لوگوں سے ملاقات ہوتی رہی اور انہی لوگوں کی آرزوؤں اور تقاضوں کے مطابق میں افسانوی برت کے گولے بنا بنا کر بیچتا رہا۔ جس بات کا تقاضا میرا اندر والا کرتا تھا یا جس کی احتیاج میرے ساتھیوں اور رفیقوں کو تھی اس کی ضرورت مجھ سے پوری نہ ہوتی تھی۔

وہ بات تو خیر اب بھی تشنۂ تکمیل ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ریڈیو کا ذریعہ اختیار کرنے کے بعد میں کسی حد تک اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے وہ ساتھی جو پڑھنے لکھنے کی نعمت سے محروم ہیں ان تک وہ بات (خواہ وہ مصلحت کے کئی پانیوں میں دھلی کیوں نہ ہو) ضرور پہنچ جاتی ہے جس کا قصد میں نے کیا ہے۔ خدا کے

لیے آپ اسے خودستائی پر محمول نہ کیجیے گا۔ حقیقت عرض کر رہا ہوں کہ ایسی بہت سی باتیں جو میں تحریر کے ذریعے قارئین تک نہ پہنچا سکا وہ زبانی اپنے سامعین تک پہنچانے میں کامیاب ضرور ہوتا ہوں۔ یہ بات الگ ہے اور یہ میرے سامعین کی بدقسمتی ہے کہ انہیں بات ہی ایسی پھسپھسی اور بے رنگ ملتی ہے کہ منفق کا باز ارنہیں لگتا۔

گو میری تمام کوششیں میری اپنی کوتاہی کی وجہ سے ناکام ہوئیں لیکن میں نے اپنے اظہار میں اس بات کی سعی ضرور کی کہ مجھے سننے والے کم از کم اصل مسئلے کی طرف توجہ دینے کی پریکٹس ضرور کریں۔ جہاں تک میرے فن کا تعلق ہے وہ مجھ سے بہت دور ہے۔ میں اسے فن کہنے سے شرماتا ہوں اور میری درخواست ہے کہ آپ مجھے تھوڑا سا شرما لینے دیجیے۔ اگر آپ مجھے اس فن کو اظہار کہنے کی اجازت دیں گے تو شاید میں زیادہ آسانی سے زیادہ کھل کر آپ سے باتیں کر سکوں گا۔ ورنہ میرے آپ اور اس فن کے درمیان حجاب کے بہت سے پردے حائل رہیں گے۔ جب میں نے ریڈیو پر حسرت تعمیر کا سلسلہ شروع کیا تو اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے ساتھیوں کو ان اندرونی مسائل کی طرف توجہ دینے کی دعوت دوں جو آہستہ آہستہ گھن کی طرح ہمارے معاشرے کو چاٹ رہے ہیں۔ جب بھارتی حملے کے بعد مجھے اسے تلقین شاہ کے نام سے نشر کرنا پڑتا تو بھی میری آرزو یہی تھی کہ پاکستان کے متعلق ان خارجی مسائل کی بابت سوچا جائے جنہوں نے عفریت بن کر ہمارے ملک کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ میں اس معاملے میں کس حد تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ آپ مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں آپ ترازو دیں گے تو میں ڈنڈی ضرور ماروں گا۔

لکھنے والے سوچنے والے اور بولنے والے کے لیے اونچی اڑان کو ایک مضبوط پر ہوتا ہے۔ یہ پر پرواز صداقت اور سچائی کا پر ہوتا ہے۔ جوں جوں اس میں قوت اور توانائی آتی ہے اڑان میں ستاروں کی رفعتیں سمٹتی آتی ہیں اور سنہرے افق اس اڑان کی اولین منزل بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھ بہت سے پر باندھ رکھے ہیں۔ یہ مانگے کے وہی پر ہیں جو کوے نے ہنس سے مانگے تھے۔ جہاں ان کو اپنے ساتھ باندھنے میں سارا قصور میرا ہے وہاں انہیں بندھوانے میں کچھ ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی سوچ کا دھارا کچھ اس رخ پر لگا رکھا ہے کہ آپ کاغذ والے کی کسی ناؤ کو اپنے بادبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ اس میں کچھ میرا آپ ہی کا قصور نہیں ہماری تربیت ہی اس طرح سے ہوئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کلکتے سے مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال نکلتا تھا۔ اس کا ایک خاص انداز اور اس کے ایڈیٹر کی زبان کا ایک خاص 'بلارا' تھا۔ حکومت انگریز کی تھی۔ ہم اس کے غلام تھے۔ الہلال حاکم پر برستا تھا۔ ہم اس سے لطف اٹھاتے تھے۔ ہماری سوچ کا دھارا ایک خاص نہج پر بہہ رہا تھا۔ پھر سوچ کے اس دھارے میں ایک اور تلاطم خیز دریا شامل ہوا۔ یہ اخبار زمیندار تھا۔ اس کی ایک بندھی ٹکی سوچ تھی۔ حاکم پر برسنے کا ایک اور انداز تھا۔

اس کے ایڈیٹر کا ایک اپنا ہی چٹخارہ تھا۔ پھر ہر پڑھنے والا اور ہر سوچنے والا اور ہر غور کرنے والا اس بات کو اپنا ایمان بنا کر بیٹھ گیا کہ حکومت پر طنز بھری تنقید کر کے وہ اپنا فرض منصبی ادا کر سکتا ہے اور اپنے

بچپن کے ضمیر کو خوش کر سکتا ہے۔ انگریز بڑا مکار بے حد چالاک اور بڑا بدذات حاکم تھا۔ اس نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ اس سرزمین کے محکوموں کو تنقید کا بالخصوص طنزیہ تنقید کا پورا پورا حق دے کر ان کی عملی قوتوں کو سلائے رکھے۔

انگریز کے جانشین دیسی حکمران بھی بڑے مکار بڑے چالاک اور بڑے بدذات تھے۔ انہوں نے بھی اسی فارمولے پر عمل کیا اور پڑھے لکھے' پرانے دھرانے سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو اصل مسائل سے غافل کیے رکھا۔ ہم ادیب شاعر نثار اور صحافی کافی چالاک نکلے۔ ہم نے بھی اس فن کو اپنا لیا اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اسے اپنا ایک آلہ بنالیا۔ صحیح بات سوچنے' معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے مطالعے کی ضرورت تھی۔ آنکھوں کا چراغ جلانے کی احتیاج تھی۔ مشاہدہ کی گہرائی اور تجربے کی ضرورت تھی۔ ہم نے سوچا کون اس لمبے جھنجھٹوں میں پڑے' سیدھی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ لوگ بھی خوش ہو جائیں گے ان کے بال بچے بھی راضی ہوں گے جس طرح آپ لوگ مالیخولیا کے مریض ہیں اسی طرح ہم بھی مالیخولیا کے مریض ہو گئے۔ یہ پردے کی باتیں ہیں اور لاہور سے دور آ کر خفیہ طور پر آپ کو یہ بتا رہا ہوں اگر میرے ہم عمروں کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

جناب والا! میں نے کئی مرتبہ اپنے فن کی چوکھٹ پر جا کر اس سے یہ پوچھنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے یہاں بیماری کا بھوک کا افلاس کا ناخواندگی کا اصل سبب کیا ہے۔ میں وہ ساری باتیں کیوں نہیں کہہ سکتا جو میرے دل کے اندر کروٹیں لیتی ہیں۔ کیا میں حکومت سے ڈرتا ہوں۔ لوگوں سے خائف ہوں۔ مذہبی پیشواؤں سے خوفزدہ ہوں۔ روایت کا اسیر ہوں؟ اور میرا فن مجھ سے کہتا ہے کہ جب تک میرے اور تمہارے درمیان یہ چوکھٹ حائل ہے تو ہر اس چیز سے ڈرتے رہو گے جس سے ڈرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب میں چین گیا اور جمعہ کے روز میں اور میرا انٹرپریٹر شنگھائی کی مسجد سے جمعہ پڑھ کر نکلے تو میں نے کہا' تونی ون مجھے کمیونزم سے بڑی نفرت ہے۔ میں اسے انسانیت کا دشمن سمجھتا ہوں۔ اور میں اس کے جراثیموں سے اپنے ملک کو پاک رکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا' کمیونزم نے انسان کے ساتھ جنم لیا ہے اور یہ جراثیم اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ یہ بات الگ ہے کہ سرمایہ داری نظام نے اسے ٹھیکے دے دے کر انسانی نظام حیثیت کے مختلف حصوں میں مقید کر رکھا ہے۔ اس وقت دنیا کا کوئی ملک چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ایسا نہیں جہاں اشتراکی نظام رائج نہ ہو۔ میں اس کی بات سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ تونی ون نے کہا' امریکہ جیسے سرمایہ پرست ملک سے لے کر ہمارے جیسے اشتراکی ملک تک راہ میں جتنے بھی ملک براعظم قطع اور صوبے آتے ہیں سب میں بنیادی طور پر ایک ہی نظام رائج ہے۔

جب کسی ملک کے لوگوں کو یا کسی شہر کے باسیوں کو آنے جانے کے لیے سڑکیں تعمیر کرنا ہوتی ہیں پل بنانے ہوتے ہیں' نہریں کھودنا ہوتی ہیں' تالاب بنانے ہوتے ہیں تو وہ سب لوگ مل جل کر اپنے اپنے کام

کاج کرتے ہیں اور معاشرے کی انا کے لیے یہ چیزیں بناتے ہیں۔ ان چیزوں کو سب لوگ مل جل کر آزادی سے استعمال کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسا کسی ملک میں نہیں ہوگا کہ کسی پل کے کنارے ایک بورڈ لگا ہو کہ امیر آدمی اس پل پر سے دن میں سو مرتبہ گزر سکتا ہے کیونکہ زیادہ رقم چندے یا ٹیکس کے طور پر دی ہے۔ غریب آدمی دن میں صرف ایک مرتبہ گزر سکتا ہے کیونکہ اس نے اس پل کی تعمیر میں صرف ایک روپے کا دان کیا ہے اور بھک منگا یہاں سے گزر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اپنے آپ کو بھول کر اور پھر مل جل کر ان سے فائدہ اٹھانے کا نام اشتراکیت ہے۔

میں نے تونی ون سے کہا بکواس بند کرو تم مجھے مذہب سے بے بہرہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ پھر مسکرایا اور کہنے لگا ''ذرا اصل اشتراکیت کا واضح ہونا مذہب ہی ہوتا ہے۔ جب امریکہ میں ایک گرجا تعمیر ہوتا ہے تو اس کی ملکیت جماعت خدا کے نام موسوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بننے والی دکانیں اور دفاتر کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتے۔ ان سے آنے والا کرایہ کسی ایک خاص شخص کا بیلنس نہیں ہوتا۔ گرجا ایک چھوٹا سا کمیون ہوتا ہے۔ سارے محلے سارے علاقے کی ذہنی جسمانی اور روحانی آسائشوں کا باعث۔ مجھے تی ون کی باتیں ایسی زہر لگیں کہ میں اسی شام پی آئی اے کا جہاز پکڑ کر اپنے پیارے شہر ڈھاکہ چلا آیا۔ راستے میں میں نے ایک دو مرتبہ اپنے فن کو آواز دی لیکن جب کبھی میں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو میرا فن زمین پر بہت نیچے کسی گھڑے میں پڑا سسکا کرتا ہے۔

میری ایک بھابی ہیں۔ ان کے ماشاءاللہ آٹھ بچے ہیں۔ آٹھواں بچہ بہت نحیف نزار اور حد درجہ لاغر ہے۔ بھابی یہ برداشت نہیں کر سکتیں کوئی ان کے بچے کو نحیف نزار کہہ کر پکارے یا اسے لاغر جان کر اس پر ترس کھائے۔ ان پر اسے موٹا کرنے اور سرخ سفید بنانے کی دھن سوار ہے۔ انہوں نے کہیں اخبار خواتین میں پڑھا کہ بچوں میں فولاد کی کمی انہیں لاغر بنا دیتی ہے۔ فولاد سب سے زیادہ پالک میں ہوتا ہے اور یہ بچے کو ابال کر دینی چاہیے۔ اب اس بچے کی یہ حالت ہے کہ اسے صبح دوپہر شام ایک تخت پوش پر چاروں شانے چت گرا کر اس پر از لگا دے کر اسے ابلی ہوئی پالک کی ایک پیالی کھلائی جاتی ہے۔ ابلی ہوئی پالک کسی صورت میں بھی گھلی ہوئی مہندی سے کم نہیں ہوتی۔ اگر خدانخواستہ آپ کو صبح دوپہر شام ہاتھ پیر باندھ کر پالک کی ایک ایک پیالی کھلائی جائے تو آپ لائل پور چھوڑ کر بھاگ جائیں لیکن چونکہ وہ بچہ ابھی چھوٹا ہے اور اپنے ماں باپ کا دست نگر ہے اس لیے لاہور چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔

میں نے اپنی بھابی سے دست بستہ درخواست کی کہ اپنے اصل مسئلے کو حل کریں۔ آپ کا مقصد بچے کو فولاد بہم پہنچانا ہے یا پالک کھلانا ہے۔ انہوں نے چڑ کر کہا میں تمہارے اس اصل مسئلے کی نشاندہی سے عاجز آ چکی ہوں۔ میرا مقصد اس کو فولاد پہنچانا ہے اسی لیے میں اسے پالک کھلا رہی ہوں۔ میں نے پھر ہاتھ باندھ کر عرض کی بھابی حضور! فولاد کی بہت سی ایسی ذائقے دار چیزیں بازار میں دستیاب ہیں کہ اگر آپ انہیں ایک

چھوٹے سے چمچ میں ڈال کر بچے کو چٹائیں گی تو وہ دوسری چمچی کے لیے ضد کرنے لگے گا۔ بھابی نے کہا' وہ کیا وہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن میں اسے پالک ہی دینا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا تو پھر یہ کہیے کہ آپ کا اصل مقصد ننھے کو گھوڑا پالک پلانا ہے۔فولاد بہم پہنچانا نہیں۔ وہ میری اس بات پر ناراض ہو کر اور فقروں کے دو تین الٹے سیدھے چکر کاٹ کر میری ماں کے مزاج کو کوسنے لگیں کہ ایسے سارے بھیئے انہی کے چھوڑے ہوئے ہیں۔کبھی کبھی اخبار پڑھتے ہوئے اور اپنے ملکی مسائل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے کہ ہماری ساری قوم ابلی ہوئی پالک کھا رہی ہے اور نحیف و نزار اور جمعرات والی عید سے تین دن بعد اور جمعہ والی عید سے دو دن بعد کی بات ہے کہ ہمارے پڑوسی انجینئر زمان خان نے اپنے ہونے والے سمدھی ڈاکٹر کریم سے اپنے ڈرائنگ روم میں کہا کہ آٹا نہ ملنے کی وجہ گندم کی کمیابی ہے اور گندم کی کمیابی کی وجہ اناج کی دھڑا دھڑ سمگلنگ ہے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی محمد دین درزی فریدہ بی بی کا ناپ لے رہا تھا۔ اس نے پڑھے لکھوں کی یہ بات سن کر نہالو جمعدارنی سے کی۔

نہالو میری بیوی کی بڑی دوست ہے۔سید صاحب کے غسلخانے میں رکھی ہوئی تمام چیزوں کی فہرست سے لے کر یونین کمپنی میں دوسری شادی کے لیے نئی درخواستوں کے نمبروں تک اسے ہر چیز کا علم ہے۔ گھر کی صفائی سے اسے کوئی خاص علاقہ نہیں لیکن باطن کی صفائی کا وہ بڑا دھیان رکھتی ہے۔نہالو نے یہ بات میری بیوی سے کی کہ بی بی آٹا اس لیے نہیں ملتا کہ کنک سمگل ہوتی ہے۔ میری بیوی نے یہ بات اپنے ماموں سے کی۔ اس کے ماموں نے میرے چچا سے ذکر کیا۔ چچا نے مجھ سے بات کی اور میرے ذہن سے ایک بخار اتر گیا۔ کہ او جی آٹا مہنگا ہونا ہی تھا گندم جو سمگل ہو رہی ہے۔

پرسوں کی بات ہے کہ میرے دل نے کہا اشفاق احمد تم پالک تو نہیں کھا رہے ہو۔ میں نے کہا' شاید کھا رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے سائیکل اٹھائی گھر سے نکلا۔ پہلے کسٹمز کے لوگوں سے رابطہ قائم کیا پھر بارڈر پولیس کے چند دوستوں سے ملا۔ پتہ چلا کہ اب تک بھارت اور پاکستان میں جو چیزیں سمگل ہوتی رہیں ان میں تانبہ' گوند' الائچی' سیاہ مرچ' چرس' افیون' سونا' سپاری اور کتھا سرِفہرست ہے۔ ابتدائے ایام میں کپڑا اور چوڑیاں بھی سمگل ہوتی رہی ہیں۔ میں نے گھر آ کر سائیکل دیوار کے ساتھ رکھ دی اور اپنی بیوی کو بلا کر کہا "جانِ من تم پڑھی لکھی عورت ہو لیکن تمہاری سوچ نہالو جمعدارنی کی سوچ سے آگے نہیں ہے۔ ہر اس شے کی سمگلنگ کرتے ہیں جن سے انہیں بے پناہ فائدہ ہو۔ میرا ذہن نہیں مانتا کہ ایک پرانا دھرانا سیانا سمگلر ڈھائی من گندم کی بوری سر پر اٹھا کر سرحد پار پہنچے جائے۔ وہاں سے پچاس روپے فی من پائے۔ ایسے پچاس جو اس ملک کے تیس کے برابر ہیں ایک بوری پر سوا روپیہ نفع کمائے۔ اس بات کو میرا دل نہیں مانتا۔ اس کمیابی کی وجہ کچھ اور ہے۔ بیوی نے کہا ایک بوری تھوڑی لے جاتا ہے۔ ٹرکوں کے ٹرک لے جاتا ہے۔ میں نے کہا حضور اگر اس کی جنس تبادلہ گندم ہے تو وہ سمگل نہیں اور اگر وہ گندم لے جانے پر ہی مصر ہے تو احمق آدمی ہے۔ پھر میں

نے نہایت ادب سے کہا بیوی کہیں ایسا تو نہیں کہ چچا جان کی طرح لوگ گندم بونے سے احتراز کرنے لگے ہوں۔ تیرے ماموں کی طرح کماد کپاس اور تمباکو پر گزارہ کرنے لگے ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ذخیرہ اندوزوں نے ہماری توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے سمگلروں کی کہانی بیچ کھیت پھینک دی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وریزاں والا شان جن کے بیان غلط بیانی سے شروع ہوتے تھے انہوں نے احتساب کے خوف سے تو سمگلروں کا راون اور راکھشش نہیں گھڑ لیے۔ لیکن میری بیوی نے میری ایک نہ مانی۔ میرے ساتھ لڑی جھگڑی روئی چیخی میرے ماں باپ کو بددعائیں دیں۔ اپنی دیورانیوں اور جیٹھانیوں کو کوسے خدا کی قسم اگر عائلی قوانین کا نفاذ نہ ہو چکا ہوتا تو میں بھی اپنی بیوی سے اسی طرح لڑتا جھگڑتا روتا پیٹتا اس کے والد صاحب کی نقل اتارتا جنہیں ستر برس کا ہو کر ابھی تک اچھی طرح سے پگڑی باندھنا نہیں آئی۔

جناب میں نے کئی مرتبہ اپنے فن سے درخواست کی ہے کہ وہ ساری باتیں کر لینے دیا کرے جو میرے دل میں اٹھتی ہیں لیکن اس نے ہمیشہ چلمن کی اوٹ سے یہی کہا ہے بھیڑوں میں بھیڑ ملی رہو۔ اشفاق احمد کوئی انوکھی بات کہنے کی کوشش کرو گے تو معاشرت کی کسی گلی کے لاپروا بچے تمہیں پتھر ماریں گے۔

حضور آپ مجھ سے میرے فن کی بابت پوچھتے ہیں میں کیا عرض کروں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں کشن لال بانڈہ کی کوٹھی سے لوٹی ہوئی کچے ریشم کی براق بشرت پہنے کھڑا ہوں۔ میرا فن ایک چار دیواری کے اندر مقید ہے اور میرے اور اس کے درمیان کا ہن سنگھ آہلو والیہ کی سیاہ بھینس بندھی ہوئی ہے۔ ہماری ملاقات نہ پہلے کبھی ہوئی تھی نہ آئندہ اس کی امید ہے۔

مٹی کی خوشبو (II)

آج سے ٹھیک تین برس پہلے' آج ہی کے دن لوگوں کے ایک گروہ نے اس موڑ پر اکٹھے ہو کر صرف مجھے اور میرے بچوں کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں اور مجھ سے اس کے بدلے میں کچھ نہ چاہا تھا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔ مجھے آج کی تاریخ یاد ہے۔

اس دن صبح کے وقت بڑے زور کا ایک پناخہ چلا تھا اور ہم اپنے گھر کے اندرونی برآمدے سے بھاگ کر باہر لان میں آ گئے تھے۔ میرے تینوں بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ان کے بدن پر مٹی تھی۔ کپڑوں سے تنکے چمٹے تھے اور سروں میں ستمبر کے پسینے کی خوشبو تھی۔ بڑا درخت پر تھا اور چھوٹے زمین پر ٹانک تلے سے لکڑی پھینک کر ناٹک بنگا کھیل رہے تھے۔ بھارت نے میرے ان تینوں بچوں پر گرانڈیل توپوں اور دھواں دھار طیاروں سے حملہ کر دیا تھا اور میرے لیے فرار کی ساری راہیں بند کر دی تھیں۔ اس وقت کچھ خاکی اور کچھ گرین اور کچھ سیاہ وردیوں والوں نے اس موڑ پر للکار کر کہا کون ہے جس نے ہمارے بھائی کے بچوں پر حملہ کیا ہے اور جواب میں مشین گنوں نے کھڑا کھڑا کر کہا ہم نے کیا ہے۔ ان پر کیا ہے جو درختوں کے اوپر اور درختوں کے نیچے کھیل رہے ہیں اور جن کے بدن پر مٹی ہے۔ کپڑوں میں تنکے ہیں اور سروں میں ستمبر کے پسینے کی خوشبو ہے۔ ہم ان کے بدنوں کی مٹی میں اضافہ کرنے آئے ہیں۔ ان پر گہری اور موٹی لتر چڑھانے آئے ہیں۔ جلو موڑ پر جمع ہونے والے گروہ نے کہا جا میرے بھائی آرام سے بیٹھ۔ خوش رہ۔ دعا کر اور بچوں کو درختوں تلے کھیلنے دے۔

میں اس وقت سے لے کر اب تک آرام سے بیٹھا ہوں۔ خوش ہوں اور اپنے بچوں کو لان میں کھیلتا چھوڑ آیا ہوں۔ خوش وقتی اور لاتعلقی کی لکڑی نے میرے وجود کے ارد گرد اتنے جالے تن دیئے ہیں کہ اب مجھے دھندلا دھندلا سا دکھائی دینے لگا ہے اور میں اپنی ذات اور اپنے وجود سے آگے اور کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ کوئی بہت ہی میرے قریب آ جائے تو تھوڑا بہت پہچان لیتا ہوں اس کے آگے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایک اندھا شیشہ لگا ہے کہ روشنی تو آتی ہے لیکن کسی کی شبیہ نظر نہیں آتی۔

میں ایک ادیب ہوں اور زمانہ مجھے کہتا ہے کسی پر اعتبار نہ کر اپنے داؤ پر رہ۔ میں ایک ادیب ہوں اور وقت مجھے کہتا ہے حالات کے حادثے سے فائدہ اٹھا لے۔ مجروحین کی کلائیوں سے گھڑیاں اتار لے۔ جیبوں سے بٹوے نکال لے۔ اپنا بلڈ ہائی کر لے۔ حادثے والے تو مر چکے۔ میں ایک ادیب ہوں اور حال مجھ سے یہ کہتا ہے اپنا مستقبل سنوار لے۔ اس انسان کی دنیا میں کوئی سکیورٹی نہیں ہے۔ میں نے کئی مرتبہ حالات سے اور وقت سے اور زمانے سے کہنا چاہا کہ یہ ساری نصیحتیں امیروں وزیروں سیاستدانوں معقلوں اور موقع تاڑوں کے لیے ہیں۔ مجھے کیوں پریشان کیا جا رہا ہے۔ لیکن میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا کیونکہ اس وقت تک میں سنہرے مستقبل اور سکیورٹی کی ٹکٹکی پر جا چکا تھا اور مجھ پر اتنے کوڑے برسائے جا چکے تھے کہ محبت کرنے والا خون میری ناک سے پانی کے اکادکا قطرے بن کر ٹپک گیا تھا۔ اور میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔ جب ایک ان تارہ آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو بہت شور مچاتا ہے۔ میں نے بھی شور مچایا لیکن یا تو لوگوں کے کان بہرے تھے یا میرا حلق خشک تھا۔ شاید میرا ہی حلق خشک تھا ورنہ گھاٹ پہ جلے کپڑے دھونے والے تو بہت تھے۔

جب جنگ ختم ہوئی اور لوگوں نے پلٹ کر پچھلے سترہ دن کا جائزہ لیا تو میں بھی ان میں شامل تھا۔ ستمبر کی جنگ میں سرحدوں پر لڑنے والے سے لے کر کھوکھے پر سودا بیچنے والے تک اور لڑاکا طیاروں کے ہوابازوں سے لے کر بنیادیں کھودنے والے مزدوروں تک بہتوں نے حصہ لیا' ایک میں ہی مفضل تھا۔ میں نے کہا' میں جنگ بندی کے بعد اپنا حصہ بناؤں گا جن لوگوں نے میرے بچوں کی جان بچائی ہے ان کا شکریہ ادا کرنے جاؤں گا۔ جنہوں نے اپنا خون بہا کر مجھے اعتماد کی دولت سے مالا مال کیا ہے انہیں سلام کرنے جاؤں گا۔

ان شہیدوں کے گھر کے سامنے کس پتھر پر کسی ٹوٹی دیوار پر یا پرانے کھنڈر پر جا کر بیٹھ رہیں گے اور اس وقت تک انتظار کرتے رہیں گے جب تک اندر سے شہید کی ماں' اس کی بیوی یا اس کا بوڑھا باپ برآمد نہیں ہوگا۔ پھر وہ ہماری طرف بڑھے گا۔ اور ہم چاروں باپ بیٹے اٹھ کر اسے سلام کریں گے اور کہیں گے ہم ان کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کی بدولت امن میں ہیں۔ ان کی وجہ سے عزت کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ آج ہم سب کو چھٹی تھی۔ ہم آپ کو سلام کرنے آئے تھے۔ پھر وہ عورت یا وہ بوڑھا آدمی میرے چھوٹے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لے گا اور کہے گا اسے بھی میں اسی طرح سے گود میں اٹھایا کرتا تھا۔ اس کے چہرے سے بھی مٹی' پسینے اور میٹھی میٹھی گولیوں اور مرمرے کی باس آیا کرتی تھی۔

لیکن تین سال گزر گئے ہم کسی کے دروازے پر بھی نہیں جا سکے۔ الٹا میرے دفتر کے ملازم اور وہ عقیدت مند مجھے سلام کرنے آتے رہتے ہیں۔ جنہیں میں گاہے بگاہے انسانی سربلندی اور اسلام کی اخوت اور مساوات کا درس دیا کرتا ہوں۔ ان لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جن کے بھائی ستمبر کی جنگ میں شہید ہو چکے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے کئی عزیز و اقارب اس جنگ میں اپنے اعضاء سے محروم ہو چکے ہیں لیکن وہ ان

غازیوں اور شہیدوں سے زیادہ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔ مجھ سے پیار کرتے ہیں کیونکہ غازی اور شہید فصیح نہیں ہوتے وہ تو گونگے ہوتے ہیں انہیں تو صرف گزرنا آتا ہے.....اپنی مٹینگیں' اپنے جلسے' اپنی تقریریں اور اپنے ملاقاتی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ شہیدوں کے برعکس اس دنیا میں میرے درجات کس قدر بلند ہیں!

آج سے ٹھیک تین برس پہلے' آج ہی کے دن لوگوں کے ایک گروہ نے مجتمع ہو کر مجھے اور میرے بچوں کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ آج پھر مجھ پر مصیبت کا وقت ہے اور میں ایک ان قادر انسان کی طرح وقت کے دھارے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ میں ایک ادیب ہوں اور ادیب جب ڈوبتا ہے تو اس کا ایک اکیلا وجود نہیں ڈوبتا۔ مجھے ڈوبنے سے پہلے ان لوگوں کا شکریہ ادا کر لینے دیجیے جو کچھ کرتے ہیں۔ جو کچھ کر گزرتے ہیں جو گونگے ہیں لیکن عمل کی بھٹی میں تپتے رہتے ہیں جو کسان ہیں' مزدور ہیں' سپاہی ہیں' ہزاروں مردم پا! مجھے اس دھارے سے نکالیے ورنہ نہ کرنے والے چرب زبانوں کے گرد متحر اور متشکر لوگوں کا دل اس قدر موٹا ہو جائے گا کہ گرانڈیل توپیں بھی اسے پھاڑ نہ سکیں گی.....

مجھے اعتماد کا بیج بونے والے اور چپکے چپکے تعمیری کام کرتے رہنے والے سیدھے اور شاد باد لوگوں کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں داد دینے کا وقت اور حوصلہ دلوا دیجیے۔ ورنہ کیڑے نکالنے والے اور جلسی زندگی میں عدم اعتماد کا زہر گھولنے والوں کے گرد خوفزدہ اور دھڑکے ہوئے آدمیوں کا ایسا جم غفیر جمع ہو جائے گا جسے کوئی Straffing منتشر نہ کر سکے گی۔

میں اس موڑ کی طرف منہ کر کے اس لیے پکار رہا ہوں کہ تاریخ نے کہا ہے جلو موڑ پر باوردی یا بے وردی لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو مصیبت زدہ لوگوں کو بچا لیتا ہے۔ اے وہ جو تم زندہ ہو میری پکار سن لو..... گو مجھے تمہاری زندگی کا شعور نہیں ہے۔ لیکن تم زندہ ہو..... پہلے تم نے بے کہے میری مدد کی تھی.....اب میں تمہیں پکار رہا ہوں۔

پاکستان اور پاکستانی ادب

مجھے پاکستان اور پاکستانی ادب کی شناخت میں کبھی کوئی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دونوں اپنی ہیئت شخصیت اور روحیت کے اعتبار سے دُور ہی سے نظر آ جاتے ہیں اور ہر شخص کو (اگر وہ نقشہ دیکھنا جانتا ہے) پاکستان اور ہر شخص کو (جو پڑھنا جانتا ہے) پاکستانی ادب تلاش کرنے میں کبھی کوئی مشکل نہیں پڑتی۔ میں سندھی نہیں جانتا' لیکن جب بھی شاہ جو رسالو میرے سامنے پڑھا جاتا ہے' تو میں فوراً پہچان لیتا ہوں کہ یہ ایک پاکستانی کے ذکر و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں پشتو نہیں سمجھتا' لیکن رحمان بابا اور خوشحال خان کے انداز ذکر سے ان کے دلوں کی دھڑکن سن بھی لیتا ہوں اور سمجھ بھی لیتا ہوں۔ اور آ جکل اس وقت' حال کے رشتے سے پاکستان کے جتنے بھی رائٹر ہیں' وہ اپنی فکر کی شباہت کے اعتبار سے میرے دائیں ہاتھ کی مانند ہیں کہ جسے پہچاننے میں مجھے کبھی بھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی' نہ اندھیرے میں نہ اجالے میں' نہ جلوت میں نہ خلوت میں۔

دراصل میرا مسئلہ اور ہے اور میں نے آج تک خوف کے مارے اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا کہ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ کالم لکھیں گے۔ کارٹون بنائیں گے۔ آتے جاتے اس شدت سے ذلیل و خوار کریں گے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن یہ محفل چونکہ خالص اپنوں کی ہے اور بالکل نجی ہے اور یہاں کی باتوں کے لیک آؤٹ ہونے کا اندیشہ نہیں ہے' اس لیے میں آپ کے کان میں کہتا ہوں کہ پاکستان کا رنج و غم سود و زیاں زندگی اور موت اس کے رائٹر کی ذات سے وابستہ ہے اور بہت جلد بہت بڑا بوجھ پاکستانی رائٹر کے کندھوں پر آنے والا ہے۔ اس کے مزے اڑانے اور اللے تللے کے دن جانے والے ہیں اور اس کے صاحب حال بننے کے زمانے قریب آ گئے ہیں۔ یہ ذمہ داری کا بوجھ اگر کوئی ماں سنے گی تو یہی سمجھے گی کہ ادیب بنے کو سہرے لگنے والے ہیں۔ کوئی سیاسی جماعت سنے گی تو خوفزدہ ہو گی کہ کہیں ہماری مستقبل کی بادشاہت پر یہ بدبخت تو نہیں آ رہے۔ افسر سمجھے گا کہ اس کا مطلب بڑی بڑی گھروتج نوکریوں پر ان کا قبضہ جمانا تو نہیں۔ تاجروں کو اندیشہ ہو گا کہ ادیبوں پر ایک بھاری ذمہ داری پڑنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ فرقہ بھی ہماری طرح امیر ہو جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ پاکستان کا ادیب بہت جلد' غالباً اسی سال کے اندر اندر' ممکن ہے

اسی مہینے میں یا اس اجلاس کے فوراً بعد اپنے احترام کی قیام گاہ میں داخل ہو کر خود اعتمادی کی مسند تک پہنچنے والا ہے۔ اس پر یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ روشن ہونے والی ہے کہ وہ صدق و صفا کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور یہ گروہ ہر خوشحال اور آنند بھرے معاشرے میں بس مختصر سا ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی' لیکن ان کی گرفت تعداد اور مقدار دونوں سے قوی تر ہوتی ہے۔ حق و صداقت میں اترنے والے کو سب سے پہلے اپنی ذات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح کوئی غواص آکسیجن سپلائی کے بغیر سمندر کی تہہ میں نہیں اتر سکتا' اسی طرح کوئی مسخرہ کوئی ہولا کوئی خوفزدہ کوئی معذرت میں لرزاں شخص صداقت کے سمندر میں نہیں اتر سکتا اور صداقت کے بارے میں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ حق جانا جا سکتا ہے' بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لکھایا بتایا نہیں جا سکتا' صداقت الفاظ کے ذریعے کبھی بھی بیان نہیں ہو سکتی' کیونکہ جو چیز بھی الفاظ کے واسطے اور لفظوں کے ذریعے سے سکھائی جا سکتی ہے' وہ حق نہیں ہوتی۔ صداقت انسان کو آزادی عطا کرتی ہے۔ لیکن صرف وہ صداقت جو مانگے کی نہ ہو۔ کہیں سے ادھار نہ لی گئی ہو۔ سیکنڈ ہینڈ نہ ہو' مستعار حقیقت اور مانگے کی سچائی انسان کے پاؤں کی بیڑی اور وجود کی زنجیر بن جاتی ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ اسیر بن جاتا ہے۔

میرے وطن کے ادیب اور شاعروں کی روایت دوسری ہے۔ انہیں صدق کی تلاش میں اپنے حال کے راستے سے داخل ہونا پڑتا ہے اور عمیق غواص کے بعد صفا کے بحر سے برآمد ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں ریاضی اعداد و شمار' نقشہ جات' جدولیات کی ایکوریسی' حقیقت نہیں ہے۔ ہماری روایت میں صرف انسان کی حقیقت حقیقت ہے۔ اگر اس کا کچھ فائدہ ہوتا ہے تو حق ہے ورنہ ناحق ہے..... لیکن ایسی باتیں آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں۔

اس وقت' گو میں اپنے ملک کے ادیبوں کی صف کے آخری کنارے پر ہوں' لیکن مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسی کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہوں' جس کے ماضی کے اراکین صاحبان صدق و صفا تھے اور جس کے مستقبل کے معزز ارکان ایک مرتبہ پھر اسی مرکز کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ میں صرف ادیبوں کے ساتھ وابستگی کی بنا پر محترم ہوں۔ بڑا ہی معزز اور بہت ہی محترم۔ اس قدر صاحب عزت اور صاحب احترام کہ مجھے خلوت میں بھی کبھی اپنے آپ سے مخول کرنے یا اپنے آپ پر چوٹ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میں آپ کے جیش کا ہوں تو ایک ادنیٰ پیادہ لیکن یقین کیجیے میں کبھی بھی آپ کو بٹ رے نہیں کرتا۔ کبھی بھی آپ کے احساس کے برخلاف نہیں چلتا۔ کہیں بھی آپ کی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔

اس وقت پاکستان کا ادیب ''کلی شے'' کی دنیا سے نکل رہا ہے اور اپنی شدھ سوچ کے خلا میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ بڑا ہی نازک اور بہت ہی صبر آزما وقت ہے۔ وہ وقت بچے پر بہت ہی خطرناک ہوتا ہے جب اس کو انگوٹھا چوسنا چھڑوایا جاتا ہے۔ کلی شے کی چسنی کا چھڑوانا انگوٹھے چھڑوانے سے بھی مشکل ہے اور یہ وقت پاکستانی ادیب پر آ گیا ہے' بلکہ اس نے خود فیصلہ کر کے اپنے آپ سے اگلی پیشی کی یہ تاریخ خود لے لی ہے۔

ادیب کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ مُلّا نے دین میں تفرقہ ڈال کر اس کو کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ سیاستدانوں نے کارکنوں میں پھوٹ ڈال کر لوگوں کو دھڑے بندیوں کے حوالے کر دیا۔ حکمرانوں اور بادشاہوں نے انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سپر پاوروں نے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو کینن فوڈ بنا دیا۔ تو اب ایک گروہ ایسا رہ گیا ہے جو کسی صورت میں بھی فرقہ بندی یا دھڑے بندی کا شکار نہیں ہوگا اور وہ گروہ ادیبوں کا گروہ ہے' جو حکیموں سے زیادہ انسانوں کا ہمدرد اور طبیبوں سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ پھر اس کو ایک ایسی رسم کی بنا بھی ڈالنی ہے' جس کو اختیار کر کے دنیا تاریکی سے نور کی طرف آسکتی ہے اور مخلوق خدا کو آسانیاں نصیب ہو سکتی ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ بخول بازی' فقرے بازی اور ٹھٹھول کی دنیا سے نکل کر ادیب پر حال ہی میں ایک بھاری ذمہ داری پڑنے والی ہے' کیونکہ وہ انسانوں کا ذکر بڑی محبت بے حد شفقت اور بڑے درد سے کرتا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے سب گروہوں میں انسان کا جب بھی ذکر ہوا ہے' ایک دوسرے انداز میں ہوا ہے' جس طرح گڈریا بھی سارا دن بکریوں کا ذکر کرتا ہے اور قصائی بھی سارا دن بکریوں ہی کے ذکر میں مشغول رہتا ہے' لیکن دونوں کی سوچ اور سمت مختلف ہوتی ہے۔

پیغمبر اور گڈریے نا ماننے والوں کے ساتھ رہنے کا فن جانتے ہیں۔ نہ ماننے والوں کو تکلیف نہیں پہنچاتے' ان کو چوٹ نہیں مارتے اور ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ادیب بھی انہی کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں۔ یہ گروہ بازی اور گروپ بندی کا دور وقتی ہے۔ ادیب حق اور صداقت کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر رہا ہے۔ ایک شدید ردِ عمل رونما ہونے والا ہے۔ یہ فقرے' یہ پھبتیاں' یہ اخباروں کی شوخ شتوگڑیاں جلد ہی ختم ہونے والی ہیں۔ ادیب واپس اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ رہا ہے۔ گڈریا پھر اپنی بھیڑوں کی رکھوالی کے لیے جا رہا ہے.....اور اس نے کرنا کچھ نہیں' کوئی جماعت نہیں بنانی' کوئی انجمن سازی نہیں کرنی' قرطاس رکنیت شائع نہیں کرنا۔ کوئی پریس کانفرنس نہیں کرنی۔ بس ایک مثال قائم کرنی ہے کہ اس ملک کی ایک بہت ہی فعال اور خوش خیال بہت ہی خوشخو بہت ہی بڑی کمیونٹی کسی دھڑے پارٹی یا گروپ کے بغیر ایک حقیقت بن کر قائم ہے' جو لوگوں کا ادب بھی کرتی ہے اور آپس کے رموز احترام سے بھی واقف ہے۔ بس اور بس اور بس.....کوئی پوسٹر نہیں چھاپنے' کچھ دیواروں پر نہیں لکھنا' کوئی سائیکلوسٹائلنگ کی ضرورت نہیں' کوئی پی آر کی حاجت نہیں' کوئی خفیہ سرکلر نہیں.....اور یہ میرا بہت بڑا مسئلہ ہے' ادب کی شناخت سے بھی بڑا کہ میں اپنے ساتھی ادیبوں کو کس طرح یقین دلاؤں کہ ایک اتنی سی بات سے.....ایک بہت بڑا راستہ طے ہو سکتا ہے۔ صرف ہمارا ہی نہیں ہماری ساری قوم کا' سارے ملک کا.....لیکن اگر اس مرتبہ پھر اس نے دیر کر دی تو یہ حکمران' سیاستدان اور سپر پاوران انسانوں کا گھان بچہ کولہو کر دیں گے اور یہ معاملہ کئی صدیاں آگے چلا جائے گا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

سن پچاس اور ساٹھ کی دہائی

کرکٹ میں پھینکے ہوئے بال کا ایکشن ری پلے تو دکھایا جا سکتا ہے لیکن گئے زمانوں کے عکس رفتہ کو ہوا کے سنگھاسن پر چڑھا کر کس طرح سے منگوایا جائے کہ آج کی نسل بھی چالیس پینتالیس برس کے نقوش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ لیکن یا سمین طاہر کو ہر نئے موسم کے ساتھ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں اور وہ پچھلے پرانے کو نیا بنا کر نئے لوگوں کو بھی اس لطف میں شریک کرنا چاہتی ہے جنہوں نے وہ زمانہ نہیں دیکھا تھا۔

1950ء سے سن ساٹھ تک کی دہائی پاکستان کی زندگی کی اولین دہائی تھی اور اس میں تیزی سے اٹھنے والی بنیادیں دیواریں بن کر چھتوں تک پہنچ گئی تھیں۔ اس وقت گو مہاجرین کے امڈتے ہوئے سمندر کا طوفان تو تھم گیا تھا لیکن چھوٹے چھوٹے ریلے اب بھی وقفے وقفے بعد پاکستان کی نئی تاریخ اور وسیع جغرافیے میں داخل ہو رہے تھے۔ فسادات کے اندوہناک واقعات نے سب کا کلیجہ چھلنی کر رکھا تھا اور اپنوں سے بچھڑ جانے کے غم نے ہماری اجتماعی زندگی میں مستقل طور پر ڈیرے ڈال لیے تھے۔ لیکن ایک آزاد ملک میں آزاد زندگی کی ابتدا نے مستقبل کے لیے ڈھیر سارے سنہرے وعدے فراہم کر دیئے تھے اور لوگ مجموعی طور پر خوش تھے۔ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں اضافے کر رہے تھے۔ اصل میں یہ جو غم ہوتا ہے ناں دکھ ہوتا ہے تو یہ اپنا بندوبست بڑی آسانی کے ساتھ خود ہی کر لیتا ہے۔ لیکن خوشی کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی دوسرے کا سہارا ضرور لینا پڑتا ہے۔ دوسرے کو اپنی خوشی میں شامل کیے بغیر شادمانی اور فرحت سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نئے ملک کے پرانے باشندے فسادات کے دردناک واقعات کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھائے ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہو رہے تھے۔ اس قدر دکھ سہنے کے باوصف لوگوں میں محبت شرافت برداشت اور Tolarnce کی قدریں پہلے کے مقابلے میں قوی تر ہو گئی تھیں۔

لاہور مال روڈ پر جی پی او کے عین سامنے ایک خاتون ڈرائیور کار چلاتی آ رہی تھیں (یہ غالباً لاہور کی اکلوتی خاتون ڈرائیور تھیں) دوسری جانب سے ایک افسر نما خوش پوش جوان اپنی گاڑی میں آ رہے تھے۔

ڈاکخانے کے سامنے دونوں کی گاڑیاں ایک دوسری سے مچل گئیں اور دونوں میں ڈینٹ پڑ گئے۔ دونوں ڈرائیور بجلی سی تیزی سے باہر نکلے اور ایک دوسرے سے معذرت کرنے لگے۔ خاتون نے کہا قصور سراسر میرا ہے کہ میں اپنی جائز سائیڈ چھوڑ کر غلط سائیڈ پر آ گئی تھی۔ خوش پوش جوان نے کہا "اس میں سراسر آپ ہی کا قصور نہیں' میری بھی کوتاہی تھی۔ جب میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ آپ غلط سائیڈ پر آ رہی ہیں تو مجھے ہی ایک طرف ہو جانا چاہیے تھا۔ میں بھی ضدی پن سے اپنی سائیڈ سے چمٹا رہا۔" پھر دونوں مسکرائے اور اپنی اپنی گاڑی کے ڈینٹوں پر نگاہ کیے بغیر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

اس زمانے میں اعلیٰ درجے کی قیمتی ترین شے قریب قریب اور ساتھ ساتھ تسلیم کی جاتی تھیں۔ مثلاً سانس جیسی قیمتی شے آپ کے نتھنوں کے آس پاس ہوتی تھی۔ روشنی آنکھوں کے ساتھ تھی۔ رنگ برنگے پھول قدموں کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوتے تھے۔ فرائض اپنے ہاتھوں میں ہوتے تھے' جیسے شہسوار کے ہاتھ میں منہ زور گھوڑے کی لگام اور خدا کا راستہ عین سامنے ہر وقت سامنے۔ اس وقت کے لوگ قربتوں میں اس شدت سے گھرے ہوئے تھے کہ ان کو دوریوں کا احساس ہی نہیں تھا۔ دور ستاروں پر نگاہیں ڈالنے اور دور دور کی کٹھن گھیریوں میں چکر پھیریاں لینے سے اجتناب کرتے تھے۔ لوگوں نے ابھی اپنی ذاتوں پر کوئی خول نہیں چڑھائے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح زرہ بکتر کے اندر کوئی تکلیف داخل نہیں ہو سکتی' اسی طرح اس کے اندر کوئی خوشی بھی داخل نہیں ہو سکتی..... خول کیوں چڑھائیں!

پچھلی صدیوں کی طرح یہ دہائی بھی مردانہ برتری کا دور تھی۔ مرد اپنے آپ کو عورتوں سے سپیریئر سمجھتے تھے اور عورتیں انہیں اپنے آپ کو سپیریئر سمجھنے دیتی تھیں۔ جس طرح بچے سیڑھی کے تیسرے ڈنڈے پر کھڑے ہو کر کہتے تھے look mama no has اور ان کی ماما واہ بھئی واہ کی تالی بجاتی تھیں۔ اسی طرح وہ اپنے مردوں کی شیخی پر تالی بجاتی تھیں..... میرے بڑے بھائی اور بھابی میں جھگڑا ہو گیا۔ بھائی نے جھڑک کر کہا "صالحہ! خاموشی سے بیٹھ جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" صالحہ بھابی بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ پھر بھائی صاحب اندر گئے اور اپنے کلے پر تازہ کلف لگی طرے دار پگڑی باندھ کر برآمد ہوئے اور مور کی طرح دم پھیلا کر بولے "اس گھر کا مالک میں ہوں۔ مختار میں ہوں۔ اس گھر کی دستار میرے سر پر ہے۔ یہ دیکھ رہی ہو ہماری خاندانی مردانہ دستار!" تو صالحہ بھابی ہنسنے لگیں اور ہنس ہنس کر پاگل ہو گئیں۔ پھر انہوں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی دستار' پر پیچ دراصل میرا دوپٹہ ہے' جو بہت ہی لمبا تھا۔ میں نے کلف لگا کر اور ابرک چھڑک کر آپ کی الماری میں لٹکا دیا تھا کہ آپ جمعہ کے روز باندھ کر نماز پڑھنے جائیں گے۔ آپ آج ہی یہ تلوار نیام سے نکال کر کھڑے ہو گئے۔"

اس عہد میں ہم بہت ہی غریب تھے۔ نہ خزانے میں مال تھا نہ ہاتھ میں دولت۔ نہ کوئی کارخانہ تھا' نہ زرعی ترقی کے اسباب۔ چھپر ڈال کر دفتر بنائے تھے۔ اینٹیں جوڑ کے دکانیں اور کھوکھے کھڑے کیے تھے۔

سکولوں، کالجوں، دفتروں اور اداروں میں کاغذ جوڑنے کے لیے کامن پن نہیں تھی۔ کاغذوں کو یکجا کرنے کے لیے کامن پن کی جگہ کیکر کے کانٹے لگائے جاتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے کٹے کٹائے کیکر کے صاف ستھرے کانٹے چار آنے کے سول جاتے تھے۔ یونیورسٹی کے امتحانوں میں آنسر بکس کے ساتھ اور کاغذ لگانے کے لیے کانٹے ہی استعمال کیے جاتے تھے اور کانٹے ٹھیک کام دیتے تھے۔

میں ایم اے کے آخری سال میں تھا۔ میری سالگرہ پر میرے والد نے گاؤں سے مجھے ایک لفافہ بھیجا، جس کے اندر ایک اور چھوٹا سا لفافہ تھا۔ خط میں لکھا تھا تمہاری سالگرہ پر ایک چھوٹا سا حقیر سا تحفہ بھیج رہا ہوں۔ گو اس کا سائز چھوٹا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں فٹ نہیں آئے گا، لیکن اسے رکھ لینا اور واپس نہ کرنا۔ میں نے بڑی کوشش کی، لیکن اس سے بڑا مجھے مل نہیں سکا۔ میری مجبوری تھی..... تمہارا ابو! جب میں نے ساتھ کا لفافہ کھولا تو اس میں ایک روپے کا نوٹ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے وہ نوٹ چوم کر اپنے ماتھے سے لگا لیا۔

اس وقت ہم بہت ہی مجبور تھے، کاغذ میں پن کی جگہ ببول کا کانٹا لگاتے تھے۔

یہ بڑی کمی، کوتاہی، قلت اور فقدان کا زمانہ تھا۔ ضروری سے ضروری چیز خود پیدا کرنا پڑتی تھی نہ ہو سکے تو اس کے بغیر خوش دلی اور خوش اطواری سے زندگی بسر کرنی پڑتی تھی اور ہم سب اس فقدان، کمی اور ناہوت کے دور میں بھی بڑے مسرور تھے۔ کوشش کے پسینے کے ساتھ ساتھ تفریح کی پھوار کا سامان بھی بہم تھا..... خواجہ خورشید انور اپنی ایک نہایت ہی مدہم ذھن کی موسیقی تیار کروا رہے تھے۔ وہ ہر ٹیک کے بعد سازندوں کو سمجھاتے اور بار بار بتاتے رہے، مگر سازندے اونچا اونچا اور کرخت کرخت ہی بجاتے رہے۔ بات سمجھے نہیں..... اچانک خواجہ صاحب نے اپنی جیب سے (Objection) کاٹن کا ایک منا سا رومال نکال کر اوپر پھینکا تو وہ کھلے ہوئے پیراشوٹ کی طرح تیرتا ہوا بڑی آہستگی کے ساتھ سازندوں کے درمیان فرش پر گرا۔ خواجہ صاحب نے کہا ''ایسے بجاؤ..... ایسے'' اور آرکسٹرا کا ایک ایک سازندہ ان کی بات سمجھ گیا..... دراصل ہم کارنٹ کے اندر کی پتی امپورٹ نہیں کر سکتے تھے، بانس کی لکڑی پتھر پر گھسا گھسا کر خود ہی بنا لیتے تھے۔

اس عہد میں ہم کاغذ میں پن کی جگہ کیکر کا کانٹا لگاتے تھے اور اپنا کام سلیقے سے نبھاتے تھے۔

لاہور سے باہر بڑی دور ایک نئی بستی آباد ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کا نام سمن آباد رکھا تھا۔ کوئی اس کو سین سے سمن آباد لکھتا تھا اور کوئی ث کے ساتھ۔ یہ آبادی چوبرجی کے بعد ایک لق و دق علاقے میں ابھر رہی تھی اور لوگ اس علاقے کی دوری کی وجہ سے یہاں آنے سے گھبراتے تھے۔ یہ علاقہ بھاٹی لوہاری مصری شاہ سے تو دور تھا ہی، اچھرہ مزنگ اور چوبرجی سے بھی بارہ پتھر پار سمجھا جاتا تھا۔ جب میری سب سے بڑی بھتیجی کی شادی ہوئی اور وہ لاہور سے بیاہ کر سمن آباد جانے لگی تو ہم سب نے اسے رو رو کر رخصت کیا۔ اس زمانے

میں وہاں کوئی سواری نہیں جاتی تھی۔ جاتی تھی تو کوچوان پیسے بہت مانگتے تھے۔ پیدل جانا ناممکن تھا۔ لوگ زیادہ سے زیادہ میانی کے قبرستان تک پہنچ پاتے تھے۔ پیدل یا چارپائی پر اس سے آگے ممکن نہ تھا۔ میرے والد دو مرتبہ اپنی نو بیاہتا پوتی سے ملنے من آباد گئے' لیکن دونوں مرتبہ راستہ بھول کر ویسے ہی گھر آ گئے۔ اس وقت محبتیں ضرور تھیں' لیکن دوریوں اور رنجوریوں نے مار رکھا تھا لیکن محبتیں فاصلوں پر غالب تھیں۔

میری اس بھتیجی نے اپنے دادا کی دعوت کی تو کہا" دادا! اس مرتبہ آپ ہرگز ہرگز میرا گھر نہیں بھولیں گے۔ یہ ٹھیک ہے علاقہ بہت بڑا ہے اور کوٹھیاں ابھی بن بن رہی ہیں' نمبر بھی الاٹ نہیں ہوئے۔ لیکن آپ فکر نہ کرنا سالم تانگہ لے کر آ جانا اور بڑی سڑک کے بعد دائیں ہاتھ اندر کو آپ کو جس گھر کے باہر لمبا سا دستر خوان تنا ہوا نظر آئے' اسی گھر میں آپ کی دعوت ہے..... دادا نے کھانا کھانے کے بعد جب دانت صندل مانگا تو ان کی پوتی نے صاف طشتری میں دھوئے دھائے کیکر کے کانٹے پیش کیے..... یہ وہی کانٹے تھے' جو اس کا نوجوان شوہر اپنی فائلوں میں ضروری کاغذات ٹانکنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

یہ ایک بہت ہی پرسکون اور پرلطف دور تھا۔ دوست پرور' مہمان پرور اور وطن پرور دور۔ مہاجر بے باش ہو چکے تھے۔ مقامی سرشاری کے تختوں پر دراز تھے۔ ہر شخص شاداں و فرحاں زندگی کے پل پر سے نظارہ کناں گزر رہا تھا۔ فرد ریل پیل' بہتات' افزونی اور افزائش کی طرف رواں تھا اور قوم اپنے تہیے کے مضبوط اور فولادی Skats پر قدم جما کر کیکر کے کانٹے سے کھونٹے کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب دور تھا۔ پرسکون' پرلطف' عیش کوش اور آنند باس لیکن چوکس اور خبردار فرداشناس اور مستقبل نواز..... لیکن میں اس کا ایکشن ری پلے کیسے دکھاؤں اور اس کی بازگشت کدھر سے سنواؤں۔

فن کار اور دفاعِ وطن میں

خواتین و حضرات! میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس موضوع پر کاغذ لکھنے کے لیے پاکستان آرٹ کونسل نے مجھے کیوں منتخب فرمایا ہے۔ یقین مانیئے میں ڈرامہ تو لکھ سکتا ہوں' لیکن اس پر پیپر لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ لیکن چونکہ اس سیمینار کے مقطع میں یہ سخن گسترانہ بات آ ہی گئی ہے تو عرض کرتا ہوں کہ برصغیر کی ثقافتی تاریخ میں ڈرامے کی عمر دو سو سال سے کچھ زیادہ ہے۔ پاک و ہند برصغیر کی سٹیج پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایکٹروں کی آمد سے جو کھیل شروع ہوا اس کا پہلا سین لڑائی بھڑائی سے بھرپور اور مکاری اور عیاری پر مشتمل تھا۔ اس دور میں جتنے بھی سوانح اور تاریخ کے جتنے بھی ابواب لکھے گئے' وہ ڈرامائی انداز کے حامل ہیں۔ دوسرا سین 57ء کی جنگ آزادی سے 47ء تک کے واقعہ پر محیط ہے اور اس عہد کے روزنامچے' مکاتیب' سوانح عمریاں' داستانیں حتیٰ کہ دریائے لطافت ایسی گریمر کی کتابیں بھی اپنے اندر ڈرامے کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ ایک بڑے ڈرامے کی روئیداد ایک ڈرامے ہی کی زبان سے بیان کی جا سکتی ہے اور ایک بڑے المیے کا اظہار تمثیل کی حرکی قوت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ تمثیل کی یہ حرکت غالب کے خطوط میں بھی موجود ہے اور اقبال کی شاعری میں بھی۔ میر کی غزلوں میں بھی ان ٹریجڈیوں کے ایکٹ ترتیب اور تواتر کے ساتھ موجود ہیں اور نظیر اکبر آبادی کی کامیڈی اور بریک میں بھی ان کے سین اور Skelt اس عہد کی آئینہ داری کرتے ہیں.....ان فنکاروں کی تحریروں میں ڈرامے کا یہ عنصر جو ارادی یا غیر ارادی طور پر در آیا تھا' اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اصناف سخن میں ڈرامہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو فن کار کا رشتہ بلاواسطہ عوام سے استوار کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان دو طرفہ وبکیل کا کام دیتا ہے۔ عوام واقعات و حادثات کا مواد تمثیل نگار کو فراہم کرتے ہیں اور تمثیل نگار ان واقعات میں احساسات اور کیفیات کی نشاندہی کرنے کے بعد انہیں ایک دستاویزی شکل میں عوام کو لوٹا دیتا ہے۔ پھر جب بھی کسی "حال" میں ان واقعات اور حادثات کو قریب تر ہو کر انہیں محسوس کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے تو تمثیل کی حرکی قوت انہی واقعات و حادثات اور کیفیت و واردات کی بساط دوبارہ بچھا دیتی ہے۔

لیکن یہ بات آپ مجھ سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ آپ ڈرامہ نہ لکھ سکیں' لیکن آپ میں ڈرامہ دیکھنے

سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ اس وقت جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے' وہ یہ ہے کہ دفاع وطن میں تمثیل نگار کو کیا رول اختیار کرنا چاہئے..... ایسا ہی ایک مسئلہ آج سے کئی سال پیشتر مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو درپیش تھا۔ ہم دونوں پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے (پہلے وہ تیسری جماعت میں تھا لیکن آہستہ آہستہ میرے ساتھ آ شامل ہوا) اور اپنے بڑے بھائی (خدا انہیں غریق رحمت کرے) سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی بڑے متقی پرہیزگار شریف النفس اور شب زندہ دار نوجوان تھے۔ جب وہ فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تو ان کے ماتھے پر محراب کا نشان پڑ گیا۔ ہمارے گھر کے سب لوگ بالخصوص میرے والد اور ماموں بہت خوش ہوئے (ماموں جان بیروزگاری کی وجہ سے ہمارے گھر میں ہی رہتے تھے اور اباجی اپنی بیوی کی خوشنودی کی خاطر بظاہر ان سے بڑا پیار کرتے تھے) جب میرے والد اور ماموں صالح نوجوان کی محراب سے حد درجہ مسرور ہوئے تو ہم نے بھی اس خوشی میں شریک ہونا اپنی سعادت سمجھا اور بھائی جان کے ہاتھوں کو ان کے کوٹ کو اور ان کی آستینوں کو موقع پا کر چوما کرتے تھے۔ ماموں جان اور اباجان اٹھتے بیٹھتے یہی کہتے سنائی دیتے "آفتاب تیرے ماتھے پر یہ محراب پیدا ہوگئی ہے' اب اسے قائم رکھنا۔ اس لاٹری کو پیشانی' آفتاب پر دمکائے رکھنا۔ خدا کرے یہ محراب تازیست قائم رہے۔ خدا کرے یہ محراب جزو بدن ہو جائے۔" ہم چونکہ چھوٹے تھے اور اس زمانے میں سائیکلوجی کا رواج نہیں تھا' اس لیے ہمیں بزرگوں کی عزت کرنا سکھایا گیا تھا اور ان کے سامنے بولنے یا انہیں سوال کرنے سے منع کیا گیا تھا۔

ہم دونوں بھائی اپنے کمرے میں آ کر اللہ میاں سے دعائیں مانگا کرتے تھے یا اللہ بھاجی کے ماتھے پر یہ محراب قائم رہے۔ یا اللہ ہمارے بھاجی کی محراب کبھی نہ مٹے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس محراب کو قائم رکھنے کا طریق کیا ہے اور اسے کس طرح مستقل بنایا جاسکتا ہے۔ بزرگوں سے ہم پوچھ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں کو خود اس بات کا علم نہیں تھا۔ کتابیں جو اس زمانے میں دارالاشاعت چھاپتا تھا' اس میں اس مسئلے پر روشنی نہیں ڈالی گئی تھی کہ محراب کس طرح قائم رکھی جاسکتی ہے۔ ہم دونوں بھائی رات کے وقت دعا مانگ کر کہ "یا اللہ میاں جی! ہمارے بھاجی کی محراب قائم رکھنا" ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے تھے (اس وقت ہم دونوں بھائیوں میں بہت پیار تھا۔ آج کل ڈھائی سال سے ہماری بول چال بند ہے۔ اس کی بیوی نے اسے میرے خلاف بھڑکا رکھا ہے۔ میری بیوی بیچاری سیدھی سادی ہے اس نے مجھے کبھی نہیں بھڑکایا) تو جناب ہم پر یہ عقدہ کئی سال تک نہ کھل سکا کہ محراب کس طرح برقرار رکھی جاسکتی ہے۔

ایسا ہی ایک مسئلہ آج کل ہمارے سامنے گرومیں لے رہا ہے کہ بھارت کے حملے کے بعد جو اتحاد اور سالمیت ہمارے درمیان پیدا ہو چکی ہے اور جس قربانی اور ایثار کا مظاہرہ ہم نے اس مشکل دور میں کیا ہے' اسے کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس دور کے جتنے بھی ماموں اور ابا ہیں' انہوں نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں بار بار یہی کہا ہے کہ اس یکجہتی اور اس جذبے کو قائم رکھئے اور اس شمع ایمان و ایقان سے اپنے ملک

کے شبستان میں اجالا کیجیے۔ لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ اس جذبے کو کس طرح سے قائم رکھا جائے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا تدابیر کی جائیں۔ ہم نے اپنے گھر میں بیٹھ کر محمد دین درزی اور ابراہیم گوجر کے ساتھ مل کر اس مسئلے پر بہت غور کیا' لیکن کس طرح کیسے کیونکر کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ انہی دنوں خدا بھلا کرے ریڈیو پاکستان کا اس نے عقلمندی کا ثبوت دیا اور اس جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی پالیسی کا اعلان کر دیا۔ اس پالیسی کا کہنا یہ ہے کہ جن ترانوں اور تقریروں نے جنگ کے دوران لوگوں میں محبت' اخوت اور یگانگت کا جذبہ پیدا کیا ہے' انہیں ہر روز تواتر کے ساتھ ہر ریڈیو سٹیشن سے بجایا جائے اور اس وقت تک بجایا جائے' جب تک واپڈا ہمیں بجلی فراہم کرتا ہے۔ محمد دین درزی کی تو اس پالیسی سے تسلی ہو گئی کیونکہ وہ سارے ترانوں کی دھنیں یاد کرنا چاہتا ہے اور موسیقی کے معاملے میں ذرا سنکی آدمی ہے' لیکن ابراہیم گوجر چونکہ ریڈیو نہیں سنتا اس لیے اس بات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر جلد کیونکر کیسے اور کس طرح پر غور نہ کیا گیا تو محبت اخوت اور یگانگت کی کھوتی واپس بوڑھ تلے آ جائے گی۔ ابراہیم گوجر کا کہنا ہے کہ ملکی اتحاد سالمیت اور ایثار کے معاملے میں وہ ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہے بشرطیکہ اس میں یہ بات شامل نہ ہو کہ آیندہ دودھ میں پانی نہیں ڈالا جائے گا۔ ساتھ ہی ابراہیم گوجر چونکہ معاملے کا آدمی ہے اور وقت کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے' اس لیے اس کا خیال ہے کہ ''کیوں کیسے اور کیونکر'' کے معاملے پر پڑھے لکھے لوگوں کو غور کرنا چاہیے۔ سیاستدانوں یا اسمبلی کے ممبروں کو نہیں۔ جب وہ پڑھے لکھے لوگوں کا ذکر کرتا ہے تو میری آنکھوں میں آپ سے آپ چمک آ جاتی ہے اور میں ڈرامے کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔

جناب والا! میرے خیال میں اصناف سخن میں ڈرامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جو واقعات اور حادثات کی ''نقل مطابق اصل'' بساط بچھا کر واردات اور کیفیات کی تجدید میں مدد دیتا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہی ایک ایسی چیز ہے جو فنکار اور عوام کے درمیان بلاواسطہ رشتہ استوار کرتی ہے۔ چونکہ اس کا تعلق محض بیان سے نہیں ہوتا' بلکہ حرکت سے بھی ہوتا ہے' اس لیے جاننے والے کو تصور کی آنکھ کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

حضور! ڈرامے لکھے جانے چاہئیں اور بہت سے لکھے جانے چاہئیں۔ اچھے' برے' چھوٹے بڑے' ڈھیلے پلپلے' بھیڑ یے چنگے لیکن لکھے ضرور جانے چاہئیں۔ اس سلسلے میں پاکستان ٹیلیویژن سروس کے لاہور سٹیشن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد ٹیلیویژن نے اپنے پروگراموں کا بیشتر وقت ڈراموں کے لیے مخصوص کر دیا۔ ایک ٹرانس میشن میں تین تین ڈرامے بھی کیے۔ اچھے برے ڈھیلے پلپلے چغتس قسم کے ڈرامے۔ ان کا Impect لکشمی چوک پر تماشا کرنے والے ہجوم پر بھی ہوا اور امراء و وزراء کے محل درمحلوں میں بسنے والی مخلوق پر۔ ان کے خوشگوار نتائج ڈیفنس فنڈ میں بڑھ چڑھ کے شرکت کرنے کی صورت میں بھی نکلے۔ مجاہدوں اور غازی بھائیوں سے محبت کے روپ میں بھی اجاگر ہوئے اور اپنے ہمسایوں اور ساتھیوں کے ساتھ رواداری برتنے اور ان کی امداد کرنے کی صورت میں بھی۔

میں سمجھتا ہوں چھ ستمبر کا دن ہماری قومی زندگی کا اہم ترین دن قرار پایا ہے۔ اس دن کی اہمیت چودہ اگست اور تیئس مارچ سے بھی زیادہ ہے۔ ہمیں اس دن کو فراموش نہیں کرنا چاہئے' بلکہ اگر آپ مجھے loud thinking کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ اس دن کو ہمیں ایک عظیم قومی تہوار کی صورت میں منانا چاہئے۔ شالامار سے لے کر واہگے تک حدِ نظر ایک بھرے پرے میلے کی کیفیت ہو۔ سڑک کے کنارے بانس گڑے ہوں جن سے بھونپو بندھے ہوں۔ ان پر وہی ترانے بج رہے ہوں' جنہوں نے ہمیں ستمبر میں گرمایا تھا۔ وہ نظمیں سنائی جا رہی ہوں' جن میں علی حیدر علی حیدر اور جنگی جگنی کے بول ہوں اور سڑک کے دونوں جانب تنبو اٹھائے ٹھاٹھ باندھے وہ تھیٹر ہوں' جو میلہ چراغاں پر آتے ہیں اور دھوم مچاتے ہیں لیکن ان کے اندر کھیلے جانے والے اردو پنجابی کھیل' اچھے برے' ڈھیلے پلپلے' بھڑے چنگے' میرے آپ کے ہمارے لکھے ہوئے ہوں۔ انہیں وہی ایکٹر کھیلیں جو میلہ چراغاں کے تھیٹروں میں کھیلتے ہیں۔ وہی ڈائریکٹر ہوں وہی پنڈی ماسٹر صرف تماشائیوں میں اضافہ ہو یعنی اب کی بار ان میں آپ میں بھی ہوں۔ لکشمی چوک کے ہجوم والے بھی اور امراء و وزراء کے محل در محلوں کے باسی بھی۔

ابراہیم گوجر کہتا ہے کہ شالامار سے واہگے تک ایک وسیع و عریض سٹیج ہو اور اس سٹیج پر چھ ستمبر کا میلہ ایک ڈرامہ ہو اور میں آپ ہم اور وہ اس ڈرامے کے کیمکیک ہوں۔ ایکٹر ہوں۔ تماشا بھی ہو اور تماشائی بھی۔ پرانی پود اس کھیل سے اصل حادثے کو یاد کر کر کے اپنی محبت اخوت سالمیت اور ایثار کی بیٹری ری چارج کر رہی ہو اور نئی پود مستقبل میں پھر اس قسم کی جانبازی کا مظاہرہ کرنے کے لیے واقعات کے سپارک پلگ چن چن کر اپنی ہمتوں کے آتش فشاں میکنزم میں فٹ کیے جاتی ہو۔

ابراہیم کہتا ہے کہ اگر بات میدانِ سیاست اور ایوانِ اسمبلی کے کسی ماموں یا ابا کو یہ کہنے کی ضرورت نہ رہے کہ "بیٹا جبینِ وطن پر اس محراب کو قائم رکھنا۔" بھارتی سامراج کے سوانگ ہوں' آکاش وانی کے چلتے پھرتے فیچر ہوں' گھنیرے درختوں تلے شہیدوں کی یادیں Tablo ہوں۔ چمکتی دھوپ میں مربوط کیا پتوں کے بھنگڑے ہوں۔ وہ رجمنٹیں جو اس محاذ پر لڑتی رہی ہیں' ان کے بینڈیوں کی ٹکڑیاں اسی ترتیب سے آتی رہیں جس طرح ان کو ایک سال پہلے ادھر advance کرنے کا حکم ملا تھا۔ نقلیے بھی اسی مخصوص موضوع پر اپنی چوکیاں سجائے ہوں اور بھاٹ بھی گھوم گھوم کر اس رزمیہ کی داستانیں سنا رہے ہوں اور کبھی کبھی تھوڑے وقفے بعد "شیر دیاں بچیاں" اور رانیاں بھی اپنی پرانی دھاڑ پس منظر میں سناتی رہیں۔ لیکن یہ ساری ٹکڑیاں اسی وقت جم سکیں گی اور میلہ جبھی بھر سکے گا جب ڈرامہ لکھنے والا ڈرامہ لکھے گا۔ بلاخوف لکھے گا اور لکھتا چلا جائے گا۔ اس کے مسودوں سے کونسلوں کے معزز تھیٹر بھی مستفید ہو سکیں گے۔ اس کے چھینٹوں سے تہبندوں والے تھیٹر بھی فائدہ اٹھا سکیں گے اور اس کے قصوں سے وہ کرداری فیچر از قسم "جگنو انو نہ سس دا" بھی مالا مال ہو سکیں گے۔

وطن کی مٹی I

خان پور کا اصل نام ہردو خانپور تھا اور اس کے اور ہوشیار پور کے درمیان ریت کا بڑا سا میدان تھا جس کو وہاں کے لوگ چو کہتے تھے۔ کوہ شوالک سے اندھادھند جنگلات کٹنے کے باعث پہاڑوں کی بارش مضافات میں جمع ہو جاتی۔ بڑی بڑی جھیلیں بن جاتیں اور جب یہ جھیلیں سوکھتیں تو ریت کے وسیع و عریض میدان نکل آتے۔ چھوٹے چھوٹے صحرا بن جاتے۔ ان صحراؤں میں کسان تربوز بوتے۔ پہلوان کثرت کرتے۔ ہندو عورتیں جل پانی کے لیے جاتیں اور رات کو گیدڑ کھیت اجاڑنے آتے۔ بڑے صحرا بڑے پیغمبر پیدا کرتے ہیں اور چھوٹے صحرا شاعر۔ بڑے صحراؤں کا سناٹا ایک صدا ہوتا ہے اور چھوٹے صحراؤں کی خاموشی چپ چاپ!

خانپور چھوٹی اینٹوں' تنگ گلیوں' پرانے مکانوں اور بوسیدہ کنوؤں کا قصبہ تھا۔ یہاں کے لوگ تلاش معاش میں افریقہ گئے ہوئے تھے اور جو نہ جا سکے تھے وہ دیواروں پر جمی ہوئی کائی کی طرح سبز چہرے لے کر گلیوں میں گھومتے رہتے تھے۔ کچھ مکان کئی برسوں سے مقفل پڑے تھے۔ کچھ کے تالے زنجیروں میں لٹک رہے تھے اور کواڑ گر چکے تھے۔ کسی کے اندر پرانے صندوق اور پرانے بستر تھے۔ کسی کے اندر اوندھے برتن اور دیواروں سے لگے پلنگ تھے اور کوئی بالکل خالی تھے۔ صرف الماریوں میں عربی' فارسی کی پرانی کتابیں اور اورنگ زیب کے زمانے کے فرمان تھے۔

خانپور پٹھانوں کا قصبہ تھا۔ ان پٹھانوں کا قصبہ جو پتہ نہیں کب اپنا اصل وطن چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور جنہوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کر کے ایک نئی نسل کو جنم دیا تھا۔ ان کی سائیکی میں ڈرنے ڈرانے کی گونج تھی لیکن ان کے دل کے رخساروں پر بندی والی عورتوں کے کوسے کوسے ہاتھ تھے۔ نوعمر جوان' افغان بچے غیرت مند ہونے کی کوشش میں مصروف رہتے اور ان کے قدم جھیوروں اور میراثیوں کی کاماسوترا گلیوں میں گھوما کرتے.....

قصبے کے اردگرد آموں کے گھنے باغ تھے۔ کھٹے چوسی آموں کے باغ۔ ان کے درمیان بڑا اندھیرا

تھا۔ درختوں کے تنوں سے لاکھوں جھینگے چمٹے ہوتے جو قریب سے گزرنے والے کا احساس پا کر درخت کے تنے سے اڑتے اور ایک جانب کی لہرا کر پھر درخت سے چمٹ جاتے۔ آم کے باغوں نے اور باغوں کے اندر ٹھکے اندھیاروں نے اس قصبے کے جوانوں کو علمیت کے بہت سے کونے عطا کر رکھے تھے اور یوں یہ قصبہ اپنی شرافت' قدامت اور نجابت کی وجہ سے دور دور مشہور ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ سب اس نہفتگی کی وجہ سے تھا جو اس قصبے کو وسیع باغوں اور پرانے بند مکانوں نے عطا کی تھی۔

خانپور تلافیوں' معافیوں اور ناکامیوں کا قصبہ نہیں تھا۔ یہ من چاہیوں کی بستی تھی جس کی ہر گلی میں مندروں کی سی علالت تھی اور جس سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں آتا تھا۔ اس کے بام و در اور نوٹے دریچے چاند چڑھنے کے منتظر رہتے تھے۔ ایسے چاند کے منتظر جو پچھلی رات کے خواب کی طرح واضح بھی ہوتا ہے اور موہوم بھی اس علاقے کی آبادی نے اب تک کوئی بڑا آدمی نہ پیدا کیا تھا۔ کوئی شاعر کوئی مصور کوئی موسیقار کوئی دیوانہ۔ بس عام سے روز و شب میں عام سے لوگ پیدا کیے تھے۔ مقدمے باز' سکول ماسٹر' عرائض نویس' بٹیر باز' ڈوڈوے پینے والے۔ پھر اچانک پرانے شکستہ مکانوں کے اندر سے ایک شکستہ سا نوجوان پرانے فرمانوں کا پلندہ لے کر نمودار ہوا جس کے فارسی متنوں کے کنارے اس نے اردو شعر لکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی محرومی اور شکستگی کے وجود پر غیرت اور محاربہ کی لوئی اوڑھ رکھی تھی۔ اور وہ ہر راہ چلتے کو شکرا کہہ کر پکارتا تھا حالانکہ اس کا اپنا وجود بلبل کی طرح کمزور اور لڑکیوں کی طرح نزبل تھا۔

خانپور جب بھی کوئی شاعر پیدا کرتا اسی شکل و صورت کا کرتا۔ اس میں منیر کا کوئی کمال نہیں خانپور کے ماحولیات کا کمال ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ منیر نے خانپور کی قدیم اور بانجھ رحم کو بڑی محنت سے درد زہ میں مبتلا کر کے خود اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

وطن کی مٹی II

قائداعظم کے نظریہ پاکستان کے بارے میں آپ نے اتنا کچھ پڑھا ہے اور اتنا کچھ سنا ہے کہ میں نہ تو اس میں کوئی اضافہ کر سکتا ہوں اور وہ نہ آپ کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتا ہوں۔ کسی کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی کرنا یوں بھی ایک ناممکن سی بات ہے کیونکہ کوئی شخص کبھی بھی کسی دوسرے کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا' ماسوائے اس وقت کے جب نقطۂ نظر اس کا اپنا ہو اور نکل کسی دوسرے کے منہ سے رہا ہو.....اس وقت' جناب والا! ہم سب اپنے ضمیر کی آواز سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ اس آواز کو ہم نے دوسری کی اصلاح کے لیے وقف کر دیا ہے لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ضمیر کی اس آواز کی چیخ پھر بھی کم نہیں ہوتی اور ہم کو اپنے اردگرد کے لوگوں کی اصلاح اور ان کی اصلاح اور رہبری کے لیے نئے نئے مضمون تلاش کر کے نئی نئی تحریریں اور تقریریں وضع کرنی پڑتی ہیں۔

ہمارے ضمیر کی آواز نے ہمارا کام بہت مشکل کر دیا ہے اور ہم ان بدقسمت لوگوں میں سے ہیں جو السر کروا کر بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ قائداعظم کے نظریۂ پاکستان اور تصور پاکستان پر جب میں سیر حاصل کتابیں اور خیال انگیز مضمون پڑھتا ہوں تو مجھے ان نکتہ وروں پر رشک آتا ہے جو بات کی تہہ کو پہنچ گئے ہیں اور جنہوں نے اس حقیقت کا راز دریافت کر لیا ہے کہ پاکستان بنانے سے قائداعظم کا اصل منشا کیا تھا۔ ہمیں نہ تو اس وقت کسی نے بریف کیا اور نہ ہی نظریاتی نقشے پر فلیگ لگا کر اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان کا مطلب برصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد یا اس مملکت سے اقتصادی فائدہ اٹھانا اور پرانی بڑی بادشاہت کی یاد میں ایک چھوٹی سی نئی بادشاہت قائم کرنا ہے جہاں گوری ایسٹ انڈیا کمپنی کو نکال کر عنان حکومت کالی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کرنا ہے اس لیے بات ہم پر واضح نہ ہو سکی۔

میں چونکہ شروع ہی سے ایک غبی اور کند ذہن سٹوڈنٹ تھا اس لیے میرے گھر والوں نے مجھے ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی تعلیم دلوانے کی بجائے مجبوراً فارسی فلاسفی والا سیدھا بی اے کروا دیا۔ اس لیے میں بھی ٹھیک سے پاکستان کا مطلب ان لوگوں کو سمجھا نہ سکا جو میرے حلقۂ ابلاغ میں آتے تھے اور جن کو پاکستان سے

روشناس کرانا میرا فرض تھا۔ کوئی ہمیں ملیچھ نہیں سمجھے گا۔ ہمارے برتنوں میں کھا کر اس کا ایمان کمزور نہیں پڑ جائے گا۔ لوہے کی پتری لگے کاٹھ کے پہیوں والے بھوکاٹ پر جب میں بارہ وولٹ کی بیٹری والا لاؤڈ سپیکر لگا کر دورے پر نکلتا تھا تو میرے ساتھ بلموں والے دو جوان اور لائسنسی پستول والا گاموں نمبردار برابر چلتا تھا میرے دائرہ کار میں حامد والا علی اولک کندھے کے مدوت تڑکے جودھا تکھے کے بکھو اعظم جھنگر گھور کا ریوہ اور فاضل کا کے علاقے آتے تھے۔

عقل چونکہ تھی ہی نہیں اور بتایا کسی نے تھا نہیں اس لیے گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک ہی بات کہا کرتا کہ بھائیو دوستو بھنو متر وانگریز اور ہندو کے ہندوستان کے مسلمانوں کی ابتر حالت دیکھ کر بابے قائداعظم نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے رہنے کے لیے ایک الگ مکان ہو جس میں ہندو انگریز کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ بے دید بے فیض اور بے ایمان کا داخلہ ممنوع ہو۔ ایسا گھر ہو جس میں مسلمان اپنی مرضی سے اپنے لکوں کے حکم کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور خوش رہیں۔ یہ بڑی حویلی جو بابا ہمیں لے کر دے رہا ہے اس کے چار بڑے بڑے کوٹھے ہیں اور پانچواں چوبارہ ہے۔ نام ہے اس کا پاکستان۔ بولو پاکستان زندہ باد......

بھرپور نعرہ لگ چکنے کے بعد میں یقین کا ہاتھ اوپر اٹھا کر ذوق کا منہ کھول کر کہتا سنوسنو! پاکستان میں آپ کو دودھ کی نہریں نہیں ملیں گی۔ ریشمی لباس نہیں ملیں گے۔ ہیر سیال کی چوری نہیں ملے گی۔ مرزے جٹ کی بکی گھوڑی نہیں ملے گی' سوہنی کے برتن نہیں ہوں گے' راجہ لمبا ہن کا تخت نہیں ملے گا' مشکل زندگی ملے گی اوکھا وقت گزرے گا مگر ایک چیز ضرور ملے گی اور ہر حال میں ملے گی اور بے فکر ہو کر ملے گی اور وہ ہوگی عزت۔ عزت نفس مان اور انسان ہونے کے رشتے سے احترام!

سنوسنو! پاکستان میں کوئی امیر ہوگا نہ غریب لیکن گھبرانا نہ کوئی گھر والا ہوگا کوئی بے گھر' پریشان نہ ہونا۔ کوئی عالم فاضل کوئی چٹا ان پڑھ' کوئی گورا کوئی کالا' کوئی نمیالا پر عزت سب کی برابر ہوگی۔ ایک جیسی ہوگی۔ ایک سار ہوگی۔ پاکستان میں کوئی کسی کو ''اوئے'' کہہ کر نہیں بلا سکے گا۔ اس پر پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے ایسے فلک شگاف نعرے لگتے کہ ہندو اور سکھ عورتیں گھبرا کر کوٹھوں پر چڑھ کر ہمارا مجمع دیکھنے لگتیں۔

سنوسنو! جب پاکستان بنے گا تو تم کو کچہریوں اور منصفیوں میں ایسے آوازیں نہیں پڑے گی کہ ''چلو اوئے کوئی قطبا ولد نمدار' ساکن رتہ کھیڑا' ملزم دفعہ 320-321-322 بلکہ' ملزم ہونے کے باوصف آپ کو کچہری میں کرسی ملے گی اور آپ کو ادب کے ساتھ اطلاع دی جائے گی کہ مجسٹریٹ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں کہ آپ کا مقدمہ شروع کیا جائے..... تھانوں اور تحصیلوں میں اہلکار اور افسر کھڑے ہو کر آپ سے بات کریں گے اور سب کام چھوڑ کر آپ کی شکایت سنا کریں گے۔ آپ خاکروب ہوں' کھٹیک ہوں' چمرنگ ہوں' چڑوا ہے ہوں' آپ کی وہی عزت ہوگی جو گورے ڈپٹی کمشنر کی ہوتی ہے اور یہ عزت صرف اس وجہ سے ہوگی کہ

آپ پاکستانی ہیں۔ اس وقت پاکستانی ہونا سب سے بڑے اعزاز کا باعث ہوگا اور ساری دنیا اس غریب ملک کے غریب عزت داروں کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آیا کرے گی۔

پھر میں ان کو خطبہ حجتہ الوداع پڑھ کر سنایا کرتا جو میں نے لکڑی کے دو رولروں کے درمیان فرمان کی طرح لگایا ہوا تھا پھر کہتا۔ سنو سنو! بابے نے حکم دیا ہے کہ بننے والے پاکستان میں ہر کسی کو قابل اعتماد شخص سمجھا جائے۔ ہر باشندے کو اعتماد کے قابل مانا جائے۔ جب تک وہ ناقابل اعتماد ثابت نہ ہو جائے..... اور بابے قائداعظم نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ مال و دولت کے پیمانے سے عزت کی پیمائش ختم کر دی گئی ہے' اس لیے ہر پیشے کا اور ہر پیشہ ور کا پورا ادب کیا جائے' اتنا ہی ادب جتنا اس وقت دولت مند عالم فاضل صاحب حیثیت اور صاحب طاقت کا کیا جاتا ہے..... اور سنو سنو! بابے قائداعظم نے اپنے سارے والنٹیر ورکر قانون دانوں کو حکم دے دیا ہے کہ پاکستان میں غرور اور تکبر کو قابل تعزیر جرم بنا کر اس کو ایک نئی دفعہ کے تحت قانون کی کتاب میں داخل کر دیا جائے' اس لیے پاکستان بن جانے کے بعد کوئی شخص بھی غرور و تکبر اور گھمنڈ اور اکڑ کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا۔ اگر کرے گا تو عدالت کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اور سنو سنو! اور اس بات کو پلے باندھ لو کہ پاکستان میں غریبی بھی ہوگی امیری بھی ہوگی۔ علم بھی ہوگا بے علمی بھی ہوگی۔ گورے ہوں گے' کالے ہوں گے' موٹے پتلے ہوں گے' تگڑے اور مریل ہوں گے۔

کوئی نوکری پر لگ جائے گا کوئی رہ جائے گا کسی کو مزدوری ملے گی کسی کو نہیں بھی ملے گی لیکن عزت و احترام میں سب مساوی ہوں گے اور تکڑی کے تول برابر ہوں گے۔ کوئی انسان کسی انسان کو نہ تو ذلیل و خوار کر سکے گا نہ ہی اپنے سے کمتر سمجھ کر اسے رسوا کر سکے گا۔ گھر میں بازار میں دفتر میں سرکار میں مدینے شریف کی زندگی کا سماں ہوگا۔ مسجد کا سا ماحول ہوگا کہ کپڑے الگ ہیں' رنگ الگ' شکلیں الگ' خوشبوئیں الگ لیکن صف ایک ہی جا ہے' ادھر سے دیکھ لو چاہے ادھر سے ایک ہی سیدھ' ایک ہی سطح' ایک ہی پرا''

اور جب قافلے چل پڑے اور جوان کڑیل بیٹوں کو ذرا سی مٹی میں کھود کر انہی کپڑوں میں دفن کرنا پڑا تو ہر خیر دین نے اپنی بلکتی ہوئی بیوی سے کہا' صبر کر ریاں۔ کاکا اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ اب ہمت کر اور جلدی جلدی سوہنے وطن کی طرف قدم مار جدھر عزتیں سانجھی ہوں گی اور شر میں ایک ہوں گی۔ جدھر ہمارا پہلی دفعہ مان آدر ہوگا۔ ہم کو عزت ملے گی ہم بھی آبرو والے ہوں گے۔ ہمارا ادب ہوگا۔ عزت ہوگی۔

جناب والا! گلی گلی لوک کہیوے مدوث اور زیرے فاضل کا کے بیشتر بزرگ تو فوت ہو گئے لیکن باقی کے کچھ جو اوکاڑے ساہیوال اور عارف والے میں موجود ہیں' میں پچھلے چالیس برس میں انہیں اپنا چہرہ نہیں دکھا سکا' انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں عزت اور آرائش اور شہرت اور نیک نامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں' لیکن انہوں نے آ کر نہ تو کبھی احتجاج کیا اور نہ ہی استفسار..... مجھے پتہ نہیں وہ کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میں تو ان چالیس برسوں میں نظریہ پاکستان پر مطبوعہ اور شنیدہ اور دیدہ مواد سمیٹ کر

یہی سمجھ سکا ہوں کہ میں اس وقت غلطی پر تھا اور نظریہ پاکستان کا مفہوم ٹھیک سے نہ تو سمجھ سکا تھا اور نہ سمجھا سکا تھا لیکن اس میں میرا ابھی اتنا قصور نہیں کیونکہ نہ تو اس وقت کسی نے مجھ کو بریف کیا اور نہ ہی نقشے پر فلیگ لگا کر سمجھایا کہ پاکستان جب بن گیا تو پھر اس کا رخ کس طرف ہوگا۔

میں اس وقت بھی ایک غبی اور کند ذہن طالب علم تھا جس کو گھر والوں نے ڈاکٹر انجینئر بنانے کے بجائے رنا رٹو کر فارسی فلائنگ والا سید حاتی اے کرا دیا تھا اور اب بھی عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں جہاں خود احتسابی کے بعد اپنے آپ کو ایک چور اور ملزم سمجھنے کے باوصف نہ تو خود کو کوئی سزا دے سکتا ہوں اور نہ ہی اس غلطی کا ازالہ کر سکتا ہوں اور نہ ہی مجھ میں کفارہ ادا کرنے کی طاقت باقی ہے۔ اب تو خدا مجھے بخش دے اور وہ بچے کھچے پاک لوگ بھی معاف کر دیں جو کسی زمانے میں حامد والا علی اولک کند ھے کے مدوث تز کے جود بے کھیوے بگھے کے معظم جھنگر گور کے زیرے اور فاضل کا کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ماننے والے اور یقین کر لینے والے لوگ تھے۔ عزت احترام آزادی اور عزت نفس کی آرزو میں یہاں آئے تھے۔ لیکن میں ان سے اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا اور جب وہ کوچہ بازار میں گلی محلے میں کچہری اور منصفی میں ہر کسی سے یہ سنتے ہوں گے کہ پاکستان کے لوگ جھوٹے' بدمعاملہ' رشوت خور' سمگلر' نشے باز اور منافق ہیں تو ان پر کیا گزرتی ہوگی.....

پاکستان کے لوگوں کو احساس ذلت اور احساس ندامت میں مبتلا کرنے کی اس منظم اسکیم کے خلاف اب بھی سینہ سپر ہو جانے کو دل چاہتا ہے لیکن اب مجھ میں قوت وصلاحیت اور وہ امنگ باقی نہیں رہی۔ اس وقت میں صرف اپنی ذات سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہوں اور میری قوت صلاحیت اور ہر امنگ صرف اپنا میک اپ کرنے اور اپنے آپ کو عزت عطا کرنے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ میں پاکستان کے شجر پر اپنی ذات کی امر بیل کو پروان چڑھا رہا ہوں اور میں مجبور ہوں۔

شخصیات

سائیں مرنا

جناب والا! میں سائیں مرنا کو کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن چونکہ ایک ہی محکمے میں ہونے کی وجہ سے ہمارے چہرے ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے رہتے تھے، اس لیے ہم ایک دوسرے کی شکلیں پہچانتے تھے اور ایک دوسرے کو سلاما لیک بھی کر لیتے تھے۔ میں چونکہ اوپر کی منزل پر میز کرسی لگا کر بیٹھتا تھا اور سائیں مرنا پیچھے لان کی گھاس پر بیٹھتا تھا، اس لیے اصولاً اسے مجھے سلام کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی بڑا افسر یا اونچا اہلکار تھا بلکہ صرف اس لیے کہ میرا ایڈیم آف لائف اس کی روزمرہ زندگی سے مختلف تھا اور حفظ مراتب کا یہی تقاضا ہے کہ روزمرہ زندگی والا ویسی آدمی ایڈیم آف لائف والے دیسی آدمی کو آگے بڑھ کر سلام کرے، اس سے مربیانہ جملے سنے اور ان کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کرے۔ کچھ ایسا ہی رشتہ میرا اور سائیں مرنے کا تھا لیکن میں چونکہ دوسرے دیسی افسروں سے زیادہ سمجھدار اور موقع شناس ہوں، اس لیے چھوٹے درجے کے لوگوں کو بے تکلف ہونے کے مواقع بھی دے دیتا ہوں اور وہ بے وقوف سچ مچ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ میں ایک مخلص، نیک نیت، روشن خیال، مرنجاں مرنج اور کھلے دل کا انسان ہوں۔ سائیں مرنا چونکہ ایک سائیں آدمی تھا، اس لیے وہ بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ پڑھا لکھا اور بابو ہو کر بھی اشفاق صیب سائیں آدمی ہے اور اس کے دل میں خدا کا نور ہے۔ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ حسن پرست تھا اور جمال کو پسند کرتا تھا۔ ایک غریب، ان پڑھ اور نچلے درجے کا انسان جب حسن پرستی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بالآخر وہ مارا جاتا ہے۔ ایک سمجھدار پڑھا لکھا شرفائی انسان اور پریشر گروپ سے تعلق رکھنے والا جب حسن کا دیوانہ ہوتا ہے تو اس کے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ مصور بن سکتا ہے، شاعری کر سکتا ہے۔ افسانے لکھ سکتا ہے۔ پلے بوائے کلب کا ممبر بن سکتا ہے۔ Permissive سوسائٹی کا سوینگر بن سکتا ہے اور شہرت اور نیک نامی کے ہوز ہو میں اپنی تصویر چھپوا سکتا ہے لیکن ایک دیسی پینڈو مارا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سائیں مرنا مارا گیا اور ایسا مرا کہ مٹی ہو گیا اور اس وقت تک مٹی ہوا رہا جب تک کہ تعلیم یافتہ حسن پرست سوسائٹی نے اس کو Pantomime کرنے کا پروگرام نہ بنایا۔ آج ہمارے آپ کے مربیانہ اور مشفقانہ

روئیے کی بدولت سائیں مرنا پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک ہم اسے زندہ رکھنے کی خواہش رکھیں گے۔ اس وقت ہم ایک آپریشن تھیٹر میں جمع ہیں اور سائیں مرنا کو ہارٹ ٹرانس پلانٹ کرنے کی رسم ادا کر رہے ہیں۔ جب تک ہمیں اسے زندہ رکھنے کا چمتکار دکھانا مقصود ہوگا، دکھائیں گے۔ اس کے بعد پھر اس کو ابدی نیند سلا دیں گے اور اپنی بیٹری اس کے پنجر میں سے نکال کر کسی اور کا پرزا چالو کرنے کے لیے لے جائیں گے۔ دراصل لوگوں کو زندہ کرنا، مارنا، جلانا، پھر مارنا مہذب سوسائٹی کے پریشر گروپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہم سب اس پریشر گروپ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے وابستہ ہیں۔ حال ہی میں اسلام آباد میں اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا اجزیشن گرڈ قائم ہوا ہے اور یہ تقریب اسی کے مین لائن کنکشن کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ سائیں مرنا کی اس تقریب میں جو ہم سب کے چہرے عقیدت سے روشن ہوئے ہیں تو اسی مین لائن کی بدولت ہوئے ہیں۔

سائیں مرنا کی اکتارہ نوازی کا قائل میں اسی دن ہوا جب اس نے ترنگ میں آ کر میرا بازو پکڑ لیا اور کہا "ایدھرآ بابو بہہ جا دھیان نال سنیں تے کسے نال گل نہ کریں"۔ میں اس کے سامنے گھاس پر بیٹھ گیا۔ سائیں نے اکتارہ چھیڑا تو اس میں سے فرقت زدہ، حرماں نصیب ہیرو کی آواز آنے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے ایکٹرآفتاب بیوفا محبوبہ سے رخصت ہوتے وقت ڈائیلاگ بول رہا ہو۔ پھر سائیں نے کہا کہ سن اگوں کی کہندی اے اور تاروں میں سے موہنی ہیر کی سسکیوں اور ٹوٹے ٹوٹے جملوں کی صدا آنے لگی۔ کہنے لگا سن بادشاہ بولدا اے اور تونبے میں سے تاج مرحوم کی پاٹ دار اور رفیع پیر کی کھرج دار آواز برآمد ہوئی۔ اس کے بعد چند ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہوا جیسے سب دھکے دے کر ہیرو کو صحن خانہ سے باہر نکال رہے ہوں اور ہیروئن چیخ چیخ کر انہیں منع کر رہی ہو۔ میں نے کہا، سائیں خدا کے لیے ایک پانچ منٹ کا آئٹم ریڈیو کے لیے ریکارڈ کرادو۔ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ اس نے کہا، خبردار کسی سے بات نہیں کرنی۔ کسی کو بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ چپ کر، دروٹ جا۔ میں نے کہا، سائیں میں تو سب کو بتاؤں گا، سب سے ذکر کروں گا۔ ہر ایک کو تمہارے کمال فن سے آگاہ کروں گا۔ تے فیر توں میری شکل وی نہیں ویکھیں گا، سنیا۔ میں نے کہا ہاں سنیا۔ بولا فیر سنی ان سنی کر جاتے بھیج جا تیری راہ کھوٹی ہندی ہے۔ میں نے اس بات کا تذکرہ سوائے محمد حسین مرحوم کے اور کسی سے نہ کیا۔ محمد حسین نے کئی مرتبہ سائیں کے قریب ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اس کو سگریٹیں پلائیں لیکن اس سے فرمائش کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ بڑا ہی ضدی اور اڑب قسم کا انسان تھا اور مرضی نہ ہو تو اپنے آپ کو بند کر کے بیٹھ جاتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں نے خود کئی مرتبہ علیحدگی میں اس سے نثر میں اکتارہ سننے کی فرمائش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ یہی کہتا رہا بابو اوہ بیوپاری لد گئے کوئی ہور گل کر۔

اور اس نے ایک دن ریڈیو کے بند سٹوڈیو میں اک ہور گل کر دی۔ میں صبح صبح شیو بنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنا ٹرانسسٹر سن رہا تھا کہ گانے والی کی لے پر ایک کراس ٹاک ابھری۔ کچھ گڑبڑ سڑبڑ ہوئی جیسے کسی

نے کچھ کیا ہو اور پھر گانا ایک دم رک گیا۔ ساز بند ہو گئے اور ٹرانس مشن میں پاز آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اناؤنسر نے نئے آئٹم کا اعلان کیا اور پہلا گانا ادھورا رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ٹرانسمشن میں پاز تو اکثر آ جاتا ہے لیکن ایسا گڑبڑ یا پاز کم ہی آتا ہے۔ جب میں ریڈیو سٹیشن پہنچا تو ہر طرف سرگوشیوں کے جالے سے تنے ہوئے تھے۔ چاچا ستار ایک موٹر کا بونٹ کھول کر سارا جھکا ہوا تھا۔ بونٹ کے باہر صرف ان کی منگھری نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے پچھلے پر ہاتھ مارا تو اچھل کر باہر آ گیا اور مجھے دیکھتے ہی بولا، اوئے پروفیسر ویکھیا اپنے بہن یا کھانگڑنوں۔ تے ہتھ پھیر گیا۔ میں نے کہا، کون دوست کس کا ہاتھ، کون اقبال۔ کہنے لگا اوہی سائیں مرنا نالے سائیں نالے مرنا۔ سٹڈیو وچ ہتھ پھیری کر گیا۔ ہن ساریاں دا ہکو بولے گا۔ میں نے کہا چھڈ یار چاچا تجھے تو ساروں کا ہکو بلانے کا شوق ہے۔ کوئی نیکی بھی ہے تیرے جی میں۔'' کہنے لگا'' چل آغا بشیر تینوں لبھ رہیا اے ساریاں نیکیاں او ہدے کول ای کٹھیاں ہوئیاں ایں توں وی پہنچ جا۔''میں آغا صاحب کے کمرے میں گیا تو سٹاف کے چند ساتھی وہاں پریشان حال گم سم مٹی کی مورتیں بنے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا'' کیا بات ہے آغا جی'' آغا بشیر نے ہاتھ کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور اپنی روایتی دھیمی آواز میں بولے'' بڑا مس ہیپ ہو گیا ہے اشفاق'' میں نے کہا'' جی میں نے کچھ سنا ہے لیکن تفصیل معلوم نہیں۔'' چودھری بشیر نے کہا، اقبال گا رہی تھی اور اس کے بعد سائیں مرنا کا آئٹم تھا۔ دونوں سٹوڈیو میں موجود تھے۔ ساتھ سازندے تھے۔ اقبال کے گانے کے دوران میں سائیں مرنا کو بیٹھے بیٹھے جانے کیا سوجھی کہ اس نے اقبال کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا اور اسے ہلا کر کہا سوہنیے کوئی سوہنی لگدی ایں، اس کراس ٹاک کے ساتھ اناؤنسر نے سٹوڈیو کاٹ لیا۔ ٹرانس مشن میں پاز آ گیا اور پھر دوسرا آئٹم فیڈ ان کرنا پڑا۔ میں نے کہا اس کراس ٹاک کا میں نے بھی نوٹس لیا تھا لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آغا بشیر نے کہا، صاف سمجھ میں آتی تھی۔ آپ نے بے توجہی سے سنا ہو گا۔ مجھے اپنی یا اپنے ادارے کی تو کوئی فکر نہیں، اس بات کا ڈر ہے کہ سائیں مرنا مر جائے گا۔ میں نے کہا، سر اس میں سائیں کے مرنے کی کیا بات ہے۔ ایک کوتاہی ہے Lapse ہے، اس کی سزا بھگت لیں گے۔ لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی اور کہنے لگے۔ اس کی سزا ہم میں سے کوئی نہیں بھگتے گا، صرف سائیں مرنا بھگتے گا اور وہ سزا پاتے ہی مر جائے گا۔ میں نے کہا، سر آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آغا بشیر نے کہا، اس واقعے کے خلاف اخبار لکھیں گے۔ اس پر قارئین کے خطوط شائع ہوں گے۔ پھر یہ احتجاج ایک چھوٹی سی تحریک کی صورت اختیار کر لے گا، سائیں مرنا کو ہیڈ کوارٹر بین کر دے گا اور جب وہ بین ہو جائے گا تو مر جائے گا۔ میں نے کہا، سر پھر کیا کریں؟ کہنے لگے ہو سکے تو اخبار والوں کی منت خوشامد کرو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ ایک مرتبہ معافی دے دیں اور اس واقعہ کو اچھالیں نہیں۔ میں نے کہا، یہ کونسی مشکل بات ہے۔ لکھنے والے آپ کی طرح بیوروکریٹ نہیں ہوتے، صاحب دل لوگ ہوتے ہیں۔ جب میں ان سے درخواست کروں گا اور ہاتھ باندھ کر بنتی کروں گا تو معافی مل جائے گی۔ سب کہنے لگے'' خدا

تمہارے مشن میں برکت دے۔''

انہی دنوں میں نے نیا نیا سکوٹر خریدا تھا اور میرے لیے مقامی رسل و رسائل کی ساری کدورتیں دور ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میں نے سکوٹر نکالا اور اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ مشن پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے سازندوں سے پوچھا کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا، جناب یہ سائیں بے ہی بدمعاش۔ ہم سب چشم دید گواہ ہیں۔ بی بی گا رہی تھیں، ہم اپنے اپنے ساز بجا رہے تھے۔ سائیں کھونجے میں Gelt کی طرح بیٹھا تھا کہ اچانک اپنی جگہ سے ابھرا اور آگے بڑھ کر بی بی کے دونوں کندھے پکڑ لیے اور کہنے لگا'' کاندھی ہوئی کندھی سونٹی لگدی ایں، خبرے بنان والا کنڈا کو سوہنا ہوئے گا۔'' پھر جناب ہمارے تو ساز رک گئے، بی بی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لال بتی کٹ گئی۔ یہ بڑا بد ہے جناب عالی، اس کو ریڈیو سے نکلواؤ۔'' میں نے کہا، میں اس کوشش میں جا رہا ہوں، میرے حق اندر دعا کرنا۔

جس پہلے اخبار کے دفتر میں میں سر نیہوڑا کر اور کندھے جھکا کر نہایت ادب اور مسکینی سے داخل ہوا وہاں سب نے ایک زوردار قہقہے سے میرا سواگت کیا۔'' آ گئے آ گئے سرکاری دلے آ گئے۔'' میں نے دل میں سوچا کہ جو لوگ دلے نہیں ہوتے وہ کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں اور کیسی اچھی اور خوشگوار زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا انہیں وسعت بھی عطا کرتا ہے اور نیک نامی بھی۔ ان کے چہروں پر ایک طرح کا سکون اور طمانیت ہوتی ہے اور وجود سے شفقت کی مقناطیسی شعاعیں نکلتی ہیں۔ میں چونکہ غرض مند تھا، اس لیے میں نے ان کی باتوں کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور ان سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، سائیں مرنا ایک احمق، بے وقوف، نالائق اور پینڈو آدمی ہے اس کو پتہ نہیں...... لیکن انہوں نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور کہنے لگے، بھائی بدمعاش کیوں نہیں کہتے، بدکردار کیوں نہیں کہتے۔ تمہارے آرٹسٹوں کی ڈکشنری میں اس لفظ کی کیوں کمی واقع ہو گئی ہے۔ ہم نے پاکستان تم جیسے بدمعاشوں اور عیاشوں کے لیے نہیں بنایا تھا۔ میں نے کہا، یار و غلطی ہو گئی۔ بندہ بشر ہے۔ ایک مرتبہ معاف کر دو، پھر نہ کرنا۔ انہوں نے کہا تم آئے ہو تو بخش دیتے ہیں۔ نہیں تو خدا کی قسم اگر تمہارا ڈی جی بھی آ جاتا تو بھی یہ رعایت نہ دیتے۔ اس کے بعد انہوں نے کاتب کو آواز دے کر کہا۔'' توکلی صاحب ریڈیو والی خبر کے گرد چوکھٹا موٹا نہ بنانا، درمیانہ رہنے دینا۔'' میں نے کہا'' یار تم خبر دے رہے ہو پھر'' کہنے لگا یہ تو ہمارا اخلاقی فرض ہے لیکن تمہاری وجہ سے ایک تو چوکھٹا باریک کر رہے ہیں دوسرے پہلے صفحے کی بجائے آخری صفحے پر لے جا رہے ہیں۔ اب بھی خوش نہیں ہو۔'' میں نے کہا'' یار میں تو اس غرض سے آیا تھا کہ اس خبر کو Kill کر دیا جائے۔'' سب نے یک زبان ہو کر واہ سائیں جی واہ۔ اس ملک سے اخلاق کا جنازہ ہی نکال دینا ہے۔ میں نے کہا، بداخلاقی والی تو کوئی بات نہیں۔ کہنے لگے، اگر تم جیسا آدمی اسے بداخلاقی تصور نہیں کرتا تو پھر دوسرے شرابی کبابی تو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہوں گے۔ شرم آنی چاہیے اشفاق بھائی۔ ہم نے یہ ملک بڑی محنت اور بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ اگر فحاشی کے اڈوں پر ہم کڑی نگاہ نہ رکھیں تو یہ ملک ایک قحبہ خانہ بن جائے گا۔ جاؤ اور جا کر اپنے سٹیشن

ڈائریکٹر سے کہہ دو کہ خبر بیک پیج پر کروا آیا ہوں۔"

میں جس طرح اس دفتر میں داخل ہوا تھا، اسی طرح سر نیہوڑائے اور کندھے جھکائے باہر نکل آیا۔ دوسرے دفتر میں میں نے بھی کچھ عرصہ کام کیا تھا اور مجھے اس بات کی پوری امید تھی کہ وہاں خبر کل ہو جائے گی لیکن وہاں بھی مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے کہا" یار ایسی خبر برسوں کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ لوگ دلچسپی لے کر پڑھتے ہیں۔ دکاندار دوسری دکان سے اخبار منگوا کر پڑھتے ہیں۔ ہمارا اخبار ایک نئے قاری کے سامنے آتا ہے۔ سیل اور سرکولیشن بڑھنے کی امید بندھتی ہے۔ تم کہتے ہو خبر کل کر دیں۔" میں نے کہا" چوکھٹا لگاؤ گے؟" کہنے لگے، یہ خبر ہی ایسی ہے کہ چوکھٹا مانگتی ہے۔ ہم کوئی اپنی طرف سے چوکھٹا تھوڑی لگا رہے ہیں۔"

میں اپنے مشن سے ناکام واپس آ گیا۔ اگلے دن اخباروں میں چوکھٹے لگے تھے۔ کراچی کے اخباروں نے اس خبر کو لفٹ کیا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کے پراسرار بند کمروں کی اخلاقی گراوٹوں کی داستانیں۔ ریڈیو کے بند کمروں میں دبی دبی نسوانی چیخیں۔ کچھ اس قسم کا مواد تھا اور سائیں مرنا لاہور سے لائلپور واپس جا چکا تھا۔ اس کے بعد انکوائری ہوئی۔ سائیں مرنا پر فردِ جرم عائد ہوگئی۔ اس کے تیس پینتیس سالہ خدمات کے بدلے میں اس کو بین کر دیا گیا۔ سائیں مرنا کے بین ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے بھی یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اخلاقی گراوٹ کا مداوا کس قدر ضروری ہے اور قومیں احتساب کے بغیر کس طرح برباد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ میں بھی اپنے ملک کی اخلاقی انجمن کا ایک سرگرم کارکن بن گیا اور میں نے اپنے گھر پر اور محلے میں اخلاق کا پرچار شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ سائیں مرنا نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر بھی کی لیکن میں نے اس سے ملنا پسند نہ کیا۔ اس کا داخلہ ریڈیو سٹیشن پر بند ہو چکا تھا اور آغا بشیر اپنے بھانویں اسے فوت کر چکے تھے۔ حالانکہ وہ زندہ تھا اور اس میں کوئی کوئی سانس باقی تھا۔ اپنے حساب کے مطابق (یعنی جس تاریخ کو اسے ریڈیو پر اکتارہ بجانا ہوتا) وہ لائلپور سے لاہور آ جاتا اور ریڈیو کے سامنے فیض صاحب کی کوٹھی کے باہر پلی پر بیٹھ جاتا۔ ہم لوگ اپنی اپنی نوکری کی فکر میں اس سے بات تک نہ کرتے۔ یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد لائلپور سے خبر ملی کہ سائیں مرنا مر گیا۔ ہم نے ڈر کے مارے اس کی یاد میں شام کو ریڈیو سے کوئی پروگرام بھی نشر نہ کیا۔ ایک بے یار و مددگار، ان پڑھ، حسن پرست پینڈو کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ ایک ابلاغ نے اسے لوگوں سے متعارف کرایا، ایک ابلاغ نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا۔ ابلاغ کے ذرائع میں بھی وہی ازلی تضاد موجود ہے۔ یہ رحیم اور کریم بھی ہوتے ہیں اور قہار اور جبار بھی اور انسان کو ان سے ڈر کر رہنا چاہیے۔

جنابِ والا! میں سائیں مرنا کو چونکہ بہت کم جانتا ہوں، اس لیے اس کے بارے میں کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔ سائیں مرنے کو زندہ کرنا اب نیشنل کونسل آف آرٹس کا کام ہے جس کے خوبصورت، چاق و

چو بند پڑھے لکھے نوجوان اہلکار فن کاروں سے بڑے مربیانہ انداز میں پیش آتے ہیں اور ایک کرسی پر بیٹھ کر دوسری پر پاؤں رکھ منہ سے پائپ نکال کر کہتے ہیں" کیوں بھئی طفیلیے۔ کالے خاں، مانڈو خوش ہو۔ کچھ فن کی خدمت بھی کرتے ہو یا بال بچوں میں ہی لگے رہتے ہو۔" اور وہ گھگھیا کر کہتے ہیں" حضور کی کرم نوازی ہے جناب عالی، حضور کی بندہ پروری ہے۔ حضور کے خادم ہیں۔ فن کی خدمت ہو رہی ہے حضور ہو کیوں نہیں رہی۔ اور اہلکار کہتا" شاباش شاباش کرتے جاؤ، کرتے جاؤ ہم تمہارے لیے بڑا کام کر رہے ہیں۔ تم لوگوں کے کلچر کی فہرستیں تیار کر رہے ہیں۔ شاباش مرنے شاباش طفیلیے شاباش مانڈو...... شاباش۔

عجیب مانوس اجنبی تھا

صوفی صاحب کا اور میرا استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔ ان کے سینکڑوں ہزاروں شاگردوں میں سے میں بھی ایک ہوں۔ صوفی صاحب شفیق تھے، خلیق تھے اور درگزر کرنے والے تھے۔ انہی چیزوں کے درمیان ان کی بے معلوم سی محبت بھی سنکا کرتی تھی۔ ہمارے یہاں کے بہت سے لوگ ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی ذات کے عاشق تھے مگر مجھ میں یہ صفت پیدا نہ ہو سکی۔ میری ہزار کوشش کے باوجود مجھے ان میں ایسی کوئی بات ہی نظر نہ آ سکی جس سے محبت کی جاتی۔ ویسے بھی ان دنوں میں چند ایسی محبتوں میں مبتلا تھا کہ مجھے اس کے لیے وقت ہی نہ مل سکا۔ وقت ہوتا بھی تو بھی میں اس کار بیکاراں کا شغل اختیار نہ کرتا۔ میں کالج سے نکل چکا تھا اور اب مجھے صوفی صاحب کی کچھ ایسی خاص ضرورت نہ رہی تھی۔ میرا ان کا رشتہ کچھ ایسا تھا جیسے امیر باپ کے دیوالیہ ہو جانے پر بچوں میں والد کا ادب تو رہتا ہے لیکن محبت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن میں نے ایک آدمی کو دیکھا ہے جو صوفی صاحب کی محبت میں کپے گھڑے والی کی طرح شرابور تھا۔ ان کا نام آتے ہی اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں ہونٹ لرزنے لگتے اور فراق کے دکھ سے اس کے چہرے پر بے آواز کراہوں کے بھنور پڑ جاتے۔ وہ عجیب شخص تھا۔

ایک دن اس نے مجھے بانا کی دکان کے پاس روک کر کہا "یار کیا وقت ہے۔ کیا زمانہ ہے۔ کیا حکومت ہے" میں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں بس ایسے ہی ہے۔"

پھر اس کی آواز بھرائی اور اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "یہ صوفی، یہ ہمارا استاد۔ یہ استاد الاساتذہ بیکار ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ مہمان نواز ہے، محفل آرا ہے۔ بادشاہ سخن ہے اور صرف پنشن کے چند داموں پر گزارا کر رہا ہے...... ہے کسی کو خیال اس کا؟"

میں نے ندامت سے سر جھکا لیا تو اس نے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر کہا "وہ...... وہ...... جگہ دیکھتے ہو خانہ فرہنگ ایران۔ یہاں اس کا دفتر تھا۔ اس کے پیچھے اس کے ریٹائرنگ روم میں ہر وقت کشمیری چائے تیار ہوتی تھی۔ کہاں کہاں سے لوگ آتے تھے۔ کیا کیا خاطریں کرواتے تھے۔ کس کس طرح سے اس کو زیر بار کرتے

تھے ..... اور اب وہ لوگ کہاں ہیں۔ کسی نے پوچھا بھی کہ صوفی کس حال میں ہے، کسی نے سوچا بھی کہ صوفی کس حال میں ہے۔ یار استاذ الاساتذہ ..... کوئی معمولی آدمی نہیں ..... صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ..... نصف صدی پر پھیلا ہوا شاعر ..... اردو فارسی پنجاب کون ماں کا لال ہے جس نے ایسی شاعری کی ہو۔ اس جیسا شعر لکھا ہو ..... ہے کسی کو غیرت؟

میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ چلو صوفی صاحب سے مجھ کو محبت نہ سہی تھے تو میرے استاد۔ میں نے ان کے بارے میں اس طرح کیوں نہ سوچا۔ میں نے کیوں محسوس نہ کیا ..... مجھے کیوں پتہ نہ چلا۔

اس نے گڑگڑا کر کہا ''یار اس کے لیے کچھ کرو، کوئی وسیلہ کوئی حیلہ ..... کوئی سفارش، منت خوشامد۔ ہم سب مل کر اسلام آباد جانے کو تیار ہیں۔ اس کو کچھ تو ملنا چاہیے۔ کچھ تو ..... غضب خدا کا اندھیر سائیں کا ..... '' پھر اس کی آواز رندھ گئی اور اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نظریں جھکا لیں۔

میں نے کہا، دیکھو جی کچھ کرتے ہیں۔ کچھ خوشامد درآمد چلاتے ہیں۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور گرجدار آواز میں بولا۔ یہ سالی حکومتیں، یہ ریاستیں یہ نوابیاں، وزیریاں سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ صوفی ایک ہی ہے۔ صوفی بار بار پیدا نہیں ہوتے بھائی جی ..... غضب خدا کا دو دو ٹکے کے میراثیوں، بھانڈوں، کاسہ لیسوں کو ہزاروں روپے کے وظیفے مل رہے ہیں۔ بھڑووں کو مربعے الاٹ ہو رہے ہیں اور صوفی اپنی وضع داری لے کر اس شہر کی انہی سڑکوں پر مفلسی کی حالت میں گھوم رہا ہے جہاں اس کے سینکڑوں شاگرد اونچی کرسیوں پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ افسر بنے ہوئے ہیں حرامزادے!

سامنے کھڑی وین کے گول شیشے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آیا تو پتہ چلا کہ حرامزادوں کی شکل عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔

اس نے کہا ''خدا کی قسم کھا کر کہو، یہ ملک چلے گا۔ یہ حکومت رہے گی۔ معاشرہ پنپ سکے گا۔''

میں نے کہا ''نہیں جی۔''

تو بھنا کر بولا۔ ''پھر ہم لوگ کس لیے ہیں یہاں۔ کیا مقصد ہے ہماری زندگیوں کا۔ کیوں زندہ ہیں جب استاد الاساتذہ اس کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔''

پیشتر اس کے کہ میں اپنی شرمندگی کا وضاحت سے اظہار کرتا وہ میرا کندھا جھٹک کر چلا گیا۔ باٹا شیزاں کے درمیانی ستون والے فقیر نے کہا ''بچ گئے صاحب جی۔ اللہ بھلا کرے!''

چھ سات بلکہ آٹھ مہینے گزر گئے۔ ایک ایسی ہی تقریب تھی۔ اسی نیشنل سنٹر میں۔ لوگ میری عمر کا لحاظ کرتے مجھے ہمیشہ اگلی قطاروں میں پہنچا دیتے ہیں لیکن اس دن میں کافی دیر سے پہنچا تھا۔ بالکل پچھلی قطاروں میں جگہ ملی۔ صوفی صاحب صدارت کر رہے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ پی رہے تھے۔ اس وقت وہ پہلے سے بشاش نظر آ رہے تھے اور ان کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ میں نے خوش ہو کر

اپنے ساتھ والے سے کہا" آج تو صوفی صاحب کا ناک خوب چمک رہا ہے۔"

"ہاں جی کیوں نہیں۔" میرے ساتھ والے نے کہا" اب تو چمکے گا۔ الاؤ کی طرح دمکے گا۔"

"اوہ۔" میں نے کہا" آپ آرام سے بیٹھیں آپ کی آدھی کرسی تو میں نے گھیر لی ہے۔"

"کوئی بات نہیں باباجی آپ جیسے لوگ کرسیاں گھیرنے کے لیے ہی اس دنیا میں آتے ہیں۔"

یہ وہی صاحب تھے جو آج سے چھ سات بلکہ آٹھ مہینے پہلے مجھے باٹا کی دکان کے سامنے ملے تھے۔ میں نے ایک بار پھر شرمندگی کے ساتھ کہا" معاف کرنا جی صوفی صاحب کے لیے ابھی تک شاید......"

اس نے میری بات کاٹ دی اور چمک کر بولا۔" صوفی کی پانچوں گھی میں ہیں جناب اور سر کڑاہی میں۔ دیکھو تو کیا چھیلا بنا بیٹھا ہے...... اسی کے پیٹے میں ہے اور پھر نوکری پر لگ گیا ہے۔"

"نوکری" میں نے حیران ہو کر کہا۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی جیسے کسی کو قتل کرنے سے پہلے لی جاتی ہوگی اور پھر کہنے لگا۔" یہ گورنمنٹ بھی پھتوؤں کی ہے۔ قبر میں لاتیں لٹکائے بیٹھا ہے اور اس کو اٹھا کر آرٹ کونسل کا صدر لگا دیا ہے۔ پندرہ سو روپے مہینہ پر۔"

میں نے کہا، صوفی صاحب کے لیے کچھ زیادہ تو نہیں ہیں۔

اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے الٹے ہاتھ کا لپڑ دینے سے پہلے دیکھا کرتے ہیں۔" کچھ زیادہ!" وہ کہنے لگا" لٹاؤ لٹاؤ۔ لانجیوں کے گز...... اندھے کی شرینی مرمز کے گھر والوں کے لیے...... پندرہ سو آرٹ کونسل سے۔ ہزار دو ہزار لیکچرز سے۔ سواری مفت۔ یونیورسٹی کے پرچے الگ۔" پھر اس نے کسی رسالے کا بھی نام لیا۔ شاید سماجی بہبود کا تھا یا فیملی پلاننگ کا اور روٹھ کر کہنے لگے" لوگ بھوکے مر گئے۔ اصلی ادیب اور شاعر دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور گورنمنٹ بھروں کو بھر رہی ہے۔"

میں نے اپنا چہرہ آگے کر کے اسے شناسائی کی دعوت دی لیکن وہ غصے میں تھا اور سب کچھ بھول چکا تھا۔ اب یہی صدارتوں کے لیے رہ گیا ہے بڈھا گکڑ۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ٹوٹ بوٹ، میر سلوٹ کا چتر۔ یہ سب تعلقات کی باتیں ہیں بھائی صاحب ورنہ ہزاروں شاعروں، سینکڑوں پروفیسر پڑے ہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔

میں نے کہا، آپ بجا فرماتے ہیں۔

اس نے میری شہ پا کر کہا، شہنشاہ ایران نے اس کو ایک قالین بھی دیا تھا قصیدہ لکھنے پر۔ روندے فارسیاں نوں۔

میں نے دبی زبان میں کہا، وہ بہت چھوٹا سا تھا جانماز قسم کا۔

اس نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر کہا، قدم قدم پر تو اس کے شاگرد بیٹھے

ہیں۔ ہر دفتر میں، ہر محکمے میں۔ اس کو کیا پروا ہے..... پندرہ سو آرٹ کونسل سے ہزار دو ہزار پیکجز سے، تین چار سو پرچوں سے۔ فرنج بینے فٹ رسالے سے۔ مفت سواری، مفت کھانا پینا، گھر اپنا، ذاتی، پھر وہ تڑپ کر ابھرا اور بولا "مشاعرے..... مشاعرے..... مشاعرے..... وہ الگ۔ مشاعرے..... مشاعرے۔"

ایک دن صوفی صاحب سفر سے آتے آتے وہیں سے دوسرے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہم نے کھلی گراؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھی اور انہیں دفن کر آئے۔ میں ان کے جنازے پر ان سے محبت کی وجہ سے نہیں گیا تھا بلکہ مجھے خوف تھا کہ لوگ بار بار پوچھیں گے کہ "اشفاق نہیں آیا؟" "بھئی اشفاق کو نہیں دیکھا!" "کیوں نہیں اشفاق نہیں آیا!" "پتہ نہیں جی" "اچھا جی" "ہاں جی"

اگلے دن میں نے اخبار میں انہی صاحب کا ایک مضمون دیکھا جو صوفی صاحب کی محبت میں ڈوب کر لکھا گیا تھا اور اس کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کے ساتھ آہیں اور کراہیں چمٹی ہوئی تھیں۔ میری بیوی نے وہ مضمون بڑے کرب کے ساتھ پڑھا اور کہنے لگی "بہت اچھا لکھا ہے۔ اس سے ملنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ضرور!"

پوچھنے لگی "آپ ان سے ملے ہیں؟"

میں نے کہا "صرف دو مرتبہ۔"

کہنے لگی "کچھ لوگ اس دور میں بھی اس قدر جذباتی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کافی"

بولی "ہم دونوں بھی تو صوفی صاحب کے شاگرد تھے۔ ہم کو ان سے ایسی محبت کیوں نہ ہوئی؟"

میں نے کہا "محبت کی نہیں جاتی بانو قدسیہ! بس ہو جاتی ہے۔"

فیض احمد فیض (1)

جناب والا ہمارے مسلک میں تو یار کی تعریف ہی تعریف ہے اور ہم اپنے اظہار میں ''لیکن'' سے گریز کرتے ہیں اور ہمارے بابے فرماتے ہیں کہ اظہار انسانی میں ''لیکن'' سے زیادہ گندہ اور نجس لفظ اور کوئی نہیں ہے اور اس کا استعمال کرنے والا ذہنی اور شخصی طور پر بڑا ہی مفلوک الحال ہوتا ہے۔ فیض صاحب کی بات کرتے ہوئے یا ان کا ذکر سنتے وقت یا ان کی اپنی باتیں پڑھتے وقت اس حقیقت کا اعتراف ضرور کرنا پڑتا ہے کہ ان کا انجام بخیر ہے اور ان کی عاقبت بہتر ہے۔

بڑی حیرانی کی بات ہے کہ فیصلے تو ابھی بہت بعد میں ہونے ہیں اور حساب کتاب کے حقوق صرف روز آخر کے لیے محفوظ ہیں لیکن کچھ خوش نصیبوں کی عاقبت کے بارے میں لوگ پہلے سے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ اپنے مالک کی نگاہ میں یہ شخص کیسا ہے اور اس کے لیے کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ درجات کی بلندی میں ایک آدھ ڈگری کی اونچ نیچ ہو سکتی ہے لیکن کیٹگری میں کبھی فرق نہیں ہوتا جن کی عاقبت کے بارے میں لوگوں نے ابھی سے فیصلہ دے دیا۔ اس میں بلند ترین مقام تو عابد لوگوں کا ہے جن کی کائنات خدا شناسی سے لے کر مخلوق شناسی تک پھیلی ہوئی ہے اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن سے مخلوق خدا کسی وجہ سے بھی خوش ہو جاتی ہے، خوش رہتی ہے اور پھر...... خوش ہی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کی عاقبت زمینوں پر ہی طے ہو جاتی ہے۔ کیوں طے ہو جاتی ہے؟ اس کا بھید مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا...... بس یہ ایک راز ہی ہے اور صدیوں سے ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔

فیض جیسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ایک کمال کا شاعر تھا اور اس کی شاعری نے لوگوں کو محویت کر لیا تھا اور اس نے غزل کی روایت کو جدید تمبل عطا کیے تھے اور اس نے فارسی ترکیبوں کو بڑے سجاؤ کے ساتھ اردو کے سبزہ زار پر پھیلایا تھا، تو یہ بات تو کئی شاعروں کے بارے میں پہلے بھی کہی جا سکتی ہے جو اچھی بلکہ بہت ہی اچھی شاعری کے باوجود فیض نہ بن سکے۔

اور فیض کو ایک بہت ہی پیارا من موہنا، مخمل، خوش ادا اور متحمل، صاحب برداشت شخص گردان کے اس کی بڑائی کرنا بھی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس کے اپنے عہد میں اس کے اپنے شہر میں اس کی اپنی جانکاری کے

اندر سینکڑوں ہزاروں لوگ ان صفات کے حامل تھے اور اب بھی ہیں...... یا پھر یہ سمجھنا کہ وہ بہت کمال کے ایڈیٹوریل رائٹر تھے، اس وجہ سے صاحب کمال تھے۔ تو ان جیسے بلکہ ان سے بہتر کئی ایڈیٹوریل رائٹر ہو گزرے، ہیں اور ہور ہے ہیں یا پھر یہ کہنا کہ فیض چونکہ ایک انقلابی تھے، ایک سوشلسٹ تھے اسی وجہ سے محترم تھے تو یہ بھی نہیں کیونکہ ان سے بہت بڑے بڑے انقلابی اور سوشلسٹ تھے، ہیں اور ہوں گے لیکن ان کا یہ نصیب نہیں ہوگا...... یا پھر یہ سمجھنا کہ چونکہ فیض کو انسانوں سے اور انسانیت سے پیار تھا، اس لیے وہ محبوب زمانہ کی ایسی اونچی کرسی پر فائز ہوئے تو ان کے مقابلے کے انسان دوست اور انسانیت سے پیار کرنے والے اسی شہر کے انہی گندے مندے علاقوں میں اور بھی بہت سے موجود ہیں لیکن وہ ہمارے محبوب نہیں ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جب کسی خاص معاشرے میں کسی خاص وقت کے اندر خاص تقاضوں کے درمیان جب فیض جیسا تو جہ طلب شخص پیدا ہو جائے تو خواتین و حضرات پھر فیض کا مطالعہ اور تجزیہ چھوڑ کر وخالق فیض کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ کچھ سے کچھ، کیا سے کیا اور کس کو کون کر دیتا ہے، کر رہا ہے اور ہمیشہ کر سکتا ہے۔ وہ جس کو بغیر حساب دیتا ہے تو پھر خوب دیتا ہے اور جس کو عزت عطا فرماتا ہے تو اس کے خلاف سینکڑوں ایڈیٹوریل، ہزاروں ایڈیٹوریل نوٹ اور لاتعداد کالم، بے شمار تقریریں، چھوٹے بڑے جھونپو، پٹاخے، جلسے الٹیناں، شمع پٹخیاں اس کی عزت کے خزانوں سے رائی کے ایک دانے کے برابر بھی کمی نہیں کر سکتیں۔ اس کے فضل کے پرتو کو کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت اور تجویز کا بڑے سے بڑا ہالہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی کسی سائے میں مبتلا نہیں کر سکتا۔

باقی رہا فیض کو خراج عقیدت یا خراج محبت یا خراج مودت پیش کرنا تو جناب والا جس عزت عطا کرنے والے نے اس کی عاقبت اچھی کر دی اور اس کے لیے لوگوں کی محبت اور عقیدت کی نشانی فراہم کر دی تو میں دو ٹکے کا آدمی اس بغیر حساب کی عطا پر کیا روشنی ڈالوں گا...... پہلے فیض سے یاری تھی اور محبت تھی اور اب صرف یہ دعا رہ گئی ہے کہ اس محبت میں کوئی ''لیکن'' نہ آ جائے۔

اور کوئی تجزیہ یا باریک بینی اس محبت کے چھوڑے نہ اتارنے لگے۔ اب وقت کم رہ گیا ہے اور مجھے بھی اچھی عاقبت والوں کی اردل میں چلنے کی خواہش ہے۔

فیض احمد فیض (2)

میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب کی برتری کا راز اور ان کے ہم سب پر ون اپ ہونے کی وجہ ان کی صداقت اور حق گوئی تھی۔ میں نے ان سے جب بھی بڑے دکھ بھرے انداز میں اس بات کا تذکرہ کیا کہ آپ حق گوئی میں ہم سب سے آگے ہیں تو انہوں نے ہمیشہ مسکرا کر کہا کہ بھئی اس حق گوئی کے ساتھ بیبا کی کا لفظ بھی تو استعمال کیا کرو کہ حق گوئی اور بیبا کی کی ترکیبیں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ ان کی بات تو ٹھیک تھی لیکن اس بیان کے ساتھ ان کی معنی خیز مسکراہٹ ہمیشہ ہی عجیب سی لگتی تھی ..... لیکن جب بہت سا وقت گزر گیا اور ہم تجربات و مشاہدات کے پانیوں میں ڈوبتے ابھرتے آگے کو چلے تو معلوم ہوا کہ حق گوئی کا بیبا کی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بیباک انسان حق گو اور حقیقت پسند ہو بلکہ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح ملائیت کٹ حجت ہوتی ہے اسی طرح بیبا کی بھی ضدی ہوتی ہے۔ دونوں کو اپنی ناک کے آگے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دونوں ہی حقیقت اور صداقت سے دور ہوتی ہیں اور دونوں ہی مخلوق خدا کا نقصان کرتی ہیں۔

فیض صاحب کو ہم لکھنے والوں پر (ہم سب لکھنے والوں پر) اس لیے برتری حاصل تھی کہ وہ ایک سچے انسان تھے اور چونکہ صادق کا ہر قول سچا ہوتا ہے اس لیے ان کی ہر بات دلوں میں آسانی سے اتر جاتی ہے۔ ہم جیسوں کی مشکل یہ ہے کہ پہلے ہم کو سچ کہیں سے ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ رسے ڈورے باندھ کے ایک مچان تیار کرنی پڑتی ہے تب کہیں اس مچان پر چڑھ کر Look maine no hands کا شور مچانا پڑتا ہے اور شور مچانے سے چونکہ آواز پھٹتی ہے اس لیے مزید شور مچانا پڑتا ہے۔ بیبا کی اور بے خوفی بڑی ہی مظلوم چیزیں ہیں اور صداقت کے سامنے ان کا جادو نہیں چلتا۔ گو ان کی آواز صداقت اور حقیقت سے بہت اونچی ہوتی ہے لیکن ان کی گرفت ہمیشہ کمزور رہتی ہے۔

فیض کے سارے ساتھی باوجود بڑے شاعر ہونے کے اور فیض کے ہم مسلک ہونے کے ان کے مقام ان کی شہرت اور ان کی موہنی کو نہ پا سکے۔ دراصل نبیوں اور صوفیوں کا بمال رکھنے والا شاعری کا بس ایک ہی راز ہوتا ہے کہ شاعر کی ذات اس قدر معتبر ہو جائے کہ لوگوں کو اس کے کہنے پر بغیر تحقیق و پہچان کے ایسا ہی

یقین آنے لگ جائے جیسا لوگوں کو نبیوں کے کہنے پر ان کی ذات پر اعتبار کے حوالے سے یقین آ جاتا تھا اور وہ بغیر دیکھے خدا کو تسلیم کرنے لگتے تھے۔

ہر لکھنے والے کے لیے مشکل ترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب اس کو یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ وہ حق بات اور سچے تجربے کا اظہار یا مقبولِ عام کرنے کا اعلان کر کے جھنڈی جیت کے لے جائے۔ شہرتِ عام کا ٹکٹ لینے اور داد کی جھولیاں سمیٹ کر محبت اور عقیدت کی گودیوں میں للنا بن کر کھیلے۔ ہمارے یہاں کے سبھی لکھنے والے اکثر و بیشتر یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کچھ ایسی پاپولر سی بات ہوتی رہے جس سے ابلاغ میں ابہام نہ ہو اور سوچ پر بوجھ نہ پڑے۔ یہ فیصلہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ جانفشانی کم ہوتی ہے اور نیک نامی زیادہ' محنت تھوڑی اور محبت والفت کی ''رن اوور'' بہت زیادہ..... لیکن فیض نے یہ فیصلہ نہیں کیا۔ اس نے ایک مسلک سے گہری وابستگی قائم کی لیکن اس مسلک کا مُلّا نہ بنا۔ اس کا صوفی بن کر جیا۔ مُلّا اور صوفی گو ایک ہی مسلک کے پیرو ہوتے ہیں لیکن مُلّا مکا تان کر' سینے پر ہاتھ مار کر' ایڑیاں اوپر اٹھا کر بکرے بلا کر اپنے ہی لوگوں کے چیتھڑے اڑا دیتا ہے۔ صوفی اپنے لوگوں کا گڈریا ہوتا ہے۔ جسے نہ ماننے والوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کا شعور عطا ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات کہتا ضرور ہے لیکن کسی کے چوٹ نہیں مارتا۔ اپنے مسلک کا اظہار ضرور کرتا ہے لیکن دلوں پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ اپنے مسلک کا محب بھی ہوتا ہے اور ناقد بھی۔ ماننے والوں کی کھونٹی نہیں اکھاڑتا۔ خود بھی حیران ہوتا ہے' ساتھیوں کے لیے بھی تحیر کا سامان بہم کرتا ہے..... کہ

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے ہوتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

اب ایسی بات فیض کے علاوہ اس مسلک کے کسی اور شاعر سے کہنی مشکل بلکہ بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے سچ کا اظہار جو اپنے مسلک کا ناقد ہو یا اپنے مسلک سے چھچھلتا ہوا گزر رہا ہو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اپنی محبت پر بے پناہ بھروسہ ہو اور سننے والے اس کے اعتماد کا ایک حصہ ہوں۔ یہ اعتماد کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے اور کس کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا کوئی طے شدہ فارمولا نہیں ہے..... لیکن

ایک روز ہم اپنے گھر کے آنگن میں سیخ کباب بنا رہے تھے۔ دسمبر کی بڑی اچھی دھوپ تھی۔ بانو نے بہت سارا مسالحہ تیار کیا تھا۔ میں سیخیں لگا رہا تھا۔ بانو پنکھی جھل رہی تھی۔ بچوں نے کہا فیض صاحب کو بلا کر لاتے ہیں۔ بڑی اچھی دھوپ ہے۔ خوب موسم ہے۔ ان کی موجودگی میں بڑی برکت رہے گی۔ میں انہیں روکتا ہی رہا لیکن میرا بڑا بیٹا موٹر نکال کر فیض صاحب کو ساتھ لے آیا۔ واقعی ان کے آنے سے سارا آنگن برکتوں سے بھر گیا۔ وہ دھوپ سے ذرا پرے ہو کر سائے میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا فیض صاحب یہ کیا ہوا سر کہ۔

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگے
ایسا نہ ہوا ہر دھارے میں
کچھ ان دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکی پتواریں تھیں
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اور جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے

میں نے کہا ''یہ کیا ہوا سر جی اس میں تو کچھ مایوسی سی آگئی۔'' کہنے لگے جب مایوسی کی لہر آئے اور انسان اس کا اظہار نہ کرے اور اس کو کسی سلوگن کے دستر خوان تلے چھپا دے تو پھر وہ صداقت سے دور ہو جاتا ہے۔ تخلیقی فنکار کے لیے یہی لازم ہے کہ وہ ہر حال میں نرو تھہ کا اظہار کرے خواہ اس کے لیے اسے اپنی بھرپور شخصیت کو پورے کا پورا کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ میں نے کہا فیض صاحب یہ تو بڑا خوفناک بیان ہے۔ ہم لکھنے لکھانے والے یہ سب کچھ داد پانے اور محترم ٹھہرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ہم کس طرح سے ایسا بیان اپنے آپ کے ساتھ باندھ سکتے ہیں اور کب ایسا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بولے مشکل کام تو ہے بھئی لیکن مشکل کام ہی تو کیے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ آسان کام تو کرنے ہی نہیں چاہئیں۔ یہ تو خود بخود ہو جایا کرتے ہیں۔

آپ کے اٹھنے سے آپ کے بیدار ہونے سے پہلے۔
بانو نے کہا" فیض صاحب سب سے مشکل کام کونسا ہے؟
کہنے لگے" محبت کرنا۔
"اور سب سے آسان" میرے بیٹے نے پوچھا۔
فیض صاحب نے کہا" محبت کروانا"

ہم سب خاموش ہو گئے تو فیض صاحب نے کہا" محبت کروانے کی دھن میں انسان بہت ہی آگے نکل جاتا ہے اور وہ بڑا ظالم' بڑا چھوٹا اور بہت ہی مکار بن جاتا ہے ..... دیکھو بھئی اگر محبت کر نہ سکو تو محبت کرواؤ بھی نہیں۔ زندگی آرام سے گزرے گی اور پرسش بھی نہیں ہوگی۔"

اپنے آخری ایام میں فیض صاحب چونکہ بہت ساری باتیں کرنا چاہتے تھے اور کرنے بھی لگے تھے اور اس وقت ایک سلسلہ شروع بھی ہو گیا تھا تو میں نے ان سے کہا" سر! تخلیقی عمل میں حقیقت کا اور Truth کا عمل کس طرح سے آتا ہے اور فنکار سچائی کو کس طرح سے اختیار کر سکتا ہے؟" تو انہوں نے بڑے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا" کون ہے بھئی جو تر وتحہ کا اظہار کرنا چاہتا ہے" تو میں نے کہا" سر فرض کیجیے میں ہی اس کے اظہار کی طرف مائل ہو جاؤں ..... تو پھر کیا کروں ......"

اب کے وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے" ایک بات یاد رکھنا' تم لکھنے والے لوگ ہو اور ابھی تمہیں اور بہت کچھ لکھنا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں کو علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا' ان کو محبت عطا کرنا۔ علم وہ کہیں اور سے بھی حاصل کر لیں گے لیکن محبت کے طلبگار وہ تم ہی سے ہوں گے۔ تم لوگوں سے ہمیشہ یہی غلطی ہوتی ہے کہ تم اپنے چاہنے والوں کو آگاہی دینے لگتے ہو اور تمہارے درمیان یگانگت کا اور اعتماد کا رشتہ نہیں رہتا۔"

پھر وہ چونکے اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے" یہ کیا ہو رہا ہے۔ بھئی ہم کو محض باتیں کرنے کے بلایا تھا۔ باتیں تو ہم ٹیلی فون پر بھی کیا کرتے ہیں' یہاں تو جیتے جاگتے لوگ اور لوگوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کا مواد بھی موجود ہے لیکن انہوں نے خود کچھ کھایا نہیں۔ یہی کہتے رہے کہ اب کچھ کھایا نہیں جاتا۔ کھانے والوں کو دیکھ کر سیری ہو جاتی ہے۔ طبیعت بشاش ہو جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

روح میں یہ کمی ہے کہ وہ نظر نہیں آتی اور اس سے کوئی تصور نہیں بندھتا۔ شخصیت میں یہ خرابی ہے کہ اس کے چوکھٹے بنے بنائے ملتے ہیں اور ان میں کوئی اپج نہیں ہوتی اور شخص میں یہ برائی ہے کہ وہ جسم سے آگے جانے نہیں دیتا۔ وقت گیٹ کیپر سا بنا کھڑا رہتا ہے لیکن قاسمی صاحب کے گیشٹالٹ کے لیے تو بالکل ہی کوئی اور لفظ ہونا چاہیے اور پھر اس کی اتنی ہی معرفت ہونی چاہیے اور اس معرفت میں سیدھے ابلاغ کا کوئی آسان سا ذریعہ ہونا چاہیے تب جا کر مخاطب کو یا پوچھنے والے کو بتایا جا سکتا ہے کہ پیرزادہ کے معنی سوا کاز کب بن جاتے ہیں اور سچائی پیراڈوکس کے بغیر بنیاد کیوں نہیں پکڑتی۔

احمد ندیم قاسمی شخص شخصیت اور فرد سے ماورا ایک راستہ ہے اور اس راہ کا سفر طے کرنے کے لیے شکوہ سے زیادہ راہگیر پر بوجھ ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ کوئی سڑک کبھی بھی ایک ہی منزل کی طرف نہیں لے جاتی۔ ہر راہ کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ دو متضاد رخ! جو سڑک آپ کو وہاں لے کر جاتی ہے وہی سڑک آپ کو یہاں بھی لے کر آتی ہے۔ آگے جانے اور واپس آنے کے لیے ہمیشہ ایک ہی راہ ہوتی ہے۔ راہ ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس کے رخ دو ہوتے ہیں۔ چاہیں تو آپ آگے جا سکتے ہیں چاہیں تو اس پر پیچھے مڑ آتے ہیں۔ فیصلہ آپ کا ہے دستگیری راستے کی ہے۔ چھوٹے اور بڑے فنکار کے تخلیقی عمل میں یہی فرق ہے کہ چھوٹا آپ کو پکڑ کر اپنے فن کی کوٹھڑی میں بند کر دیتا ہے اور آپ کی اتنی خدمت خاطر کرتا ہے کہ آپ کو اس کوٹھڑی سے نکلنے ہی نہیں دیتا اور بڑا فنکار آپ کے لیے راستہ بن جاتا ہے۔ آنے کے لیے بھی اور واپس جانے کے لیے بھی لیکن یہ مرتبہ ہر بڑے فنکار کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے حصے میں آتا ہے جو اپنی ذات کا کانٹا فن کے تلوے سے نکال کر الگ کر دیتا ہے اور جس راہ میں کانٹے کا خوف نہ رہے اس پر مداح اور مخالف بلا خوف و خطر ایک ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ ایسی سڑک جانے والوں کے لیے بھی آسانیاں فراہم کرتی ہے اور واپس آنے والوں کو بھی برابر کی سہولتیں عطا کرتی ہے۔

میں ندیم صاحب کے فن، ان کی شخصیت، ان کے مزاج کے بارے میں تو کچھ لکھ سکتا تھا لیکن جب ان کا نوفل گشتالت شاہراہ ریشم بن گیا تو میں رک گیا۔ راہ کا بیان تو کوئی سالک ہی کر سکتا ہے، چنگی محرر کدھر سے کر سکتا ہے۔

حفیظ جالندھری (شخصیت)

میں نے کئی مرتبہ حفیظ صاحب پر کچھ لکھنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ رک رک گیا۔ کچھ اس لیے نہیں کہ مجھے لکھنا نہیں آتا یا میں حفیظ صاحب پر لکھ نہیں سکتا یا میرے پاس سب سے الگ اچھوتا مواد نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ میری اور ان کی ''یاری'' کئی برسوں پر پھیلی ہوئی ہے اور ان سالوں کی جالی میں کئی پھول، کلیاں، تتلیاں، ٹڈے، بھورے، کنکے، پودنے پدے واقعات کی صورت میں پھنسے ہوئے ہیں اور میں جب بھی ان کا ذکر کرتا ہوں تو اس میں ''میں'' کا ذکر ضرور آ جاتا ہے اور ادب کے پنڈتوں کا خیال ہے کہ کسی دوسرے کی بات کرتے ہوئے ''میں'' کا گلا گھونٹ کے رکھنا چاہیے اور اپنے ذکر کو بقدرِ ضرورت بھی نہیں آنے دینا چاہیے اور یہ پتہ ہی نہیں چلنے دینا چاہیے کہ آپ کا اور اس کا کوئی رشتہ بھی تھا...... بس یہی ایک چیز دوستوں کے ذکر میں مانع رہی ہے جن میں ایک حفیظ صاحب بھی تھے۔

جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے کئی راستے ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی پہنچ اور اپنی اپنی جیت کے حوالے سے راستہ اختیار کرتا ہے اسی طرح حفیظ صاحب تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ بزرگنوان رشی منی، تیاگی اور گیھاواسی کہتے ہیں کہ چوٹی جتنی اونچی ہوگی رستے اتنے ہی پر پیچ ہوں گے اور رستہ جتنا سیدھا ہوگا چوٹی اتنی ہی آسان ہوگی۔ حفیظ صاحب تک پہنچنے کے لیے میں نے ہمیشہ اپنی پسند کی تین پگڈنڈیاں اختیار کیں اور ہر ایک کو دوسری سے روشن تر اور دلچسپ تر پایا۔ ان میں سب سے پہلی اور میرے روزمرہ کے اختیار کی پگڈنڈی حفیظ کی افسانہ نگاری کی تھی جس نے انہیں میری نظر میں ایک بلند پایہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ''ڈیمی گاڈ'' سا بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں تفصیلی گفتگو تو پھر کبھی ہوگی فی الحال اس قدر جان لیجیے کہ حفیظ انجانے میں ایسے افسانے لکھ گئے تھے جو پرانے روسی افسانہ نگاروں کی طرز پر تھے اور جن میں انسانوں کے دکھ اور حالات کے دباؤ ویسے ہی تھے جیسے گورکی اور دوستووسکی کی کہانیوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ہمارے یہاں کی ڈریسنگ ذرا رومانوی ہے اور اس کو اپنی تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

حفیظ کی چوٹی تک پہنچنے کی دوسری پگڈنڈی ان کے Scientific Vision کی تھی جس سے ہم

مشرق کے لوگ زیادہ مانوس نہیں ہیں اور جو ہماری گرفت میں آسانی کے ساتھ آیا نہیں کرتی۔ حفیظ اس معاملے میں ہم سے بہت مختلف تھے کہ ان کے پاس سائنسی بصیرت تھی اور اس معاملے میں بالکل ہمارے ساتھ کے تھے کہ ان کا رویہ یا Attitude سائنسی نہیں تھا۔ وہ جس بات پر اڑ جاتے تھے اسی پر اڑے رہتے تھے اور اس میں دوسری قسم کی گنجائش پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ''چیونٹی نامہ'' ان کے سائنسی تجسس اور سائنسی بصیرت کی دلیل ہے اور اردو ادب کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے تشخص و تعین میں ابھی کافی وقت درکار ہوگا۔ اردو کے کسی اور ادیب یا شاعر نے اس نوع کی طبع زاد کتاب کہیں اور لکھی ہو تو مجھے اس کا علم نہیں لیکن جہاں تک محققوں اور تاریخ ادب اردو کے طالب علموں کا مذکور ہے وہ کسی ایسی تحریر کی نشاندہی نہیں کرتے۔ ''چیونٹی نامہ'' چونکہ ہمارے رومانوی اور غزل الغزلاتی مزاج سے دور کی چیز ہے۔ اس لیے ایک عام قاری کے لیے حفیظ صاحب تک پہنچنے کا رستہ نہیں ہے لیکن موجود کا قاری چونکہ ہمیشہ نہیں رہے گا اس لیے نئی نسل اور حفیظ کے درمیان بہت دیر تک راستے کا پتھر نہ بن سکے گا۔ اگر ایک ایسے ہی موضوع کے اظہار سے بلجیم کا مورس ماترلنک دنیائے ادب میں آفاقی شہرت حاصل کر سکتا ہے تو حفیظ کی بقائے دوام کے لیے یہی ایک چھوٹی سی کتاب ابدیت کا درجہ اختیار کر سکتی ہے۔

حفیظ کے کلہ کوہ تک پہنچنے کے لیے ایک اور راستہ ان کے تجربات اور مشاہدات تھے جو ان کی زندگی کے ماہ و سال پر چھوٹے بڑے سوال بن کر پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن ہر پڑھے لکھے، صاحب تحقیق و تفتیش کی طرح وہ بھی تشکیک سے بہت گھبراتے تھے اور ہر سمجھ میں نہ آ سکنے والے واقعے کو ''واہیات'' اور بے معنی کہہ کر رد کر دیتے تھے۔ کتوں سے دعا کرانے والا واقعہ میں نے بڑی منت خوشامد کے بعد ان سے لکھوایا اور پھر اسے چھپوانے کے لیے کئی مرتبہ پالا گن کیا جب جا کر وہ واقعہ اشاعت پذیر ہوا۔ میں نے ان کی خدمت میں ان پر گزرے ہوئے دوسرے محیر العقول واقعات قلمبند کرنے پر بہت ہی زور دیا لیکن وہ مانے نہیں۔ اس عہد کے تینوں بڑے شاعر جوش، فیض، حفیظ تحیر سے اور تشکیک سے دور دور ہی رہے اور علم کے مقابلے میں یا تحقیق کے سامنے شاعری کو برقع پہنا کر ہی گزار لے گئے۔ حالانکہ اگر آپ غور کریں گے اور کافی توجہ دے کر مشاہدہ کریں گے تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ تحقیق مردہ ہے اور تشکیک زندہ ہے۔ جو بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی اور اس تحقیق کو فلسفیوں، نکتہ وروں اور سائنس دانوں نے طے کر دیا وہ جز دانوں میں لپیٹ کر آہنی الماریوں میں محفوظ ہو گئی، طے پا گئی، ختم ہو گئی، مر گئی لیکن جو بات تشکیک کا شکار رہی اور ماننے اور نہ ماننے جانے کے درمیان گھومتی رہی وہ ہمیشہ زندہ رہی اور ہر عہد کے لوگوں کے سامنے ایک چیلنج بن کر کھڑی رہی۔ حفیظ صاحب کے سامنے ایسے بہت سے چیلنج تھے جو انہوں نے زندگی کے دشوار گزار صحراؤں سے حاصل کیے تھے لیکن وہ ان چیلنجوں کو اور ان للکاروں کو تحریر میں لانے سے گریز کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ایک بہت ہی واضح، شفاف اور بے خطر رستہ تھا جو اس عظیم شاعر کی بلند تر چوٹی پر جاتا تھا۔ میں نے نجی محفلوں میں، ملاقاتوں میں، ان سے گفتگو میں، بحث میں اور

گستاخی میں ہمیشہ یہی راستہ اختیار کیا اور ان تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔

حفیظ اس عہد کے وہ عظیم شاعر ہیں جو Unsung رہے اور جس قدر توجہ اور داد کے وہ مستحق تھے وہ انہیں نہ مل سکی لیکن یہ کام میرا، آپ کا، ہمارا نہیں یہ کام کسی اور کا ہی ہے۔ اس خیر کا دریچہ کسی اور طرف سے ہی کھلتا ہے۔ کچھ میرے جیسے بے صبرے عاشق اور تاولے گرویدے کمندیں پھینک پھینک کر دریچہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ حال پر خوش، دعا گو صرف تعلق پر ہی مسرور رہتے ہیں۔

سنتے ہیں غالب بھی اپنے عہد کا بڑا Unsung Poet تھا اور شیفتہ اور علائی کو بھی اس بات کا بڑا دکھ تھا لیکن جب غالب اپنا زمانہ گزار کر ہمارے عہد میں داخل ہوا تو شعر کا فہم اور شاعری کی علامت ٹھہرا اور ہر شاعر اس کی میزان پر تولا جانے لگا۔

اصل میں یہ تو دریچہ کھلنے کی بات ہے اور کھولنے والے کی مرضی پر منحصر ہے۔ یہاں وقت کی کوئی قید نہیں۔

زوبی میرا دوست

زوبی میرا دوست نہ بھی ہوتا تو بھی میں اس کو ایک بڑا فنکار ہی سمجھتا۔ حالانکہ میرے سمجھنے اور نہ سمجھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پھر بھی اس کو اصرار ہے کہ میں چار گواہوں کے سامنے اس امر کا اعلان کروں کہ زوبی ایک عظیم آدمی، ایک عظیم فنکار اور ایک عظیم تخلیقی قوت ہے۔ یہ بالکل زوبی کا بچپنا ہے اور آپ خود دلیل آفتاب کے طور پر اس کے مرقعات کا جائزہ لے چکے ہیں۔

اب جبکہ ہم زندگی کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جہاں سے بس ایک جست کی کسر رہ جاتی ہے تو کچھ پرانی باتیں کہہ دینے اور کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے اور زوبی نے عہد کیا تھا کہ ہم اپنی اپنی لائن میں بڑے آدمی بننے کی کوشش کریں گے اور شمالی ہندوستان کے Whos Who میں داخل ہونے کے لیے سرتوڑ کوشش کریں گے اور اگر نیا ملک پاکستان بن گیا تو اس کے دونوں حصوں کے معروف لوگوں کی صف اول یا زیادہ سے زیادہ صف دوم میں اپنا اپنا مقام ضرور حاصل کریں گے۔ میں تو خیر نوکریوں اور ملازمتوں کی ذلتوں میں لتھڑا رہا۔ اس لیے اس معاہدے کو پورے طور پر نبھا نہ سکا لیکن زوبی نے اپنے زورِ عمل سے اور اپنی دن رات کی محنت سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شمشیر زن جس میدان کو فتح کرنے کا تہیہ کرتا ہے اس کو فتح کر کے چھوڑتا ہے۔

اصل میں اگر ہم دونوں کو بچپن میں ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے نہ دی جاتیں جن میں اولوالعزم لوگوں کے قصے، بہادر لوگوں کی داستانیں اور غریب بچوں کے ترقی کی منازل طے کرنے کی روایتیں نہ ہوتیں تو ہم بھی ایسی واردات نہ کرتے اور خلقِ خدا ہمارے بوجھ سے محفوظ رہتی لیکن ہمارے بزرگوں نے ہمیں قصے ہی ایسے سنائے تھے اور کتابیں ہی ایسی لے کر دی تھیں کہ ہم نے سوائے ترقی کرنے کے اور اپنی راہیں خود سنوارنے کے اور اونچے ستاروں پر کمند ڈالنے کے سوا اور کچھ سوچا ہی نہیں۔ نہ اپنے ارد گرد سے محبت کی نہ انسان کو انسان سمجھا۔ نہ الفت کے دربار کی دربانی کی نہ عجز و نیاز کے مزے لوٹے۔ ہم تو خیر اچھے رہے لیکن ہمارے ارد گرد ہم سے کتنے خون ہو گئے اور کیسے کیسے معصوم قتل ہو گئے، اس کا ہمیں علم نہیں۔ پھر ہم ایسے نظام

تعلیم کے سکہ بند پھوڑے تھے جو علم عطا نہیں کرتا، مینڈھے تیار کرتا ہے۔ یہ نظامِ تعلیم ہمارے ملک میں ہی نہیں سارے عالم اور پورے کرہ ارض پر جاری ہے۔ یہ خوبصورت اور معصوم اور شریف اور فرشتہ صفت بچوں کو مقابلے پر اکساتا ہے اور ان میں مقابلے بازی کی روح پیدا کرتا ہے اور کمپنی مشن کے زہر کے ٹیکے دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر فرسٹ آؤ گے تو یہ انعام ملے گا، سیکنڈ آؤ گے تو یہ انعام دیا جائے گا۔ سارے سکول میں اول رہو گے تو وظیفہ ملے گا۔ نقدی ملے گی، باہر کے ملکوں کی سیر ملے گی اور بہت سے انعام ملیں گے۔ چنانچہ وہ معصوم البلا اور فرشتہ پھوڑا اس انعام اور اس خصوصی برتاؤ کے شوق میں ٹکریں مارنے والا ایسا بھیڈو بن جاتا ہے کہ سب اس کے قریب آنے سے گھبراتے ہیں اور کنی کتراتے ہیں۔ علم کے باڑوں سے جنہیں ہم درس گاہیں اور دانش گاہیں کہتے ہیں، ایسے ڈھڈئیل چھترے اور مینڈھے برآمد ہوتے ہیں جنہوں نے چودہ سال کی مدت میں آگے بڑھنے کے لیے تاک کے ٹکر مارنے کا فن بہ طریق احسن سیکھ لیا ہوتا ہے۔ پھر وہ زندگی کی جو راہ بھی اختیار کرتے ہیں، جس شعبے کو بھی اپناتے ہیں، اپنے ارد گرد کے لوگوں کو ٹکریں مار مار کر گراتے جاتے ہیں، زخمی کرتے جاتے ہیں اور راہ خالی بنا بنا کر ترقی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ درس گاہیں اور دانش گاہیں خوبصورت، شریف النفس اور قابل رشک انسان پیدا نہیں کرتیں بلکہ مقابلہ باز تیغ زن Competition پیدا کرتی ہیں۔ ہمارے یار عزیز قیوم قریشی صاحب نے بھی ایک طویل و عریض باڑہ کھول رکھا ہے۔ وہ بھی زمانے کے قاعدے کے مطابق اول، دوم، سوم اور وظیفہ خور اس کو قرار دیتے ہیں جو اپنی انا کو پالتا ہے اور دوسروں کو معمولی، گھٹیا تھرڈ ڈویژن بنانے میں زور لگاتا ہے۔ دنیائے علم کے نزدیک لائق، شریف، قابل تقلید اور مثالی طالب علم وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ بابر نے کون سے سن میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا یا خط سرطان اور خط جدی کے درمیان کون سی دنیا آباد ہے یا لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے محاورے کا کیا مطلب ہے۔ دوسرا طالب علم خواہ کتنا ہی شریف کیسا ہی اچھا شہری کتنا اچھا پاکستانی کیا اعلیٰ مسلمان کیسا مثالی بیٹا اور بھائی کیوں نہ ہو، مقابلہ باز اور زور آور اور Competitive سپرٹ سے رچے ہوئے کے سامنے ڈفر، خرا گین کی بھرتی بیکار اور نالائق کہلاتا ہے...... ہم دونوں بھی چونکہ نالائق کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ہم نے بھی دائیں بائیں خوب تیغ آزمائی کی اور جو ہماری راہ میں آیا اس کو روندتے ہوئے کاٹتے ہوئے اونچی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور الحمدللہ کافی اونچے ہو گئے۔ ہمارے کچھ ساتھی اس Conpetitive Spirit کے سہارے سی ایس پی میں کامیاب ہو کر بیورو کریٹ ہو گئے جو یہ سپرٹ دو آتشہ رکھتے تھے وہ سیاست کے میدان میں چلے گئے اور امیر وزیر ہو گئے۔ عجیب بات ہے کہ مخلوق خدا کے خدمت گزاروں کے علاوہ اور جو کوئی بھی کسی اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے یا عظیم ہوتا ہے یا گریٹ ہوتا ہے۔ اس کی آستین پر کئی معصوموں کے قتل کا خون ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی ارفع انسان سمجھا کرتا ہے۔

زولی بڑے غضب کا مصور ہے۔ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اس نے جو تصویریں، جو مرقعے

اور جو مجسمے بنائے ہیں وہ آپ نے دیکھے ہیں۔ انہیں پسند کیا ہے، ان کی داد دی ہے۔ ان سے مسحور ہوتے ہیں لیکن اس کی وہ تصویریں جو اس نے اپنی معصومیت کے دور میں بنائی تھیں، وہ آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔ شگوہ کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن یہ زوبی نہیں ہے۔ اس کا اصل وہ رنگدار مرقعے ہیں جو وہ شہرت، ناموری، جہدِ مسلسل، کوشش پیہم اور تجویز اور پلاننگ کی سیڑھی سے اتر کر بناتا ہے اور کسی کو دکھاتا نہیں۔ کہا کرتا ہے یہ میری عبادت ہے اور عبادت کسی کو دکھا کر نہیں کیا کرتے۔ عبادت ترقی کے لیے نہیں، سرخروئی کے لیے کی جاتی ہے۔ مجھے لوگوں کی نظروں میں متقدر ہونے دو۔ خبردار جو کسی اور سے اس کا ذکر کیا۔ بھاگ جاؤ۔

یہ آئل کلر کے مربع چوکھٹے ہیں۔ دو فٹ بائی دو فٹ۔ خطاطی نہیں ہے، کتابت بھی نہیں۔ بس رنگ ہیں، گھلے ملے، کھلے کھلے، ملے جلے اور یوں لگتا ہے جیسے لکھا ہو۔ النبی الامی، افضا لک ذکرک، یا مزمل، یٰسین، کن فیکون...... میں کہتا ہوں، یہ بھی لوگوں کو دکھاؤ۔ کہتا ہے ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔

زوبی کمال کا آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہے ایک دن یہ چپکے سے شہرت ناموری اور ترقی کے زینے سے نیچے اتر کر پھر تھرڈ ڈویژن مخلوق خدا میں مل جائے گا اور میں اپنی انا کی نیم پر اسی طرح بیٹھا رہ جاؤں گا جیسے چھوٹی بلی درخت پر چڑھ تو جاتی ہے لیکن پھر اس سے نیچے نہیں اترا جاتا۔ وہیں ایک بڑے سے ڈالے پر پڑی پڑی سوکھ جاتی ہے۔

کاش 1943ء میں جب ہم نے سید مٹھا کی ایک تنگ گلی میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ ہم اپنی قوم اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کرنے کے لیے ترقی کریں گے اور جو ہماری راہ میں آئے گا اسے روندتے جائیں گے تو اے کاش اس وقت ساتھ ہی یہ معاہدہ بھی کر لیا ہوتا کہ ہم واپس اپنی تھرڈ ڈویژن قوم میں جائیں گے اور اپنے بچھڑے ہوئے ملنگوں سے گلے ملیں گے تو اکٹھے ہو جائیں گے اور ہم سے کوئی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا...... لیکن اس وقت اپنے زورِ عمل میں اور اپنے خوش آئند مستقبل کی لگن میں ہم ایسا معاہدہ کرنا بھول گئے...... اچھا زوبی!

محمد حسین

آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے۔

جالندھر میں ماسٹر رحمت علی کی تھیٹریکل کمپنی ڈرامے اسٹیج کر رہی تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی منڈوے کے گرد منڈلاتے۔ اس ہجوم میں دولڑکے بھی تھے۔ دونوں سگے بھائی، تھیٹر کے رسیا، تماشا دیکھنے کے لیے سکول سے بھاگے۔

تھیٹریکل کمپنی تماشا دکھا کر جالندھر سے چلی گئی تو یہ دونوں بھائی اس کمپنی میں شامل ہونے کے لیے اپنے گھر سے ایسے بھاگے کہ آج تک واپس نہیں آئے۔ جب کمپنی ہوشیار پور میں اپنا تماشا دکھا رہی تھی تو لوگوں نے اسٹیج پر دو نئے چہروں کو دیکھا جو اپنی اداکاری کی وجہ سے بہت جلد مقبول ہو گئے۔ اب دونوں کو درسی کتابوں سے اپنا سبق نہیں پڑھنا پڑتا تھا۔ اب ان کی کتابیں وہ ڈرامے تھے، وہ کردار تھے جنہیں وہ یاد کر کے اسٹیج پر اس طرح پیش کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو ان کی ذاتی زندگی کا آج تک پتہ نہ چل سکا۔

بڑے بھائی کو پونے دوسو اور چھوٹے کو ڈیڑھ سو ماہوار ملتا تھا لیکن زندگی کا یہ سنہری زمانہ "سو فیصدی گاتی بولتی فلموں" نے ماند کر دیا اور رہی سہی کسر ریڈیو نے پوری کر دی۔ ماسٹر رحمت علی کی تھیٹریکل کمپنی ٹھپ ہو چکی تھی۔ بڑا بھائی کسی اور کمپنی میں ملازم ہو کر کلکتے چلا گیا اور چھوٹا بھائی اسٹیج سے بہت دور نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے والے ہجوم کی آنکھوں سے اوجھل آل انڈیا ریڈیو دہلی کے بند سٹوڈیو میں مائیکروفون کے سامنے صداکاری کے جوہر دکھانے لگا۔ بچوں کے پروگرام میں منھو میاں، عورتوں کے پروگرام میں نانی عشو، ڈراموں کا ہیرو، رقیب دوست اور کئی دوسرے کرداروں کو وہ اپنی آواز سے اجاگر کرتا رہا۔ ان مختلف کرداروں کو مختلف آوازوں میں پیش کرنے والی آواز فقط ایک تھی اور یہ آواز محمد حسین کی تھی۔ وہی آواز جو قریب قریب بیس برس سے ہوا کے دوش پر ہے۔

اس طویل عرصے میں تھیٹر کو زندہ کرنے کے لیے محمد حسین نے دو بار اپنی زندگی میں دو بڑی ناکامیوں کا سامنا کیا۔ دلی میں پہلی بار 1937ء میں اور پنڈی میں دوسری بار 1954ء میں۔ یہ دو بڑی

ناکامیاں محض اقتصادی بدحالی کا نتیجہ تھیں اور اسے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ اس دور میں بڑے سے بڑے فنکار کی فنی صلاحیتیں اقتصادی بدحالی کی وجہ سے زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اس کی بڑی خواہش ہے کہ پاکستان میں ایک نیشنل تھیٹر ہو جس کی وسیع اسٹیج پر وہ اپنے ملک و قوم کے ماضی و حال اور مستقبل کو معیاری فن کے ذریعے اجاگر کرتا رہے۔ آج کل وہ نہ صرف ریڈیو پاکستان میں بلکہ فلموں میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کا فلمی نام علی بابا ہے لیکن وہ چالیس چور کہاں سے لائے جو اس کی کایا پلٹ دیں اور وہ نیشنل تھیٹر کی وسیع اسٹیج پر آرٹ کی خدمت کرے۔ یوں تو وہ شہنشاہ اکبر، منحوس، دردمندی، جیب کترا، شفیق باپ، دکھی انسان، ظالم فرعون، بدمعاش سبھی کچھ بنتا ہے لیکن ابھی تک وہ محمد حسین نہیں بن سکا۔ وہ خود تو ایک بہت بڑا ایکٹر ہے لیکن محمد حسین اس کے نزدیک وہ شخصیت ہے جو آرٹ کے لیے پیدا ہوئی اور آرٹ ہی میں فنا ہو گئی۔

بھائی سردار احمد

بھائی سردار احمد کو میں اچھی طرح سے نہیں جانتا۔ دراصل ان کو کوئی بھی اچھی طرح سے نہیں جانتا اور جو اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان کو کوئی اچھی طرح سے نہیں جان پاتا اور وہ سب سے مل ملا کر اور سب کا جی راضی کر کے چپ چاپ گزر جاتے ہیں اور کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ابھی جو ہمارے درمیان موجود تھا، وہ چلا گیا ہے اور اس نے ہمیں کانوں کان بھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی کہ وہ جو ابھی تھا، وہ نہیں رہا ہے۔ ایسے لوگ بڑے غیرت مند، بہت ہی محبت کرنے والے، بڑے ظالم اور بے حد ڈاہڈے ہوتے ہیں۔ سردار احمد بھی ان میں سے ایک تھے بلکہ وہ ایک ہی تھے، ان میں سے ایک نہیں تھے۔

سردار احمد کے گرد مجھ ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایسا نرغہ تھا جو ہماری کم نگہی کی وجہ سے ان کے گرد تنگ ہوتا رہتا تھا اور ان کی ذات میں ایسی وسعت تھی جس سے مَس ہو کر یہ نرغہ نور کے ہالے میں تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ وہ ایک عجیب طرح کی موجودگی کے سادھو تھے کہ گھر بھر میں ہوتے ہوئے بھی کبھی محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ ہیں اور جب کسی کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ ہر جگہ نظر آ جاتے تھے۔ ہر کونے میں، ہر کمرے میں، ہر چھت پر ہر دیوار کے پاس۔ اپنے مخصوص تاثر کے ساتھ کہ چہرے پر سنجیدگی کی طرح موجود ہوتا اور مسکراہٹ نظر آتا اور مسکراہٹ سے شروع ہوتا تو مونا لیزا کی سنجیدگی تک پہنچ جاتا۔

ہم نے بھائی سردار احمد کو ان کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ خاص کیا معمولی سی اہمیت بھی نہ دی۔ وجہ یہ تھی کہ ان میں اہمیت طلب کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ہر ایک کا کام کر دیا کرتے اور ہر ایک کی بات شانت ہو کر سن لیا کرتے۔ ایسے لوگوں کو کوئی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کرتا۔ اہم لوگ کھڑ کے دڑ کے والے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جاننے والے، جتوانے والے لوگ، ماننے والے لوگ سیدھے ہوتے ہیں۔ معصوم اور سادہ لوح۔ ان کو سوائے نبیوں اور ولیوں کے اور کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ نہ ہی پسند کرتا ہے۔ نہ اپناتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے بھائی سردار احمد کو نہ تو پسند کیا اور نہ ہی اپنایا اور نہ ہی کسی قریبی کو پتہ چلنے دیا کہ ان کے ساتھ ہماری کوئی تعلق داری ہے۔ وہ اپنی جگہ مسکراتے رہے اور ہم اپنی جگہ کنی کتراتے رہے۔ ہمارا کام فرمائش کرنا تھا

اوران کا کام فرمائشیں پوری کرنا۔ ہمارا کام سر کی ہلکی سی جنبش سے ان کو سلام کرنا تھا اوران کا کام ہمیں دعا دے کر ہمارے لیے راستہ چھوڑ دینا تھا۔

اول اول تو ہم جمیلہ کی وجہ سے ان کے قریب آ گئے لیکن بعد میں اپنی وجہ سے ان سے دور ہو گئے۔ ان کے ساتھ کرنے والی ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں جس کی بدولت ہم ان کے اور قریب آ سکتے۔ ان میں کوئی ایسا چھل تھا ہی نہیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھ دوستی کی جا سکتی۔ وہ ایک پاک سے آدمی تھے اور بغیر نصیحت آموز اور سبق آموز گفتگو کے پاک انسان تھے۔ اس لیے ان کو پاکیزگی کے اس معیار پر رکھنا بھی مشکل تھا جس پر ریٹیل (Retail) کی دکانوں میں دوسرے پاکیزہ لوگ ڈسپلے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد ہم نے انہیں چھوڑ چھاڑ دیا اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔

ایسی منازل کو طے کرتے وقت جب ایک بہت ہی مشکل مقام آیا کرتا ہے تو پھر کسی صاحب نظر کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ وہی مقام تھا اور میں اس ہاتھی ڈباؤ مسئلے میں سرتاپا غرق تھا کہ ذوالفقار تابش نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ اس نے ایک درویش دریافت کر لیا ہے جو اس قدر معروف تو نہیں لیکن ہے بہت کرنی والا۔ اس کے پاس کوئی خاص کرامات تو نہیں البتہ اس کے چہرے کو دیکھ لینا ہی عبادت ہے۔ ہم کچھ پر پیچ رستے اور نامانوس گلیاں قطع کر کے گمٹی بازار کی اندھیری کوٹھڑی میں پہنچے۔ بابا جی ایک لنگوٹی باندھے مرگ چھالا پر بیٹھے تھے اور ان کی گردن میں نیلے منکے والی ایک ڈوری بندھی تھی۔ تابش نے ان سے مصافحہ کر کے چند باتیں کیں۔ پھر ایک بڑیا نکال کر انہیں دی اور ساتھ ہی چند ہدایات دے کر ان سے رخصت چاہی۔ بابا جی نے ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور دیر تک تابش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپتھپاتے رہے۔ ان کی دعاؤں کے دوران مجھ پر کپکپی سی طاری رہی۔

بابا جی کی کوٹھڑی سے ہم سیدھے جمیلہ کے یہاں پہنچے۔ بھائی سردار احمد ایک آرام کرسی کے کنارے اکڑوں بیٹھے پتے لکھ رہے تھے۔ رسالہ نما کتابیں شائع کرنے کا کام جمیلہ کرتی تھی اور ان کے ریپروں پر پتے لکھنے کا کام بھائی سردار احمد۔ اس روز جمیلہ گھر پر نہیں تھی تو ہم کافی دیر تک سردار احمد کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تابش ان سے کچھ سلوک وغیرہ کی منزلوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ شرما شرما کر ایک ایک بات کا وضاحت سے جواب دیتے جاتے تھے۔ میں حسب عادت ان سے بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا کہ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے اگر انسان بے ٹکٹا پکڑا جائے تو پھر اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور وہ ہر بار مسکرا کر یہی جواب دے رہے تھے کہ اسے کسی ٹکٹ والے کے ساتھ کر دیا جاتا ہے جو اس کی بن ٹکٹی کا سارا بوجھ اٹھاتا ہے اور اس کو منزل تک لے جاتا ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی نیت پر مبنی ہے کہ وہ منزل پر جانا بھی چاہتا ہے یا سفر کرنے والوں کے درمیان مخول بازی کرنے کے لیے بن ٹکٹا بنا ہوا ہے۔ ہم کافی دیر تک بھائی سردار احمد کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں جمیلہ واپس آ گئی۔ اسے کار سے اترتے

دیکھ کر بھائی سرداراحمد نے کہا "او کے جی، اب آپ مجھے پتے لکھنے دیں اور خود ان سے باتیں کریں۔" جمیلہ نے ان سے کہا تو کچھ نہیں البتہ اس کے چہرے سے ناخوشی کا اظہار ہوتا تھا کہ بس ابھی تک صرف اتنے ہی پتے لکھے ہیں۔ ہم اٹھ کر جمیلہ کے کمرے میں آ گئے اور سرداراحمد تیزی کے ساتھ چٹیں لکھنے لگے۔

اگلے دن تابش نے مجھ سے ٹیلی فون پر پوچھا تو میں نے بابا کی بڑی تعریف کی اور ان کو اپنے دل کے بہت قریب پایا۔ تابش میرے ان تاثرات سے بہت خوش ہوا اور اپنی تحقیق کی صحیح پڑتال ہو جانے پر خوشی سے اس کی گھگھی سی بندھ گئی۔ ہم بڑی دیر تک ٹیلی فون پر سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے اور طرارے بھرتے رہے لیکن گفتگو ختم ہونے سے ایک فقرہ پیشتر ہماری ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں جب ہم کو ایک ساتھ یہ معلوم ہوا کہ ہم دونوں دو مختلف شخصیتوں کی تعریف کر رہے تھے۔ میں گمٹی بازار والے بابے پر لہلوٹ ہو رہا تھا اور تابش بھائی سرداراحمد کے اندرونی سفر کو دریافت کر رہا تھا۔

سرداراحمد کے اندرونی سفر کو دریافت کرنا ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ ان کی ہیئت میں مسافرت کا انداز تھا ہی نہیں۔ نہ ہی ان کے چہرے سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں کچھ معلوم ہوگا۔ وہ تو ایک ایسے انسان تھے جیسے آپ پان بنوا رہے ہوں یا پھل خرید رہے ہوں یا گاڑی میں پٹرول بھروا رہے ہوں اور آپ کے قریب ایک شخص کھڑا ہو۔ اچھا خوش پوش، مسکراتا ہوا۔ بھلا سا انسان۔ بھدر پرش، لب ہلائے بغیر دعا دینے والا اور جب وہ وہاں سے چلا جائے تو آپ کی کسی حس کو ایک سیکنڈ کے ہزاروں حصے کے لیے احساس ہو کہ وہ ایک شخص تھا...... عین اسی طرح جس طرح آج ہم کو احساس ہو رہا ہے کہ سرداراحمد ایک شخص تھا۔ ایک خاص شخص ایک خاص فرد۔ محکمے کا آدمی اور ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور ہم اپنی سوچ اور اپنی فریکوئینسی کے مطابق وہی کچھ کر رہے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ کوئی انعام، کوئی تمغہ، کوئی وظیفہ، کوئی مجلس، کوئی محفل ___ لیکن اگر خدانخواستہ وہی شخص پھر لوٹ کر ہمارے درمیان میں آ جائے تو ہفتہ دس دن کے جشن کے بعد پھر ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں، یہ ہم پر اچھی طرح سے روشن ہے۔ خدا ہم پر کس درجہ مہربان ہے کہ ہماری آہ و بکا اور نالہ وشیوں اور گریہ پیہم کے باوجود جانے والوں کو واپس نہیں بھیجتا۔ وہ ہماری طبیعتوں کو ہم سے بہتر سمجھتا ہے۔ ہم کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھتے رہنے کے لیے اپنی ستار العیوبی کو وسعت دیتا رہتا ہے اور ہم جو سرداراحمد جیسے نہیں ہیں، ان پر بھی کرم فرماتا رہتا ہے۔

''مسعود قریشی''

مسعود کے ساتھ دوستی ہو سکتی ہے، لڑائی ہو سکتی ہے، دل لگی ہو سکتی ہے لیکن اس پر کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ اصل میں کسی بھی معمولی آدمی پر کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس کی زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس قدر بے معنی اور لایعنی ہوتا ہے کہ اس کو الفاظ و بیان کی بلندیوں اور تھمنوں سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ اب میں اس ورید وصورت پرانی چادر میں کس طرح سے پھونک بھروں کہ یہ ست رنگا غبارہ بن کر فضا میں اوپر چڑھے اور آپ نیچے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور اس کی عظمت کے گن گائیں۔ ایک معمولی آدمی کو غیر معمولی زور لگا کر بھی عظیم نہیں بنایا جا سکتا۔

مسعود قریشی سے میری دوستی ان وقتوں کی ہے کہ اگر ہمارے والدین نے بروقت ہماری شادیاں کر دی ہوتیں تو اس وقت ہم تین تین بچوں کے باپ ہوتے لیکن اس وقت کے والدین اپنی اولاد پر اس قدر توجہ نہیں دیتے تھے اور ان سے اتنے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے جتنے آج کے والدین ہیں۔ ہمارے والدین کی اس بے توجہی نے ہماری شخصیتوں میں ایسا صبر پیدا کر دیا کہ تیس سال کی یہ دوستی بغیر کسی دراڑ یا ترخ کے بڑی خیر و خوبی کے ساتھ گزر گئی۔ بیچ بیچ میں کچھ چیزیں اتریں اور کہیں کہیں کوئی کوئی چھلتر ابھری لیکن جلد ہی محبت اور موانست کی یہ سطح پھر ہموار ہو گئی۔ اس ملائمت پیدا کرنے میں سارا کمال مسعود کا ہے جو بنیادی طور پر ایک ترکھان ہے اور رندہ لگانے کے فن کو خوب اچھی طرح سے جانتا ہے۔ زندگی میں جب بھی دوستی کیجیے یا بڑھئی سے کیجیے یا جولاہے سے۔ بڑھئی جہاں کوئی میڑھ دیکھتا ہے رندہ لگا کر یا ستھری سے چھیل کر چول بٹھا کر چوکھٹے کو پھر گونیے کے اندر کر دیتا ہے اور جولاہا جہاں تار ٹوٹتا ہے لب لگا کر بٹ دے کر پھر دھاگا جوڑ دیتا ہے۔ ترکھان اور جولاہا کبھی تضاد کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ اس کی نگاہ ایک ہی مقام پر رہتی ہے۔ ادیب اور شاعر، مسافر اور تماش بین، افسر اور سیاستدان ہمیشہ دوعملی اور دوفکری کا مارا ہوا ہو گا کیونکہ اس کی نگاہ اپنے کار کی طرف نہیں بلکہ شکار کی طرف ہوتی ہے اور شکار چونکہ ہر لمحہ حفاظت کے مرکز بدلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لیے شکاری بھی کبھی ایک جگہ پر قیام نہیں کر سکتا۔ اس میں تضاد، ڈپلیکیٹ Duplicaty، ریاکاری اور منافقت کی بیڑی بر

وقت چارج ہوتی رہتی ہے۔

مسعوداس عارضے سے یوں بچا ہوا ہے کہ ایک تو یہ معمولی انسان ہے اور دوسرے اس کی ابتداء ایک بڑھئی کی ہے اور اس کی انتہا بھی ایک ترکھان کی ہونے والی ہے۔۔ یہ درمیانی وقفہ جو نوکری کا ہے تو اس میں گو اس کا عمل ترکھانا نہیں رہا لیکن اس کا زاویہ نظر اور Attitude بڑھئی کا سا ہی رہا۔ میرے تو یہ بے حد قریب رہا ہے لیکن آپ نے بھی غور کیا ہوگا کہ اس کے چلنے کا انداز کمانچے کا سا ہے۔ وہ کمانچہ جس کی ڈوری کا ایک بل برمے پردے کر چھید نکالا جاتا ہے۔ برمہ سیدھا ہوگا۔ عموداً ننانوے ڈگری پر لیکن اس کا کمانچہ جب چلے گا تو اسی جھول کے ساتھ جس طرح مسعود قریشی چلتا ہے۔ آپ نے کبھی پدام ڈالنے والا چھوٹا بغلی رندہ دیکھا ہے؟ وہ جس سے تصویروں کے فریموں میں ایک کٹ دیا کرتے ہیں، شیشہ اور اس کے بعد تصویر رکھنے کے لیے۔ اس رندے کی آواز بڑی ہموار، سمور اور یکساں ہوتی ہے لیکن نکر سے پہلے اس میں ایک رکاوٹ اور لکنت سی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اگر آپ نے بڑھئی کے پاس کھڑے ہو کر وہ رندہ چلتے دیکھا ہے اور غور سے اس کی آواز سنی ہے تو آپ کو مسعود کی گفتگو میں بھی اسی ملائمت، اسی ردھم اور اسی رکاوٹ کا احساس ہوگا۔ اگر آپ نے اس کی شاعری کا ٹھہراؤ کے ساتھ مطالعہ کیا ہے تو آپ کو اس میں ہر رُت، ہر موڑ اور ہر پٹرن کے اندر ایک نقطہ ارتکاز ملے گا۔ دکھ ہے تو اپنا ہے، خالص ہے۔ صاحب حال کا ہے، گزرا ہے یا گزرنے والا ہے یا گزر سکتا ہے۔ مانگے کا دکھ نہیں جو نئی ترکیبوں کے ساتھ نئے اسلوب میں ڈھالا گیا ہو اور دوسری چلنت اور مقبول شاعری سے متاثر ہو کر نظم کیا گیا ہو۔ اطمینانی ہے، شکر ہے اور خوشی ہے تو ایسی جیسے کڑی دھوپ میں بڑی پیاس پر خوب ٹھنڈا پانی پڑنے سے اندر سے الحمد للہ نکلے، Ritual کے طور پر نہیں۔ ایسا آہنگ انبیاء کے ان ماننے والوں کو ملتا ہے جن کا پیشہ یا نجاری ہو یا پارچہ بافی یا کوزہ گری یا گلہ بانی۔ دوسرے لوگ میری طرح سے زبردستی لکھتا لکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی آواز اونچی کر کے سنانے کے لیے جیسے قوالی کے اندر حال چڑھے شخص سے توجہ ہٹانے کے لیے پدی لوگ اونچے اونچے سبحان اللہ کہہ کر پھدکنے لگتے ہیں۔

جب میں پہلی مرتبہ مسعود سے ملا تھا تو وہ چھتری کی ٹیک لگائے ایک پہاڑی راستے پر کھڑا تھا اور جب میں پچھلی مرتبہ اس سے مل کر گیا ہوں تو وہ ممتاز مفتی کے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس طرح کھڑا تھا اور ان دونوں کھڑتوں کے درمیان تیس سال کا لمبا وقفہ تھا۔ تیس سال کی اس لمبی مدت میں مسعود نے کوئی حیرت انگیز کام سرانجام نہیں دیا۔ نوکری کی، بچوں کو پالا، غزلیں لکھیں، یاری نبھائی، سفر کیے، دکھ اٹھائے، نظمیں لکھیں، خوش ہوا، تمبا کو نوشی کی، پان کھائے، والدہ سے محبت کی۔ چھوٹے بھائی کو پیار کیا، داد دی اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں اور ایسی باتیں تو ہر شخص کی زندگی میں گزرتی ہیں۔ ان میں انوکھا پن کہاں سے تلاش کروں اور اس کی کریکٹر سنڈی کدھر سے کروں۔

ہم خربوزے خریدنے گئے، مسعود ساتھ گیا۔ ایک مرتبہ ایک گروہ سے ہماری ہاتھا پائی ہو گئی۔ مسعود

کے بھی چونیں آ ئیں لیکن یہ ہمیں اگلے دن معلوم ہوا۔ ہم کتابیں دیکھنے گئے، مسعود بھی ساتھ گیا۔ ہم ایک برات میں برات سے بچھڑ گئے، مسعود بھی بچھڑ گیا۔ ہم رات گئے گھر پہنچے، وہ بھی آدھی رات کو واپس پہنچا۔ ہم سب نے سلک کی قمیضیں خریدیں، مسعود نے بھی خریدیں۔ ہم بیٹھے وہ بھی بیٹھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم مرنے گئے وہ بھی ہمارے ساتھ مرنے چلا گیا۔ ہم نے ارادہ ترک کر دیا اور واپس آ گئے مسعود نے بھی ارادہ ترک کر دیا اور واپس آ گیا...... اب ایک ایسے شخص پر جس کی خودی ذرا سی بھی بلند نہ ہو، کوئی کیا لکھے اور کس طرح سے لکھے۔

مجھے معلوم ہے اور میں اس کا شاہد ہوں کہ مسعود بچوں کو خود سکول چھوڑ کر آ تا رہا ہے۔ قیمہ بھرے بت کریلوں کے ساتھ ٹھنڈی نمکین لسی پیتا رہا ہے۔ بائیسکل پر جا کر ڈاکخانے میں اکنالجمنٹ ڈیو لفافہ رجسٹری کرا آ تا رہا ہے۔ خربوزے کے بیجوں سے گریاں نکالتا رہا ہے۔ ہر ٹیلی فون کال کے جواب میں ''ریڈیو پاکستان جناب عالی'' کہتا رہا ہے۔ سر درد پر ایسپرو اور چوٹ لگنے پر ٹنکچر آیوڈین استعمال کرتا رہا ہے۔ بچوں کے پاس ہونے پر مٹھائی کھلاتا رہا ہے۔ چھینک مارنے پر الحمد للہ کہتا رہا ہے۔ مالی نقصان ہونے پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا رہا ہے۔ چوخانہ سویٹر پہنتا رہا ہے۔ افسر کے آگے سے اور گھوڑے کے پیچھے سے کبھی نہیں گزرا۔ خواہش نفسانی کو گھڑے کا پانی پلا کر خوش کرتا رہا ہے۔ انگریزی قصے پڑھتا رہا ہے، شاعری کرتا رہا ہے۔ پینسٹھ اور اکہتر کی جنگوں میں گندگی گالیاں دیتا رہا ہے اور Non Intellectual کی طرح جنگ لڑتا رہا ہے لیکن اتنی ساری باتیں جاننے کے باوجود مسعود قریشی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جسے Glamourize کیا جا سکے یا جس کے گرد اس کی شخصیت کا خاکہ تیار کیا جا سکے۔ اس طرح کے تو سبھی لوگ ہوتے ہیں اور سب لوگوں کے سکیچ تو نہیں لکھے جا سکتے ناں۔ پھر میں کس طرح اس معمولی نوعیت کے انسان پر کچھ لکھوں یا اس کا تعارف کراؤں۔

جب کسی شخص پر کوئی مشکل آن پڑتی ہے تو وہ پیروں فقیروں کی طرف بھاگتا ہے یا بادہ نوشی کرنے لگتا ہے یا رنگ رلیوں کی دنیا میں اپنے آپ کو غرق کرتا ہے لیکن مسعود قریشی پر جب بھی ایسا کوئی مشکل وقت آتا ہے تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ اب کی بار تنخواہ میں سے کچھ رقم بچا کر اوزار لاؤں اور کل سے اپنا ترکھانا پھر سے شروع کروں۔ اس کے بغیر یہ زندگی بہت ہی تلخ ہوگئی ہے۔ بے حد مصنوعی اور بہت زیادہ Taxing۔ لیکن میں ہمیشہ اسے روکتا ہوں کہ ابھی تو تیرے پاس کوئی گھر نہیں، ورنہیں تو کاٹھ کا کباڑ کہاں رکھے گا وہ ہر مرتبہ یہی دلیل پیش کرتا ہے کہ اس کرائے کے گھر میں جالی والے دروازے نہیں ہیں اور شمیم کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تو اجازت دے تو میں سارے دروازوں کو جالی کے تاکے چڑھا دوں مکھی مچھر سے بچت ہو جائے گی۔۔ اس کے علاوہ میرا دل بھی لگا رہے گا۔ یکسوئی کی نعمت بھی میسر آئے گی۔ اپنے بڑوں کے ساتھ ایک رابطہ بھی قائم ہو جائے گا لیکن میں اس کو کبھی یہ رائے نہیں دیتا کہ اس کا یہ رابطہ قائم ہو یا جن کو وہ

اپنے بڑے سمجھ رہا ہے۔ ان کے ساتھ اس کی کوئی Equation بنے۔ میرے خیال میں مسعود کو ابھی اور میچور ہونے کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ میں کچھ ایسا پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے اس پر تقریباً ہر ہفتے کچھ لکھا جا سکے۔ اس کو ابھی ہرگز ملازمت سے ریٹائر نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی بھی کارپینٹری کے سند نہیں خریدنے چاہئیں۔ کبھی بھی عمومی کام نہیں کرنے چاہئیں۔ ایسی شاعری نہیں کرنی چاہیے جس میں سچ مچ دکھ اور سچ مچ کی راحت اور سچ مچ کے خیر کثیر کا ذکر ہو۔ ابھی مسعود کو دانشوروں اور سکہ بند شاعروں سے مل کر ان سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور ان کے علم کو اپنی شاعری میں اتارنا ہے اور جب تک یہ نہیں ہوگا ایسی محفلیں جو آج بڑا زور لگا رہی ہے، بلبلے کی طرح بیٹھ جائیں گی۔ لیکن یہ بڑھئی بڑا ضدی ہے۔ بدلتی ہوئی رت کا ساتھ نہیں دیتا۔ ملی میٹر کے آ جانے پر بھی وہی پرانے دو فٹے سے لکڑی ناپتا ہے اور انچوں کے حساب سے چولیں نکال کر چوکھٹا بٹھاتا ہے...... میری اور اس کی دوستی ایک مثالی دوستی ہوتی اگر ہمارے درمیان ایک بنیادی اختلاف نہ ہوتا۔ مسعود ہر بات کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور خدا کو علیم مطلق سمجھتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ بادشاہی خدا کی ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے لیکن میں کوشش، جدوجہد، ہمت، تجویز، محنت اور سٹرگل کو اپنی رہنما قوت تسلیم کرتا ہوں۔ میرا رخ ترقی کی طرف اور سنہرے مستقبل کی طرف ہے اور اس کی ڈائریکشن ان پرانے دھرانے ناسائنس دان بزرگوں کی طرف ہے جن کا ایک پیشہ اس نے اختیار کر رکھا ہے۔

میں اس پر کیا لکھوں اور کس طرح سے لکھوں کہ یہ ایک سطر کا بھی اہل نہیں ہے۔ یہ آج بھی، اس وقت بھی جب کہ لوگوں کے ایک دوسرے سے لڑنے کے لاکھ بہانے ہر گھڑی موجود ہوتے ہیں، کسی کے ساتھ نہیں لڑتا۔ اس کے ساتھ بھی نہیں جو اس کا شدید مالی، ذہنی، بدنی نقصان کر جائے۔ میں ہولے ہولے اس کے کندھے پر ٹکے مارتا رہتا ہوں اور چڑ تا رہتا ہوں اور یہ ہنستا رہتا ہے اور اپنی مخصوص لسپ میں کہتا رہتا ہے جو شخص ایک مرتبہ خدا کو علیم مطلق مان لیتا ہے اس کے مخلوق خدا کے ساتھ سارے جھگڑے ایک ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔

بتایئے ایسی سوچ رکھنے والے پر کچھ لکھا جا سکتا ہے؟ آپ دانشور لوگ ہیں، ذہین اور تجربہ کار حضرات ہیں۔ ترقی کے رموز کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ مسعود قریشی پر کسی صورت میں کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے!

محمد خالد اختر

اگر آپ کے پاس پچھلے سال کی کوئی ڈائری ہے یا اس سے بھی پچھلے سال کی چند ڈائریاں پڑی ہیں تو ان کو ضائع نہ کیجیے۔ سنبھال کر رکھئے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ ڈائریاں بڑے سائز کی ہوں، ان صفحات کی جن کے ایک صفحے پر ایک تاریخ ہوتی ہے اور جن کی کشیدہ سطریں بہت تنگ ہوتی ہیں۔ گئے سالوں کی یہ پرانی ڈائریاں یا تو آپ مجھے بھجوا دیں یا بالواسطہ طور ر اختر ہاؤس بہاولپور روانہ کر دیں جہاں یہ اپنے اصل مالک کے پاس خود بخود پہنچ جائیں گی۔

آپ نے نابینا حضرات کو بریل لکھت کی کتابیں پڑھتے دیکھا ہوگا جو ابھرے ہوئے نقطوں پر انگلیاں پھیر کر نفس مضمون کو اچھی طرح سے سمجھ جاتے ہیں اور موٹی موٹی کتابیں گھنٹوں میں ختم کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دنیا کی کسی بھی زبان میں چھپی ہوئی ہیومر پر کوئی کتاب ہو تو محمد خالد اختر کو ایک لمحے کے لیے دیجیے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ڈوبتی ابھرتی لہروں کا نظارہ کیجیے۔ نبض دیکھ کر مریض کے ذہنی اور جذباتی معاملات کو بہت دور تک سمجھ جانے کے قصے تو سنے تھے لیکن کسی کتاب کو محض چھ سسٹم کے ذریعے اپنے اندر اتارنے کا کمال ہم نے صرف محمد خالد اختر میں ہی دیکھا۔ کہتے ہیں یہ عشق کی آخری منزل ہوتی ہے جس میں عاشق اپنے محبوب کے دل کی بات اپنی بات سے بھی بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ کتابوں سے محبت کرتے ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا بھی اور سنا بھی لیکن جو عشق خالد کو مطالعے سے ہے، اس نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے کہ خدا کرے باقی سب معاملات درست ہوں کیونکہ اس دیوانگی میں تو وہی مبتلا ہو سکتا ہے جو اور سب اطراف سے کٹ جائے اور اس دنیا کے مطالب کا نہ رہے لیکن یہ بات بھی نہیں ہے۔ خالد ایک بہت ہی شفیق ملاقاتی اور بڑا ہی یار باش انسان ہے اور یہ اسی کا کمال ہے کہ اس نے خواہش کے بغیر اپنے اتنے چاہنے والے پیدا کر لیے ہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف بڑی آسانی کے ساتھ ایک سلسلہ خالد یہ اختریہ چل سکتا ہے اور بہت دور تک پھیل سکتا ہے۔ میں اس سلسلہ کے ناظم الامور کے طور پر بہت مفید خدمات سرانجام دے سکتا ہوں لیکن خالد کو اول تو یہ سلسلہ پسند نہیں ہوگا اور اگر وہ مان بھی گیا تو مفید خدمات سرانجام دینے کی اجازت نہیں دے گا۔

حالانکہ جب تک مفید خدمات سرانجام نہ دی جائیں پبلک خوش نہیں ہوتی۔

خالد سے میری محبت ذاتی نہیں پیوندی ہے۔ میں اس کی تحریروں کو پڑھتا تھا، خوش ہوتا تھا اور داد بھی دیتا تھا لیکن اس قدر نہیں جس قدر میری بیوی کو توقع تھی اور جتنی داد اس کے حساب سے ڈیو تھی۔ بانو قدسیہ جب بھی محمد خالد اختر کا کوئی مضمون، ناول کا کوئی حصہ یا بیان کا کوئی ٹکڑا پڑھتیں تو ہنسی ضبط کرنے کے شکنجے میں خود کو اس قدر جکڑتیں کہ اُن کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا اور وہ زور زور سے آوازیں دے کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتیں لیکن ان کی آواز چیک چیک کرتے پریشر ککر سے زیادہ بامعنی نہ ہوتی اور ہم سب ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگتے۔ ہنسنے کا یہ سلسلہ ہمارے یہاں بڑی دیر تک جاری رہتا اور پھر جب ہم میں سے کوئی اس پیراگراف کو پڑھ کر خود اس میں اترنے کی کوشش کرتا تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہتی کہ اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ اوروں کو تو بانو قدسیہ بڑی صدق دلی سے معاف کر دیا کرتی لیکن میری کورذوقی پر اس کو بڑا دکھ ہوتا اور وہ بجھی سی جاتی۔ اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں مکتسر ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور میری تعلیمی اور تربیتی بیک گراؤنڈ کچھ ایسی مضبوط نہیں ہے اور میں چیز اس کی آواز سنے بغیر ہنسنے سے قاصر ہوں اور لطیفے کے خط کشیدہ الفاظ کے مطالب واضح کیے بغیر اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی اس کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ میں محمد خالد اختر کی تحریر کو اور اس کے بیان کی لطافت کو اور اس کے واقعاتی گریز کو کیوں نہیں سمجھتا اور کیوں اپری شی ایٹ نہیں کرتا لیکن جب اس کو دوسرے ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بانو قدسیہ کا یہ دکھ اجتماعی رنگ اختیار کر گیا اور اس نے مجھے ادبی تخیلی کے ایک اور چنے بنے کے طور پر معاف کر دیا مگر اس معافی کے باوجود اس نے مجھے محمد خالد اختر کے انداز پر اردو، انگریزی اور پنجابی میں سوا سوا گھنٹے کے پانچ لیکچر دیئے اور مجھے یہ سمجھانے کی پرزور کوشش کی کہ ''سٹل ہیومر'' کس کو کہتے ہیں اور اس کی خوبصورتی بیان کے کس زاویئے میں چھپی ہوتی ہے۔ مجھے ان لیکچرز کا بہت فائدہ ہوا اور میں خالد کی تحریر کی خوبصورتیوں کو سمجھنے بھی لگا لیکن ہنستے وقت میری آنکھوں سے ایسا پانی نہیں بہا جس طرح بانو قدسیہ کی آنکھوں سے اب بھی بہتا ہے اور میری صورت ویسی کبھی نہیں بنی جیسی ہنستی ہوئی بری عورت کی صورت بانو قدسیہ بن جاتی ہے۔

تیرہ چودہ برس پہلے کی بات ہے جب ایک محفل میں فیض صاحب نے کہا، بھئی ہم کو تو محمد خالد اختر کی تحریر پسند ہے اور ہم تو چاکی واڑہ میں وصل کو اردو کا عظیم ناول سمجھتے ہیں تو بانو قدسیہ نے فیض صاحب کا کندھا تھپتھپا کر کہا تھا، شاباش فیض صاحب آپ تو بہت ہی لائق ہیں اور آپ کی اسیس منٹ بالکل کوریکٹ ہے۔ میں آپ کو فل مارکس دیتی ہوں۔ جذبے میں آ کر وہ یہ بات کہہ تو گئی لیکن پھر خود ہی شرمندہ سی ہوگئی کہ میں کس کو کیا بات کہہ رہی ہوں۔

لیکن اس ساری گفتگو کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں خود محمد خالد اختر کی قدر و قیمت کو جانچ نہیں سکا اور اس کی صلاحیتوں کو آنک نہیں سکا ہوں۔ میں نے محمد خالد اختر کو خوب پڑھا ہے اور اس سے بے حد متاثر

ہوا ہوں۔ یہ بات الگ ہے کہ میں نے پبلک میں کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا اور اس بات کو سب کے سامنے تسلیم نہیں کیا لیکن اس میں میرا کوئی اتنا بڑا قصور نہیں ہے جب سارے بہاولپور کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ اس نے کتنے بڑے سپوت کو جنم دے رکھا ہے اور اردو ادب کو کس پائے کا ادیب عطا کر رکھا ہے تو پھر اس میں مجھ ایسے غیر بہاولپوری کا کیا قصور۔ جب بہاولپور کے لوگ محمد خالد اختر سے بے نیاز رہ سکتے ہیں تو ہم ایسے غیر ملکی اس سے لاتعلق کیوں نہ رہیں۔ جب بہاولپور کے لوگ افسروں اور اونٹوں کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تو ہم کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان کے پتنل کی صفت ثناء میں اپنی جان گنوائیں۔

محمد خالد اختر کی ذات اور اس کے حالات کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ سب کچھ تو اس کے دوست اور قدیمی یار بتائیں گے۔ میں تو صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ محمد خالد اختر ان بہت ہی خوش قسمت سوچنے والوں میں سے ایک ہے جو اپنے مشاہدے کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے اور جو مغربی مصنفوں کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے نئے فہم تلاش کر رہا ہے۔ خالد کے فن کا سب سے بڑا کمال اس کے مغربی علوم کے مطالعہ میں مشرقی زندگی کی پہچان ہے۔ یہ پہچان ایسی انوکھی، ایسی سبک اور کچھ ایسی اچانک ہے کہ اگلے فقرے پر پہنچ جانے کے بعد پچھلا راز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اگلا فقرہ گزری ہوئی بات کی وضاحت کرتا ہے یا اگلے فقرے پر پہنچنے میں جو وقت ملتا ہے، اس میں سوچ نکھر کر موضوع کو اپنی شعاعوں میں گھیر لیتی ہے یا مصنف کے ساتھ چلنے کا ڈھب آ جاتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی فقط ایک واقعہ ہو جاتا ہے۔ ایسا واقعہ جس کے لیے نہ تو کوئی سامان تیار تھا نہ ہے اور نہ ہی کیا گیا۔ ایسا انداز مشق سے حاصل نہیں ہوتا صرف فطرت کی طرف سے ملتا ہے اور اہل نظر کہتے ہیں کہ یہ انداز خاموشی میں رہنے والے کے لیے مختص ہے اور خلاء کی بے آوازی اور بے صدائی کے اندر اترتا ہے۔

محمد خالد اختر کی تحریریں ہیں تو تفنن طبع کا سامان لیکن اس اوپر کی سطح کے نیچے ایک اور ہی علم موجود ہے۔ یہ علم آپ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ آپ کے اندر کے خوابیدہ علم کو گھنٹی بجا کر بیدار کرتا ہے اور اس کے بیدار ہوتے ہی خود غائب ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ محمد خالد اختر کا شعوری عمل نہیں ہے بلکہ اس شخص کی تخلیقی مجبوری ہے جو بہاولپور میں پیدا ہو کر دور دور کے لوگوں کو کھڑکا رہا ہے اور خود بھی پریشان ہو کر شرمندہ شرمندہ سی زندگی بسر کر رہا ہے کہ میرا مقصد کسی کو خفت میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ یہ لکھنا لکھانا تو مجھ سے بس یونہی سرزد ہو رہا ہے۔ اگر خالد کو اپنے کارناموں پر مان ہوتا یا اپنی اس تخلیقی مجبوری کو اس نے صحت مند اور کارآمد اور خدمت ادب کوشش کا نام دیا ہوتا تو البتہ وہ ہمارے جیسا ادیب ہوتا اور پھر ہم چل کر یوں اس کے آگے سیس نوانے اور اس کی مہما گانے نہ آتے۔ بہاولپور اور بہاولپور کے رہنے والوں کی خدمت میں سلام پہنچے اور خالد کی عمر دراز ہو کہ ہم صرف اس کی وجہ سے یہاں حاضر ہوئے ورنہ کون آتا ہے اور اتنی دور کس سے آیا جاتا ہے۔

ہاں سچ! وہ جو میں نے ابتداء میں آپ سے پرانی ڈائری یا پرانی ڈائریوں کا ذکر کیا تھا تو ان کا

حصول بھی خالد صاحب کے لیے ہی تھا۔ محمد خالد اختر پرانی ڈائری کے چھوڑے ہوئے سفید کاغذوں کے علاوہ اور کسی سطح پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ کہانی ہو، مضمون ہو، سفر نامہ ہو، تبصرہ ہو غرضیکہ کسی قسم کا مسودہ ہو وہ آپ کو ڈائری کے اوراق پر لکھا ہوا ہی ملے گا۔ آج تک اس نے کوئی خط کوئی محبت نامہ کوئی معاہدہ ایسا نہیں لکھا جو کسی شریفانہ کاغذ پر ہو۔ یہ اس کی مجبوری ہے اور ہم اس مجبوری کا احترام کرتے ہیں لیکن ڈائری کے تنگ رول کے اندر اردو کے بڑے بڑے کھیم شحیم الفاظ کو یوگا کے آسنوں میں بٹھانا بھی خالد ہی کا کام ہے۔ میں اکثر اس کے پرانے خط نکال کر دیکھتا ہوں تو الفاظ سے مل کر اس عمر میں بڑی تسکین ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے باریک لائنوں کے اندر سرکس کی نوخیز لیڈیاں تاروں پر چل رہی ہوں اور ان کے جسم لمبی کششوں اور چھوٹے شوشوں سے کھل کھل جاتے ہوں اور وہ اپنے آپ کو سمیٹتی، انگڑاتی جسم اور روح دونوں کے کرتب دکھا رہی ہوں۔ صورت اور معانی کا ایسا امتزاج آپ کو سوائے خالد کی لکھائی کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ پرانے عرب ساربان کہتے ہیں کہ جو شخص ریگستان کے کنارے بیٹھ کر غروب ہوتے سورج کے سامنے اونٹوں کی گزرتی ہوئی قطار کو دور تک اور دیر تک دیکھتا ہے، اس کی لکھائی کا انداز محمد خالد اختر کی لکھاوٹ جیسا ہوتا ہے۔

بہاولپور کو اور بہاولپور کے لوگوں کو اور بہاولپور کے صحراؤں کو اس کی ڈاچیوں کو ہمارا سلام پہنچے جنہوں نے اتنی بڑی شخصیت کو جنم دیا اور اس کے بدلے میں نہ تو کسی سے کوئی صلہ مانگا اور نہ ہی کسی کو اپنی برتری کی چمکیں مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

بہاولپور کو سلام! اس کی جد پشت کو سلام!!

الف لیلہ ولیلہ

واصف صاحب سے میری ملاقات میرے خالہ زاد بھائی ویدو خان نے کرائی اور ہم جلد ہی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ اس وقت ان کی شاعری کی کتاب "شب چراغ" شائع ہو چکی تھی اور وہ اس کی رونمائی کے لیے کوئی ڈیٹ فکس کر رہے تھے۔ میں ان سے ان کے کالج میں بھی ملا۔ پرانی انارکلی کے ایک غیر معروف چائے خانے میں بھی ہماری طویل نشستیں رہیں اور دو مرتبہ وہ میرے دفتر بھی تشریف لائے۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ میں ان کے دام الفت میں گرفتار ہو کر ان سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گیا اور ہم بے حد مختصر مدت میں کافی پرانے دوست بن گئے۔

اس دوستی کے روز نامچے میں پورے دو سال کے صفحات بالکل بلینک ہیں۔ نہ ہم ایک دوسرے سے ملے، نہ کوئی نام و پیام کی صورت نکلی، نہ ایک دوسرے کو کہیں دیکھا۔ نہ ذکر ہوا نہ ذکر سنا۔ نہ کوئی درمیان کی ہوا چلی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس بات کا احساس تک ختم ہو گیا کہ اگر میں ہوں تو دوسرا بھی یہیں کہیں ہوگا اور اگر دوسرا یہاں نہیں ہے تو پھر میرے ہونے کا ریفرنس بھی معدوم ہو چکا ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا لیکن ہوا ضرور شاید اس میں کچھ انہی کی آرزو اور انہی کا امر کارفرما تھا۔

ایک روز بڑے ڈاکخانے کے پچھلے دروازے پر مجھے نیپا کے ترمذی صاحب ملے تو انہوں نے مجھ سے رات کی ان نشستوں کا ذکر کیا جن میں کچھ ہم خیال لوگ جمع ہو کر ایک بزرگ سے ان کا بیان سنا کرتے تھے اور ان سے اپنے اشکال بیان کر کے ان کے جوابات حاصل کیا کرتے تھے۔ اس بزرگ پاک سیرت اور صاف باطن کا نام انہوں نے واصف علی بتایا لیکن میں نے نام پر کوئی توجہ نہیں دی اور حاضری کا وعدہ کر کے ترمذی صاحب سے اجازت لے کر پوسٹ باکس سیکشن میں چلا گیا۔ کوئی ہفتہ بھر بعد ترمذی صاحب میرے دفتر آئے اور وعدہ پورا نہ کرنے کا شکوہ کیا۔ اصل میں مجھ سے ایک مرتبہ گھر واپس پہنچ کر، کپڑے تبدیل کر کے آرام سے بیٹھ رہنے کے بعد پھر نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ترمذی صاحب کی شبینہ محفلوں کا انتظام میرے گھر کے بہت قریب تھا، اس لیے میں نے ہامی بھر لی۔

قذافی سٹیڈیم سپورٹس کالج کے دفتر میں دس بارہ مختلف النوع اور مختلف الخیال لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان بھی سفید ریش والے ایک بزرگ تشریف فرما تھے جو سامعین کو اپنی کیفیات کی آشنائی عطا کر رہے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو کچھ لوگ مصافحے کے لیے اٹھے اور ان کے ساتھ وہ پیر صاحب بھی سروقد کھڑے ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا اور عقیدت کے ساتھ اسے ماتھے سے چھو لیا۔ انہوں نے بھی تقریباً اسی ڈرل کو دہرایا لیکن میں نے زور لگا کر اپنا ہاتھ ان کے ماتھے تک نہ پہنچنے دیا اور ان کی کوشش ناکام ہو گئی۔ ہم رسمی علیک سلیک کے بعد، مزید کچھ کہے سنے خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور سفید ریش بزرگ نے آنکھیں بند کر کے چہرہ چھت کی طرف اٹھا لیا۔ دس بارہ منٹ کی اس مراقبے جیسی طویل خاموشی کے بعد ترمذی صاحب اندر داخل ہوئے اور انہوں نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ خاموش محفل میں جان سی پڑ گئی اور حاضرین اس طویل گھٹن سے ایک دم آزاد ہو گئے۔ ترمذی صاحب نے للکار کر کہا "نیازی صاحب، اشفاق صاحب پہلی مرتبہ ہماری محفل میں آئے ہیں، ان کے لیے چائے کا فوری بندوبست ہونا چاہیے۔ ساتھ نمک پارے اور چھوٹی چم چمیں بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کو چینی سے پرہیز نہیں ہے۔" ترمذی صاحب کے اس آرڈر پر سفید ریش پیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور سینے پر ہاتھ رکھ کر پھل پا چلتے ہوئے میرے لیے چائے بنانے چلے گئے۔

جن کی میں نے دست بوسی کی تھی وہ واصف صاحب کے ایک بزرگ عقیدت مند تھے جن کے ذمے چائے بنانے اور چائے سرو کرنے کی ڈیوٹی تھی اور جو محفل ختم ہونے پر رات کے ایک ڈیڑھ بجے واصف صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے پر مامور تھے۔

اتنے میں کچھ اور لوگ آ کر شریک محفل ہو گئے اور کسی نے پوچھا بھی کہ "ملک صاحب ابھی تشریف نہیں لائے" تو جواب ملا "بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

میں ترمذی صاحب سے ان کے دفتر کی، ان کے دوست اور ہمارے عزیز انوار خان کی تفصیلات بہم کر رہا تھا کہ باہر ایک موٹر رکی اور محفل کے لوگ "ملک صاحب آ گئے، ملک صاحب آ گئے" کہتے ہوئے اٹھ کر باادب کھڑے ہو گئے۔ ملک صاحب ہاتھ میں چابیوں کا گچھا گھماتے ہوئے دروازے میں داخل ہوئے تو وہ ملک صاحب نہیں تھے واصف علی واصف تھے جن کے ساتھ ہماری لمبی لمبی ملاقاتوں کا مصروف ترین رن وے دو سال سے بالکل بند پڑا تھا نہ کوئی لینڈنگ تھی نہ ٹیک آف نہ ٹاور سے کوئی پیغام ملتا تھا نہ ریڈار کوئی سگنل دیتا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے لپک کر ملے۔ جپھیاں، تھاپڑے، طعنے، گلہ گزاریاں، حال احوال ہم بڑی دیر تک کھڑے رہے اور چونکہ واصف صاحب کھڑے تھے اس لیے حاضرین محفل بھی کھڑے رہے۔ انہوں نے بار بار سب سے بیٹھنے کی درخواست کی لیکن کوئی نہ بیٹھا۔ ناچار ان کو اپنی جگہ پر جلوہ افروز ہونا پڑا۔

ان کی نشست ایک ڈھلچو سی کرسی تھی جس کے آگے چھوٹی سی تھلنگا میز تھی۔ اس پر ایک چوکور ٹائم پیس رکھا تھا جس کا منہ واصف صاحب کی طرف تھا۔

انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا'' ہاں کوئی سوال، کوئی مسئلہ؟'' اور کونے سے ایک صاحب نے کہا '' جب انسان کے ہونے میں اس کی تقدیر لکھ دی گئی ہے اور قسام ازل نے اس کا سارا پروگرام پہلے سے طے کر دیا ہے تو پھر کوشش، جدوجہد اور کرنے کا کیا مقام رہ جاتا ہے؟

واصف صاحب نے جب اس مسئلے پر بولنا شروع کیا تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ شاعر، وہ لٹریچر کا طالب علم، پرائیویٹ سکول کا استاد، علمی اور ادبی محفلوں کا خاموش ہمراہی، ایک امڈتے ہوئے دریا کی طرح سارے کو اپنی لپیٹ میں لے کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ باتوں میں فلسفی کے دلائل اور ریاضی دان کے چوکھٹے آویزاں تھے۔ آنے والی دلیل پچھلی کہی ہوئی بات کے فریم ورک سے باہر نہیں جاتی تھی اور دانش کی قدیم حکایات سائنسی Equations میں لپٹتی چلی آتی تھیں۔ میں گھر سے یہ توقعات لے کر نہیں چلا تھا، اس لیے کچھ باتیں تو میں نے پکڑ لیں لیکن بیشتر میرے ذہن کے پردوں سے صاف پھسل گئیں اور میری نظروں کے سامنے تلملتی ہوئی ادراک کی حدوں پر دور دور تک پھیل گئیں۔ ان کا وجود باقی نہیں تھا البتہ ان کی چھوڑی ہوئی دودھیا سی روشنی سوچ کے آخری کناروں پر موجود تھی۔ اگلے روز میں اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر لے گیا جسے واصف صاحب نے پہلے روز تو چلنے نہ دیا، البتہ اگلے روز مان گئے۔

اس جگہ پر ہماری محفلوں کی روشنی ایک ہزار اور ایک رات تک جگمگاتی رہی اور واصف صاحب شمع محفل کے روپ میں ہم کو مسلسل روشنی عطا کرتے رہے۔ چور تو ایک رات میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور نہ ہونے سے ہونے میں بدل جاتا ہے لیکن ہم ایک ہزار ایک رات پوری Flood light میں گزارنے کے بعد بھی چندے کے چندے ہی رہے۔ ہم وہ بدنصیب چور تھے جو اپنی بیروزگاری کے ہاتھوں تنگ تھے اور اپنا اصل کام کر گزرنے کے بجائے واصف صاحب کی شاہراہ پر ہر شام اپنی احتجاج کے ٹائر جلانے جمع ہو جاتے تھے۔

واصف صاحب بیچارے اس دھوئیں کے پیچھے سے ہم کو خطاب کرتے اور ہماری راہیں اجالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے لیکن ہم شاید اجلی راہوں کے طلبگار نہیں تھے۔ ہم ایک پیر کی تلاش میں تھے، ایک اعلیٰ اور '' کرنے والے'' پیر کی تلاش میں جو ہمارے دکھ، دلدر دور کر کے ہمیں اس مقام سے واصل کر دے جس کے قصے ہم نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے اور جن کی باتیں ہم نے ان کتابوں میں پڑھی تھیں جن کے صفحات چاقو سے کاٹ کاٹ کر آگے چلنا پڑتا ہے۔

ان ایک ہزار ایک رات کی طویل مدت کے دوران ٹھیک چوبیسوں رات کو میرے اور واصف صاحب کے درمیان ایک رخنہ پیدا ہو گیا اور یہ خلا ہم دونوں کے درمیان پھیلتے پھیلتے وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ ٹھیک رات کے ایک بجے، ان کے گھر کے سامنے موٹر میں بیٹھے بیٹھے ہم نے بڑی لمبی گفتگو کی اور بہت ہی

بھلے آدمیوں کی طرح ہم نے بادل ناخواستہ ایک دوسرے کی بات مان لی۔

یہ جو ہم پندرہ بیس آدمی رات کے ڈیڑھ ڈیڑھ بجے تک باقاعدگی سے بیٹھ کر محفل میں لولگاتے تھے تو ہم کو ایسے پیر کی تلاش تھی جو ہمیں حق کا راستہ دکھائے اور ہماری پیشوائی کرے لیکن ایسے پیر کا ملنا بہت ہی مشکل تھا۔ سب لوگ دھوکا باز، جعلی پیر اور نقلی پیشوا تھے۔ ان کے قصے آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے تھے اور مخلوق خدا ان سے بہت نقصان اٹھا چکی تھی۔ واصف صاحب کی محفلوں میں ہمارے بیشتر سوال پیر کی ہیئت ترکیبی اور اصلی پیر کی پہچان سے متعلق ہوا کرتے۔ واصف صاحب کے جواب بڑے سادہ اور عام فہم ہوتے تھے لیکن وہ ہماری دستگیری نہیں کرتے تھے۔ وہ دستگیری نہیں کرتے تھے یا ہم خود ان سے ہاتھ چھڑوا کر اپنی بغلوں میں دبا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک ایسی حقیقت تھی جس کی ہم کو موقع پر موجود حالت میں سمجھ نہیں آتی تھی۔ البتہ بعد میں کچھ کچھ غبار ضرور چھٹتا تھا۔

ہماری اس محفل میں ایک نوجوان جن بھی باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑے ہی مضبوط بدن کا، شیریں کلام ہمہ طور متبسم شخص تھا جو اپنا آپ چھپانے کے کئی ڈھنگ جانتا تھا۔ میری طرح شبیر صاحب کو بھی شک تھا کہ وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہے تو وہ ہمیں آپس میں سرگوشی کرتے دیکھ کر دور سے نفی میں سر ہلا کر شدت سے مسکرایا کرتا۔ بہت ممکن ہے یہ میرا وہم ہو کیونکہ میں نے اس سے کبھی پوچھا نہیں کہ معاف کیجیے، آپ جنوں کے کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بالفرض محال اگر وہ بتا بھی دیتا تو مجھے کونسی جنوں کی ساری گوتوں کا علم ہے۔ میں نے ہوں ہاں کر کے رہ جانا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا ہی نہیں لیکن میرا واہمہ تین طرف سے اتنا پختہ تھا کہ وہ میرے یقین کے لینٹر کا پورا بوجھ سہار چکا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ نوجوان جن کرسی پر پورا بوجھ ڈال کر نہیں بیٹھتا تھا۔ دونوں پاؤں زمین پر جما کر اپنے وجود کا سارا وزن پاؤں پر ڈال کر رکھتا تھا۔ نئی اور مضبوط لوہے کی کرسی پر بھی سیٹ سے ہوا بھر اونچا رہ کر بڑی پھلتا کے ساتھ سارا لیکچر سنتا تھا۔ دوسرے جب نیازی صاحب چائے بنا کر لائے تو وہ اپنی پیالی بار بار لبوں سے لگا کر پرچ میں رکھتا رہتا تھا، چائے پیتا نہیں تھا۔ کنارکوزہ کی اس خالی بوسہ گری کی وجہ یہ تھی کہ وہ چائے میں شریک محفل رہنا چاہتا تھا کیونکہ ایک مرتبہ اس نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنے ہونٹوں کے نیچے سے بے آواز سڑک کے ساتھ ساری پیالی ختم کر دی تھی اور پھر شرمندگی سے میری طرف دیکھ کر نظریں جھکا لی تھیں اور تیسرا کمال اس میں یہ تھا کہ ان پوری ایک ہزار رات کے اندر اس نے نہ تو کبھی کسی بے چینی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی واصف صاحب سے کوئی سوال پوچھا۔ وہ کسی بہت ہی اعلیٰ جن گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور اس کی تربیت کسی بہت ہی مہنگے King Solomin میڈیم سکول میں ہوئی تھی۔ گو وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا لیکن میں ہمیشہ اسے پہلے سلام کیا کرتا تھا۔

پھر ایک ناصر صاحب تھے جو انشورنس ایجنٹ تھے۔ وہ روحانیت کے سخت خلاف تھے اور اسے

پیروں کا ایک ڈھکوسلا گردانتے تھے۔ ناصر صاحب مولویوں کو بھی برا سمجھتے تھے جن کی وجہ سے پاکستان میں ترقی کی راہیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ یہاں کوئی کارخانہ لگا سکتا تھا نہ سائنس کا سامان فروخت کر سکتا تھا نہ ولایتی دوائیاں استعمال کر سکتا تھا۔ وہ موت کے بھی بہت خلاف تھے اور اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ موت وغیرہ بھی ملاؤں کی بنائی ہوئی کوئی چیز ہے کہ اس کا روح سے تعلق ہے اور جب روح نکل جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب ہم ناصر صاحب سے ذرا تنگ ہوئے تو واصف صاحب نے منع کیا کہ ہر شخص کے پیشے کا احترام کرنا چاہیے۔ ناصر صاحب چونکہ لائف انشورنس کا کام کرتے ہیں اس لیے وہ موت کو کس طرح سے پسند کر سکتے ہیں جو اچانک حملہ کر کے ان کا بیمہ شدہ آدمی کا کلیم کمپنی میں داخل کروا دے۔ واصف صاحب کی بات ٹھیک نکلی۔ ان کے تین انشورنڈ کلائنٹس کی بے وقت موت پر کمپنی نے ان کو وارننگ دے دی تھی اور ان کا لائسنس خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ ان ساری بے چینیوں اور گھبراہٹوں کے باوجود ناصر صاحب باقاعدگی سے محفل میں آتے تھے اور ہر ایک کے لیے کمپنی کے کیلنڈر اور ڈائریوں کے تحفے لاتے تھے۔

کچھ لوگ آنا اچانک بند کر دیتے تھے اور پھر ان کا کوئی اثر آثار نہیں ملتا تھا۔ کچھ نئے، حیران اور پریشان سراسیمہ سے لوگ بغیر کسی تعارف کے اور بغیر کسی کا سہارا لیے اس محفل میں آنا شروع کر دیتے تھے۔

واصف صاحب کا فیض تواتر کے ساتھ جاری رہتا۔ ان کی گفتگو کا انداز آزاد نظم کا سا تھا۔ کوئی فقرہ چھوٹا ہوتا کوئی بڑا لیکن وزن سے کوئی بھی خارج نہ ہوتا۔ نہ ظاہری طور پر نہ معنوی طور پر۔ نہ گیانی انگ میں نہ سری بھید میں۔

میں نے تنگ آ کر کہا" واصف صاحب آخر یہ روحانیت ہے کیا شے؟"

کہنے لگے، روحانیت کوئی تجربہ یا مشاہدہ نہیں۔ کوئی Observation نہیں۔

اگر تم اس کا مشاہدہ کر سکو، اس کو سٹڈی کر سکو، اس کا جائزہ لے سکو تو پھر یہ ایک ذہنی عمل ہوا۔

ایک ذہنی عمل، ایک جسمانی عمل!

لیکن روحانیت کوئی شے نہیں کوئی Thing نہیں کہ اس کا مطالعہ کیا جا سکے۔

اس کا مشاہدہ کیا جا سکے۔

روحانیت کوئی بیرونی شے نہیں۔ یہ تم خود ہو، سارے کے سارے، پورے کے پورے۔

جسم کی کچھ کھیلیں ہیں۔

اسی طرح ذہن کی کچھ کھیلیں ہیں۔

Self اپنی مرضی کے مطابق ان کھیلوں میں مصروف رہتا ہے۔

ان میں شریک رہتا ہے۔

لیکن روحانیت کوئی کھیل نہیں، کوئی اکھاڑہ نہیں۔
کوئی پلے گراؤنڈ نہیں۔
Constitution نہیں، رولز آف دا گیم نہیں۔
یہ ایک لمبی آگاہی ہے...... ایک خبر ہے۔ صرف ایک ہی شہ سرخی ہے۔
ذہن اور جسم کے جتنے بھی کھیل ہیں سب Disturlance پیدا کرتے ہیں۔
روحانیت Disturlance سے مبرا ہے۔
سارے تجربے، سارے مشاہدے بے چینی پیدا کرتے ہیں۔
لیکن جب دیکھنے کو کچھ نہ ہو، کوئی شے مشاہدے میں نہ ہو...... اور
صرف آگاہی ہو...... ایک لمبی آگاہی بغیر کسی رکاوٹ کے بغیر جھاڑ جھنکار کے
بغیر تجربے کے، بغیر مشاہدے کے...... بس ایک خبر ہو، چوطرفہ آگاہی ہو۔
اس وقت تم روحانی ہو۔
اس وقت تم سچ ہو، اس وقت تم حقیقت ہو۔
اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ روحانیت کوئی خواب نہیں، نیند کی جھوک نہیں۔
کوئی ٹرانس نہیں۔
بلکہ یہ ایک بیداری ہے۔ ایک ایسی بیداری جو لمبا خواب دیکھنے والے نے ہمبلا مار کر حاصل کی ہے۔
اس بیداری کے پیچھے ایک راز ہے ایک رمز ہے، ایک بھید ہے۔
جس نے اس کو اپنی چٹکی میں پکڑ لیا
وہ روحانیت سے آشنا ہو گیا۔

جب یہ بات ہو رہی تھی اور اس سے آگے کی باتیں ہونے لگی تھیں تو ہماری آنے والی ایک ہزار ایک رات کی یہ ابتدائی چوبیسویں رات تھی۔ ٹھیک آدھی رات کو میرے اور واصف صاحب کے درمیان ایک رخنہ پیدا ہو گیا اور ہماری دوستی کے درمیان ایک خلیج نمودار ہو کر ہماری نظروں کے سامنے سمندر کی طرح پھیل گئی۔

ٹھیک رات کے ایک بجے، ان کے گھر کے سامنے، موٹر میں بیٹھے بیٹھے، میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا ''واصف صاحب میری اور آپ کی دوستی نہیں چل سکتی کیونکہ دوستی ہمیشہ ایک سطح کے لوگوں کے درمیان ہوا کرتی ہے اور میرے اور آپ کے لیول میں بڑا فرق ہے۔ آپ اس وقت جس مقام پر ہیں میں لاکھ کوشش کے باوجود وہاں نہیں پہنچ سکتا اور آپ اپنی تمام تر شفقت اور محبت کے باوصف بار بار میری سطح پر نہیں اتر سکتے۔ اس لیے ہمارا دوستی کا رشتہ ختم ہوتا ہے اور ایک دوسرا تعلق شروع ہوتا ہے۔ جسے میں فی الحال کوئی نام نہیں دے سکتا۔

انہوں نے ہر چند میری تشفی کے لیے بڑی مضبوط دلیلیں فراہم کیں لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر میں نے بھی دنیا دیکھی تھی اور گھاٹ گھاٹ جھک ماری تھی۔ کیا مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ ان کے علم میں اور ہمارے علم میں فرق ہے۔ ہمارا سب کچھ اکتسابی تھا اور ان پر ایک خاص گوشے سے عطا ہو رہی تھی۔ ان کا ایک فقرہ مجھ ایسوں کے سوسو صفحات پر بھاری تھا اور ان کی بات دل پر اور دماغ پر ایک ساتھ اترتی تھی اور ایک سا گہرا اثر کرتی تھی۔ فلسفی، دانشور اور ریاضی داں دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاعر، داستان گو اور نغمہ گر دل کو برماتے ہیں لیکن ان دونوں سلطنتوں پر فقر کا بادشاہ حکمرانی کرتا ہے۔ واصف صاحب خوش قسمت تھے کہ ان کو فقیری بھی مل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ بادشاہت بھی عطا ہو گئی۔ ہم ان سے بھی زیادہ خوش قسمت تھے کہ ان کا اتنا لمبا ساتھ نصیب ہو گیا اور اگر کوئی بیمہ ایجنٹ ہم کو روک کر پوچھے کہ اس سارے میلے میں کیا کھویا اور کیا پایا تو ہم واصف صاحب کے لفظوں میں ہی جواب دیں گے کہ انسان اس دنیا میں نہ کچھ کھوتا ہے نہ پاتا ہے ..... بس آتا ہے اور جاتا ہے!

واصف صاحب نے اپنی زندگی میں ہمیں بہت کچھ دیا۔ بڑی محبت، بڑی توجہ اور گہری لگن کے ساتھ دیا۔ اس کے بدلے میں نہ کچھ مانگا نہ کسی شے کی توقع رکھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بھی اپنے روایتی انداز میں ان کی توقع پر پورے اترے۔ حتی الوسع ان کا دل شاد کیا اور اپنے روایتی انداز میں ان کی توقع پر پورے اترے کہ:

مکے گئے، مدینے گئے، کربلا گئے
جیسے گئے تھے لوٹ کے ویسے ہی آ گئے

اکیلے سفر کا اکیلا مسافر

تنہا ہونا زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے اور بھری پری دنیا میں اکیلے ہو جانا خدا کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ یہ دولت ہر کسی کو آسانی سے نصیب نہیں ہوتی کیونکہ یہ انبیاء کا حصہ ہے۔ نبی کو یا تو بچپن میں ہی تنہا کر دیا جاتا ہے اور اس سے اس کے والدین لے لیے جاتے ہیں یا خود اس کے والدین کے ہاتھوں اسے دریا میں اکیلے بہا دیا جاتا ہے یا ڈھیر سارے بھائیوں کے ہاتھوں کسی کنویں کی تہہ میں تنہا بٹھا دیا جاتا ہے اور انبیاء کے اکیلے رہنے اور تنہائی کا راستہ اختیار کرنے کا سلسلہ اوائل ایام تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ سن شعور سے آگے گزر جانے کے بعد وہ تنہائی کا مقام خود تلاش کرتے ہیں اور اکیلے رہنے کے لیے کسی بڑے برگد یا لق و دق سینا کی وادی یا سنگلاخ پہاڑ کی چوٹی پر بنے میڑھے چٹانی پتھروں کے اندر حرا کی غار خود منتخب کرتے ہیں جس کو کچھ بہت بڑا علم عطا ہونے والا ہوتا ہے۔ وہ تنہا ہو جاتا ہے اور تنہائی کی بارگاہ میں جوتے اتار کر سر ڈھانپ کر پاکیزگی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ ادب کے ساتھ انتظار کرتا ہے اور وقت آنے پر اپنا توشہ وصول کرتا ہے۔ پھر وہ برگد کے نیچے سے اٹھ کر وادی سینا سے نکل کر اور جبل نور سے اتر کر اس توشے کی نعمت اپنے لوگوں میں بانٹنے کو واپس بستی میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ تو ایک بہت بڑی بات ہے۔ میری نظر میں تو ہر تخلیقی عمل تنہائی کی اساس پر بنیاد اٹھاتا ہے۔ پیدائش کا عمل تنہائی سے منسلک ہے۔ موت جیسی خوبصورت تخلیق اکیلے ہو کر عمل میں لائی جاتی ہے تاکہ پیچھے آنے والوں کی راہ بند نہ ہو۔ بیماری کا کمبل کہ جس میں ٹوٹتے سیلز تانا اور نیورو سیلز کے بدلتے سگنل بانا بن جاتے ہیں، تنہائی کی کھڈی پر اکیلے بیٹھ کر ہی بنا جاتا ہے۔ یہ تو خیر اونچی چیزیں ہیں۔ مرغی بھی جب انڈا دینے جاتی ہے تو تنہائی اختیار کرتی ہے اور اکیلے بیٹھ کر اس تخلیقی عمل کو سرانجام دیتی ہے۔ جہاں دانش ہے وہاں تنہائی ہے۔ جہاں علم ہے وہاں اکلاپا ہے۔ جہاں انفرمیشن ہے، اعداد و شمار ہیں Statistics ہے وہاں ہجوم ہے۔ انبوہ ہے رولا ہے جہاں مرغیوں کو قطاروں میں بٹھا کر انڈے دلوائے جاتے ہیں، دراڑوں میں لے جا کر آدمی مروائے جاتے ہیں۔ لیبر روموں میں عورتیں تڑپا کر بچے جنوائے جاتے ہیں وہاں پیدائش تو ہے لیکن تخلیق

نہیں۔ انڈا تو ہے مگر ذائقہ نہیں۔ بچہ ہے مگر بدھائی نہیں۔ موت ہے مگر گوشۂ تنہائی نہیں۔

یوسف کامران ان خوش نصیب فنکاروں میں سے ہے جس نے اکیلے مسافر کی حیثیت سے ایک تنہا راستہ منتخب کیا ہے۔ میں اس کتاب کی نظموں کے تعلق سے بات نہیں کر رہا۔ اس انسانی تعلق سے بات کر رہا ہوں جو میرے اور یوسف کے درمیان بڑی دیر سے قائم ہے کہ یوسف اگر لکھے تو فنکار ہے نہ لکھے تو فنکار ہے کیونکہ وہ بائی پراڈکٹ کے سہارے اپنے آپ کو منوانے پر یقین نہیں رکھتا۔ گھوڑا شہسوار کے بغیر بھی گھوڑا ہی کہلاتا ہے لیکن شہسوار گھوڑے کے بغیر شہسوار نہیں ہوتا۔ فٹ پاتھ پر دوسرے لوگوں کی طرح چلتا ہوا ایک بندا ہوتا ہے۔ یوسف کامران شعر لکھے نہ لکھے، نظم بنائے نہ بنائے کتاب چھپوائے نہ چھپوائے شاعر ہے۔ اس کی ساری روح ساری سائیکی شاعر کی ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں اس کے نتھنے، اس کا رنگ چلئے آپ یہ باتیں نہ مانیں یہ تو تسلیم کریں گے کہ اس کی بے اعتنائی اپنے مسودے سے بے پروائی، پکڑ پکڑ کر لوگوں کے نتھنوں میں اپنے کلام کا دھواں نہ دینا، کچھ لکھنا اور بھول جانا اور بھول جانا اور گم کر دینا تلاش نہ کرنا اور کسی سے غصہ گلہ نہ کرنا اور مل جانا تو شکوہ شکایت نہ کرنا۔ تنہا رہنے کے لیے ایسا پیشہ اختیار کرنا جس کا علم وادب سے یا شاعری سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ بیمار پڑنا تو ایسی بیماری سہنا جو بدنی بھی ہو، ذہنی بھی، روحانی بھی جس میں مراق کی کیفیت بھی ہو، کشف والوں کا آخری پہرا بھی ہو اور اطالوی جگلوز کی جنسی لذت بھی ہو۔ تنہائی تلاش کرنے کے کئی بہانے ہوتے ہیں۔ کئی حیلے کئی کھکھن کرنے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہجوم کو ایک جمِ غفیر کو ایک گروہ (Mob) کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے آواز دینا پڑتی ہے کہ میں اکیلا ہوں، میں اجنبی ہوں، میں تنہا۔ اے لوگو میری بات سنو۔ میرے ساتھ ایک بول میٹھا بولو۔ میرے ساتھ Communicate کرو، میری بات سمجھو۔ میں Aliniate ہو رہا ہوں ..... اور جب لوگوں کا ہجوم دھکم پیل کرتا، پکارنے والے کے دروازے پر پہنچتا ہے تو فریادی راستہ صاف پا کر چور دروازے سے اس کھڑکی کی طرف نکل جاتا ہے جہاں بیٹھ کر تخلیقی عمل سکون کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے۔

یوسف کامران کی یہ کتاب بھی جمِ غفیر کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ جب ایک انبوہ بڑی ہمدردیاں اور بڑے فلسفے اور بڑی باریکیاں لے کر اس کے دروازے پر پہنچے گا تو میں جانتا ہوں کہ یوسف کامران ان سب کو ازان گھاٹی بتا کر چور دروازے سے نکل جائے گا۔ ایک لمبے اور اکیلے سفر پر۔ بالکل تنہا۔ کسی بڑے اور کریم اور شفیق تخلیقی عمل کے لیے۔ اپنا معمولی سا توشہ سمیٹنے کے لیے اور پھر واپس لوٹ کر اس میں سے ہمارا حصہ ہمیں دینے کے لیے۔ ہمارے حصے کی آسانیاں ہمیں عطا کرنے کے لیے ہمیں تقویت بخشنے کے لیے۔

لیکن! خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ خواتین و حضرات خطرہ ہر گھڑی تلوار کی طرح سر پر لٹکا رہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ چھوٹا سا ذہین فنکار اکیلا نہ رہ سکا، کسی برگد کے نیچے، کسی دور افتادہ گوشۂ تنہائی میں اور اس کو کسی گروہ کا یا ہجوم کا چسکا پڑ گیا اور یہ انبوہ کا اور بلوائیوں کا فنکار بن گیا تو یہ فن کی دنیا کا Villain تو بن جائے

گا، چانداور ستاروں کی سجدہ گاہ نہ بن سکے گا۔

خواتین وحضرات خطرہ ہر وقت تلوار کی طرح سر پر لٹکا رہتا ہے۔ بکرا پاک اور طیب شے ہے لیکن خطرہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ذبح ہو جائے تو حلال ہے، جھٹکا ہو جائے تو وہی طیب شے حرام ہو جاتی ہے۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو یوسف کامران۔ ہر طرح کے خطرات سے بچائے۔ آسانی عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

''ملامتوں کے درمیان''

ہر زندہ شے کے اندر اس کا تضاد موجود ہوتا ہے۔ یہ تضاد نہ ہو تو اس زندہ شے کی نشوونما ہو تو سکتی ہے لیکن اس نشوونما کو ہم Vegetable Growth کہتے ہیں۔ جیسے گوبھی کا پھول، سرسبز و شاداب ڈنٹھلوں والا گتھا ہوا چوبر۔

کشور ناہید کا تضاد یہ ہے کہ کشور بنیادی طور پر ایک شاعر ہے۔ اول آخر دائیں بائیں شمال جنوب ہر طرح سے شاعر ہے اور اس کو زمانے کا ساتھ دینے کے لیے اینگری ینگ وومن کا رول بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رول کشور کو اتنا پیارا ہے کہ اس کی یاری میں وہ میلہ گھومنی بن گئی ہے جس طرح ایک ماں اپنا بچہ پڑوسن کی نگرانی میں چھوڑ کر نہر والے پل پر تجن پیاروں کو ملنے چلی جاتی ہے۔ اسی طرح سے کشور زمانے کو، مردوں کو، ملنوں کو ظالم سماج کو بے رحم یوا ین کو دھکے مارنے بڑی بڑی دور نکل جاتی ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو اس کا بچہ رو رو کر نڈھال ہو چکا ہوتا ہے اور سسکیاں لیتے ہوئے ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں ڈبو ڈبو کر جو لوری وہ اس کو دیتی ہے وہ کشور کی شاعری ہے۔ جو دھکے وہ ظالم انسانوں کو اور وقت کے چلن کو مارتی ہے وہ ناہید کی خودنمی اور خدافہمی ہے اور اس میں اس کی فہمائش کے سلسلے نکلتے ہیں جس سے لوگ ناراض ہوتے ہیں اور میں خوش ہوتا ہوں۔ کشور چونکہ دکھی ہے، اس لیے شاعر ہے۔ انسان ہے اس لیے کراہتی ہے، مظلوم ہے اس لیے شکوہ کرتی ہے، بندہ ہے اس لیے کرب میں مبتلا ہے۔ ناہید چونکہ بہادر ہے اس لیے احتجاج کرتی ہے۔ مطالعوی ہے اس لیے نتیجے اخذ کر کے پھنکار کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے اس لیے کھڑکیوں کے شیشے توڑتی ہے۔ متکبر ہے اس لیے جلوس نکالتی ہے لیکن ہیں دونوں گویاں۔ ایک سائیڈ سکے کی شبیہ ہے، دوسری باادب باملاحظہ خبردار ہے...... اور یہ دونوں ہی اس کے وجود کی روپ وان اشرفی ہیں۔

اگر آپ ''ملامتوں کے درمیان'' کی فائل نکالیں تو اس میں بریاں دے لوکوں ہر حال میں نکل آئے گی۔ اس میں فال کے مروجہ طریق کو چھوڑ کر آپ آگے بڑھتے جائیں تو ''صحرا شرط غزالوں کی'' کے فوراً

بعد آپ کو خود کلامی میں وحشن کی پوری کام کی پکی لاکھوں کی لاڈلی ہنر والی ناہید ملے گی جو ہر ہر مصرعے میں جھٹکے مار مار کہے گی، ادھر آ۔ ادھر آ میں تیرا منہ جھلسوں تیری جان نکالوں، تیری بوٹیاں کروں۔

میرے عہد میں اردو کی یہ نامور شاعرہ اس وجہ سے بڑی ہے کہ یہ غیر ضروری طور پر زین (Zen) کے عمل سے واقف ہے۔ Zazen اور ساری یوگا شکار سے اور مارشل آرٹس سے تعلق رکھتی ہے۔ شکاری کو شکار کرنے کے لیے سب سے پہلے سادھی کا فن سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کو اپنے صید کے ساتھ اک مک ہونے کا ہنر سیکھنا پڑتا ہے اور اک مک ہونے کے لیے یا کسی دوسرے کے ذہن میں اترنے کے لیے یا تو آپ کو اس سے شدید محبت کرنی پڑتی ہے یا اس کو قتل کرنے کی گھات لگانی پڑتی ہے۔ یہ دونوں عمل ایک ہی اشرفی کے دو رخ ہیں۔ شکار دو یا یہ نہیں کہ شکاری تیغ بکف جنگل میں اترے اور ترائیوں میں مارا مارا پھرے بلکہ شکار کا جادو یہ ہے کہ صید اٹھ اٹھ کر اور آگے بڑھ بڑھ کر شکاری کے پنجوں میں خود بخود آتے جائیں اور شکار ہوتے جائیں۔ جس طرح ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح سے سمجھ نہیں آ سکتی کہ ایک رشی سمان سادھو جنگل باسی دنیا سے دور کومل نرمل معصوم مرگ کا شکار کیسے کرسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ہر ایک کے لیے کٹھن مشکل ہے کہ احتجاج سے بھری، دھکے مارنے والی نقص میں ناہید بیک وقت ملائمتی اور احتجاجی کس طرح سے ہو سکتی ہے لیکن گود میں سسکیاں لیتا گالیاں دیتا بچہ آپ کو یہی بتائے گا کہ ایسے ہی ہے۔ مجھے دیکھ لو۔ اس کو جاننا ہو تو میری ہیئت اور میری کیفیت پر نظر کرو۔ جس طرح ایک میں تین کا تصور ہے میری ماں ایک میں دو ہے اور ہر ماں ہر ایک میں دو ضرور ہوتا ہے۔ کہیں کہیں یہ زوج معلوم ہے۔ کہیں ہمارے علم سے باہر ہے۔ یہی وجہ Creater ہے کہ کم فہموں کی آسانی کے لیے کشور نے اپنی اور ناہید کی شاعری کو ایک ہی کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔

پروین شاکر

میری ایک بہت ہی بری عادت ہے کہ جو شخص مجھے اچھا لگتا ہے، اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے اور اس کا ہر کام پیارا لگتا ہے۔ مجھ سے اس پر تنقید نہیں ہو پاتی۔ جیسے لڑکیاں اپنی بہت ہی پیاری سہیلیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کرتی ہیں کہ شہلا کا رنگ تو گندمی ہے اور اس کا قد بھی چھوٹا ہے اور چہرہ بھی کسی قدر لمبا ہے لیکن اس کی چھب بہت ہی پیاری ہے اور دور سے آتی ہوئی بڑی من موہنی سی لگتی ہے ...... مجھ سے لاکھ کوشش کے باوجود اس قسم کے تجزیے نہیں ہو سکتے اور میں جس کھونٹے پر ایک مرتبہ بندھ جاتا ہوں، وہاں سے رسہ نہیں تڑا سکتا۔ میں کوشش بھی کروں تو تعلق توڑ نہیں سکتا۔ یہ میری ایک Built in خرابی ہے اور اعلیٰ تعلیم بھی اسے شارٹ سرکٹ کر کے اس کا فیوز نہیں اڑا سکی۔

اول اول جب میں نے فنون میں پروین کی ایک غزل پڑھی تو اس کی اور غزلیں پڑھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ تین چار غزلیں اور مل گئیں (اس وقت یہ نئی نئی شاعری کے میدان میں داخل ہوئی تھی) پھر ہر ماہنامے اور سالنامے اور خاص نمبر کا انتظار رہنے لگا اور جب پروین نے اپنا لوہا پوری طرح سے منوالیا تو ہم بھی ماننے والوں کا روپ اختیار کر کے اس کی شاعری کے زاویئے میں داخل ہو گئے۔ گو اس ماننے میں میرا بہت سا ذاتی، مالی، جذباتی اور احساساتی نقصان بھی ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے لیکن میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔ پروین کی شاعری کے سحر سے مسحور ہو کر اس کے تتبع میں میں نے بھی اسی پبلشر کو اپنی اگلی کتاب اشاعت کے لیے دے دی جہاں سے اس نے اپنی خوشبو چھپوائی تھی۔ اس کے ساتھ تو پتہ نہیں کیا گزری البتہ مجھ کو پروین کی شاعری سے محبت کرنا بہت مہنگا پڑا اور میرا بہت سا ذاتی مالی جذباتی اور احساساتی نقصان ہو گیا لیکن پروین کی شاعری کی خاطر میں تقریباً اتنا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ نقصان برداشت کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

اس عہد میں جب "Life is for Living" نعرہ عام ہو گیا ہے اور انسانوں نے زندگی سے رشتہ منقطع کر کے Living کے ساتھ تعلق استوار کر لیا ہے، شاعری، مصوری، موسیقی اور لطف کی بساط لپٹ گئی ہے۔

ایسے انقلابی اور معاشی دور میں اگر آپ کو کوئی خاص شاعر بھی مل جائے اور اسی کی شاعری کی بو باس وہی ہو جو انسانوں پر نازل ہونے والی ازلی شاعری کی تھی اور جس سے انسان اسی طرح لطف اندوز ہوتے تھے جس طرح چشموں، ندیوں، نالوں، ہوا کے جھونکوں اور اونٹوں کی گھنٹیوں سے ہوتے تھے تو پھر آپ کو چونک کر اور رک کر اور اپنا آپ جھٹک کر ایک مرتبہ پھر اس کی ساری شاعری سے گزرنا پڑے گا جس میں معیشت، سیاست، کفاف، گزران اور گزر اوقات کا ذکر نہ ہو۔ علم الاقتصاد کے تیور نے دنیا اور سارے شعبوں کو تو خوفزدہ کیا ہی تھا۔ ادب شاعری مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کا بھی کڑا کا نکال کے رکھ دیا۔ آج کے عہد کا کوئی شاعر (ملکی یا غیر ملکی) اپنے آپ کو اس وقت تک ایک محفوظ شاعر نہیں سمجھتا جب تک وہ معیشت اور کفاف کے بارے میں ان لوگوں کا ذکر نہ کرے جن کا ذکر کرنے سے فن کو بڑی داد ملتی ہے۔ اس عہد نے شاعری بلکہ سارے فنون لطیفہ کے سارے اصل راستے بند کر کے ان کے رخ اپنی طرف موڑ لیے ہیں اور ایسے خوبصورت انسانی جذبوں کو اپنے فیوڈل دربار کے بیگی اور مراثی بنا لیا ہے۔ پرانے شاعر غریب ہوتے تھے اور حسن کی بات کرتے تھے۔ اپنی ناداری کے باوصف جمال سے محبت کرنے کی آرزو پیدا کرتے تھے۔ آج کا شاعر حسین ہے اور صاحب حیثیت ہے لیکن لوگوں کے دلوں میں غربت کا خوف پیدا کر کے انہیں ڈرا ڈرا کے اور کنبا کنبا کے مار رہا ہے۔ ایسے عہد میں اگر آپ کو ایک شاعر سیفو، میرا، زیب النساء، یا پروین جیسا مل جائے تو زندگی کی تمام بے اعتباریوں کے باوجود اس پر اعتبار آنے لگتا ہے اور اگر دگرد کے سارے دکھوں، کربوں اور سڑکنوں کے باوصف انسان کو لطف کی دولت ملنے لگتی ہے جیسے غریب ترین، دریدہ صورت اور پریدہ انگ ماں کے دودھ سے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے گھونے بچے کو طاقت اور توانائی حاصل ہونے لگتی ہے ..... شاعر کا صرف اپنی شاعری کے بل بوتے پر قد آور ہونا ہی اس کے شاعر ہونے کی شناخت ہے۔ یہ نشان شاعری کسی اور کے پاس بھی ضرور ہوگا لیکن پروین کی شاعری کی تو اصل بنیاد ہی یہی ہے۔ پروین کوئی عہد ساز یا رجحان ساز یا کار کشا کارساز شاعر نہیں ہے۔ وہ فقط شاعر ہے اور شاعری کے اندر باہر زندہ ہے۔ محبت اس کی کمزوری ہے جو اس ننھی منی جان میں کم ہیموگلوبن رکھنے والے خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ اصل میں محبت کا سب سے بڑا کمال ہی یہی ہے کہ وہ کبھی فاتح نہیں ہوتی، نُھی مُھی ماڑی ماڑی اور نربل نربل رہی ہے۔ اس کا فتح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ فلارنس نائیٹنگیل کی طرح ہمیشہ مفتوحوں کے ساتھ رہتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہی سب سے مضبوط ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے زنجیر توڑ کے رکھ دیتی ہے اور یہ کمال ہم لکھنے والوں میں صرف پروین شاکر کے پاس ہے اور اس کے پاس بھی اس کی محبت کرنے والی روح کی وجہ سے ہے ورنہ بڑی بڑی محبتیں کرنے والے اپنی محبتوں کے دعوے میں شمشیر محبت نیام سے نکال کر اپنے گھر والوں پر ہی وار کرنے لگتے ہیں۔ پھر ان پر بھیڑیے اور ہرنی کی دوستی کبھی نہیں ممکن ہے۔ جیسی نظمیں لکھنی پڑتی ہیں لیکن تب تک وہ بھیڑیوں کے غول میں بہت دور پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

پروین کی شاعری کے بارے میں میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی یہ ایک مختصر سی تمہید ہے۔ پوری تمہیں میں پھر لکھوں گا اور اصل مضمون اس وقت پیش کروں گا جب ہماری فریکوینسی Stray Sigus سے نکل کر Muse کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔ اس وقت تک میں پروین شاکر کو اس کے نئے مجموعے کی اشاعت پر ڈھیروں ڈھیر مبارکباد دیتا ہوں اور اس کے لیے دعا کرتا ہوں۔

بشریٰ رحمٰن

میاں عبدالرحمٰن ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہے جو پہلی ہی نظر میں اپنے آپ پر کچھ اس طرح سے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ پھر ساری عمر ان کی نظر میں اور کوئی محبوب جچتا ہی نہیں لیکن یہ بشریٰ کا سب سے بڑا کمال ہے کہ اس نے اپنی سوکن کے ساتھ بڑے سبھاؤ اور سلیقے کے ساتھ زندگی بسر کر کے دکھائی ہے اور آئندہ بھی اس کے حوصلے بلند ہی نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ بشریٰ رحمٰن کو ایک رائٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں، کچھ سوشل ورکر کی حیثیت سے۔ کئی ایک اسے ایک خوش لباس اور خوش گفتار خاتون کی وجہ سے مان دیتے ہیں اور اس وقت ساری دنیا اسے ایک سیاست دان کے روپ میں دیکھ کر اس سے متعارف ہو چکی ہے لیکن میں بشریٰ کو محض عبدالرحمٰن میاں کی بیوی کی حیثیت سے جانتا ہوں کیونکہ میرا اس سے قریب ترین رشتہ ہی یہی ہے۔

بشریٰ کو ہم لوگوں سے ایک نہایت ہی بے معنی سی شکایت ہے کہ اس نے ایسی اچھی کتابیں، اتنے اچھے مضمون، اعلیٰ درجے کے ناول اور اب اس معرکے کے کالم لکھا لیکن ادیبوں نے اس کی تحریر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اس پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ اس پر دی جانی چاہیے تھی لیکن اس کا یہ شکوہ محض ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہے کہ اس کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ادیب سوائے اپنی تحریر کے کسی اور کی تحریر پر توجہ دے ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ایک ماں کی نظر میں دوسری ساری دنیا کی اولاد گندی پلپلی بھینگی اور بدشکل ہوتی ہے اسی طرح ایک ادیب کی نگاہ میں دوسری سب تحریریں بے جان، سپاٹ، مردہ، بے معنی اور ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم بھی برابر کے شاکی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بشریٰ ابھی تک اس معاملے میں حساس ہے اور ہم پورے طور پر بے حس ہو چکے ہیں۔ یہ جو تھوڑی بہت داد، ذرا سی ہلا شیری اور ملے ملے ہمیں نصیب ہے تو باہر کے حلقوں سے۔ ادیبوں بیچاروں کے پاس تو دینے کے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ داد یا شاباش کدھر سے دے دیں گے۔ پڑھا لکھا دانشمند آدمی بڑی دانائی اور عقلمندی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اگر کسی کو کچھ دے دے تو اس کی اپنی زندگی سے ایک رکن کم ہو جاتا ہے۔ ہم تو اپنے شعر کا وزن گرنے نہیں دیتے، اپنے وقار میں سکتہ پڑنے کو کس طرح سے گوارا کر سکتے ہیں۔ دوسروں کو کچھ دینے دلانے کا کام

بے وقوف لوگوں کا ہے اور ہم لوگ، معاف کرنا اور سب کچھ ہو سکتے ہیں بے وقوف نہیں ہوتے۔ تو بشریٰ کا یہ گلہ کہ اس کو ادیبوں کی طرف سے اور ادیب برادری کی طرف سے کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا، بالکل بے معنی ہے۔ ہم نے تو خود اپنی کلغیوں میں ادھر ادھر سے نوچ کھسوٹ کے مشکل سے دو ڈھائی پر پھنسائے ہیں، ہم اس کو کدھر سے اس میں حصے دار بنالیں لیکن کالم نویسی کے بعد شاید بشریٰ کا یہ گلہ باقی نہیں رہا کیونکہ اب وہ خدا کے فضل سے Dictating پوزیشن میں ہوگئی ہے اور اس کی بات ادیب حلقوں میں خود بخود غور سے سنی جانے لگی ہے۔ گو داد اس کو اب بھی نہیں مل سکے گی کیونکہ ہمارے پاس ساری داد بس اپنے جوگی ہوتی ہے۔

لیکن میں جس بشریٰ کا ذکر کر رہا تھا، وہ دوسری بشریٰ ہے جو کھانے پکانے، گھر چلانے، بچوں کی تربیت کرنے اور شوہر کے ناز اٹھانے کے فن سے بخوبی آشنا ہے۔ باوجود اس کے کہ بشریٰ کے ارد گرد نسوانی تحریکیں بڑے زور شور سے چل رہی ہیں اور ان کے نعرے تحریری طور پر اس کے گھر کی چار دیواری کے اندر ہر روز پہنچتے رہتے ہیں۔ بشریٰ، مٹر قیمہ، شامی کباب اور ریاستی حلوہ اپنے ہاتھوں سے خود پکا لیتی ہے اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ دوسروں کو کھلا کر خوش بھی ہوتی ہے۔ اس وقت جب ویمن لبریشن کی تحریک خود اس کے اندر بھی لہریں بن بن کر گزر رہی ہے۔ بشریٰ اپنے بچوں کے ٹوٹے ہوئے بٹن خود ٹانکنے کے فن سے ابھی تک آشنا ہے۔ بٹن ٹانک چکنے کے بعد دھاگا قینچی سے نہیں کاٹتی دانت سے کاٹتی ہے تاکہ بٹن ٹکوانے سے قریب ترین Contact ہو سکے اور زندگی میں راہیں بدلنے سے پہلے مل بیٹھنے کی ساری حسرتیں اس بہانے پوری ہوتی رہیں۔

بشریٰ کے پاس اچار کے مصالحے والے گوشت کی ڈش کا ایک ایسا نسخہ ہے کہ میں نے آج تک اس سے بہتر کھانا کہیں اور نہیں کھایا۔ مشرق و مغرب اور شمال جنوب میں میں نے بڑے دور دراز کے سفر کیے ہیں لیکن کسی کے ہاتھ میں ایسا رس اور کسی کی ''ریسے پی'' میں ایسا چس کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔ اصل میں یہ تعریف میری ماں کے زمانے کی ہے اور اس عہد میں اس خصوصیت کا ذکر کرنا جو خوبی سے نکل کر خرابی کے خانے میں داخل ہو چکی ہو، کوئی اچھی بات نہیں لیکن میں کیا کروں کہ میرے پاؤں تلے کی زمین اور میرے سر کا سورج ابھی تک پرانے ہیں اور ان میں بابا آدم سے لے کر میری مرحومہ ماں تک اور اس کے بعد سے لے کر اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حیرانی کی بات ہے کہ زمانہ ترقی کر گیا اور ہم ابھی تک رجعت پسند زمین اور قدیم سورج کے درمیان ہی زندگی بسر کر رہے ہیں بلکہ ترقی یافتہ ترین زمانہ ان دونوں قدیم ترین اور روایتی ترین خطوں کے اندر ہی سفر کر رہا ہے اور چونکہ ترقی یافتہ ترین زمانہ ابھی تک ان خطوں کے اندر ہی سفر کر رہا ہے اور چونکہ ترقی یافتہ ترین زمانہ ابھی تک ان خطوں سے باہر نہیں نکلا، اس لیے مجھے بشریٰ کی اس خصوصیت کی جی بھر کے تعریف کر لینے دیجیے جو ابھی تک ہمارے اٹھانوے فیصد لوگوں کے نزدیک ایک خصوصیت بلکہ ''دی خصوصیت'' ہی ہے کہ ایک اچھی ماں اور ایک گھر گرہستی عورت ہی ''دی گریٹ'' ہوتی ہے۔

لیکن جہاں بشریٰ میں اللہ تعالیٰ نے کئی خوبیاں یکجا کر دی ہیں اسی طرح اسے ایک برائی میں بھی الجھا کے رکھ دیا ہے۔ جس طرح مختصر ترین راستہ ہمیشہ زیرِ تعمیر ہوتا ہے۔ اسی طرح بشریٰ کی اس ایک چھوٹی سی خامی اسے کامیابی کی منزل سے ہمیشہ دور رکھتی ہے۔ بشریٰ ابھی تک بڑوں اور بزرگوں کے سامنے باادب رہتی ہے حالانکہ سن پچاسی مکمل طور پر ختم ہو کر چھیاسی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ ایسے ترقی یافتہ دور میں، اس عمر تک پہنچ کر بھی باادب رہنا بڑی رجعت پسندی کی دلیل ہے لیکن بشریٰ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور نظر آتی ہے۔ گو پہلے کے مقابلے میں اس نے اس بری عادت کو کافی حد تک ترک کر دیا ہے اور اسمبلی کی پریکٹس کے بعد تو یہ عادت انشاء اللہ بالکل ہی ختم ہو جائے گی، تاہم فی حال یہ پرانی روک باقی ہے۔ تعظیم اور ادب کے خلاف فقرہ اس کے ذہن میں جنم تو لیتا ہے اور زبان کے گرد آ کر لپٹتا بھی ہے لیکن احترام کے ہونٹ ہمیشہ بھڑے رہتے ہیں اور وقت گزر جانے کے بعد تو یہ دروازے بالکل ہی سیل بند ہو جاتے ہیں۔ ایسی کئی وارداتوں میں جب میں نے رحمٰن میاں کا ناجائز ساتھ دیا تو بشریٰ نے پاس ادب سے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ حالانکہ اسے ایک ایک بات پر آٹھ آٹھ فقرے سوجتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس نے ان فقروں کو اپنے کالموں میں لے جا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ یہ باتیں کن کن کے خلاف ہو رہی ہیں اور کیوں ہو رہی ہیں...... ہماری گھریلو واردات ہمیشہ ایک ہی بات پر ہوا کرتی ہے۔ میاں عبدالرحمٰن کو یہ شکایت ہے کہ لوگ اس کے فلسفے کو نہ تو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس پر اپنا آپ اپلائی کر کے اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ جب اس موضوع پر بہت ہی چیختا چلاتا ہے تو بشریٰ ہمیشہ ایک ہی فقرہ کہا کرتی ہے کہ میاں صاحب اگر آپ مکمل طور پر خاموش رہا کریں تو مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی خاموشی سے اتفاق کرنے لگ جائیں گے لیکن اس پر اور ہنگامہ ہوتا ہے اور ہر مصالحت کے دوران مجھ پر پہلے سے زیادہ بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اتنی بات بشریٰ بھی نہیں سمجھتی کہ اس دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ دیکھتے نہیں، کان ہوتے ہیں اور وہ سنتے نہیں لیکن کوئی آدمی ابھی تک ایسا تیار نہیں ہو سکا جس کے زبان ہو اور وہ بولتا نہ ہو۔ بشریٰ ادب کے مارے خاموش ضرور ہو جاتی ہے لیکن میری اس منطق سے متاثر نہیں ہوتی۔

اصل میں میرے پاس بشریٰ کے لیے تعریف ہی تعریف ہے۔ مجھے نہ تو آج اس میں کوئی برائی نظر آتی ہے اور نہ آگے چل کر نظر آئے گی۔ بشریٰ ایک رشتے سے میری بہو ہے اور بہو کی اور سسر کی زندگی بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ ہر سسر کو اپنی بہو اور ہر بہو کو اپنا سسر اچھا لگتا ہے لیکن میری جگہ اس وقت اگر بشریٰ کی ساس یہاں کھڑی ہوتی اور اس کو کچھ کہنا ہوتا تو شاید یہ مضمون بہت حد تک مختلف بلکہ کافی حد تک الٹ ہی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس محفل میں آج میں اکیلا آیا ہوں اور بانو قدسیہ کو گھر پر چھوڑ آیا ہوں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بشریٰ نہ صرف مجھے پیاری ہے بلکہ بہت ہی پیاری ہے......!

اکبرلہوری

جدوں ساڈے ہتھ پلّے کش ناں رہ جاناں تے اسیں اکبرلہوری دے بوہے جا سلام کرنا۔ اوہنے کہنا آؤجی' جی آیاں نوں! جدوں اسیں وڈیائی سورقائی نال آ پھر جاناں تے اپنے آپ توں چنگا کوئی ہور نہ دسناں تے اسیں اکبرلہوری کول اپڑ جانا تے اونیں کہنا آؤجی۔ جی آیاں نوں بہہ جاؤ! اسیں کہنا اسیں بہت آ پھرے ہوئے ایں بہہ نئیں سکدے تے اکبر ہوراں نے کہنا' پر فیر مینوں وی کھڑو نہیں دیئو..... اکبرلہوری میرے حساب نال ناں کوئی عظیم انسان سی ناں کوئی مکتب فکر سی ناں یاراں دا یار سی ناں سپر پاور دشمنی سی۔ ناں نمو چھانا تھرڈ ورلڈ سی۔ نہ قبلہ و کعبہ جناب والا صاحب سی ناں نورچشمی' طول عمرہ' برخورداری..... اوہ اک واقعہ سی جنہیں مشرق توں لے کے مغرب تیکر اک لکیر چھک دتی سی تے اوہ لکیر نظر نہیں آندی۔ نہ اوہدی زندگی وچ نہ اوہدی زندگی توں بعد۔ کش واقع تاریخ دے سنگھاسن تے بہہ تے حنوط شدہ لاشاں طراں حکومت کردے رہندے نیں۔ کش واقع بھکشواں طراں گلیاں وچوں لنگھ جاندے نیں تے کسے نوں پتہ وی نئیں چلدا کہ ایتھوں کوئی لنگھیا سی۔ بس اک عجیب جئی خوشبو آندی رہندی اے تے ہر اک "پچھدا رہندا اے۔" میں کیا جی ایہہ خوشبو کاہدی اے۔ ایہہ خوشبو کتھوں پئی آندی اے۔" ایتھے بنے کوئی سی"؟ جنویں کسے وڈے ہوٹل دے صاف ستھرے' ٹھنڈے ٹھار کمرے وچ جا کے بیٹھے۔ بیرے نوں ٹپ دے کے رخصت کر دیئے تھرمس وچوں ٹھنڈے پانی دا گلاس لے کے پئے تے پتہ چل جاندا اے کہ کل ایس کمرے وچ کون سی۔ کی ہویا سی۔ پھر کی ہویا سی تے کدوں کو کمرہ خالی ہو کے ہسٹری بن گیا سی۔ واقعہ' جھونکا تے بھکشو اک جئی مسک مئی نال گزردے نیں۔ لنگھ جان تے پتہ چلدا اے کہ واقعہ سی بلا سی۔ بھکشو سی۔ ہون تے نظر نئیں آندے پتہ نہیں چلدا۔ بے ملوے رہندے نیں اکبرلہوری دا وی ایہہ کرکے پتہ نہیں چلیا کہ اوہنے واج دے۔ ڈانگ کھڑکا کے موہڈیاں توں تلک کے گل نئیں کیتی۔ ہمیشہ کول وچ گاپا پر سرپورے لائے۔ سرمدحم وچ ای پورے لگدے نیں۔ اڑاٹ پان والا گانئیں سکدا اڑنگ سکدا اے اوہنوں سراں دی کی خبر' پنجابی نہس' سونی! بول کے وکھائی اوس توں وی سونی۔ کوئی شیخی نہیں کوئی دبکا

نہیں کوئی احسان نہیں کوئی مان نہیں۔ اردو ٹی چی ترنم نال پڑھیا' واہ وا۔ میں کیا یار مینوں داستان گولنی اک مثنوی لکھ دے۔ کہن لگا بئے۔ ''ایس وقت۔'' میں کیا نئیں بابا ایس مہینے دے اندر اندر۔'' کہن لگا نئیں اک رات دے دے۔ سویرے لے لئیں۔ میں کیا یار کش مقبل دی گل کر میں مثنوی منگی اے منی آرڈر دی رسید نہیں جیڑھی بابو مہر لا کے دے دیندا اے آکھن لگا'' آرام آرام نال' آرام آرام نال۔'' اگلے دن اسمبلی جان توں پہلاں نو بجے مثنوی داستان گو دے کا تب نوں دے گیا۔ میرے بھتیجے نے سی ایس ایس دی تیاری کرنی سی تے اوہنوں انگریزی دی ٹیوشن چاہی دی سی۔ اک گورے صاحب نال کیا مین روڈ تے رابطہ قائم کر یا او بنے کیا میں تلفظ تے ڈلیوری تے سکھا دیاں گا' میری ماں بولی جو ہوئی پر بے انگریزی لکھنی سکھنی اے تے اکبر لاہوری نوں پھڑ لوؤ۔ نہرو دے کولوں ہو کے اوہدے گھر نوں راہ جاندا اے۔

اسیں حضرت سائیں فضل شاہ صاحب دے چھپر تھلے بیٹھے سی۔ ڈیرے پاک وچ پڑاں تے لوک سن پر بابا جی نورواے کدھرے باہر تشریف لے گئے سن مینوں ڈھلی پتلون میلے گلے تے ڈاہڈی عینک والا بھلکشو کہن لگا جدوں Ego کسے طراں وی ساتھ نہ چھڈے۔ سادھ سنگت وچ وی باندری طراں نال ای چمڑی رہوے تے فیر چولا چھڈنا ضروری ہو جاندا اے۔ ہنکار دی بوای بڑی ڈاہڈی ہندی اے۔ ارمان نال بہن نئیں دیندی۔'' اینے نوں حضور تشریف لے آئے۔ سارے آپو اپنی تھاں کھڑو گئے تے بابا جی سدھے آ کے اپنی تھاں تے کندھ نال ڈھولا کے بہہ گئے۔ اسیں وی ہولی ہولی بہہ گئے اک اکبر لاہوری کھڑا رہا۔ سرنیواں.....ہتھ سینے تے۔ پتلون دے پہنچے مروڑے دے کے اتے کیتے ہوئے۔ بابا جی نے کیہا۔ ''ہاں جی اکبر صاحب تے اکبر صاحب نے اپنی خاص لہک وچ ترنم شروع کر دتا۔ القارعہ ماالقارعہ کیتے پاٹ نہ جائیں بھکانیا۔ کھلر نہ جائیں گاریا.....

فیر ایسے طراں نظم سناندے سناندے اکبر صاحب ٹر پئے۔ تپنی توں جتیاں چکیاں تے اونویں ای پچھلی قدمے ٹردے ٹردے ڈیرے توں باہر نکل گئے۔ بابا جی مینوں کہن لگے۔'' پت ایناں نوں ملدے ملاندے رہا کرو۔ ایناں نے پردہ کر جانا ایں۔'' مینوں ایس محاورے دے معنیاں دا نئیں سی پتہ ایس کر کے اوس دن توں لے کراج تک اکبر نوں ناں مل سکیا۔ پر مینوں پتہ اے اوہ ہے گا ضرور۔ وہ بھی پانویں چلی جاوے پر اوہدی کوٹھڑی وچوں مہندی بلدی تے کلیاں دی خوشبو آندی رہندی ہے۔

عارف عبدالمتین

بعض اوقات کسی ایسے شخص کے بارے میں کچھ کہنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے جس کی بہت سی جہتیں ہوں اور جو ہر جہت کا لدا پھندا کامیاب بنجارا ہو۔ ایسے بنجارے کی ہر ہر راہ میں اس کے منتظر گاہک اس کے صرف اسی سودے سے واقف ہوتے ہیں جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی دوسری جھولیوں اور بہنگیوں سے ان کی آشنائی نہیں ہوتی لیکن ذرا سے اونچے ٹیلے پر بکریاں چرانے والا چرواہا جو ایسے بنجارے کو ہر روز نئے راستوں پر جاتے دیکھتا ہے' اس کے بارے میں آسانی سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آج بنجارے کا رخ کدھر کا ہے اور اب جو نمودار ہو گیا ہے تو کیونکر ادھر کا ہے اور جب شام ہو گی تو جدھر گیا تھا' ادھر سے کیوں نہیں آ رہا۔

عارف عبدالمتین کی گروتھ اور نشوونما کا معاملہ بھی بنجارے کے سفر کا سا ہے جو گزشتہ چالیس پچاس برس کے اندر ہر سمت میں سیل رواں بن کر نمودار ہوا اور عارف عبدالمتین کی تخلیقی صلاحیت کو مضبوط گراؤنڈ فراہم کر گیا۔ اس نشوونما میں کچھ پیش قدمی عارف عبدالمتین کی طرف سے ہوئی اور کچھ فاصلہ گروتھ نے خود طے کر کے عارف کی طرف خصوصی رجوع کیا۔

ہمارے یہاں لوگ تخلیق کے معاملے میں وضعداری سے کام لیتے ہیں۔ جہاں سے کام کی ابتداء کی وہیں پر اخیر وقت اختتام کا بورڈ لگا دیا۔ زندگی بھر تجسس سے کام لیا نہ تحلیل و تجزیے کا گندا کام کیا۔ تختی لکھنے سے زندگی کی ابتدا کی اور آخر عمر تک پچھی ہی لکھتے رہے۔ لکھتے لکھتے خط اچھا ہو گیا۔ دائرے گھیرے اور خط میں رعنائیاں پیدا ہو گئیں۔ تختی پوچھنے کے لیے کھڑیا بھی اچھی اور ملائم استعمال میں لے آئے لیکن پچھی لکھنا نہ چھوڑا۔ اسلامی تاریخی ناول والے اس طرز کے ناول لکھتے گئے اور ادب کی جدلیاتی قدروں والے انہی قدروں کے موتی ٹانکتے رہے۔ ہمارے یہاں سوچنے کو اس لیے برا سمجھا جاتا ہے کہ اس سے خود تنقیدی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جو راستہ تبدیل کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ راستے کی تبدیلی پر فلور کراسنگ کا طعنہ مل سکتا ہے' اس لیے ہم لوگ سوچ کا بکھیڑا ہی نہیں پالتے کہ اس کی پیروی میں ہم پر کچھ اور راستے اجاگر نہ ہو جائیں لیکن ہماری برادری

میں عارف عبدالمتین شاید وہ واحد شخص ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن اور صوبائی سیکرٹری ہونے کے باوصف اپنی ذاتی سوچ اور منفرد فکر تار عنکبوت کو مضبوطی سے تھام کر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ صدق دل سے کامریڈ بنے اور اسی صداقت کے ساتھ مذہب سے وابستہ رہے۔ ساری عمر مارکس سے محبت کی اور جب ایم۔اے کرنے کا وقت آیا تو اسلامیات کو سبجیکٹ کے طور پر اختیار کر لیا۔ کسی جذباتی رویئے کے تحت نہیں' عقلی فیصلے کے مطابق۔

عارف عبدالمتین کو اس حقیقت کا علم نہیں اور شاید علم ہو جانے پر بھی وہ اس حقیقت کا بوجھ نہ اٹھا سکے کہ مادیت کی ایسی شفاف اور واضح معلومات حاصل کرنے کے بعد اور اس بھید کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پا جانے کے باوصف اس کے وجود میں روحانیت کا عمل بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جاری رہا اور اس کے فکر کا ہر سکہ اپنے دونوں رخوں کے دونوں نقوش کے ساتھ موجود رہا۔ عارف عبدالمتین' مذہب سائنس اور معاشرتی حقیقت پسندی کو الگ الگ اشیاء یا متضاد شے نہیں سمجھتے بلکہ انہیں حقیقت کی تلاش اور کائنات کی اساس کو دریافت کرنے کے ذرائع خیال کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں...... لیکن عقلی طور پر یہ حقیقت جان لینے کے بعد اور زندگی کا اتنا طویل سفر طے کر چکنے کے بعد اس مفروضے کی حقیقی پڑتال نہ ہو سکی کہ یہ بہت ہی مشکل کام ہے کہ اس میں انفرمیشن کے دائرے سے نکل کر حق اور حقیقت کی بستی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ علم دوست انسان کے لیے یہ موت سے کم نہیں اور موت سے پہلے مرے بنا یہ راز حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے عارف نے بڑی ایمانداری' نیک نیتی اور ایک بڑے تخلیقی فنکار کی امانت و دیانت کے ساتھ اعتراف کیا کہ:

میں عمر بھر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ مجھے اپنی حقیقت' اس معاشرے کی حقیقت' اس دھرتی اور آکاش کی حقیقت حتیٰ کہ پوری کائنات کی حقیقت یا کہنہ کی جستجو نے پا بجولاں رکھا ہے۔ کبھی کبھی تو اس عمل میں سے گزرتے ہوئے میں بالکل Over-Shadow ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں حقیقت کو جس معروضی انداز میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس میں مجھے دکھائی نہیں دے رہی بلکہ میں اس کے محض موضوعی روپ کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ایسے میں میرے اندر زبردست خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش میں اس جانکاہی اور Anguish سے نجات پاتے ہوئے حقیقت کو اس کی مطلق صورت میں دیکھ سکوں اور پھر اس میں گھل مل کر خود حقیقت بن جاؤں!

لیکن عارف عبدالمتین کو یہ کون بتائے کہ اس Anguish اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کے لیے سرحد ادراک سے پرے ایک اور مسکن ہے جس کے رہن سہن کے آداب مختلف اور جہاں بسیرا کرنے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ وہاں ہماری اب تک کی سیکھی ہوئی Terminology کام نہیں دیتی کیونکہ وہاں سائنس کی شریعت کا نفاذ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے کا قائم ہے۔ جب تک یہ دنیا طبقوں میں تقسیم

رہے گی' شرک میں مبتلا رہے گی۔ جب یہ کشمکش دور ہوگی واحدانیت کا راز آپ سے آپ واضح ہونے لگے گا۔

اب پتہ نہیں عارف عبدالمتین پر کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ واحدانیت کی طرف مراجعت کرتے ہیں یا کثرت کے پرانے کھونٹے کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔ اس کھونٹے کے گرد چکر کاٹنے میں خارش کی سی لذت ہے اور ایک اکائی کا راز بڑی ذل حقیقت ہے لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ہماری ساری برادری میں عارف عبدالمتین کی گرد تھہ بڑی واضح اور توجہ طلب ہے۔ اس لیے کیا پتہ کہ عمر کے آخری حصے میں بکھرنے سے بچ جائیں اور پیٹھ کا بوجھ اتار کر آرام سے ان سیڑھیوں پر چڑھ جائے جو حقیقت کو اس کی مطلق صورت میں دکھانے کی راہ فراہم کرتی ہیں اور آخر میں حقیقت کے ساتھ اک مک ہونے کے وعدے کی خوشخبری بھی دیتی ہے۔

زندگی کے تیز رفتار گروہ کو تو اپنے زمانے کے صرف مادی وسائل سے سروکار ہوتا ہے لیکن سڑک کے ایکسٹریم کنارے دھیو دھیو چلنے والا بھیجو بھیجو بندا اصل حقیقت اور مطلق صورت کا گھگا گھگا راز بھی پالیتا ہے۔ کیا پتہ ہم لکھنے والوں میں وہ شخص عارف عبدالمتین ہی ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ وہی ہے کیونکہ میرے حدکی روشنی میں اسی کے خدوخیال واضح اور نمایاں نظر آرہے ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی (تبصرہ)

بڑی دیر کے بعد ایک بہت اچھی کتاب پڑھنے کو ملی۔ آسان، رواں، سادہ اور بولتی بولتی۔ جو لوگ فیض صاحب کو جانتے ہیں وہ تو اس سے لطف اندوز ہوں گے ہی جو نہیں جانتے وہ بھی اس کتاب کی آواز سے لطف اٹھائیں گے۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' بڑی سُریلی کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے بلمپت اور دُرت لے کو ترتیب سے نہیں باندھا۔ جہاں جی چاہا چلنت ہو گئے ہیں جہاں جہاں فیض کے مکالمے آئے ہیں بندش خود بخود دھیرج میں اتر آئی ہے۔ ساری کتاب کلیان ٹھاٹھ میں ہے لیکن مصنف نے اپنے اناڑی پن سے ترانہ کی ادائیگی کے بعد پھر سے الاپ شروع کر دیا ہے اور یوں اردو ادب میں ایک نئی صنف در آئی ہے۔

کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' قلم اور ٹیپ ریکارڈر کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ میرا تعلق ادب سے کم اور براڈ کاسٹنگ میڈیا سے زیادہ رہا ہے اور چونکہ میں اپنے گرد اور اپنے ماحول کی تفصیلات کان کے ذریعہ حاصل کرتا ہوں۔ اس لیے اس کتاب نے مجھے جی بھر کے لوٹا ہے اور بے اختیار داد لی ہے۔ کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کرتے وقت مجھے کہیں کہیں تو اس بات کا احساس بھی ہوا کیا کہ کب ریکارڈر رکا۔ کب ٹیپ بدلی اور کس وقت پھر چلا۔ وہ بات جس کا ذکر اکثر ادیب لحن کے حوالے سے کرتے ہیں اور آہنگ کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک روپ آپ کو اس کتاب میں ملے گا خواہ ابتدائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ میں کہ ایک نابغہ اور دانشور ہوں اور بدملحی کا ایک مدرس کہ پرائمری سکول کا ہیڈ مدرس ہے، دونوں ہی اس کتاب سے یکساں طور پر فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے ردِعمل اور دونوں کے فیڈ بیک کا گراف قریباً قریباً ایک سا رہے گا۔ خوب کتاب ہے اردو زبان کے لیے یہ ایک نیک فال ہے کہ اس کے لشکر میں ایسے آسان اور عام فہم مصنف بھی داخل ہونے لگے ہیں۔

جہاں تک اس کتاب کے مرکزی کردار کی ذات کا تعلق ہے وہاں میں کچھ زیادہ عرض نہ سکوں گا۔

اس لیے کہ اس معاملے میں میری رائے تعصب پرمبنی ہے۔ نظریاتی اعتبار سے میں فیض صاحب کے مخالف کیمپ میں ہوں۔ باوجود اس کے کہ یہ میرے گھرانے پر اور بانو قدسیہ پر از حد شفقت فرماتے ہیں۔ ان سے التفات کے ساتھ پیش آتے ہیں اور ہمیشہ ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ پھر بھی میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ گو فیض صاحب نے خود بھی برملا کبھی اس کا اظہار نہیں کیا لیکن ان دھیمے تیور سے واضح طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں اور میرے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کو تضیع اوقات خیال کرتے ہیں۔ پھر بھی دل پر جبر کر کے ان کو بڑا مان دیتا ہوں۔

میرا اور فیض صاحب کا نظریاتی اختلاف ہے۔ میں ایک شرعی آدمی ہوں اور فیض صاحب ملامتی صوفی ہیں۔ تاریخ میں ڈھونڈنے سے آپ کو کئی ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں ایک شرعی اور صوفی کی دوستی ہوگئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آخری منزلیں ایک ساتھ طے کیں لیکن ایک شرعی آدمی کی کسی ملامتی سے کبھی درستی نہیں ہو سکی۔ فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی سلسلہ میں بیعت کر کے نہیں کیا۔ نہ ہی میرے اندازہ اور تحقیق کے مطابق انہوں نے ورد وظیفہ چلہ کشی کی ہے۔ انہوں نے صوفیا کا ایک تیسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ جو اس مجاہدے پر محیط ہے جسے بزرگان دین ادب اور تواضع کا نام دیتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی فرماتے ہیں کہ ایک دم میں ولدیت حاصل کرنے کے لیے ادب اور خدمت کو اختیار کرنا چاہیے۔ بزرگان دین اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ طریق تصوف کے طالب کو چاہیے کہ ادب ظاہری اور باطنی کو نگاہ میں رکھے ادب ظاہری یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ بحسن ادب وکمال تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آوے اور ادب باطنی یہ ہے کہ تمام اوقات واحوال ومقامات میں باحق رہے۔ حسن ادب ظاہر سرنامہ ادب باطن کا ہے اور حسن ادب ترجمان عقل ہے اور عقل چراغ راہ ہے کہ صداقت کے تیل سے منور ہے۔ ادب صبر، دھیما پن، درگزر، کم سخنی اور احتجاج سے گریز یہ صوفیوں کے کام ہیں، ان سب کو فیض صاحب نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اوپر سے ملامتی رنگ یہ اختیار کیا ہے کہ اشتراکیت کا گھنگھنا کھڑکاتے پھرتے ہیں کہ کوئی قریب نہ آئے اور محبوب کا راز نہ کھل جائے۔ واہ بابا مل واہ کیا کہنے، چوری کرتے بھن گھر رب دا اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ۔ واہ بابا مل واہ۔ کھڑ کائی جا گھنگے!

میرا تعلق چونکہ اونچے خانوادے سے ہے اور میں مسلمان بادشاہوں کا پرستار ہوں اور ملوکیت کو ہی اسلام سمجھتا ہوں اس لیے میری اور بابا مل کی نہیں بن سکتی لیکن کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموش اور چپ چاپ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرورکائنات کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان، تندخو، بداندیش یہودی دکاندار کی درازدستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے کہ آج فیض کو اس سے بات کرنے بھیجو۔ یہ بھی دھیما ہے، صابر ہے۔ بُردبار ہے۔ احتجاج نہیں کرتا۔

پتھر بھی کھالیتا ہے، ہمارے مسلک کو دل سے سمجھتا ہے۔

لیکن خیر یہ تو دوسری بات ہے۔ مرزا صاحب آپ کی کتاب واقعی بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اس بھلاوے میں دوسری کتاب لکھنے نہ بیٹھ جایئے گا۔ ایسا مرکزی کردار اور نہیں ملے گا۔ آپ کی عزت آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے...... خدا حافظ۔

کرن کرن سورج

میرے ساتھ شروع ہی سے یہ مشکل رہی ہے کہ میں بڑے بلکہ بہت ہی بڑے انسانوں کے درمیان اپنی خوشی اور اپنی رضا کے ساتھ گھر ارہا ہوں اور بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ اپنی خودی کو چھوٹی چھوٹی کاتار رہا ہوں لیکن مشکل یہ رہی ہے کہ نہ تو آج تک اپنی خودی اور زعم آگہی کو ملائم کر کے تسلیم کی دنیا میں داخل ہو سکا اور نہ ہی ان بڑے لوگوں کے پیچھے چل سکا جن کے پاس راستوں کی نشاندہی تھی اور جنہوں نے متعدد مرتبہ اپنی خوشی سے مجھے ''روٹ پرمٹ'' عطا کیے لیکن میرے پاس کوئی گاڑی ہی نہ تھی نہ ہمت کی نہ ارادے کی۔

ان بڑوں میں سب سے پہلے بڑے سائیں فضل شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ تھے، دوسرے نئی سائیں راضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور تیسرے مسٹر قدرت اللہ شہاب مرحوم اور اب حال پر موجود جناب واصف علی واصف ہیں جن کی'' کرن کرن سورج'' پر روشنی ڈالنے کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

'' کرن کرن سورج'' واصف صاحب کے ملفوظات کا دوسرا ایڈیشن ہے جن میں سے بعض کے مطالب اور مفاہیم کو انہوں نے اپنے ان مضامین میں کھول کر بیان کیا ہے جو نوائے وقت میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں اور معلوم علم کے حاملوں کو ایک نئی جہت عطا کرتے رہے ہیں لیکن اس جہت کو پورے طو پر اختیار کرنا یا اسے معلوم علم پر ترجیح دینا ایک اور مشکل بلکہ بہت ہی مشکل مرحلہ ہے۔ میں یہ تو خوب اچھی طرح سے سمجھتا ہوں کہ واصف صاحب کا علم ہی وہ علم ہے جس کے حاصل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور جس میں اضافہ کرنے کے لیے دعا کا طریق بھی سکھایا گیا ہے لیکن میں نے جو اب تک پڑھا ہے یا مجھے جو اب تک پڑھایا گیا ہے، وہ اس سے مختلف ہی نہیں اس کے برعکس بھی ہے۔

واصف صاحب فرماتے ہیں کہ علم میں دوسروں کو شامل کرنے کا نام علم ہے۔ اپنے علم سے دوسروں کو مرعوب کرنا اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا تو جہالت ہے...... لیکن میرے اور ہنری کسنجر اور گورباچوف اور یو

این او اور بی بی سی اور نیوز ویک اور از ویستا کے علم کا تو بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ دوسروں کو نہ صرف مرعوب کیا جائے یا احساس کمتری میں مبتلا کیا جائے بلکہ ان کو خوفزدہ کر کے اس خفقان میں مبتلا کر دیا جائے جس میں سگ گزیدہ پانی کے سامنے لرزاں ہوتا ہے۔

میرے ذہن میں اور میرے علم میں اور میرے مشاہدے میں Might is right اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا تصور قائم ہے بلکہ ڈارون کے بعد Survival of the fittest کا لازمہ اور بھی راسخ ہو گیا ہے لیکن واصف صاحب فرماتے ہیں کہ آندھیاں سب چراغ نہیں بجھا سکتیں۔ باز اور شکروں کی موجودگی کے باوجود چڑیا کے بچے پرورش پا رہے ہیں۔ شیر دھاڑتے رہتے ہیں اور ہرن کے بچے کلیلیں بھرتے رہتے ہیں۔ فرعون نے سب بچے ہلاک کر دیئے مگر وہ بچہ بچ گیا۔ زمانہ ترقی کر گیا ہے مگر مکھی، مچھر اور چوہے اب بھی پیدا ہوتے ہیں جراثیم کش دوائیاں نئے جراثیم پیدا کر رہی ہیں۔ طب مشرق و مغرب میں بڑی ترقی ہوئی (ساتھ ہی) بیماریوں میں بھی اضافہ ہوا۔ انسان کل بھی دکھی تھا آج بھی سکھی نہیں ..... (اصل میں) علاج خالق کے قرب میں ہے، لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔

دنیا بھر کے نفسیات دان اور معاشریات و سماجیات کے ماہر یہ متفقہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ غصے، جنس، کلام اور نفرت وغیرہ کے جن جذبوں کو دبا کر رکھا جاتا ہے اور جن کا مکمل کر اظہار نہیں کیا جاتا، وہ جذبے فرد میں اور معاشرے میں گھٹن پیدا کر دیتے ہیں اور اس گھٹن سے حیات انسانی میں بڑے بڑے ناسور پیدا ہو جاتے ہیں اور ان ناسوروں کی وجہ سے فردی، عددی اور گروہی زندگی بے چینی اور ہیجان کا شکار ہو جاتی ہے ..... لیکن واصف صاحب اور راہِ سلوک کے سارے باب یہ فرماتے ہیں کہ زندگی سے تقاضا اور گلہ نکال دیا جائے تو سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ سکون اللہ کی یاد سے اور انسان کی محبت سے پیدا ہوتا ہے ..... لیکن خواتین و حضرات! آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں اور آپ کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے کہ معلوم تاریخ انسانی میں انبیاء کو اور انعمت علیہم والوں کو چھوڑ کر آج تک ہر انسان نے دنیا کو اس کے سوا اور کچھ نہیں دیا کہ جس سوسائٹی نے اس کو Reject کیا اس کے خلاف انتقام کا علم بلند کیا۔ اسے بدلہ لینے کے لیے للکارا اور پھر اسے توڑ مروڑ کر خود ٹوٹ پھوٹ گیا۔ زندگی سے تقاضا اور گلہ نکال دیا جائے تو پھر نہ تو کوئی اخبار شائع ہو نہ کوئی کالم لکھا جائے نہ دنیا کی لائبریریاں ایک کمرے سے آگے بڑھیں نہ مائیکروفلم نہ مائیکروفش۔

لیکن جناب والا! میں بڑی مشکل میں گھرا ہوا ہوں۔ دنیا کا ہر علم نافع مجھے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ میں گرو کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دوں اور اس کے ہر فعل ہر فرمان اور ہر اشارے پر اپنی مرضی کو اور اپنے ارادے کو قربان کر دوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ مجھ سے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے رہنما اپنے گاڑی بان اپنے کھویا کو اس کی مرضی پر چھوڑ دوں اور اس کی حرکتوں پر اور کارکردگیوں پر نگاہ نہ رکھوں اور اس کی کمزوریوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر احتساب کا خفیہ البم نہ بناتا رہوں میں جب بھی کبھی رات کے وقت ہوائی سفر کرتا

ہوں تو ایک پل کو بھی آنکھ نہیں جھپکاتا۔ بالکل کھمب کی طرح اپنی سیٹ پر گزار رہتا ہوں۔ میرے اردگرد تقریباً سارے بے وقوف ہمسفر کمبل تانے سور ہے ہوتے ہیں لیکن میری ساری توجہ اپنے رہنما، اپنے پائلٹ، اپنے گرو پر ہوتی ہے کہ وہ کوئی بیوقوفی یا حماقت نہ کردے۔ میں خدا کے فضل سے ساری رات ذرا بھی Relax نہیں کرتا اور بالکل چاک و چوبند رہتا ہوں۔ اسی طرح میں نے زندگی کے اس طویل سفر میں بھی کسی پر بھروسہ نہیں کیا۔ کسی کے ہاتھ میں اپنی راس نہیں دی۔ اپنی خودی کو اپنے ساتھ اپنے پہلو میں سنبھال کے رکھا ہے اور کسی کے علم کو اپنے علم سے بڑا نہیں سمجھا۔ کسی کو اس بات کا استحقاق ہی نہیں دیا کہ چلو آج سے میری ساری زندگی تیرے حوالے اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو چند گھنٹوں کے لیے ہی تیرے حوالے۔

پچھلے دنوں جب میرا آپریشن ہوا تو میں نے اپنے آپ کو سرجن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹروں کے پاس اپنا علم تھا، میرے پاس میرا اور جب ان دونوں کا ٹکراؤ ہوا تو سرجن بے بس ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بانو قدسیہ سے کہا کہ مریض کو تھیٹر سے لے جائیں، ابھی مشکل ہے۔ بانو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، جی یہ جو عجیب سا لباس آپ نے انہیں پہنایا ہے، وہ اتروا دوں تو سرجن نے کہا نہیں ابھی اسی لباس میں رہنے دیں اور انہیں وارڈ میں لے جائیں۔ وہاں دو دن انہیں شدید قسم کے خواب آور دے کر نیم بے ہوش کریں گے اور جب ان کی Resistance کم ہو گی اور بلڈ پریشر نیچے آئے گا تو تھیٹر لے جا کر پورا بے ہوش کریں گے۔ Tell them have nice time and love to your children.

بابے کہتے ہیں کہ گرو کی بات ہی گر ہے۔ گرو سے تعلق ''علم'' ہے۔ گرو کی خوشی فلاح ہے۔ گرو کی ناراضگی سے بچنا چاہیے۔

فرمانے والے فرماتے ہیں کہ گرو کی بات پر ایسے یقین کرو جیسے ایک معصوم بچہ اپنے ماں باپ کی بات پر یقین کرتا ہے۔ اس بے یقینی کے دور میں یقین کا حاصل ہونا کرامت سے کم نہیں۔

کہا گیا ہے کہ راہ طریقت میں طالب جس شخصیت کو اپنا رہبر، شیخ، گرو، مرشد، پیر یا ہادی سمجھے، اس کے حکم کو بلا چون و چرا بخوشی تسلیم کرے۔ کوئی راہ بغیر راہبر کے طے نہیں ہوتی۔ صحبت شیخ ذریعہ علم ہے۔ طرز عمل ہے اور وسیلہ نجات ہے۔ یہ سارے اقوال ان بزرگوں کی ایکسٹینشن کے ہیں جن کا نام واصف علی واصف ہے اور درج اس کتاب میں ہیں جس کی بات پہلے بھی ہوتی رہی لیکن آج پھر کی جا رہی ہے۔ کرن کرن میں لکھا ہے کہ مرید کی اپنی صداقت اور عقیدت ہی اس کو منزل تک پہنچاتی ہے۔ اگر منزل نصیب ہو گئی تو شیخ کے کامل ہونے میں کیا شک؟ مرید منزل تک نہ پہنچا تو شیخ کے کامل ہونے نہ ہونے کا کیا تذکرہ۔ خوش نصیب مرید، شیخ کا ہر حال میں ممنون رہتا ہے اور بد نصیب ہمیشہ اپنی کوتاہی کا شیخ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

جناب واصف صاحب یہ بات تو میں پورے طور پر سمجھ گیا کہ ''جس کو زندگی میں کوئی سچا گرو نہ ملا

ہو اس چھوٹے چیلے کو بدنصیب نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے لیکن یہ کس طرح سے ہو کہ میں اپنے سارے خوفوں کو چھوڑ کر آپ کے پاس آؤں اور پھر باطن کے سفر پر روانہ ہو جاؤں۔ جس طرح میں پہلے اپنے جاننے کے تکبر سے برآمد نہیں ہو سکتا تھا، اسی طرح اب اپنے خوف کو چھوڑ کر کسی نئی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

اس عہد میں جس شخص کے پاس اپنے ذاتی اور الحاقی خوف ہوں اس کو خدا کی بھی ضرورت نہیں رہتی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جس کے پاس خوف وہراس اور دہشت کی متاعِ گرانبہا موجود ہو اس کو اور کسی شے کی بھی احتیاج نہیں رہتی۔ جن بیویوں کے پاس خوف کی دولت موجود ہے انہوں نے اپنے خاوندوں کو سالہا سال سے دوبئی اور جدہ میں بھیج رکھا ہے اور ان کی غیر موجودگی میں اپنے اپنے خوف کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔ جس والد کے پاس اپنا جدی پشتی خوف موجود ہے اس نے اپنے سارے بچوں کو ولایت میں داخل کروا دیا ہے اور ان کی تصویروں کے بجائے اپنے خوف کے فوجی کلر پرنٹس سے دل بہلاتا رہتا ہے۔ جن بچوں کے پاس اپنے اپنے مستقبل کا خوف اور اپنی اپنی ان سکیورٹی کی دہشت موجود ہے وہ ہاتھوں میں ہتھوڑے لے کر اپنے سوئے ہوئے والدین کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ یہ ایسا خوبصورت اور ترقی یافتہ دور ہے واصف صاحب جس کا ہر خوش نصیب خوفزدہ اپنے اپنے خوف کے مندر میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز بڑی شاندار اور قابلِ رشک زندگی گزار رہا ہے۔

ساٹھ سال کی مدت بڑی مدت ہوتی ہے۔ اب میں اس مندر سے نکلنا چاہتا ہوں۔ کئی اچھے اچھے اور مضبوط بازو مجھے اس گرداب سے نکالنے کے لیے کئی مرتبہ آگے بڑھے لیکن میں ان کے ساتھ کلیاں ہی کرتا رہا۔ ڈائیلاگ ہی بولتا رہا اور اظہار ہی کرتا رہا۔ واصف صاحب آپ کو آپ کے علم کا اور آپ کی کتاب کا اور اس تقریب کا اور ان سارے چہروں کا واسطہ جو آپ کو دنیا کی ہر شے سے عزیز ہیں مجھے بھی اس خوف کے مندر سے نکال لیے۔ یہاں تو بڑا ہی اندھیرا ہے۔ نہ روشنی ہے نہ سورج نہ کوئی کرن......

شبِ چراغ

جب بھی مجھے زندگی میں شاعری کی کوئی نئی کتاب پڑھنے کا موقع ملا، میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ جب پہلے سے دنیا میں اس قدر شاعری موجود ہے پھر اس کے لکھنے کی کیا خاص ضرورت پیش آ گئی تھی اور اگر لکھی ہی گئی تھی یا لکھ لی گئی تھی تو پھر اس کا چھاپنا کیا ضرور تھا۔ کچھ ایسی ہی سوچ شب چراغ کے ساتھ وابستہ رہی۔ اگر کبھی سردیوں میں مجھے کسی ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو میں اس کو ایک بیکار سی چیز سمجھ کر اس کے قریب سے گزرتا ہوں اور اگر مجھے پتھروں پر پاؤں جما کر اس کے تنے کے اوپر سے گھوم کر آگے جانا پڑے تو اور بھی جھلاہٹ ہوتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ ایسے درخت وقت پر کاٹے کیوں نہیں جاتے اور پھر جب گرمیوں میں وہی درخت سیاہ رنگ کے جوسی آلو بخاروں سے لد جاتا ہے اور اس کی سرسبز شاخیں اپنے پھل کے بوجھ سے ہانپنے لگتی ہیں تو میں سر جھکا کر اور ادب کا ہاتھ اٹھا کر کہتا ہوں "معاف کرنا بھائی صاحب آپ تو پھلدار درخت تھے اور آپ کے اندر سیت، سر اور ثمر کے سارے جلوے موجود تھے لیکن مجھے اس کا علم نہ تھا اور اگر تھا بھی تو الاقلیلا کہ آپ صرف درخت ہیں اور سوکھے کے مارے ہوئے ہیں!

کچھ ایسا ہی قصہ واصف علی کی "شب چراغ" کے ساتھ ہوا۔ بند پڑی تھی تو جاڑے کا درخت تھی اور جب کھلی تو بار آور اور تناور درختوں کے جنگل میں تبدیل ہو گئی۔ ایسا جنگل جس سے زندگی کی ابتداء ہوئی تھی اور جہاں کچھ جاندار ایسے تھے جو پیٹ کے بل رینگتے تھے۔ کچھ دو ٹانگوں پر چلتے تھے اور کچھ چار ٹانگوں پر۔

انسانوں کو انسان سے زیادہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہوتی، چاہے وہ کسی ایک انسان میں ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ ایک انسان اپنی ذات ہی کیوں نہ ہو...... اپنی ذات کا علم تحیر کی طرف لے جاتا ہے اور تحیر تجسس اور تحقیق کی طرف۔ ہر متجسس انسان یہ جاننے کے لیے بے تاب رہتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اسے Tic کرتی ہے۔ یہ بے تابی اس میں بیک وقت حیرانی بھی پیدا کرتی ہے اور مایوسی بھی کہ اپنے آپ کو جاننا دنیا کا سب سے مشکل اور نا قابلِ فہم مسئلہ ہے۔ کچھ لوگ اس مسئلے میں اس بری طرح سے الجھتے ہیں کہ ان کی حیرانی اور مایوسی شاعری کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور یہی حادثہ واصف کے ساتھ گزرا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ شب چراغ کا مطالعہ کرتے وقت اور خاص طور پر اس کی نظموں کو اٹھاتے وقت آپ کے ذہن میں کچھ بڑے شاعروں یا ایک بڑے شاعر کا خیال ضرور آیا ہوگا اور آپ نے واصف کے اس سے متاثر ہونے کی نشاندہی بھی کی ہوگی۔ خود واصف نے بھی اس پر فخر کر کے اپنے آپ کو مبارکباد دینے کی کوشش کی ہوگی لیکن یہ واصف کی اصل شاعری نہیں ہے۔ اصل شاعری اس کی نظموں، غزلوں اور دوحوں میں نہیں بلکہ اس غیر موجود اور نامحسوس تصور میں ہے جو حقیقت نہیں مگر حق نظر آتا ہے اور جو حقیقت ہے، وہ ناحق دکھائی دیتا ہے۔ کبھی آپ نے جانوروں کے دو گروہوں پر غور کیا۔ کرگدان، ہما اور عنقا غیر حقیقی، ناموجود اور متھیکل جانور ہیں لیکن ہمیشہ حقیقی نظر آتے ہیں۔ زرافہ، کنگرو اور رائینا سرس حقیقی اور موجود جانور ہیں لیکن متھیکل نظر آتے ہیں۔ اسی ہونے اور نہ ہونے کے درمیان یا اسی موجود اور غیر موجود کی حد یا حق اور ناحق کی باؤنڈری کے ساتھ ساتھ واصف کی شاعری جھنجھناتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں تصور، روح کی reverberation بن کر شاعروں کے سگنل دینے لگتا ہے کہ من مندر کی مورتی من کو ہی تڑپائے + ویش، بدیش بنائے کے اب کا ہے کو جائے۔

اصل میں واصف جیسے حادثاتی شاعر جن کا ارادہ مستقل طور پر شاعر بننے کا نہیں ہوتا، اپنی مرضی سے شاعری نہیں کرتے۔ ایسے لوگ تو بس آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور پھر ان کے درمیان ایک طویل عہد انگڑائی کی طرح تن جاتا ہے...... واصف کہے کبیر سے سنو ہمارے یار + ہم تم جیسے جگت میں آئیں نہ دوجی بار...... اور وہ جو بات میں نے شروع میں کہی تھی کہ شاعری تو پہلے ہی بہت ہے، پھر ایک نئے شاعر کی کیا ضرورت تو واصف اس ذیل میں نہیں آتا۔ یہ ایک مختلف رنگ کا شاعر ہے اور اگر آپ پوچھیں کہ وہ مختلف کیوں ہے اور اس کی شاعری میں دوسروں کے مقابلے میں کیا فرق ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہی فرق جو کاغذ پر لکھے ہوئے بوسے اور اصل بوسے کے درمیان ہوتا ہے۔

خالی آسمان

''خالی آسمان'' میں چھپنے والی نظمیں اور غزلیں شہزاد کی کچھ وقت پہلے کی نظمیں اور غزلیں ہیں اور اس وقت سے لے کر اب تک شہزاد اپنے محسوسات اور مشاہدات کے سفر میں بہت آگے نکل گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا اپنے اس تخلیقی عمل سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا اور وہ اس وقت جس آگہی میں اتر رہا ہے، اس نے شہزاد کو اس کے ماضی سے سراسر لاتعلق کر دیا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کچھ راہیں ایسی بھی کھلنے لگی ہیں جو خوش نصیب لوگوں پر کوئی واقعہ گزر جانے کے بعد آپ سے آپ کھل جاتی ہیں......اور یہ آپ سے آپ کھل جانا بھی بجائے خود ایک واقعہ ہی ہوتا ہے۔

آج کے Information Orientd دور میں انسان کو اس قدر آسانی عطا ہو گئی ہے کہ اسے علم اور سچائی فیملی سائز پیک میں بڑے سستے داموں مل جاتی ہے اور اس کو حقیقت کی تلاش میں اور Truth کی کھوج میں کوئی منزل طے نہیں کرنی پڑتی۔علم کے بڑے بڑے مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹوروں پر اسے اپنی پسند کا سچ اور اپنی ضرورت کا عمل مل جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ گرین Stems بھی دستیاب ہو جاتے ہیں جن سے وہ انہی سٹوروں سے اپنی خواہش کی انفرمیشن بھی بونس کے طور پر حاصل کرتا رہتا ہے...... واقعی اس ریڈی میڈ عہد نے انسان کو کتنی آسانیاں عطا کر دی ہیں اور انسان پہلے کے مقابلے میں کس قدر ترقی کر گیا ہے۔

اس ترقی کے دور میں وہ ادیب اور شاعر اور دانشور بڑے سوکھے ہو گئے ہیں جو اصل بات پا گئے ہیں اور جنہوں نے اپنی سوئی ایک میٹر پر فٹ کر دی ہے اور جنہوں نے اپنی پسند کی مضبوط کمند کو منڈیر پر پھینک کر فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔وہ تحیر کی ایسی بک بک سے ہمیشہ کے لیے نکل گئے ہیں کہ

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یا

جو نظر قرار گیرد بہ نگار خواب اوئے

پتہ آں زماں دل من پے خوبتر نگارے

یا......

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

وغیرہ وغیرہ وغیرہ
لیکن کچھ لوگ بلکہ چند لوگ بلکہ کوئی کوئی، بس ایک آدھ آج بھی تحیر کے عالم میں کھڑا پوچھ رہا ہے،
سوچ رہا ہے کہ

جانا ہے کس طرف یہ خبر کس طرح ملے
اے خاک تجھ پہ نقش کف پا کوئی تو ہو
ہر شاخ سے نمو کی تمنا نہیں مگر
اے فصل گل درخت پہ پتا کوئی تو ہو
کیا رفتگاں سب اپنے نشاں ساتھ لے گئے
اس دشت میں جلا ہوا خیمہ کوئی تو ہو

اور پھر اسی شاعر کی نعتیہ غزل کہ:

جہان ہاؤ ہو کے سب تماشے ایک جیسے ہیں
مجھے رستہ دکھا مولاً کہ رستے ایک جیسے ہیں

اور پھر کیا کمال کا مشاہدہ اور کیسی فکرمندی اور کس درجہ بے یقینی اور کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ:

راکھ اپنی سمیٹتا ہوں میں
تند آندھی سے ڈر رہا ہوں میں
اپنے بکھرے ہوئے ہیولے کو
اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
خود کو پہچاننے کی کوشش میں
کئی چولے بدل چکا ہوں میں
خواہش زخم بن گئی دل میں
دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں میں

اپنی کوئی ادا بھلی نہ لگے
جانے کیا خود سے چاہتا ہوں میں
آگہی اپنی ذات سے نہ ہوئی
رنگ ہوں روشنی ہوں کیا ہوں میں

میں شہزاد کی شاعری کا متوالا ہوں۔ آج کا نہیں بیسوں سال پہلے کا! اس کا اعتراف اس لیے نہیں کیا کہ اس میں میری کچھ تختی لڑائی ہے۔ اسے شاید یاد ہو کہ نہ یاد ہو، شہزاد نے کلاک ٹاور ایک منظوم ڈرامہ لکھا تھا اور ریڈیو پاکستان لاہور سے اس کی پروڈکشن اچھی بلکہ بہت ہی اچھی ہوگئی تھی۔ اس ڈرامے کی فضا اس کی سپر نیچرل تقسیم اور اس کی شاعری کے رنگ نے میرے ذہن میں ایک لکیر کھینچ دی تھی کہ یہ شاعر خطرناک ہے اور اگر یہ جلد ہی کسی مسلک کے ساتھ وابستہ نہ ہوا تو ہم سب کو مشکل میں ڈال دے گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ شہزاد اس کے فوراً ہی بعد فلسفے اور منطق سے بڑے والہانہ انداز میں پیوست ہو گیا اور اس سے" کلاک ٹاور" کا منارا دور ہو گیا۔

لیکن کئی سالوں کا سفر طے کرنے کے بعد اور فلسفے اور منطق سے ایک سعادت مند فرزند کی طرح رخصت لے کر شہزاد پھر تحیر کی وادی میں نکل آیا ہے۔ اس کے معمولات، اس کا مطالعہ، اس کی گفتگو، اس خاص بے چینی کا پتہ دیتی ہے جو کسی خاص واقعے کے بعد رونما ہوتی ہے۔ ایسے شخص کا دائرہ کتنا بھی محدود کیوں نہ ہو، وہ خود بھی پریشان رہتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے...... لیکن جس شخص کا ایک حقیقت پر کھونٹا گڑا ہو وہ کم از کم خود تو آرام وسکون سے رہتا ہے۔

جو شخص اپنے سوا یا اپنے قریبی حلقے کے سوا ہر شخص کو کافر وزندیق سمجھتا ہے اور صرف اسی حقیقت کا مسافر ہے، وہ کیسے مزے میں ہے۔ جو شخص مسلمان کے لیے Fundamantalist کا لفظ استعمال کرتا ہے، اس کی زندگی کتنے آرام سے گزرتی ہے۔ وہ عالمی شہرت رکھنے والے فزسٹ کیلئے آنندی میں ہوں گے جنہوں نے آئن سٹائن کو لکھا کہ تمہارا نظریہ اضافیت ہے تو درست اور $E=mc^2$ حسابی طور پر تو بالکل صحیح ہے لیکن چونکہ یہ نظریہ Aialectical Materalism کے فلسفہ سے بعید ہے، اس لیے ہم اسے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں ..... سوری!

اصل میں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شہزاد احمد کی غزلوں کا سبقاً سبقاً مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم اس شعر پر پہنچے کہ

میں چاہتا ہوں حقیقت پسند ہو جاؤں
مگر ہے اس میں یہ مشکل حقیقتیں ہیں بہت

تو ہمارے دل پر کئی طرح کے شکوک وشبہات گزرے۔ بھلا حقیقتیں بہت ساری کس طرح سے ہو

سکتی ہیں جب اس قسم کے شکوک وشبہات ابھرتے ہیں اور کسی اندیشے کے تاک میں ہونے کا گمان گزرتا ہے تو ہم حال پر موجود اپنے شیخ واصف علی واصف سے رجوع کرتے ہیں۔ (پہلے سائیں فضل شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے)

واصف صاحب نے پوچھا "ایک حقیقت کونسی ہوتی ہے" میں نے ان دنوں کے مطالعے کے مطابق عرض کیا کہ "سر جس طرح Survival of the Fittest کہنے لگے واہ وا۔ بہت خوب۔ کتنی زبردست حقیقت بیان کی ہے آپ نے۔ کمال ہے کمال ہے لیکن تند و تیز بازوں اور شہبازوں اور شکروں کی موجودگی کے باوصف چڑیا کے بچے پرورش پا رہے ہیں۔ شیر دہاڑتے رہتے ہیں اور ہرنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت بھی دھیان میں رکھئے کہ آندھیاں سب چراغ نہیں بجھا سکتیں۔

اصل میں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شہزاد کی شاعری (ساری کی ساری نہ سہی اس میں کہیں کہیں کے تریڑے) اس قسم کی شاعری سے تعلق رکھتی ہے جس میں الفاظ اور معانی اور بیان تو ہمارا جانا پہچانا ہوتا ہے مگر اس کا خیال Information کی دنیا سے ماورا کا ہوتا ہے۔

ESP کے سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی بنچ پر بیٹھا ہوا روزمرہ کے معمولی واقعے، سیب گرنے سے اس قدر گہرے تحیر میں ڈوب جائے کہ اس کا سارا اکتسابی علم مفقود ہو جائے اور اس کی ذہنی فریکوئنسی تبدیل ہو جائے تو اسے Graint Granaty Grenth کا سگنل کہتے ہیں اور اس کی ساری تفصیلات موصول ہونے لگتی ہیں۔ میں خدانخواستہ شہزاد کو ایسی بڑی اونچی سطح پر لا کر تو اسے طعن وتضحیک کا نشانہ نہیں بننے دوں گا اور نہ ہی کبھی کسی دیسی کو کسی ولایتی کے مقابل لا کر دیسی کی صفت وثناء کرنے کی جرأت کروں گا۔ البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ کسی کسی آدمی میں کبھی کبھی کوئی Stray Signal ایسا ضرور آ جاتا ہے جس کا اس کی اپنی کاوش سے یا کسی ذاتی کمال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جب میں شہزاد کی شاعری کے بارے میں کچھ کہتا ہوں تو میری مراد صرف اس کی غزلوں سے ہوتی ہے..... شکریہ!

''اپنا اپنا جہنم''

کہانی کے متعلق اب تک اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اسے کریکٹر، تقسیم، زبان و بیان، Conflict وغیرہ کے توازن پر پرکھنے اور جانچنے کا کام آپ مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی میں نقاد نہیں ہوں۔ کہانی کا پوسٹ مارٹم کرنا اور افسانہ نویس کی دھجیاں بکھیرنا میرے نزدیک آسان کام نہیں ہے۔ میں گلاب کو پتی پتی کرنے کے بعد اسے گلاب کا پھول کہنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ اس لیے جمیلہ ہاشمی اور جمیلہ کے افسانوں کے بارے میں جو کچھ بھی میں کہوں گا ایک پڑھنے والے کی حیثیت سے کہوں گا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے کہوں گا۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ مادہ کی تین حالتیں ہیں۔ ٹھوس، مائع اور گیس۔ افسانہ جو مادہ زندگی سے بڑی حدت دے کر اخذ کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ سیال حالت میں پایا جاتا ہے اور سیال چیزوں کی طرح اس پر چند اصول لاگو ہوتے ہیں۔ افسانوں میں بھی ایک خاص قسم کی Viscosity ہوتی ہے یعنی افسانے میں ایک متعین شدہ بہاؤ ہوتا ہے جس طرح شراب میں یہ خاصیت ہے کہ وہ پانی سے جلدی بہہ نکلتی ہے۔ شراب اور پانی کے مقابلے میں شہد اتنی جلدی بہنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح ہر افسانے میں سیال چیزوں کی طرح بہنے کی قوت ہوتی ہے۔ کچھ افسانے ست رو جامد شہد کی طرح چلتے ہیں۔ کچھ آبشاروں کی طرح گرتے ہیں اور اپنے ساتھ قاری کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔ کچھ مہران دریا کی طرح چلتے ہیں جن کا بہاؤ ہر میل پر ہر کوس پر اندر سے تیز اور اوپر سے ست ہوتا جاتا ہے۔ کچھ افسانے لاوے کی طرح ابلتے اور گرم چشموں کی طرح پھوٹتے ہوئے بہتے ہیں اور کچھ افسانے جمیلہ کے افسانوں کی طرح بہتے ہیں۔ جیسے پچھلی رات کو بارش کے قطرے کیلے کے پتوں پر سے پھسلنے لگیں۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے ـــ یخ سردی میں ٹھنڈی بارش کے قطرے!

کچھ افسانوں میں Surface tension اس قدر ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس کھچاوٹ سے گزر کر کبھی مائع افسانے کے اندر نہیں پہنچ سکتا لیکن جمیلہ کے افسانوں میں یہ جھلی اتنی سخت نہیں ہوتی۔ یہاں پڑھنے

والا لمحہ بہ لمحہ افسانے میں اترتا چلا جاتا ہے۔ سوکھے جامنی رنگ کے ذرات پانی کے گلاس میں آہستہ آہستہ گھل مل جاتے ہیں۔

بہاؤ کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ سیال چیزوں کے Flow کو بڑھانے کے لیے اگر انہیں گرم کیا جائے تو شہد پانی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ جمیلہ کے افسانے پڑھنے سے پہلے اگر پڑھنے والا اپنی حدت ساتھ لے کر چلے تو جمیلہ کے افسانوں کا بہاؤ بھی تیز رفتار ہوگا۔ اگر قاری کے اندر کی فضا منجمد ہوگی تو یہ افسانے پھسلنے کے بجائے برف کے تودے بن جائیں گے جن کے پار جانا عام طور پر آسان نہیں ہوتا۔

جمیلہ ہاشمی یادوں کا افسانہ لکھتی ہے جس پر ہمیشہ ایک رت حاوی رہتی ہے۔ اس میں رت چاہے بیرونی ہو چاہے اندرونی چاہے دھند ہو چاہے خزاں چاہے بوندا باندی ہوتی رہے چاہے دھوپ کھلی رہے۔ جمیلہ کی ساری کہانی کسی ایک خاص رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ اس میں کبھی کوئی موسم نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ایک رت ہوتی ہے۔

پھاگن کی رت

برہا کی رت

ملن کی رت

سوگ کی رت

جمیلہ کی کہانیاں Weather کی کہانیاں ہیں۔ Climate کی کہانیاں نہیں ہیں۔ Climate اوسط کے حساب سے معلوم کی جاتی ہے۔ اس کا ایک نپا تلا حساب ہوتا ہے۔ اس لیے موسم ایک Predietable اذیت ہے لیکن رت یا Weather ایک Non Predietable جہنم ہے۔ جمیلہ جمیلہ کے کردار، جمیلہ کے کہانیوں کی فضا ایسے ہی جہنم میں سسکتی ہیں۔ سب کردار اپنے اپنے کندھوں پر اپنی اپنی صلیب اٹھائے پھرتے ہیں اور انہیں دشت آرزو میں وہ جگہ نہیں مل سکتی جہاں وہ یہ صلیب نصب کر کے اپنے آپ کو مصلوب کر کے اپنی نظروں میں شہید ہو سکیں۔

اس سلسلے میں اہورنگ کی مایا پیش پیش ہے۔

جمیلہ کی مایا اپنی محبتوں اور کامیابیوں کے باوجود سائے کی طرح ڈھلتی ہے۔ شاید اس کی زندگی میں ہر ایک ایسے رخ سے داخل ہوا تھا کہ کبھی اس کی پوری صورت کسی کو بھی دکھائی نہ دے سکی اور اس کے باوجود مایا کو کتنی آرزو تھی کہ کوئی اس کا چہرہ مکمل طور پر بے نقاب کر سکتا!

جمیلہ کے رگھو کو نہ سہاروں کی ضرورت ہے نہ محبت کی اور نہ کسی اور تعلق کی! اور اس لاتعلقی کے طوفان میں وہ یوں سرگرداں پھرتا ہے جیسے آندھی میں گرا اخبار کا پرانا بوسیدہ ٹکڑا......

تارا جو میٹنگوں میں جاتی ہے جو فائلیں مکمل کرتی ہے۔ ایسوسی ایشن بناتی ہے، کالج میں تاریخ

پڑھاتی ہے اور آئندہ کے متعلق کبھی نہیں سوچتی۔ کیسے وثوق سے وہ کیدار بابو سے کہتی ہے کہ اب کہنے اور سننے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ جو پتھر کی مورتی ہے جس کے سینے میں عورت کا دل تو دھڑکتا ہے لیکن جو عورت بننا نہیں چاہتی۔ مورتی ہی بنے رہنا چاہتی ہے لیکن اس کے باوجود تارا کا جنم کیسے پکار پکار کر اس لمحے کو بلاتا ہے جب وہ مورتی نہ رہے گا، عورت بن جائے گی لیکن کبھی کچھ نہیں ہو پاتا۔ کہنے اور سننے کو کبھی کچھ باقی نہیں رہتا اور مایا کی طرح تارا کو بھی دشت آرزو میں اپنی صلیب گاڑنے کے لیے دوگز زمین بھی نہیں ملتی۔

جمیلہ کے کیدار بابو جو برسوں سے تارا کو پوجتے چلے آئے ہیں اور جو بظاہر اس حق سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ انہیں پوجتے رہنے دیا جائے۔ جو خوب جانتے ہیں کہ وہ تارا کے قریب کبھی نہ جائیں گے کیونکہ تارا ایک دردسر کے سوا اور ایک چیلنج کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیدار جسے اچھی طرح سے پتہ ہے کہ جس قوم نے دوسو برسوں میں اپنوں سے نفرت، اپنوں پر ظلم، اپنی روایتوں سے بیزاری، اپنی ہی باتوں پر ہنسنا سیکھ لیا ہے ان کے پاس جو بھی محبت باقی رہ جاتی ہے وہ زہر آلود ہوتی ہے۔ اس لیے تارا کی آرزو میں ایک سرد جہنم ہے جو ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتا ہے۔ جیسے پاؤں نہ ہوں اور آدمی بھاگنے کی آرزو میں تڑپتا رہے۔

پھر مرلی دھر ہے جو کبھی شرے کو کبھی چنڈی داس کو یوں قائل کرتا پھرتا ہے۔ گویا قائل کرنے اور نہ کرنے پر ہی اس کی زندگی کا مدار ہو۔ پھر اس کے اندر سے ہنسی کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی غیر مجھ سے الگ میری پہنچ سے باہر میری ہنسی اڑا رہا ہو......

دشت آرزو کے یہ بونے یہ دراز قد جن، یہ میری زاویہ۔ محبوس شہزادے، شہزادیاں کون ہیں؟ یہ کیسی مکڑیاں ہیں جنہوں نے اپنے ہی گرد جالے بن کر اپنے آپ کو قلعہ بند کر رکھا ہے۔ جمیلہ کی کہانیاں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ سارے کردار مصنف کے وجود سے اس کی آرزوؤں کے ناکام اعضاء کی طرح کٹ کر بکھرے ہوئے ہوں اور اسی طرح کلبلا رہے ہوں جیسے چھپکلی کی دم کٹ جانے کے بعد دیر تک کلپتی رہتی ہے۔

یہ سارے کردار دیکھ کر ایک بار خیال ضرور آتا ہے۔ گویا جمیلہ کسی آتشدان کے پاس بیٹھی آگ تاپنے میں مشغول ہے اور اس کے سائے دیواروں پر چھت پر اور فرش پر مختلف زاویوں سے پڑ رہے ہیں۔ ہر سائے میں آگ تاپنے کا فعل موجود ہو لیکن آگ سے اتنی ہی دوری ہے جتنی سائے اور جمیلہ میں موجود رہتی ہے۔

موجودہ دور نے یوں تو بے اطمینانی کی بہت سی سمتیں کھول دی ہیں اور پسماندہ ممالک میں ایسے ایسے عبوری مسائل کے ٹائم بم رکھ دیئے ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی نسل ایک دھماکے سے تباہ ہو سکتی ہے لیکن اس عبوری دور میں جب ہماری عورت مکمل طور پر مغرب کا نمونہ بن نہیں سکی اور مشرقی اقدار کی آخری ڈوری سے لٹک رہی ہے، اس دور نے عورتوں کو عجب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے اور اسی کشمکش کی بدولت عورتوں کی ایک ایسی کھیپ ابھر رہی ہے جو افسانے، ڈرامے اور ناول کے میدان میں جہاد کے سے جذبے سے لڑ رہی ہے۔

ایک طرف اس کے پاس مشرق کا تصور زن ہے جو مرد کو مجازی خدا کے روپ میں دیکھتا ہے دوسری

جانب اس کے پاس مغرب Mass Communication کی داستانیں ہیں جن میں عورت Nymphomania کے روپ میں رہ کر ہی اپنی جذباتی آزادی کے لیے لڑ سکتی ہے۔ مغرب سے اُسے Liberation Movement کی صدائیں آتی ہیں۔ گھر سے اسے شمع خانہ بننے کا حکم ملتا ہے۔ سرحد پار سے پتی پاردھوم کی صدائیں آتی ہیں۔ چین سے اسے دوستی مساوی حقوق اور آزاد زندگی کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے میں کئی ناآسودہ خواب جنم لیتے ہیں۔ جیسے برسات کے بعد صبح صبح کُکرمتے ہری ہری گھاس پر سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ناآسودہ خواب آج کی عورت کا مقدر ہیں۔

ایسے ہی ناآسودہ خوابوں کا رنگ زہر سے تعبیر کریں چاہے لہو سے جمیلہ کے افسانوں کا رنگ ہے اور اس اعتبار سے خوب رنگ ہے کہ جمیلہ مادہ زندگی کو سیال بنانے کا ڈھنگ جانتی ہے اور خوب جانتی ہے کہ چاہے زہر ہو چاہے لہو بالآخر سب انسان کے لیے جہنم کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ایسا خودساختہ جہنم جس پر آج تک کسی انسان نے کسی اور کی بنائی ہوئی جنت کو ترجیح نہیں دی۔

جمیلہ ان چند خوش نصیب ادیبوں میں سے ہے جو قیام پاکستان کے بعد جب پاکستان آئے تو اپنے پچھلے وطن، پچھلے شہروں، پچھلے کلچر اور پچھلے لوگوں کی یاد کو بھی ساتھ ہی لے آئے۔ جمیلہ آبلہ پا آئی اور یاد کے مرغزاروں میں کھو گئی۔ وہ خوش نصیب ہے کہ اس کے ماضی کے ہر کانٹے پر روئی کا پھول نکل آیا۔ جمیلہ اور میں دونوں ماجھے اور مالوے کی سرزمین سے واقف ہیں لیکن جمیلہ غالباً ایسے نین تارا مرلی دھر، فیڈی داس، راگھو، مایا، کدم مالتی جیسے لوگ ملتے رہے۔ ایسے روپ سروپ بھرے لوگوں میں یہ رہی جنہوں نے جمیلہ کو کبھی کسی احساس شکست، احساس ندامت یا کوتاہیوں کا احساس نہیں دیا۔ میں اس معاملے میں ایسا خوش نصیب نہیں۔ یہی مرلی دھر، راگھو، مایا، کدم جب میرے ساتھ تھے تو مجھے ہر وقت یہ احساس دلایا کرتے تھے کہ میں ان کے درمیان کی چھپٹ بھیا ہوں گھٹ منحسیا ہوتا ...... ایک ایسا اچھوت جس سے وہ کئی صدیوں سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔ مجھے گلہ جمیلہ سے نہیں ان نین تارا قسم کے لوگوں سے ہے جنہوں نے جمیلہ کے دامن کو سندر لاقسم کی یادوں سے بھر دیا اور مجھے اپنے وقت کا شائی لاک بنا دیا کہ میں عرصہ دس سال سے تلقین شاہ لکھ رہا ہوں اور پھر بھی میں شائی لاک کے الفاظ میں پوچھتا ہوں۔

''کیا ان مرلی دھروں نے مجھے بے عزت نہیں کیا۔ میرے نقصانات پر خوش نہیں ہوئے۔ میرے نفع کا تمسخر نہیں اڑایا، میری قوم کو مضحکہ خیز نہیں سمجھا اور میرے ہر معاملے میں روڑے نہیں اٹکائے۔ میرے دوستوں کے دل سرد کیے اور میرے دشمنوں کے دلوں میں نفرت کو بھڑکایا اور اس کی وجہ کیا ہے۔ صرف یہ کہ میں مسلمان ہوں، کیا مسلمان کے ہاتھ نہیں ہوتے، اس کے پاس اعضا، احساسات، جذبات، محبتیں کچھ نہیں ہوتا، کیا وہ مرلی دھر کی طرح کھانا نہیں کھاتا، ویسے ہی ہتھیاروں سے کیا وہ زخمی نہیں ہوتا۔ ان ہی بیماریوں کا شکار

نہیں ہوتا، گرمی اور سردی اس پر ایسے ہی اثر انداز نہیں ہوتے۔ اگر آپ ہمیں سوئی چبھوئیں تو کیا ہمیں درد نہیں ہوگی۔ ہمارا لہو نہیں بہے گا۔ اگر آپ ہمیں زہر دیں تو کیا ہم زندہ بچ جائیں گے۔ اگر آپ ہمیں دھوکہ دیں تو کیا ہمارا انتقام ناجائز ہے۔

جمیلہ خوش نصیب ہے کہ وہ Nostalgia کے افسانے لکھ سکتی ہے۔ میں کم نصیب ہوں کہ برسوں اوھر میں نے یہ نعمت کھو دی۔ جمیلہ کے پاس ایک ماضی ہے جس میں شعلے بھڑکتے ہیں، پھول کھلتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں۔ افسوس ہمارے پاس نہ ماضی ہے نہ مستقبل۔ ماضی ان لوگوں نے تباہ کر دیا جن کے پاس ہم رہتے تھے۔ مستقبل وہ Mass Communication تباہ کر دے گی جو مغربی ملکوں سے میزائل بن بن کر میرے چینڈ وخرمن پر گر رہی ہے۔

اس لیے میں اور میرے جیسے اور لکھنے والوں کے حصے میں وہ نعمتیں نہیں ہیں جو جمیلہ کی کہانیوں میں ملتی ہیں۔ جمیلہ خوش نصیب ہے کہ کم از کم ادب کی دنیا میں اس کے اپنے لیے کوئی جہنم نہیں۔ اس کا ماضی ایسا خوشگوار ہے کہ وہ جب چاہتی ہے بائیں باغ کی کھڑکی کھول کر سر باہر نکالتی ہے اور مرلی دھر، راگھو، مایا، کدم کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیتی ہے۔

میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا

اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ عجیب بلکہ انوکھی کتاب کچھ نرالے تقاضے لے کر ادب یا تاریخ یا معاشرتی نفسیات یا اجتماعی عمل کے افق پر ابھری ہے۔ اس کتاب کا مقصد حال پر موجود ان تمام لوگوں کے سامنے ڈھاکہ کے ڈوبتے منظر کو رکھنا ہے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ اس خطا میں ان کا کتنا حصہ ہے اور وہ کس حد تک قصوروار ہیں اور اصلاح کی صورت میں انہیں اپنی صداقت کا ثبوت کس طرح سے بہم پہنچانا ہے۔ یہ کتاب پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محض عہد و پیماں کی تکرار سے اور اس کو اونچی آوازوں میں نشر کرتے رہنے سے کوئی کبھی بھی سچا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے مطالعے سے ایک عام آدمی کو یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ جب کوئی جماعت وجود میں آتی ہے تو لوگ اس سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اگر قیادت راسخون فی العلم کے ہاتھ میں نہ ہو تو وہ اپنے ساتھیوں کے لیے آسانی کے بجائے بوجھ بن جاتی ہے اور لوگ جب خلوت اور جلوت میں اپنے بڑوں کے تضاد کو دیکھتے ہیں تو پھر ان سے ان کا دلی تعلق قائم نہیں رہتا۔ پھر یہ درس بھی ملتا ہے کہ مجبوریاں کبھی کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتیں چاہے ان کا انبوہ کثیر موجود ہو۔

آپ سب اچھی طرح سے جانتے ہیں اور تجربے کے میدان سے گزرنے کے بعد آپ پر یہ حقیقت بالکل روشن ہو گئی ہے کہ مخلص قیادت کے لیے دو صفات درکار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کو علم کہتے ہیں اور دوسری کو صبر! علم بڑا ہو تو ساتھیوں کی حفاظت کا حق اچھی طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ صبر بڑا ہو تو مصائب و آلام کے وقت ساتھیوں کو پوارہ کرد کھایا جا سکتا ہے۔ قائد کے علم سے اس کے ساتھیوں کو جلی مدد ملتی ہے اور صبر سے خفی مدد ملتی ہے اور اپنے اپنے مقام پر یہ دونوں ہی ضروری ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ قیادت ایسے ہاتھوں میں نہ ہو تو رخ نور سے ظلمات کی طرف ہو جاتا ہے اور ظلمات میں بھٹکنے والے گروہ کو پھر کبھی بھی منزل کا سراغ نہیں ملتا۔

صدیق سالک سمیت تمام شاہدین اس بات کی شہادت دے چکے ہیں کہ جب بھی خیر کو قبول نہیں کیا جاتا تو غیر گلے پڑ جاتا ہے۔ جب بشارت کے راستے کو چھوڑ دیا جائے گا تو انذار کے راستے پر چل نکلنا لازمی ہو جائے گا۔ خدا کی طرف سے ملی ہوئی جس توفیق کو بھی بھلائی سے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ وہ برائی سے ضرور

استعمال ہوگی۔ زندگی Vaccuum میں نہیں رہ سکتی؟

جنگ کے رموز جاننے والے اصحاب کے لیے یہ کتاب اس قدر اہم ہے کہ وہ اگر بے سروسامانی سے لڑنے والی فوج کو آئیڈیل مان لیں تو ان کی پوری زندگی میں کسی جگہ بھی کجی نہ آئے گی۔ دنیا کے ہر جرنیل کو جنگ کا پلان بناتے وقت ان عظیم مردوں کو سلام کرنا چاہیے جنہوں نے تعمیل ارشاد کرتے وقت سامان حرب کی کمی کی شکایت نہیں کی۔ اپنے دشمن کی عددی برتری سے مرعوب نہیں ہوئے اور ذلت کے لمحے کو محیط ہوتے دیکھ کر بھی من مانی پر مائل نہ ہوئے۔

سیاست کے رخ سے اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کے جال میں پھنسا کر بے دست و پا کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس جال کی طنابیں چاروں طرف سے کھینچ دی جاتی ہیں۔ یہ ایسی گرفت ہوتی ہے کہ اس کو شکار خود گلے لگاتا ہے۔ اس لیے اس پھندے سے چھوٹ جانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ جو بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے وہ ضرور راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ یہ علم مطلق کا ارشاد ہے جس کے کلمات کبھی نہیں بدلتے۔

''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اس لحاظ سے بھی ایک اوریجنل کتاب ہے کہ اس کا سب کچھ اپنے انداز میں ہے۔ اپنی کہانی ہے، اپنی زبانی ہے اور اپنوں ہی کو سنائی جا رہی ہے۔ سنانے والے کی آواز دکھ بھری ہے اور اس کی آنکھیں طلسمی شیشوں کی جھلملیوں میں اپنے حال کو چھپا رہی ہیں لیکن رخساروں پر نشان ہیں ان سوتوں کے جو ان آنکھوں سے پھوٹتے رہے ہیں اور ان گالوں پر سے گزرتے رہے ہیں اور شاید اب بھی گزرتے رہتے ہیں۔

ذرا اس کوشش پر توجہ فرمایئے جو مصنف نے حقائق بیان کرتے وقت اپنی پسند پر بھاری پاؤں رکھ کر کی ہے۔

''رمنا کورس میں جلسے کا وقت ہوگیا۔ ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن نے افسران بالا کی اجازت کے بغیر جلسہ گاہ سے براہِ راست کارروائی نشر کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور ریڈیو اناؤنسر ڈھائی بجے سے سامعین کو رواں تبصرے کی صورت میں بتا رہا تھا کہ جلسہ گاہ میں دس لاکھ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بندھو مجیب الرحمان کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ اعلان راولپنڈی میں بھی کسی نے سنا اور صدر یحییٰ کے ہیڈ کوارٹر...... سے ایک بریگیڈیئر نے ڈھاکہ فون کیا کہ یہ بکواس بند کراؤ۔ ریڈیو والوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں کہا کہ مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز کا حکم ہے کہ جلسہ گاہ سے براہِ راست نشریات فوراً بند کی جائیں۔ تعمیل نہ ہوئی تو آپ ذمہ دار ہوں گے۔ ریڈیو کے افسر نے غصے سے جواب دیا، اگر ہم ساڑھے سات کروڑ عوام کی آواز نشر نہیں کر سکتے تو پھر یہاں کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ٹیلی فون بند ہونے کے چند منٹ بعد ریڈیو اسٹیشن خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنی نشریات کا آغاز اگلی صبح کیا۔ جب مجیب الرحمان کی تقریر کا ٹیپ نشر کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔''

اس منظر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاکم اعلیٰ کے کان اس کے وجود سے بہت فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ

کان خبر سن کر اسے حاکم اعلیٰ کی پسند کے مطابق رنگ دے کر اس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ کان وہ اندھیاریاں ہیں جو لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ یہ کان اپنی پسند کے خلاف آواز سن کر اس پر بکواس کا لیبل لگاتے ہیں اور اسے بند کروانے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ ریڈیو افسر کا جواب بھی من وعن درج کرنا صدیق سالک کی شان ہے۔ سالک جس وقت کی بات کر رہے ہیں اس وقت انہیں یہ نظر آتا ہے کہ جس عمل کو قول سے روکنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ اپنے لیے جلد ہی نئی راہیں تلاش کر لے گا اور اس عمل کو بکواس کہنے والے اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب جائیں گے۔ طے پایا کہ عمل کو قول سے کبھی روکا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ مصنف کی امانت داری کو سلام کیجیے کہ آپ سے کچھ چھپانے میں مصنف نے بڑے بخل سے کام لیا ہے اور سب کچھ بے کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ اس نے کسی جگہ بھی قاری کو چھوٹا نہیں دکھایا، نہ ہی اس کے احترام میں کمی کی ہے۔

یہ المناک کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سیاسی افق سے متعلق ہے۔ دوسرا خانہ جنگی سے تعلق رکھتا ہے اور تیسرا جنگ سے وابستہ ہے۔ پہلے حصے میں وہ مناظر اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں جن سے انجام صاف جھلک رہا ہے لیکن واپسی کا راستہ بھی کھلا ہے لیکن جب ذاتی خوشی پر قومی خوشی کو قربان کرتے ہوئے حیا نہ آئے تو پھر اختیار ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خانہ جنگی اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ جب قانون نافذ کرنے والے ادارے شبہات میں گھر جاتے ہیں تو ان کی ہر کوشش حاکم ومحکوم کے درمیان فاصلوں کو بڑھاتی جاتی ہے۔ جنگ کے حصے میں ایک اور حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے کہ مکتی باہنی ہندوستان کی فوج کو تمام خطرات سے بحفاظت گزار دیتی ہے لیکن ثمرات اور انعام کے حصول کے وقت پیچھے کر دی جاتی ہے۔

پھر اس پوری داستان کو اس کی تمام جزئیات کے ساتھ جاننے کے لیے 14 اگست 47ء سے لے کر یکم جنوری 1970ء کے عرصہ کے درمیان کے اہم واقعات کو تاریخ وار بیان کیا گیا ہے۔ یہ جدول اس لیے شامل کتاب کی گئی ہے کہ قاری ترتیب واقعات کو اس تناظر میں دیکھے اور جہاں وہ اس وقت ہے، اس مقام کو پہچانے۔ اگر خدانخواستہ اس وقت بھی وہ اپنی خواہشات کا اتباع کر رہا ہے تو اس کو فوراً چھوڑ دے اور مخلصین کی رفاقت کو اپنے لیے باعث افتخار جانے کیونکہ اس میں فلاح دارین مضمر ہے۔

صدیق سالک جو اس عہد کا تاریخ دان ہی نہیں بلکہ اپنی طرز کا ایک سالک فلسفی بھی ہے اپنی تحریر کے رشتے سے میرے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جو ایک طالب علم کی طرح اپنے پوروں پر جو وظیفہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

1- جس قول کی (تحریری ہو یا زبانی) عمل کے ساتھ شہادت نہ دی جائے وہ نہ سچا ہوتا ہے نہ زندہ۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے یعنی اصلاح کی صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ قول کے اعلان کے وقت یہ دیکھا جائے کہ جو بات کی جارہی ہے، بات کرنے والے کا عمل بھی

اس کا شاہد ہے یا نہیں۔

2- اپنی ذات کے لیے صبر اور مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے والے ہی باعزت ہوتے ہیں۔ عزت حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔

3- لیڈر کی پہچان یہ ہے کہ وہ خطرے کے وقت اپنے گروہ میں سب سے آگے ہو اور تقسیم انعام کے وقت سب سے پیچھے رہے۔

4- جب غریبوں کو سنبھالا نہ جائے اور ان کو صرف استعمال کیا جائے تو ایک وقت کے بعد وہ استعمال کرنے والوں کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔

5- کسی نفس پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ رکھنا بڑی بے علمی ہے۔ اس سے Inter personal relations منقطع ہو جاتے ہیں۔

6- علم والا بہتر جاننے والا ہوتا ہے اور بہتر جاننے والے کی شان یہ ہے کہ وہ ہر کمتر جاننے والے کو اس کے مقصود تک پہنچا دے اور اسے چوٹ نہ مارے۔ یہ نہیں ہوگا تو علم حاصل کرنے کا حق ادا نہ ہوگا۔ درسگاہیں، دانش گاہیں اور یونیورسٹیاں کھلتی رہیں گی۔ تعلیم عام ہوتی رہے گی اور مخلوق خدا کے مسائل بڑھتے رہیں گے۔

7- اس ملک کا ہر نظام Mistrust پر قائم ہے۔ چنانچہ لوگوں کی بیشتر قوت، وقت اور سرمایہ Trustwerthy ہونے کا ثبوت فراہم کرنے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو قابل اعتماد مان لیا جائے جب تک کہ وہ نا قابل اعتماد ہونے کا ثبوت بہم نہ پہنچائے۔

8- ہمارے یہاں لائق احترام قیادت کا فقدان ہے۔ لائق احترام قیادت ہر سطح پر ضروری ہے اور قیادت کا حق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کا رخ مدح اور خدمت سے متاثر نہیں ہوتا۔

9- لوگ اپنے آپ کو باعزت اور قیادت کا اہل ثابت کرنے کے لیے وسعت مال کو مقصود بنا رہے ہیں لیکن اعلان ہو چکا ہے کہ وسعت مال پر قائم ہونے والی فضیلت کے دن گئے۔ اب فضیلت کی بنیاد وسعت علم پر ہوگی اور صاحب علم وہی ہے جو کم جاننے والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

خواتین و حضرات! واقعات کے اعتبار سے تو واضح ہے لیکن انداز بیاں کے حساب سے بھی یہ کتاب بڑی دکھ بھری ہے۔ یہ اس عہد کی وہ گریک ٹریجڈی ہے جس کے ہجوم غم میں غم کارواں، غم سفر اور غم ناکامی ساتھ ساتھ رواں ہیں۔ میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا ماضی کی تاریخ نہیں، حال کا مینوئل ہے کہ اگر آئندہ کبھی اس قسم کی سچوئیشن پھر پیدا ہو تو پاکستان کیا کرے اور پاکستانی کا رخ کس طرف ہو!

مسعود قریشی کی آشوب آگہی

شکوہ، فرقت، خواہش، قربت بات وہی انداز وہی
خاص بہت بنتے تھے ہم بھی عشق میں کتنے عام ہوئے

یہ مسعود قریشی کی مخصوص غزل کا شعر ہے جس میں نہ تخلص ہے نہ مقطع ہے۔ اس شعر کو تھوڑی دیر تک اپنے ذہن میں محفوظ کر لیجیے کیونکہ اس کے حوالے سے میں مسعود کا قد اور اس کی شاعری کا قطر ناپنے کی کوشش کروں گا۔ ہر شاعر کو اپنے کلام پر الہامی ہونے کا شبہ ہوتا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی اپنے آپ کو عام انسان یا عام آرٹسٹ نہیں سمجھتا۔ تاوقتیکہ اسے اپنی پرانی چھپی ہوئی غزلوں میں باسی پان لپٹے ہوئے نہ ملنے لگیں۔ اس پر بھی وہ دل سے تو نہیں مانتا کہ اس کا کلام الہامی نہیں لیکن عموماً اس کے لبوں پر لوگوں کی بے رخی، بدذوقی اور کم عقلی کا مرثیہ زیادہ رہنے لگتا ہے اور شعروں کی بارش کم ہوتی ہے۔

ایک بار پھر شعر سن لیجیے۔

شکوہ، فرقت، خواہش، قربت بات وہی انداز وہی
خاص بہت بنتے تھے ہم بھی عشق میں کتنے عام ہوئے

ایک لحظہ کے لیے مسعود قریشی پر نظر ڈالیے۔ اس کا لباس، گفتگو، اندازِ نشست و برخاست، رہن سہن کسی میں بھی بھڑکیلا پن یا جدت طرازی کی انہونی کوشش نہیں ہوتی۔ روحیات کے سیانے کہتے ہیں کہ جو شخص یہ بات جان لیتا ہے کہ اس کی جبلت یا عادت ہے جو اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے، اس کا آئی کیو عموماً بہت زیادہ ہوتا ہے جو وقت پسند اذیت پسند، انوکھے پن کے بہروپ کا سہارا لے کر زندہ رہتا ہے۔ وہ چونکا تو دیتا ہے لیکن اس کی صحبت میں لوگ خوش نہیں رہتے اور بسا اوقات وہ خود اپنی خلوت میں بھی تکلیف دہ گھڑیاں گزارتا ہے۔ آئی کیو کے پیمانے سے کسی شاعر کو نہیں ناپنا چاہیے کیونکہ ہر آرٹسٹ اول و آخر کسی وجہ سے لکھتا ہے لیکن اس شعر کو پڑھنے کے بعد میں بالخصوص طور پر اور اس کی شاعری کو پڑھنے کے بعد مجموعی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسعود ذہین آدمی ہے۔ اس کا آئی کیو ضرور 110 سے اوپر ہوگا کیونکہ اسے احساس ہے۔

جس وقت مسعود نے یہ شعر کہا ہوگا اس وقت اپنے متعلق، اپنی شاعری کے بارے میں اور اپنے عشق کے سلسلے میں اس پر دو گتھیاں کھلی ہوں گی۔ پہلی بات تو یہ واضح ہوئی ہوگی کہ ہر انسان چاہے اپنے تئیں خود کوکوہکن، مجنوں، رانجھا، یا پرویومر سمجھے لیکن سچا عاشق ہونا توفیق کی بات ہے اور معراج عاشقی ہر انسان کا حصہ نہیں۔ خاص عاشق بننے کی آرزو ایک طرف اور عام انسان کی طرح چاہنا، ناراض ہو جانا بھولنا، دغا دینا، حسد کی آگ میں جلنا، اس آرزو کی ذہنی حقیقت ہے اور عام انسان کو اس گوشت پوست کے جسم کے ساتھ عام محبت اور اس کے مطابق رہنے میں زیادہ ذلت کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔

پہلی حقیقت کھلتے ہی مسعود نے اپنے ذہنی عشق اور اس کی ڈکونا پروازوں کو دل سے قبول کرلیا۔

دوسری بات مسعود پر یہ بھی کھلی کہ شاعری، آدمیت اور شہرت مزید توفیق کی باتیں ہیں۔ شہرت کی فائل لے کر جب فرشتے بڑے صاحب کے پاس پہنچتے ہیں تو مہر قبولیت خدا جانے کن شرائط کی بنا پر کن کاغذوں پر لگتی ہے۔ آج تک مسعود نے کبھی جیب سے کاغذ نکال کر یہ نہیں کہا کہ اتفاقاً یہ غزل میرے ساتھ آ گئی ہے، تم بھی سن لو۔ مسعود جانتا ہے کہ ابلاغ کے سہارے شاعری کا ستون اگر اٹھا بھی لیا جائے تو ٹیلی ویژن کے اشتہاروں کی طرح یہ بھی جلد کھوکھلا ہو جائے گا۔ اس نے کبھی اپنی وجہ شہرت پر غور نہیں کیا۔ اسی لیے اپنی ذات اور اپنی شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس کی ناک پر پسینہ آ جاتا ہے۔ وہ ہم جیسے شیخی خوروں کو کبھی نہیں بتاتا لیکن خوب جانتا ہے کہ شہرت کا نقش کیسا بھی پائیدار کیوں نہ ہو یہاں ابدی ذات صرف خدا کی ہے اور انسان کا ہر نقش مسلسل تبدیلی کے چلتے ہوئے نوکے کی کاٹ تلے آ جاتا ہے۔ اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ مسعود کی شاعری اس کا حال ہے، اس کی اپنی واردات کا ایک حصہ ہے۔ وہ آپ پر خاص قسم کا رعب ڈالنے، تاثر دینے کے لیے شعر نہیں کہتا۔ بس ایک سرگوشی اس کے دل میں اٹھتی ہے۔ ایک بھنور سا پڑتا ہے اور اپنا دوست سمجھ کر وہ یہ شعر آپ کو سنا دیتا ہے۔ شعر کہنے یا سنانے کا تعلق شہرت ناموری یا ابدی نقش ابھارنے سے نہیں ہے بلکہ اظہار سے ہے۔ جیسے کوئی گھونسلے سے چتکبرے انڈے نکال کر آپ کے پاس لائے اور آپ اور وہ مل کر ان کی خوبصورتی، رنگ اور وزن کو دیر تک آنکتے رہیں۔

مسعود تو عشق اور شہرت کی حقیقت سے واقف ہو کر بزاغت ہو گیا ہے لیکن اس کی نظمیں پڑھ کر اور مسعود کی رفاقت میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد مجھ پر بھی ایک تکلیف دہ بھید کھلا ہے۔ مسعود جیسے لوگوں پر انعام کی ایک خاص بارش ہوتی ہے جو خاص لوگوں پر کبھی نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسعود بڑے سچے دل سے اپنے آپ کو عام اور بے حقیقت سمجھتا ہے۔ وہ اس زعم میں مبتلا نہیں کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوگا تو سمندر چنگھاڑیں گے اور پہاڑ روئیں گے اور اس کی محبوبہ خودکشی کرے گی۔ افسوس کی بات ہے لیکن جب کوئی شخص واقعی اپنے آپ کو بے مایہ اور چھوٹا سمجھنے لگتا ہے تو اس کی شخصیت میں بڑی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اور اس خوشبو کے دور اور نزدیک چرچے ہونے لگتے ہیں۔ پھر اس کا قد تو نہیں بڑھتا لیکن وہ ایک چھتارے درخت

سے گھمن گھیر سائے پھیلانے لگتا ہے۔ وہ اونچا تو نہیں ہوتا لیکن نشیب میں بہنے والے پانیوں کی طرح پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان کا نقش زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں کہیں بڑے شاعر، بڑے ادیب، بڑے آرٹسٹ جمع ہوں گے وہاں مسعود اپنے کوٹ کے کالروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور اندر سے زانوئے تلمذ تہہ کر لیتا ہے۔ محفلوں میں نہ وہ شاعری کی باتیں کرتا ہے نہ اس کے ذاتی تجربات گفتگو کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ نہ ہی اس کی آواز میں دانشوروں کی سی وثوقیت ہوتی ہے لیکن ایسے وقتوں میں اس کے چہرے پر حیرت ہوتی ہے...... کی حیرت، ریگستانوں کی حیرت...... یہی حیرت اس کی شاعری میں آدمیت کی جان بن کر سامنے آ جاتی ہے...... وہ حیران ہوتا ہے...... حیران رہنا چاہتا ہے لیکن محفل سے گھر تک پہنچتے پہنچتے محبوب مسعود میں کبیر کی روح ابھر آتی ہے۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات پر سوچنے لگتا ہے جو ایک عام نارمل صحت مند لیکن حساس انسان کی زندگی کی اساس ہیں اور حیرانی کی جگہ دکھ کی ہلکی ہلکی پھوار اس کے دل کی کھڑکی پر پڑنے لگتی ہے۔

رخصت میں جس اکتاہٹ کا ذکر مسعود نے کیا ہے وہ اسی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

تھک گئے جسم و دل و روح کلرکی سے پھر
مضمحل زیست میں اک شعلہ سرکش بھڑکا
سرکشی ایک بہادر کی بھلا کیا کرتی
میں نے صاحب سے کوئی روز کی رخصت لے لی
تاکہ بے رنگ تسلسل کا تو بندھن ٹوٹے

کلرکی کا بے رنگ پیشہ، جسم و روح کی مضمحل کیفیت اور صرف ایک واحد فرد کی سرکشی کا المیہ! یہ نانگا پربت جیسی فلک بوس حقیقتیں نہیں ہیں لیکن یہ ہر اس شخص کا المیہ ہے جو عادت کا تابع ہے اور جس کا روزمرہ کبھی نہیں بدلتا۔ مسعود نے اس نظم میں نظریں اوپر اٹھا کر سوپر سونک رفتار سے جانے والا طیارہ نہیں دکھایا۔ صرف وہ راہ دکھائی ہے جس پر ہر طرف کائی جمی ہے اور تازہ بارش کی بوندیں اس کائی کا سینہ چیر کر اسے نئے پانیوں سے آشنا کر رہی ہیں۔

کائی لگے کلرک کے باسی پانی پر...... چھٹی کی تازہ بارش...... لیکن جو بات نظم میں درج نہیں اور جو اس نظم کی جان ہے، وہ مسعود کے سائل کی جان ہے۔ وہ جب کبھی مسئلہ سلجھا دیتا ہے تو اپنی اس سلجھاہٹ سے اس کو اور بھی المناک بنا دیتا ہے۔ جیسے مرنے والے مریض کو آکسیجن کے ٹنٹ میں ڈالنے کے بعد اس کے رشتہ دار میانی صاحب میں قبر کا انتظام کرنے بھی چلے جاتے ہیں۔ مسعود کلرک کو تازہ چھٹی کی نوید سنانے کے بعد بھی آپ سے سرگوشی میں کہتا ہے کہ یوں تو کلرک نے رخصت لے لی ہے لیکن بے رنگ تسلسل کا بندھن کبھی ٹوٹا

ہے کہ اب ٹوٹ جائے گا۔ اس کو چھنی لے کر بھی دیکھ لینے دو۔

کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ اندر سے بہت زیادہ عیار ہی نہ ہو لیکن پھر یہ شبہ چند شعر آگے چل کر خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ عیار بننے کے لیے بڑے لوازمات کی ضرورت ہے۔ یہ ایک پورا پیشہ ہے ایک انفرا سٹرکچر ہے۔ آرٹسٹ کے پاس اتنے ذرائع کہاں۔ آرٹسٹ کمینہ ہو سکتا ہے لیکن عیار نہیں۔ بہت سے لوگ کم علمی کی وجہ سے کمینگی کو عیاری کا نام دے دیتے ہیں۔ ایک اور بہت ہی خوبصورت نظم ملاحظہ کیجیے۔ گو میری بات کا اس سے بالواسطہ کوئی تعلق نہیں۔

آج راہیں بچھڑ چلی اپنی
زندگی کو کہیں قیام نہیں
تیرے آنسو سلام کرتے ہیں
اس مسرت کو کیوں دوام نہیں
میں تو کچھ اور بھی ٹھہر جاتا
وادیوں کا وجود عام نہیں
وقت کو تاب انتظار کہاں
وقت تیرا میرا غلام نہیں

بظاہر اس نظم میں وقت ولن ہے۔ وہ مسرت سے ابدیت چھین لیتا ہے۔ انقلاب وقت کا ماحصل ہے اور تبدیلی انسانی مسرت کی جانی دشمن ہے۔ مسعود ظاہری طور پر تبدیلی اور وقت کے سر انسانی زندگی کا المیہ تھوپ کر آپ کو شانت کرنا چاہتا ہے لیکن اگر آپ ایک دو بار اس نظم کو پڑھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اصلی المیہ یہ نہیں ہے۔ میں یہ شعر پھر پڑھتا ہوں۔

میں تو کچھ اور بھی ٹھہر جاتا
وادیوں کا وجود عام نہیں

یہاں ان دو مصرعوں میں ایک چھوٹا سا ٹائم بم چھپا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے راہیں بچھڑ جاتی ہیں۔ وقت شبخون مارتا ہے اور تبدیلی مسرتوں کو چاٹ جاتی ہے لیکن اصلی المیہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ پچھلی راہوں کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ خود اس کے اندر تبدیلی کے لیے ایک رہنما دیا جلتا رہتا ہے اور وہ خود تبدیلی کا مرغ بادنما بنا رہتا ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا کہ مسعود عام نارمل آدمی ہے۔ یہ نہ صرف خود بڑے آئیڈیل بنانے سے گریز کرتا ہے بلکہ آپ کو بھی اس خود فریبی جال سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ انسان کو عظیم نہیں سمجھتا۔ انسان ہی سمجھتا ہے۔ اگر کبھی اس کا دل ایسا اعلان کرنا بھی چاہے تو وہ کہنی مار کر کہتا ہے۔

یہ رم کردہ وحشی یہ دل

اپنے زخموں میں اک تازہ تر زخم کاری لیے سوچتا ہے
کہ یہ زخم اب آخری زخم ہوگا

محبت کے روزن سے اب کوئی مجھ کو نہیں ڈس سکے گا
مجھے دل کی معصوم و سادہ ادا پر ہنسی آ رہی ہے

مسعود آپ کے لیے کوئی ہاتھی پکڑ کر نہیں لاتا کہ آپ کے آنگن میں باندھ دے جس کو چارہ کھلانا زندہ رکھنا آپ کے بس کی بات نہ ہو۔ کیونکہ بڑے آئیڈیل بڑے مستکوں والے ہاتھی ہوتے ہیں۔ ان کے رہنے کے لیے مہاراج ادھیراجوں کے محل دو محلے درکار ہوتے ہیں۔ جنہیں سینکڑوں انسان کو توڑ پھوڑ کر اٹھایا جاتا ہے۔ مسعود چھوٹے چھوٹے خوش رنگ پرندے اپنی انگلی پر بٹھا کر دکھانے لاتا ہے۔ ابھی آپ پوری طرح سے ان کے رنگ بھی نہیں دیکھ پاتے کہ وہ پھر سے اڑ جاتے ہیں۔ وہ رم کردہ دل کو پابہ زنجیر نہیں کرتا بلکہ آزاد چھوڑ دیتا ہے لیکن پھر حیرانی کی بات ہے کہ یہی وحشی شام ٹھہرے پھر بسرام کرنے کو آپ ہی کا پتہ تلاش کر لیتا ہے۔ آپ ہی سے پوچھتا ہے کہ اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے آپ نے اپنے حال میں اس قدر تلخی کیوں بھر دی۔

تجھے جنون ہے کہ دنیا کے پار اتر جائے
حیات تلخ رہے عاقبت سنور جائے
بشر کا خون بہے دیوتا نکھر جائے

مسعود کی شاعری نرمل کومل اور دھیمی دھیمی ہے۔ اس میں آپ کو مدھم پرنم پرنم یہ تصور ملے گا کہ

کبیرا ایسے ہور ہو جیسے نرمل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر کبیر

اور یہ نیر آنکھوں سے اترنے والی وہ ٹھنڈی شبنم ہے جو راتوں کو پچھلے پہر بڑی خاموشی سے تکیوں پر اترتی ہے اور صبح جاگنے والا سوچتا ہے کہ اس کی مالش بھیگی بھیگی سی کیوں ہے۔

مسعود کی چھوٹی چھوٹی غزلیں موتی پرونے والی چھوٹی چھوٹی سویاں ہیں۔ ایسی سویاں اگر کبھی جسم کے اندر چلی جائیں تو پھر یہ شریانوں میں گردش کرنے لگتی ہیں اور جسم میں ان کا سراغ نہیں ملتا۔ سنا ہے اگر یہ شریانوں میں تیرتی رہیں تو ایک دن دل میں جا کر صلیب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور پھر روح کا ایک حصہ بن کر اس کے ساتھ ہی پرواز کر جاتی ہیں۔

میں آج تک تو یہی سمجھتا رہا کہ مسعود ہمارے ساتھ کھیلا کھایا اٹھا بیٹھا سویا رویا ہے۔ یہ کچھ ہماری طرح کا ہی ہوگا اور پھر میں نے اپنا سارا تھیسس بھی اس مفروضے پر قائم کیا ہے کہ وہ ایک قد آور سوچ کا حامل نہیں لیکن اب میں کسی حد تک اس سے خم کھانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ یہ مضمون لکھتے وقت آشوب آگہی دیکھ چکا تھا اور اس پر حاوی بھی ہو گیا تھا کہ معاً میری نظر اس شعر پر پڑی

چارہ گرو دو محرومی کی لذت کا تریاق
پھیل چلا ہے نس نس میں اب خوشحالی کا زہر

اب میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا ہوں اور شاید اس محفل کے خاتمے تک اپنا نظریہ بدلنے پر بھی مجبور ہو جاؤں۔ مسعود کے اس شعر کی جزئیات بزرگانِ دین کے فرمان کے مطابق ہیں کہ جس معاشرے میں دولت آ جاتی ہے وہ ظالم اور بزدل بن جاتا ہے کی تفصیلات اور پرانے حملہ آوروں کا زہر میں تیر بجھاتے ہوئے کورس گانا کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے۔ اس پر حملہ کرو، یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ اور اس سے ماورا کہ شاعر کے ذہن میں نہیں لیکن اس کی سائیکی اگل رہی ہے۔ یہ سارے تصورات موجود ہیں۔ خدا ہم سب کو خوشحال رکھے لیکن خوشحالی کے زہر سے محفوظ رکھے۔

کالے لوگوں کی روشن نظمیں (تبصرہ)

کالے لوگوں کی روشن نظمیں پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ نمائندہ چناؤ خوبصورت ترجمہ اور اندر کی بات کا برملا اظہار...... میں نے امجد اسلام امجد کے ترجے کا وصف بیان کرتے وقت بھی کہا تھا کہ امجد کے ترجے خالص ترجے ہوتے ہیں اور ان کو روانی عطا کرنے کے لیے مترجم نے اپنی طرف سے بھی کوئی روغن استعمال نہیں کیا۔ امجد کی وساطت سے تیسری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے متعارف ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور میں چونکہ انگریزی کے مقابلے میں اردو بہت تیزی سے پڑھ سکتا ہوں اور آسانی سے سمجھ لیتا ہوں۔ اس لیے کم وقت میں بہت سا مواد سمیٹنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور بہت ساری کمیاں تھوڑی سی مدت میں پوری ہو جاتی ہیں۔ میں اور مجھ جیسے اور بہت سے قاری اس تکمیل کے لیے امجد اسلام امجد کے شکر گزار ہیں۔

پہلے زمانے میں افریقہ کی شاعری کا ایک اپنا ہی انگ ہوتا تھا۔ اس کی چھب نرالی اور چھاپ مختلف ہوتی تھی۔ اس وقت تحریری صورت میں زیادہ تر ملتے تھے جو ڈسکوں کے لفافوں پر چھپے ہوتے تھے۔ ان میں انسانوں کا اور انسانوں کے دکھ درد کا قصہ ہوتا تھا جنہیں سن کر بڑی بڑی جبر جنگ روحیں بھی بلبلا اٹھتی تھیں۔ آج کی نیگرو شاعری میں کڑک، گرج اور دھمکی ہے اور بدلہ لینے، خون بہانے اور ظالم کو راہ راست پر لانے کا آہنگ ہے۔

کالے لوگوں کی روشن نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گورے لوگ واقعی بڑے ظالم ہیں اور انہوں نے صدیوں سے کالے لوگوں کو مظلوم و مقہور بنا رکھا ہے اور اس جبر و استبداد سے نجات حاصل کرنے کا سیدھا سارا راستہ یہ ہے کہ گوری قوموں کو ختم کر دیا جائے اور ان سے چن چن کر بدلہ لیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بدلہ لینے کی زنجیر کڑی اندر کڑی طویل ہو جاتی ہے اس لیے کہیں کہیں محبت کا ذکر بھی مل جاتا ہے لیکن ایسے جیسے ٹھوٹھر کے خاندان میں گاؤ تکیے کی باتیں ہوں۔

پتہ نہیں کیوں یہ نظمیں پڑھتے ہوئے میں جگہ جگہ رک جاتا تھا اور اپنے عیش پسند سہل انگار اور خوشحال

ماحول کے پیمانے سے ان شاعروں کا قد ناپنے لگتا تھا۔ میں چونکہ ان شاعروں سے واقف نہیں ہوں اس لیے خدا مجھے معاف کرے، ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا تھا۔ اس کتاب کی پہلی نظم ''خدا کو بتاؤ'' کہ ہر روز دوپہر کے کھانے پر میں اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے کوڑے کے ڈبے سے گندگی کھاتے دیکھتا ہوں۔ گلے ہوئے آلوؤں کے ٹکڑے اور سڑا گلا جیم۔ اسے بتاؤ کہ میں اپنے دل میں ان کے لیے آنسو بہتا اور روتا ہوں کیونکہ میں ان محتاجوں اور مفلسوں سے محبت کرتا ہوں۔ خدا کو بتاؤ کہ..... اسے بتاؤ کہ وہ اپنے آسمانوں کے ابدی سکون سے نکلے اور اس جہنم میں آئے۔

یہ نظم پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اس نظم کا خالق ہینگر ڈبلیو او تھو جینڈ وتنزانیہ کے کسی بورڈ میں ڈائریکٹر ہو یا پبلک ریلیشنز میں کوئی اونچا عہدیدار ہو یا اس کے والد کی کافی پاپنشنز ہوں اور وہ اپنے خوبصورت کمرے میں اعلیٰ درجے کا ہائی فائی میوزک سن کر سگار پیتے ہوئے ایسی خوبصورت نظمیں تخلیق کرتا ہو۔ ہم بھی تو اپنے تخیل اور ذخیرہ الفاظ کے زور پر ایسی نظمیں لکھا کرتے ہیں۔ پھر وہ کیوں نہیں لکھ سکتے۔ لیکن پھر میں لاحول پڑھتا ہوں اور اپنے سر کو جھٹک کر کہتا ہوں، ایسی باتیں سوچنا اچھی بات نہیں۔

ایک اور خوبصورت نظم ہے ''ایجاد کر سکتے ہو تو محبت ایجاد کرو'' لیکن میرا کافر دل اس پر بھی نہیں ٹکتا۔ وہ کمبخت مانتا ہی نہیں کہ جھنڈے دینے والا اور شوشنک لہرانے والا محبت کا درس کس طرح سے دے سکتا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک دکھی دل ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہے کہ آؤ ہم صدیوں کا بدلہ لیں اور پھر لوگوں کو محبت کی تعلیم دیں۔ ان کو پیار سے رہنا سکھائیں۔ آج کی شاعری واقعی بہت سائنٹفک اور ٹیکنیکل ہے کہ رجز خوانی کے پلانٹ کو غزل کی غلام گردش کہہ کر پکارتی ہے اور اس کے دھماکوں کو بوسوں کے بلاسٹ کا نام دیتی ہے لیکن یہ تو میرے کافر دماغ کی پیداوار ہے۔ اس مجموعے میں رحم کی اپیل جیسی نظمیں بھی ہیں اور نغمے کا سفر جیسی بھی اور ''کہیں ایک ایسا جہان ہے'' کے انداز کی بھی۔ ان میں بڑا دکھ، بڑا کرب اور بڑی ہوک ہے جیسے اچیاں لمیاں ٹاہلیاں کے اندر گجری کی سسکیاں اور روہی میں گذرنے کی لاش کے گرد اس کی نحیف ونزار بھیڑیں۔

لیکن اگر آپ کو ترجمے کا مزا لینا ہے تو ''میرا گاؤں کو ابھانیا'' پڑھئے۔ ایک بار دو بار نہیں کئی بار۔ آپ نے ایسا گاؤں نیشنل جیوگرافک میگزین کی تصویروں میں نہ دیکھا ہو تو امجد کے ترجمے میں اس کی رنگین سلائیڈیں دیکھ لیجیے۔

تازہ مکئی اور بڑے بڑے پھل...... جن کا گودا نکال کر ہم لوگ چکوردوں کا رس اور خربوزوں کی کھیر تیار کرتے ہیں اور طرح طرح کے تازہ رس بھرے اور خوش ذائقہ پھل کھاتے ہیں۔

ہم اپنی دودھ والی بھینسوں کو دوہتے رہے۔ میں نے اپنی بھینس کا تھن منہ میں لے کر براہ راست دودھ کشید کیا۔ ہم نے اپنے مٹی کے برتنوں میں بالائی جمع کی اور اسے پھٹے ہوئے دودھ میں آمیخت کیا اور اس کے بعد مکئی کی تازہ روٹیوں کے ساتھ سوروں کی سی اشتہا سے ان سب چیزوں کو کھایا۔ زندگی ان دنوں کیسی

خوبصورت ہوا کرتی تھی۔

ہمارے پاؤں اس دھرتی پر تھے جو ہمارے پرکھوں کی امانت دار تھی۔ ہم قحط سالی کے دنوں میں اس زمین کی اپنے نمکین آنسوؤں سے آبیاری کرتے تھے۔

اور پھر یہ بھی ایک صبح ہی تھی۔ جیسا کہ دستور ہے ہر صبح، صبح ہی کے وقت ہوتی ہے۔ دوپہر، شام یا رات کو نہیں ہوتی۔

''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' مختصر ہونے کے باوصف ایک عظیم کتاب ہے اور ہم امجد اسلام امجد کے ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی شاعری سے روشناس کرایا جس میں پینیج پروگرام دکھ کے ساتھ ساتھ اصل دکھ بھی موجود ہے۔ ایسا دکھ جو ہمارے اصل لوگوں میں موجود ہے لیکن ہم میں نہیں۔ وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے اور ہم اس کو ہر صنف ادب میں بڑی چابکدستی کے ساتھ عیاں کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کیا مزے کی بات ہے کہ ہم ان کے دکھ کو ایکسپلائٹ کر کے اس سے عزت، شہرت، نیک نامی بھی حاصل کرتے ہیں اور آسائش بھی۔ آخر ہم جاہل، بے یارو مددگار اور سیدھے لوگوں کی کون کونسی مہربانیوں کو جھٹلائیں گے! شکریہ

درخواست بنام علامہ اقبال اور غایت پاکستان

جس طرح سے اپنے زمانے کے انسائیکلو پیڈین دقیق مسائل کو قابل فہم انداز میں پیش کرنے کے فن سے آگاہ تھے۔ اسی طرح ہمارے دوست مظفر حسین ایک فکر انگیز مسئلے کو قاری کی آسانی کے لیے چھانٹ چھونٹ کے اور کانٹ کونٹ کے اپنے کتابچے میں ''سطر بند'' کرنے کے اصول وضوابط سے کچھ اس طرح سے واقف ہیں کہ مشکل سے مشکل موضوع تھوڑی دیر تہہ دام پھڑ کنے کے بعد آپ سے آپ رام ہو جاتا ہے اور آپ کو اپنے خصائص اور معائب سے خود ہی روشناس کرانے لگتا ہے۔ یہ فن انہوں نے بڑی بندگی، دردمندی اور رضامندی کے بعد اپنے مرشد حضرت علامہ سے سیکھا ہے کہ وہ فلسفے کے جس بسیط وعمیق کلیے کو ایک سیدھے سادے مترنم اور متحرک شعر کے فریم ورک میں اتار دیتے تھے اسی طرح مظفر صاحب اس شعر کی جزئیات کا مکمل ایک کتاب کے بجائے ایک کتابچے میں کر لیتے ہیں۔ وہ جو میموگراف کا صحیح تشدد ولایت میں مروج ہے اس کی روح کو ہمارے یہاں مظفر صاحب نے ہی پکڑا ہے اور اسے اصل تقاضوں کے ساتھ اردو زبان میں انہوں نے ہی نبھایا۔

ان کا حالیہ کتابچہ ''علامہ اقبال اور غایت پاکستان'' اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے کچھ ایسا نیا نہیں کہ ہم اس کے ہولے سے ناواقف ہوں۔ کچھ کچھ یاد پڑتا ہے جیسے ''قالو بلا'' کے زمانے کی ایک جھلک ادراک اور محسوسات سے بہت پرے ذہن سے لاتعلق سی ہو کر کسی انہونے پردے پر جھلملاتی ہے۔ بس کچھ ایسے ہی یاد آتا ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے مضامین اور اپنے افکار میں ''پاکستان کو عالمگیر نظام اخلاق'' ''عالمگیر نظام سیاست'' اور ''انسان پرور مقاصد'' کے لیے وجود میں لانے کے ایک Spring Born کا درجہ دیا ہے جہاں شمال مغربی ہندوستان کے مسلم مفکر، مسلمان سیاست دان اور مسلم تہذیب وتمدن اور ادب وثقافت کے رہنما دنیا بھر کے پائمال، خوار و پریشان و دردمند انسانوں کو صوبوں کے قصر مذلت سے نکال کر عدل و انصاف اور اخوت ومساوات کے گلستانوں میں آباد کریں اور الخلق عیال اللہ کے اصول کی پاسداری کریں۔ حضرت علامہ نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ

جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔

مظفر صاحب اپنے کتابچے میں کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس حقیقت پر بار بار زور دیا ہے کہ ایک عالمگیر انسانی برادری کی صورت گری کی صلاحیت صرف اور صرف اسلام ہی میں پائی جاتی ہے کیونکہ ایک طرف توحدت الٰہ اور وحدت آدم کے عقائد کی بنیاد پر دنیا کے تمام انسانوں کو برابری کی سطح پر لا کر واحد معیار فضیلت و کرامت تقویٰ کو قرار دیتا ہے اور دوسری طرف اس عالم گزراں کے حالات وواقعات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے فکر آخرت کو انسان کی سوچ کا دائمی عنصر بنا دیتا ہے۔

اسلام کی اس دوطرفہ خصوصیات کا صحیح ادراک مجھے آج سے چالیس برس پہلے ہوا جب میں براڈ کاسٹنگ کی چالاکیوں کا فن سیکھنے امریکہ گیا۔ ہماری نیویارک یونیورسٹی کی پانچویں منزل پر ایک چھوٹا سا کیفے ٹیریا تھا جس میں ایک سلاٹ مشین لگی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے اس بات کا صحیح علم ہوا کہ جس طرح سکہ سلاٹ مشین میں پورے کا پورا داخل ہو کر ثمر بار کھڑکی کھول دیتا ہے اسی طرح سے دین میں بھی پورے کا پورا داخل ہونا ضروری ہے۔

حضرت علامہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کے پاس تازہ ڈھلا ہوا سکہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ جہاں ان کے مضامین، مکاتب، لیکچرز اور افکار کی دنیا میں موجودہ زمانے کے رشتے سے توجہ طلب اور خیال افروز رہنما اشارے ملتے ہیں۔ وہاں ان کے کلام میں اس روحانی سفر کا ایک ایسا تسلسل موجود ہے جو آدم خاکی کو مرد کامل بنا کر اس کائنات کو روشن کرنے اور روشن رکھنے کا امین ہے۔ حضرت علامہ کے کلام میں جا بجا، ہر شعر، ہر نظم اور ہر غزل کے اندر آپ کو جا بجا ایسے ''بابے'' بھی ملتے ہیں جو ذلتوں کے مارے کٹے پھٹے درماندہ لوگوں کو رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس کے دھاگے میں پرونے کا فن جانتے ہیں۔ مظفر صاحب ان بابوں کو خوب پہچانتے ہیں اور ان سے گہری آشنائی کا دم بھرتے ہیں بلکہ اب تو وہ خود باطن کے سفر میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ''پکارتے ہیں تو وہ مڑ کے دیکھتے بھی نہیں''

یہ ڈیرے، یہ درگاہیں، یہ خانقاہیں، یہ زاویے نوعِ انسانی کے روحانی، جسمانی، جذباتی اور نفسیاتی بیماریوں کی علاج گاہیں تھیں جہاں ایک الٰہ واحد کے عقیدے کی بنا پر تمام انسانوں کے درد کا درماں مہیا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کو ایک خاص ضرورت کے تحت کسی ضرورت مند طبقے نے بڑے حسن اور سلیقے کے ساتھ ختم کر دیا اور ساتھ ان کو نام دھر کر ہمیشہ کے لیے بدنامی کی گھاٹیوں میں بھی اتار دیا لیکن اگر اسلام رحمتہ اللعالمین کے صدقے نوعِ انسانی کو رحمتوں سے شرابور کرنے آیا ہے تو مظفر صاحب کو ''غایت پاکستان'' کی مزید وضاحت کے لیے ایک اور رسالہ لکھنا ہوگا جس میں دین کے سکے کا دوسرا رخ بھی اسی وضاحت سے اور اسی تفصیل سے دکھانا ہوگا جس پر کم از کم دوسو سال سے بالکل کوئی توجہ نہیں دی جا سکی۔ اس مدتِ گزشتہ میں

اسلام پر تحقیق اور تدقیق کے تو بے شمار ادارے کام کرتے رہے ہیں لیکن شکستہ دل لوگوں کے درد کا درماں کرنے کے لیے کوئی روحانی شفاخانے فراہم نہ ہو سکے۔ فرض کیجیے آج کسی گاؤں یا کسی محلے سے مظلوم لوگوں کا ایک خانماں برباد گروہ، کاغذی پیرہن پہنے نالہ کناں قاضی حسین احمد صاحب یا پروفیسر طاہر القادری یا ڈاکٹر اسرار صاحب یا غامدی صاحب کے یہاں اپنے دکھ درد کے مداوا کے لیے فریاد لے کر جائے تو وہاں سے ان کو کچھ دینی لٹریچر، کچھ کتابیں، کچھ پمفلٹ اور کچھ رنگین نقشے تو مل سکتے ہیں وہ کندھا نہیں مل سکتا جس پر ماتھا ٹیک کر دیر تک آنسو بہائے جا سکتے ہوں۔

برادرم مظفر تو بڑے حوصلے کے آدمی ہیں اور وہ باخوف اور بغیر کسی جھجک کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان ہندو کے خوف یا ہندو کی نفرت کے نتیجے میں معرض وجود میں نہیں آیا بلکہ توحید کے روحانی اصول کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب اور ایک نئے ورلڈ آرڈر کی تشکیل کے لیے قائم ہوا ہے۔ قدرت نے پاکستان کو ایک نہایت ہی اہم اور مثبت کردار سونپا ہے اور ہمارا منتہائے مقصود ایک عالمی برادری کا قیام ہے۔ یہ کام ہمارے ہاتھوں انجام پانا ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہیں۔

مظفر تو بہادر آدمی ہیں۔ انہوں نے تو حضرت علامہ کی حضوری سے اذن پا کر یہ بات کہہ دی لیکن میرا معاملہ بڑا کمزور ہے۔ میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح پر قائداعظم کا پورا ہاتھ اپنی پشت پر محسوس کرنے کے باوجود ان کے اس اعلان کا ذکر اپنے بچوں سے بھی کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ جب انہوں نے کہا ''مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور اقتصادی نظام اسی طرح سے اپنا لیا تو عوام کی پرسکون خوشحالی حاصل کرنے کے لیے ہمیں کوئی مدد نہیں ملے گی...... ہمیں دنیا کے سامنے ایک ایسا مثالی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے تصورات پر قائم ہو۔''

لیکن باوجود اس کے کہ غایت پاکستان کے بارے میں حضرت علامہ اور قائداعظم کے بین احکام تسلسل کے ساتھ موجود ہیں، ان کو اپنے بیٹے، پوتوں، نواسے نواسیوں پر واضح نہیں کر سکتا کہ وہ کہتے ہیں کہ دادا ہماری نہ کوئی ہیئت ہے نہ شان، نہ قدامت نہ شناخت۔ ہم کس طرح سے دنیا کی امامت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی بزرگواری کے دستِ دعا ہر وقت اوپر اٹھا کر یہ طلب کرتے رہیں کہ خدا آئی ایم ایف کو ہم پر مہربان رکھے اور اڑے تھڑے وقت میں اس کی بدولت ہمارے کام چلتے رہیں۔ ہم نے خودی، خودداری اور خودنگری سے کیا لینا ہے۔

ایران صبحدم اور انقلاب ایران (تبصرہ)

آج سے چند برس پیشتر جب ایران میں ہمارا آنا جانا عام تھا اور ایران کے لچھن ولایت کے لچھنوں سے زیادہ چھنک دار اور لچھے دار تھے، اس لیے سمجھدار اور شریف لوگ ولایت کے بجائے ایران ہی کا رخ کیا کرتے تھے۔ ایران ان دنوں تھا بھی اپنے پورے جوبن پر بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ ان دنوں ایران کا جوبن ہی جوبن تھا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ انہی دنوں ایک روز ملکہ فرح دیبا پہلوی نے بڑی اونچی آواز میں اخباروں کے ذریعے پوچھا ''بھئی خدا کے لیے کوئی ہمیں یہ تو بتائے کہ یہ خمینی کیا چیز ہے۔''

ملکہ فرح پہلوی کی زبانی ہم نے بھی بابا خمینی کا نام سنا اور پھر ملکہ کے شوہر شہنشاہ ایران کی ہمت اور مہربانی سے ہم آیت اللہ خمینی کو بہ نفس نفیس دیکھا اور پھر ریڈیو پر ان کے خیالات سننے کا موقع بھی ملا لیکن بابا خمینی کے آجانے کے بعد پھر ایران جانے کا موقع نہیں ملا۔ سنتے ہیں اب ایران وہ پہلے والا ایران نہیں رہا۔

یہ عہد چونکہ علم کا یا دانش کا یا کشف کا عہد نہیں ہے اور اس میں علم کے بجائے انفرمیشن کی ڈبل ڈبل ڈوزیں پلائی جا رہی ہیں، اس لیے کسی پر کچھ نہیں کھلتا کہ کون کس حال میں ہے اور اس کے اندر کا اصل روگ کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی پسند کی ''انفرمیشن ڈائجسٹو مکسچر'' کی بوتل اپنے بریف کیس میں ڈالے پھرتا ہے اور وقت مقررہ پر اس مشروب آگہی کی خوراکیں اپنے تشنہ وجود میں انڈیلتا رہتا ہے۔

ہم تیسری دنیا کے لوگوں کو چونکہ ایک کامیاب Information Oriented سوسائٹی بنانے کے بعد اب Consumer Society میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس لیے میں سوچ سمجھ کے میدان میں آوا باوا سا رہتا ہوں۔ جن سوالوں کے جواب میری ذات کے کمپیوٹر میں پروگرام کیے گئے ہیں اور جو ہر پڑھا لکھا آدمی گھٹ گھٹ اپنے خطبوں، کالموں اور مکالموں میں بیان کر دیتا ہے، وہ میرے اندر کی خرابی کی وجہ سے ہر مرتبہ شارٹ سرکٹ ہو جاتے ہیں اور مجھ سے بالکل سیدھے اور چالو قسم کے سوالوں کے جواب بھی بن نہیں پڑتے۔ البتہ انقلاب ایران کے بارے میں کہ آیا یہ انقلاب ہے بھی یا نہیں میں پورے طور پر مطمئن ہوں۔

لیکن پیشتر اس کے کہ آپ اس سوال کا جواب خود نکالنے بیٹھیں مجھ سے حکمت کی دو باتیں سن لیجیے۔ یہ وہی حکمت کی بات ہے جو چند حد ے مرزے خان کو نجل نے دی تھی اور جو سینہ بہ سینہ ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ پہلی تو یہ کہ اگر کسی غیر ملک کا ریڈیو تمہارے ملک میں اس صفائی اور وضاحت سے سنائی دینے لگے گویا تمہارے اپنے ملک کا سٹیشن بول رہا ہے تو سمجھ لو کہ اس ملک کی نیت تمہارے بارے میں نیک نہیں ہے اور وہ تم کو تمہاری اور تمہارے لکھوں کی راہ سے ہٹانے کا متمنی ہے۔ اس ذیل میں تین ریڈیو سٹیشن آتے ہیں۔ وائس آف امریکہ، بی بی سی اور ریڈیو ماسکو۔ بی بی سی تو ہمارے اندر کی فضا پر اس حد تک قادر ہو گیا ہے کہ اب مقامی سٹیشن کی طرح میڈیم بینڈ پر بھی آنے لگا ہے۔ یہ تینوں سٹیشن ہر آدھ آدھ گھنٹے بعد طوطے کی طرح منڈیر پر پنجے جما کر اور موکھے سے گردن ہمارے گھر کے اندر ڈال کر ہم سے پوچھتے ہیں "اوئے آرام سکون سے اندر بیٹھے ہو...... (اس بیٹھے ہوئے ہو کے بعد اپنی پسند کی گالی آپ خود لگا لیجیے لیکن وہ گالی اخلاق سے گری ہوئی ہونی چاہیے کہ اوئے آرام سے بیٹھے ہوئے ہو......) آپ کے گھر میں موکھے میں گردن ڈال کر کسی قسم کی Uninvited Suggestion دینے والا کبھی بھی آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ آپ اس کی بات سن لیں لیکن اس کو اپنا دوست نہ سمجھیں۔ دوست وہی ہو سکتا ہے جس کی آواز کبھی ڈوب گئی کبھی ابھر آئی۔ موسم اچھا ہو تو کسی دن تھوڑی سی سنائی دے پھر مہینہ مہینہ چھٹی۔ دیکھئے ہم دوست ہیں اور چونکہ ہمارا ارادہ کسی شرارت کا نہیں اس لیے لندن میں ریڈیو پاکستان کی آواز کبھی سنائی دیتی ہے، کبھی پہنچ ہی نہیں پاتی۔ کبھی تین چار لفظ سمجھ میں آ جاتے ہیں، کبھی غاؤں غاؤں ہی ہوتی رہتی ہے۔ بی بی سی چونکہ دوست نہیں ہے، اس لیے اپنی بات کھڑکا کے سناتی ہے اور اپنا مافی الضمیر وضاحت سے بیان کر کے ورغلاتی ہے۔ اپنی بات ٹھونسنے والا باس ہو سکتا ہے، برادر نہیں۔ چنانچہ یاد رکھئے جس ملک کا ریڈیو سٹیشن آپ کے ملک میں صاف اور واضح سنائی دے، اس ملک کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ ملک آپ کا دوست نہیں اور اس کی بات کا اعتبار نہیں۔

دوسری حکمت کی بات ونجل یہ بیان کرتا ہے کہ جس ملک سے کبھی کسی انقلاب کی اطلاع ملے اور اس انقلاب کو عوام کی حمایت حاصل ہو تو دور بیٹھے بیٹھے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے دونوں سپر پاوروں کے اشارداتِ گرامی پر توجہ دو۔ اگر ایک سپر پاور نے اس انقلاب کو پسند کیا ہے اور دوسری اس کے خلاف ہے تو سمجھو انقلاب نہیں قتلِ عام ہے اور اگر دوسری سپر پاور نے اس کو پسند کیا ہے اور پہلی اس پر نکتہ چینی کرتی ہے تو جبر و استبداد کا نیا کامپلیکس قائم ہوا ہے۔ ونجل کی اس حکمت کی روشنی میں گزشتہ پچاس سال کے اندر ایران کا انقلاب وہ انقلاب ہے جسے دونوں سپر پاروں نے سخت ناپسند کیا ہے اور دونوں نے اس پر اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ دونوں سپر پاوروں کے جگہ جگہ پھیلے ہوئے حاشیہ بردار اسے انقلاب کا نام دینے سے منع کرتے ہیں اور اس کی بات کرنے والوں کو پسماندہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ میں انقلابِ ایران کو اس لیے انقلاب سمجھتا ہوں کہ ہمارے سروں کے دونوں ہی صاحب، دونوں ہی سپر پاوریں اس سے نالاں اور ناراض ہیں اور

اس کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

مشکور حسین یاد بڑا خوش قسمت انسان ہے۔ چونکہ یہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے اللہ اس کو ہمیشہ بڑی بڑی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اچانک ایران پہنچا دیا گیا اور جن باتوں کے بارے میں ہم دور بیٹھ کر ٹیوے ہی لگایا کرتے تھے، ان کو یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا۔ پھر یہ خوش رہنے والا شخص ایسا شکر گزار ہوا کہ اس نے واپس آتے ہی ''ایران صدم'' لکھ کر اس زیارت گاہ کو ایک دستاویزی سپاسنامہ بھی پیش کر دیا۔

مجھے اس کتاب میں مشکور کی شاعری سے وہ بحث مقصود نہیں جو ہم حلقے میں یا ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو بس یہاں اس قدر عرض کرنا ہے کہ سیدھے سادے نارمل اور نیچرل انقلاب کے بیان کرنے کے لیے مضمون آفرینی یا معنی آفرینی کس قدر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو بس......

سیدھی سادی باتیں
جن کو آج کی دنیا والے
سمجھنے سے قاصر ہیں
ان سیدھی سادی باتوں کو
ان کی اہمیت کو'
ان سیدھی سادی باتوں کی خوے آہن
خوئے گلاب وسوسن کو
ارضِ عجم نے سمجھ لیا ہے
کوئی بھی منظر باطل رنگ نہیں ہے
جس جانب بھی
نظریں اٹھتی ہیں
طرح طرح کے معنی سے بھرپور اجالے
استقبال کو آگے بڑھتے ہیں
سیدھی سادی باتیں
یعنی ایک خدا پر یقین کامل
اس کے رسولؐ کی اطاعت
اس دنیا کے بعد آنے والی دنیا کی......تیاری
باقی رہنے والے لامحدود کی تیاری

یہ ایران کا اسلحہ ہے
سیدھی سادی باتیں

یا پھر اس وقت ایران نے عملی طور پر جس اخوت اور باہمی یگانگت کا اظہار کیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے صاحب کتاب نے اس شخص کے دل کی بات کہی ہے جس کی نگاہیں ایک ناقابل یقین نظارے سے متاثر ہو کر حیرت میں تبدیل ہو گئی ہیں کہ

کیا شیعہ کیا سنی
پہلا خواب مسلماں ہونا
پہلا خمار
خمارِ وحدت
پہلا نشہ
نشۂ ایماں
پہلی حقیقت...... جنت
باقی ساری باتیں جھوٹی
کیا شیعہ کیا سنی!
فریادِ ایران! ...... مسلماں ہونا
باقی سارے کام فضول
اور باقی سارے نام فضول

''ایران صبحدم'' نے مجھ پر عجیب الٹا اثر کیا ہے۔ پہلے میں مشکور کے تبحرِ علمی، اس کے اندازِ تدریس اور اس کی نثر کی گھلاوٹ کا قائل تھا۔ اب میں اس شخص کے خلوص، محبت، پُرتاثیر جذبے اور اس کی مجزوبانہ پیش قدمی کا گھائل ہو گیا ہوں۔

میں یہ بات مشکور حسین یاد کے سامنے کہنا نہیں چاہتا کہ اس کا دل مٹھاس اور محبت سے وجود میں آیا ہے لیکن آپ سے ضرور عرض کرنا چاہوں گا کیونکہ آپ اس کا ذکر مشکور سے نہیں کریں گے کہ یہ سارے انقلاب اور یہ ساری شکستیں اور ساری فتح مندیاں دراصل اللہ کے حکم سے ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے، جس طرح سے چاہتا ہے ویسے ہی ہوتا ہے۔ جس بات کو ہم اللہ کا حکم کہتے ہیں، اسی بات کو پڑھے لکھے دانشمند حضرات ''تاریخی عمل'' کا نام دیتے ہیں۔ جس طرح اللہ کا حکم عمل میں آ چکنے کے بعد ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے، اسی طرح اللہ کا حکم عمل میں آ چکنے کے بعد تاریخی عمل والوں پر بھی واضح ہوتا ہے۔ آج تک کسی بھی تاریخی عمل کے بارے میں کوئی پہلے سے اعلان نہیں کر سکا۔ آج تک کسی کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ

پرتگال میں تاریخی عمل کب ہوگا۔ لاطینی امریکہ کا تاریخی عمل کس طرح کا ہوگا اور کون سے سال ہوگا اور ہندوستان میں گزشتہ چونتیس سال سے تاریخی عمل کیوں نہیں ہو پاتا۔ کہاں اٹک کے رہ گیا ہے۔ وہاں کی بھوک ننگ غریبی اور افلاس کا ردعمل اور تاریخی عمل کب شروع ہوگا۔ اصل میں یہ سب کچھ اللہ سائیں کے حکم سے ہوتا ہے اور وہی حاکموں کا حاکم اور شاہوں کا شہنشاہ ہے۔ آئے ہوئے انقلاب اسی کے حکم سے واپس ہو جاتے ہیں اور رکے ہوئے زمانے اسی کے اشارے سے انقلاب میں مقلب ہو جاتے ہیں۔ انقلابوں کو لوگوں کے عمل، لوگوں کی قوت اور لوگوں کے حسن تدبیر کے علاوہ لوگوں کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دعا کے بغیر انقلاب اکثر اپنا راستہ تبدیل کر لیتے ہیں۔ ایرانیوں نے بڑی دعائیں کیں کہ ایران ظالموں کی گرفت سے آزاد ہو کر خوشحال ہو جائے۔ ان کی دعا منظور ہوئی۔ ایران آزاد ہو گیا۔ پاکستانیوں نے بڑی دعائیں کیں کہ پاکستان بن جائے اور ہم ظالموں کے چنگل میں نہ جانے پائیں۔ پاکستان بن گیا۔ پھر ہم نے اپنے زورِ عمل اور حسن تدبیر کے سامنے دعا کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔ آدھا پاکستان واپس ہو گیا...... مجھے یقین ہے ایران یہ غلطی نہیں کرے گا اور اس عطا کو اپنے عمل سے وابستہ کر کے اپنے معطی سے دور نہیں ہو جائے گا۔ کم از کم ''ایران صبحدم'' کے مطالعے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ آگے اس کی مرضی ہے وہ چاہے تو آئے ہوئے انقلاب واپس کر دے اور چاہے تو بے آب و گیاہ بنجر قدیموں کو انقلاب آفریں دبستانوں میں تبدیل کر دے۔

ہندوستان کیا ہے (تبصرہ)

علی محتشم کی کتاب ''ہندوستان ہے کیا'' اصل میں تو بیورلی نکلز کی کتاب Verdict of India کا ترجمہ ہے لیکن میں اسے مترجم کی طبع زاد کتاب ہی سمجھتا ہوں۔ 1944ء میں جب اس کتاب کا مقامی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہوا تو سارے ہندوستان میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہندوؤں کو اس حقیقت افروز کتاب سے شدید جھٹکا لگا اور مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں روشنی کی ایک نئی کرن ملی۔

اس وقت اردو کے اخباروں اور ہفت روزہ جریدوں میں اس کتاب کے کچھ ابواب ترجمہ ہو کر شائع بھی ہوئے لیکن وہ اس قدر دلچسپ اور توجہ طلب نہ تھے جس قدر کہ انگریزی کی اصل کتاب۔ دراصل بیورلی نکلز کا اندازِ تحریر ایک محفل ساز داستان گو کا ہے جس کے بیانیے پر اس کا تخاطب کا رنگ غالب ہے۔ اس کتاب کے ترجمے کے لیے بھی کسی ایسے مترجم کی ضرورت تھی جس کی عبارت میں اس کا ذاتی لہجہ شامل ہو۔ چنانچہ اس کام کے لیے ورڈکٹ آن انڈیا کو علی محتشم سے بہتر اور کوئی مترجم مل ہی نہ سکتا تھا۔ اس نویسندہ کی تحریر کا اعجاز یہ ہے کہ جس نے انگریزی کتاب پڑھی ہے اس کو یہ ایک صاف ستھرا، رواں اور سبک ترجمہ دکھائی دیتا ہے اور جو اس کے انگریزی متن سے ناواقف ہے اس کے لیے یہ اردو کی ایک طبع زاد کتاب ہے۔

مترجم نے کہیں کہیں کسی باب کو تخیلی انداز میں بھی پیش کیا ہے جس سے نفسِ مضمون کی جزئیات نکھر کر سامنے آ گئی ہیں۔ ہمارے یہاں مصوری میں تو ''منی ایچرز'' کا فن اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے مگر ترجمے میں یہ کمال ہمارے بڑوں میں یا مولوی عنایت اللہ دہلوی کے پاس تھا یا اب اتنی مدت کے بعد علی محتشم کے یہاں نظر آیا ہے۔

میری تمنا ہے کہ علی محتشم اپنی ملازمت کے دوران کچھ اور کتابوں کے ترجمے بھی کریں اور اس بات کو ذہن سے نکال دیں کہ ''ریٹائرڈ ہو کر یہ کام کروں گا'' ترجمہ کرنا بڑے جوکھوں کا کام ہے اور اس میں زور لگتا ہے۔ ریٹائر ہو کر انسان زیادہ سے زیادہ اپنی یادداشتیں رقم کر سکتا ہے۔ ترجمہ کا بھاری پتھر نہیں اٹھا سکتا۔

میری ڈھیر ساری دعائیں اس ترجمے اور اس مترجم کے ساتھ ہیں۔

کلیوں کے خواب (تبصرہ)

یہ آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے۔ جب کتابوں کی رونمائیاں نہیں ہوتی تھیں مگر شعر و شاعری کی باتیں ہوتی تھیں اور ایک بابا تھا اور وہاں درگاہ پر ایک شاعر اپنا نیا مجموعہ بابا جی کی خدمت میں پیش کر رہا تھا تو انہوں نے کہا بھائی شعروں کی کتاب چھاپنا تو بس ایسے ہی ہے جیسے شاہی مسجد کے مینار سے کوئی شخص گلاب کی ایک پتی نیچے زمین پر پھینکے اور پھر کان لگا کر سننے لگے کہ اس کا کھڑاک چاروں طرف پھیلا یا نہیں۔ لوگ چونکے کہ نہیں۔ ٹریفک رکا یا نہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس دکھ کا مداوا بھی کیونکر ہو کہ اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے عہد میں ہر ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں سے ڈھائی اور پونے تین فیصد لوگ شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں بلکہ جوں جوں کوئی ملک ترقی کرتا ہے، اسی قدر شاعری اس سے دور ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں آدمی تحیر سے نکل رہا ہے یا نکالا جا رہا ہے، اس قدر وہ شاعری سے، روحانیت سے، معصومیت سے بلکہ انسانیت سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس وقت سارا جہاں فکر و تدبر کے گہرے کنوئیں میں غوطے لگا کر اپنے سوالوں کے جواب جمع کر رہا ہے اور ''الاقلیما'' کے اعلان کو غلط ثابت کرنے میں مصروف ہے۔ حتیٰ کہ اس عہد کا شاعر بھی اپنی شاعری میں حق بات اور سچ بات کا اعلان کر کے ہر ایک کو جھڑکیاں سی دیتا پھرتا ہے اور ہر پڑھنے اور سننے والے کی چھنگری پھل کر کے اسے گھر بھیج رہا ہے۔ مگر ہمارے یہاں کچھ شاعر ابھی تک باقی ہیں جو معصومیت کے تحیر میں گم ہیں اور ان میں سے ایک نرگس شیخ ہے اور نرگس شیخ کی سادگی کی سب سے بڑی دلیل اس کے نام کے ساتھ شیخ کا لفظ ہے جسے شاعری کی دنیا میں ہمیشہ جھیڈ مسخری کے ساتھ ہی یاد کیا گیا ہے۔ حالانکہ اکاؤنٹس، بینکنگ، ڈیل، بارٹر، کانٹریکٹ اور انٹرپرائز کی دنیا میں یہ بہت ہی محترم القاب اور بڑی ہی قابلِ احترام ہستی ہے۔

عالمِ حیرت میں گم اور نرگس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی شاعری اس کی ذات پر وارد نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ جس طرح خواتین اپنی رعنائی کو اور اپنے چہروں کو اپنے وجود پر وارد کرتی ہیں اور وہ ان کی ذات کا حصہ نہیں ہوتے یا جس طرح ہم دانشور لوگ علم و دانش کے باز کو چرمی تسمہ ڈال کر اپنے

بازوئے مرد افگن سے چمٹا کے رکھتے ہیں یا جس طرح عبادت گزار لوگوں کے وجود کسی وقت عبادت کے اندر ہوتے ہیں اور کسی وقت باہر...... تو نرگس کی شاعری ایسی پورٹیبل اور Datachable نہیں ہے۔ یہ ایسی سیدھی، احمق، صاف، بھولی اور اناڑی سی لڑکی ہے کہ ہر وقت شاعری کی سرتی میں غرق رہتی ہے۔(سرتی ہماری سندھی زبان میں بازی لے جانے اور برتری حاصل کرنے کی کیفیت کو کہتے ہیں)

کچھ لوگ اس دنیا میں میڈیم کی حیثیت سے آتے ہیں اور ان پر کسی شے کا سایہ ہوتا ہے۔ وہ یوں تو عام زندگی میں سیدھے سادھے، الہڑ للنا ہوتے ہیں لیکن جب بات کرتے ہیں تو ہمیشہ ٹرانس کی کیفیت میں کرتے ہیں۔ نرگس شیخ پر بھی شاعری کا سایہ ہے اور یہ ساری ہم کلامی اور یہ بشارتیں اور دیدار کی لذت اس کو شانِ کریمی کے دربار سے عطا ہوئی ہے ورنہ اتنی چھوٹی سی لڑکی کی چھوٹی چھوٹی کلیوں کے خواب اس قدر آشنا نہ ہوتے اور ان میں جان کاری کا ایسا رنگ نہ ہوتا۔

خواتین کی شاعری عام طور پر حرماں نصیبی اور رنج و غم کے اظہار سے آگے نہیں بڑھا کرتی۔ ان کا تخیل اپنی سسکیوں کی ڈسکار میں ہی بھونرے کی طرح گھومتا رہتا ہے لیکن نرگس شیخ اپنی شاعری کی نیند میں چلتی چلتی جان کاری کی آخری منزل یعنی پیراڈ سیکل اظہار کی وادی تک پہنچ گئی ہے" حرف و صوت کے ہاتھوں میں کہاں آتا ہے۔ والی ساری غزل اس سفر کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ تو معلوم ہے اک دن اسے آنا ہوگا
دل کیوں انجانے سے اک خوف سے گھبراتا ہے
ساتھ چلنے کی تمنا ہے تو دوگام تو چل
تو تو ہر گام پہ کچھ سوچ کے رک جاتا ہے

اور

اس کو بھی گلہ ہے کہ میں کچھ سوچ رہی ہوں
مجھ کو بھی شکایت ہے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے
کچھ تنگی بھی واستہ تھی گو سوچ سے تیری
لوٹ آنا ترا دل کو بہت اچھا لگا ہے

اور

اڑا کے لے گیا وہ نیند میری آنکھوں سے
اداس کر گیا اک شخص مسکرا کے مجھے
سمجھ رہی تھی جسے بے نیاز میں نرگس
وہ شخص دیکھ رہا تھا نظر بچا کے مجھے

نرگس شیخ کی نعتیں، منقبتیں اور سلام پڑھ کر اس شاعرہ کے رُخ کا پتہ چلتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس نے کہنے کی غرض سے کہی ہیں اور اس کی منزل وہ نہیں ہے جو ہم لکھنے والوں کی عام طور پر ہوتی ہے۔ مجھے تو اس کے ارادوں سے ابھی سے خوف آنے لگا ہے کہ:

شہ رگ کی بات چھوڑ یہ سب کا نصیب ہے
مجھ کو تو قرب خاص دے اور انتہائی دے

برسوں سے دھو رہی ہے قرینے سے میری سوچ
وہ لفظ جس کا لمس نم پارسائی دے

نرگس بصارتیں بھی، سماعت بھی، اس کے نام
دل میں بھی اس کا نام دھڑکتا سنائی دے

ایسی محفلوں کے لیے ایسے مضمون لکھتے وقت اور اپنے بچوں کی تحریریں پڑھنے کے بعد خوف بھی آتا ہے، حسد بھی پیدا ہوتا ہے اور شرمندگی کا احساس بھی جنم لیتا ہے لیکن نرگس شیخ کی اس انجمن سے میں بڑے دکھ کے ساتھ نکل رہا ہوں کہ اس کو تو نم پارسائی عطا کرنے والا لفظ نصیب ہو گیا اور ہم اس لفظ سے کتابی طور پر ہی آشنائی حاصل کرتے رہے اور آگے بھی جب تک جینا ہوگا اکیڈمک جینا ہوگا اور بقیہ جس قدر زندگی ہوگی کتابی زندگی ہی ہوگی......

لیکن کچھ بزرگوں کا بیان ہے کہ بچے بھی اپنے بڑوں کی سفارش کر سکتے ہیں اور بچوں نے بھی بڑوں کو راستہ عطا کیا ہے۔

شہادت گہہ الفت (تبصرہ)

اردو ادب کا یہ عہد سفرناموں اور سیاحت ناموں کا عہد ہے اور مختصر افسانے کے بعد آج کے اردو ادب میں جو چیز ہمیں نمایاں نظر آتی ہے وہ سفرنامہ ہی ہے۔ گو تعداد کے حساب سے ہمارے سفرنامے قلیل ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے دراز قامت، نظر فریب اور بے حد قابل توجہ ہیں۔ اب تک اردو میں جتنے بھی سفرنامے لکھے گئے ہیں وہ اگر سارے کے سارے نہ سہی تو بیشتر غیر ملکی سیاحتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے سفرناموں سے ہمارا قاری لطف اندوز تو ضرور ہوتا ہے لیکن پورے طور پر نہیں۔ جغرافیائی طور پر یہ الگ الگ منطقوں کی بکھری ہوئی داستانیں ہیں۔ ان میں قاری کے لیے دلچسپی کا سامان تو ہے لیکن اپنائیت نہیں۔ فن کی خوبصورت بنت نظر آتی ہے لیکن مانوس مٹی کی خوشبو نہیں۔

کیپٹن ریاض انجم کا ''شہادت گہہ الفت'' ایک ایسا رپورتاژ ہے جو شروع سے آخر تک زمینی اور جغرافیائی اور روحانی اور جذباتی طور پر اور فنی اور تکنیکی اعتبار سے پاکستان میں رہنے، بسنے، چلنے پھرنے، گھومنے، رکنے والے کی روداد ہے۔ مصنف نے اس روداد کو پرانے کلاسیکی انداز میں پیش کیا ہے اور بالاکوٹ سے لالہ زار تک کے پیدل سفر کی داستان ان خطوں کے ذریعے قاری کے ذہن سے گزاری ہے جو ایک پیدل مسافر نے اپنے قائم بالذات ڈیئر جاوید کو لکھے ہیں۔ ان خطوں کے اندر ہر پڑاؤ سے کوچ کی خبر ملتی ہے اور ہر کوچ میں آگے آنے والے پڑاؤ کی خوشخبری جھلکتی ہے اور مصنف جو سرتاپا پاکستان کی محبت میں شرابور ہے۔ اس پڑاؤ اور کوچ کے درمیان ایسی پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے جن سے مصنف کا اور اس کے ہم وطنوں کا اس ملک کے مستقبل سے رشتہ استوار ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ مصنف اپنی کوتاہیوں اور اپنے ہم وطنوں کی زیادتیوں کا احتساب کرتے ہوئے کچھ سخت قسم کی سرزنش بھی کر دیتا ہے، تاہم وہ اپنے ملک کے اور اپنے پیاروں کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اچھی بلکہ بہت ہی اچھی کوشش ہے۔ اس نوعیت کے اور بہت سے سفرنامے لکھے جانے چاہئیں جن میں اپنوں کی اپنوں سے باتیں اور اپنی سرزمین کی باتیں ہوں۔

ادب کے میدان میں آگے چل کر ہم کیپٹن ریاض انجم سے اور بہت سی توقعات رکھتے ہیں۔

رفیق اظہر (تبصرہ)

رفیق اظہر نے اتنی چاہت اور محبت سے مجھے اپنا مجموعہ کلام پڑھنے اور پھر اس کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ حالانکہ تب میرے دل میں خطرے کی ایک بتی سی جل اٹھی تھی کہ اپنی بے مقصد مصروفیات کی وجہ سے میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکوں گا۔ بہر حال میں نے اس مجموعے کو جستہ جستہ دیکھا تو کہیں کہیں رک بھی گیا اور شعر کو پھر سے پڑھا اور لطف اٹھایا اور میرے نزدیک اچھا شعر وہی ہے جسے پڑھ کر آدمی پل بھر کو تھم جائے اور پھر اس کے بعد کی کیفیات کا بیان کرنا آسان نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب رنگ باتیں کرتے تھے، خوشبو دکھائی دیتی تھی، موسم بدلتے تھے تو محسوس ہوتا تھا جیسے جہان تازہ تخلیق ہو رہا ہو مگر پھر زندگی دو جمع دو کے چکر میں ایسی الجھی کہ سوچ مکڑی کا جالا ہو کر رہ گئی جسے منفعت کی مکھیوں کو شکار کرنا تھا اور بس...... اس کے علاوہ مشینوں کی رفتار نے بھی ذہنوں کے سکون کو چیر کے رکھ دیا۔ ایسے میں شعر نے بھی اپنا چولا بدلا اور زندگی کے دوسرے رویوں کے بھیانک پن سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی۔ لفظوں کی توڑ پھوڑ، مفاہیم کی بے حرمتی اور مروجہ بحور کی شکست و ریخت کو جدت کا نام دیا گیا مگر......

رفیق اظہر نے کچھ دوسرے سچے اور سچے شاعروں کی طرح ایسی جدت کو منہ نہیں لگایا، انہوں نے مروجہ بحروں میں ہی شاعری کی اور خاص طور پر چھوٹی اور مترنم بحروں کو اختیار کیا۔ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا عام طور پر بہت مشکل خیال کیا جاتا ہے مگر رفیق اظہر نے انہی بحروں میں عمدہ شعر کہہ کر اپنی فنی پختگی کا دلنواز ثبوت فراہم کیا ہے۔

بظاہر رفیق اظہر کا کینوس محدود ہے۔ انہوں نے زیادہ تر پہلی پہلی محبتوں کی کیفیتوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے لیکن اگر ڈوب کر سوچا جائے تو زندگی کی ساری وسعتیں اور جہتیں انہی حدود میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔

سادگی رفیق اظہر کا وصف خاص ہے۔ انہوں نے خاصے دلنشین مناظر بڑی سادگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالے ہیں، ان کے اس مجموعے کو دیکھ کر امید کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ اس شوق اور لگن کے ساتھ ریاضت شعر کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب شعر نواز حلقوں میں ان کا نام ایک مقام کا حامل ہوگا۔

ظہوری قصوری اور اس کی نعتیں

کچھ لوگ شروع ہی سے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ انہوں نے کچھ محنتیں یا کوششیں اور کمائیاں نہیں کی ہوتیں فقط اپنی خوش نصیبی کی چادر اوڑھی ہوتی ہے جس کے سہارے وہ مشقت کی مشکل ترین وادیوں سے بڑے اطمینان سے گزر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی بس ایک ہی خوبی ہوتی ہے کہ یہ ماننے والے لوگ ہوتے ہیں اور جب کسی کو ایک مرتبہ مان لیتے ہیں تو پھر زندگی کے آخر دم تک تسلیم کے حلقے میں ہی رہتے ہیں۔ ظہوری بھی انہی خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ہے جو اولوں اور سابقوں کی پیروی میں ماننے والوں کے گروہ سے جڑا ہوا ہے۔ گو فاصلہ دور کا ہے لیکن رشتہ بہت ہی قریب کا ہے۔ اس کی پکار کا لحن اور اس کی صدا کی دلسوزی وہی ہے جو اپنے آقا سے غلامی کی نسبت پیدا کر لینے کے بعد ہر متعلق کا طرۂ امتیاز بن جاتی ہے۔

آج سے چند برس پہلے جب میں محمد علی ظہوری سے قصور میں ملا تھا تو یہ ایک نعت خواں تھے اور ان کی آواز کا سحر فقط ان کی عقیدت کے رشتوں سے بندھا تھا۔ اب یہ خود نعت کہتے ہیں اور اسی محبت اور عقیدت کے سہارے کہتے ہیں جس نے ان کو ہم سب کے درمیان خوش قسمتی کی چادر اوڑھا رکھی ہے۔ نعت کہنا، نعت لکھنا اور نعت پڑھنا بڑے مقدر والوں کا کام ہے۔ بڑے بڑے اونچے درجے اور اعلیٰ پائے کے شاعر گزرے۔ سارے اصناف سخن کا احاطہ کیا لیکن نعت نہ لکھ سکے۔ چھوٹے چھوٹے، سیدھے سادھے فن ناآشنا شاعروں نے نعت کے قدموں میں اپنے کچے گھر، ناپائیدار وجود اور بے حیثیتی کی ساری دولت ہاتھ باندھ کے ڈال دی اور مقبول ہو گئے۔ یہاں بھی سرخرو آگے بھی پاس۔ یہاں بھی خوش آگے بھی بامراد۔

محمد علی ظہوری کی نعتیں جن کے عظیم نمونے یا فصاحت و بلاغت کی کانیں نہیں ہیں کہ ان پر ادبی زاویئے سے آڑھی ترچھی روشنی ڈالی جائے۔ یہ تو عجز و نیاز اور انکسار کی دست بستگیاں ہیں جو محبوب کے پسند خاطر ہو جائیں تو فقیریاں شاہیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ نگاہ میں نہ آئیں تو غلاموں کی فہرست میں اندراج کا اذن ضرور بن جائیں۔ یہ نعتیں اونچے محلوں اور روشن ایوان کے لیے نہیں۔ وہاں پڑھی جانے والی نعتیں بھی بڑی بابرکت اور فضل و کرم کی مرجع ہوتی ہیں۔ وہ بھی فزونیٔ نعمت کا باعث ہوتی ہیں لیکن ظہوری کی نعتیں میرے

آپ کے ہمارے محلے، ہمارے گلیارے، ہمارے کوچے کی عرض گزاریاں اور بنتیاں ہیں جو ہمارے ذہنوں کے بجائے ہمارے دلوں میں جنم لیتی ہیں۔ ان سے ہم اپنی تاریک راتوں کو اجالتے ہیں اور انھی کی بدولت اپنی ذات کی سیپوں میں پریم کا موتی پالتے ہیں۔

یہی خوش نصیب لوگ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، دولت دنیا اور دولت دین سمیٹنے والوں کی محفل میں جب کبھی آتے ہیں تو منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ کچھ رعب بزرگی کی وجہ سے اور کچھ پاس ادب کی بنا پر لیکن اگر کوئی ان کی خاموش آنکھوں کی تحریر پڑھ سکے تو اتنا ضرور سمجھ جائے کہ

اور مانگو نہ ظہوری کوئی بس اس کے سوا
اپنے اللہ سے اللہ کا پیارا مانگو

اندھیرا اُجالا

''اندھیرا اجالا'' پاکستان ٹیلی ویژن کی وہ طویل ترین سیریز تھی جو اپنے انداز اور نفس مضمون کے اعتبار سے بہت ہی کامیاب رہی۔ آپ نے ان ڈراموں میں سے بہت سوں کو ٹیلی ویژن پر دیکھ کر پسند کیا ہوگا لیکن اس وقت جب آپ ان کو پڑھیں گے تو ان ڈراموں کے وہ باریک پہلو بھی آپ پر عیاں ہوں گے جن پر آپ کی نظر تب نہیں گئی تھی۔

پولیس کا محکمہ اگر ہمارے یہاں کی مقدس گائے نہیں تو اس معاشرے کا ''مرکھنا بھینسا'' ضرور ہے جس کو کسی طرف سے بھی ہاتھ ڈالنا اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا کر کے رکھنا ہے۔ ہمارے ملک میں مختصر سی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند گوروں نے صرف محکمہ پولیس کے زور پر یہاں دو سو برس تک حکومت کی اور جاتے وقت ہم کو اس محکمے کے ہاتھ گروی رکھ گئے۔ یونس جاوید نے کمال جرأت کے ساتھ اس محکمے کے پرت اتار کر نہ صرف ہم کو اس سے روشناس کرایا ہے بلکہ خود محکمے کو بھی پہلی مرتبہ اس کی کارگزاری سے متعارف کرانے کا موقع فراہم کیا۔ اس سیریز کے دیگر اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنی پیش قدمی میں نہ تو محکمہ پولیس سے کوئی شوخی کی اور نہ ہی کسی گستاخی کا موجب ہوا۔ نہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے خم ٹھونک کے پولیس لائن میں داخل ہوا اور نہ کسی قسم کے دیرینہ حساب چکانے کی کوشش کی۔ ایک عام خیال تھا کہ مصنف ڈرامے کی صنف کا سہارا لے کر ٹی وی میں کالم نویسی شروع کر دے گا اور پھر جس جس کو چاہے گا ٹکٹکی پر کستا چلا جائے گا لیکن شکر ہے کہ ڈرامہ نگار نے اپنا رول تبدیل نہیں کیا۔ وہ شروع سے آخر تک تمثیل نگار ہی رہا۔

اس دنیا میں اظہار کے انداز کتنے بھی کیوں نہ بدل جائیں، ایک کامیاب اور اچھے ڈرامے کی گرفت اس کے مکالموں میں ہی محفوظ ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اچھی ڈائریکشن، خوبصورت ادائیگی، گہری کیفیات اور لطیف محسوسات کی ترجمانی کے مقابلے میں اپنے مکالموں سے کھلنے والا ڈرامہ زیادہ بامعنی اور زیادہ توجہ گیر ہوتا ہے۔

''اندھیرا اجالا'' کے مکالمے ان ڈراموں کا بڑا ہی مضبوط نکتہ ہیں جن کی ادائیگی میں یوں تو ان ڈراموں کے سارے ہی کردار داد کے مستحق ہیں لیکن ''جعفر شاہ'' اور ''ڈائریکٹ حوالدار'' تو جھنڈی ہی جیت کے لے گئے۔ جب آپ یہ ڈرامے پڑھیں گے تو آپ کو یاد آ جائے گا کہ یونس جاوید نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی شعوری کوشش کے بغیر ڈرامہ نگاری کے سب سے بڑے عمل کو راہ دے کر ان تمثیلوں کو بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ ڈرامے کی بنیاد کہانی ہو۔ کسی خاص کردار کی عکاسی ہو۔ مکالمہ بندی ہو یا مصنف کے فلسفے یا اس کے ''سخن'' کی ترجمانی ہو، ڈرامے کے ''بڑا ڈرامہ'' بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کردار ناظرین کی موجودگی میں بلاواسطہ طور پر ایک دوسرے سے بات نہ کریں بلکہ ان کے مکالمے پہلے ناظرین کو پہنچیں (خواہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی حد تک ہی پہلے پہنچیں) اور پھر اس کے مخاطب کو موصول ہوں۔ مثلاً اگر کردار الف کردار ب سے مخاطب ہو تو اس کا فقرہ ناظرین میں سے ہو کر ''ب'' کو پہنچے اور جب ''ب'' اس کا جواب دے تو اس کا فقرہ پہلے ناظرین کو صوتی اثر کی طرح چھو کر پھر الف تک پہنچے۔ گویا کرداروں کی آپس کی گفتگو میں ناظرین کا چینل قائم رہے۔ جہاں یہ چینل قائم نہیں رہتا وہاں فقرے فقروں سے باتیں کرنے لگ جاتے ہیں اور ان کے ادا کرنے والے سارے کردار مردہ ہو جاتے ہیں۔ ''اندھیرا اجالا'' کے یہ ڈرامے آپ کو اس وجہ سے اتنے پسند آئے کہ ان میں یہ چینل مستقل طور پر قائم رہا اور ''جعفر شاہ'' کا ہر فقرہ پہلے آپ تک پہنچ کر پھر اپنے مخاطب کو موصول ہوتا رہا۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بعد کے آنے والے ادیبوں میں چند بہت ہی اچھے ڈرامہ نگار پیدا ہوئے جنہوں نے تمثیل کی دنیا میں وہ خلاء پُر کیے ہیں جو ہم سے ہماری پوری کوشش کے باوصف بھرے نہ جا سکے تھے۔ ان ڈرامہ نگاروں میں یونس جاوید کا بہت اونچا مقام ہے جن کے ساتھ اردو ڈرامے کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

نور کا سفر (تبصرہ)

شروع شروع میں جب سفر نامہ حیطۂ تحریر میں لایا گیا تو غالباً اس کا مقصد ''نئی دنیاؤں'' کے بارے میں اپنے ہم وطنوں کو معلومات فراہم کرنا تھا۔ اس دور میں دو چار منزلوں کی مسافت کے بعد ہی ایک نئی دنیا کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اب جبکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ پوری دنیا ایک بستی کا روپ دھار گئی ہے، سفر نامہ صرف جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی کتاب نہیں رہی۔ اس میں اور بہت کچھ شامل ہو گیا ہے۔

اب سفر نامہ لکھنے والا محض بیرونی مناظر کا حال ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اپنی کیفیتوں کی نگاہ سے حالات کے صد رنگ فوٹو بھی اتارتا جاتا ہے۔ ایسے مرقعوں میں دیکھی ہوئی جگہ بھی ایک نئے زاویئے سے نظر آنے لگتی ہے اور اس کی وسعت اور بزرگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

حج کے سفر سعید کا معاملہ اس سے بھی مختلف ہے۔ جب ایمان کی روشنی سے منور کوئی مسافر اس سفر پر روانہ ہوتا ہے اور واپس آ کر بھی ایک مدت تک اس سفر کی نورانی کیفیات کی بارش میں شرابور رہتا ہے تو وہ ان کے تذکرے سے خود بھی لطف اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنے حال میں شامل کرتا جاتا ہے۔

ناصر قریشی کا یہ سفر نامہ کچھ ایسی ہی کیفیات کا حامل ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ اس نے اس سفر میں ناصر قریشی کی انگلی تھام رکھی ہے اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا ہے۔

نور کے اس سفر میں بہت سے ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں مصنف اپنے قاری کی صرف ''آسٹرل باڈی'' (Astrol Body) کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں الفاظ محسوسات کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں اور جہاں ناصر ایک عاجز گداگر کی طرح چوکھٹ سے لگا تحیر کی دنیا میں دوش تا کمر ڈوب چکا ہے۔

ناصر قریشی نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ کچھ مضمون بھی رقم کیے ہیں اور چند توجہ طلب ریڈیائی

تحریریں بھی اس کے کریڈٹ پر ہیں لیکن جو مُبہم بات اس نے اپنے اس رپورتاژ میں بیان کردی ہے وہ اس کا حصہ ہوکر رہ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ قارئین کے دلوں میں کرنیں بکھیرنے کا باعث ہوگا اور ناصر کے لیے وجہِ نجات۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران ناصر قریشی نے جس طرح سے میری دیرینہ کوتاہیوں کے چند تاریک گوشے روشن کیے ہیں اللہ انہیں اس کی جزائے خیر دے...... آمین!

ارشد میر

ایس دنیا وچ سب توں آسان شے ای سب توں مشکل ہندی اے۔ غسلخانے وچ نہاندے ہوئے ہتھوں تلکے صابن نوں پھڑنا زندگی دا سب توں اوکھا کم اے۔ گھوناجیہا ڈاہڈھی ای نہیں دندا!......ارشد میر مینوں بڑا ہی حیران کردا اے۔ جدوں اوہ ایس سڑے بلے تتے اگ زمانے وچ ہاسیاں دے غبارے تے نچکراں دے بلبلے بنا بنا کے سانوں سوکھیاں کرن دی کوشش وچ لگا رہندا اے۔ کسے نوں خوش کرنا یاں سوکھیاں کرنا بڑا ای اوکھا کم اے۔ لوکاں ایسے کر کے جنگاں تے لاماں وانڈھ لایا کیوں جو اوکھیاں کرنا تے خدائی نوں اوکھ وچ رکھنا اسان کم سی تے چھیتی ہو جاندا سی۔

جدوں میں ایناں مضموناں نوں پڑھیا تو ہسن دے نال نال اصل وٹے وی بڑے کھادے۔ ''گدڑ'' نوں میں پہلاں وی جاندا سی تے ''پتو'' نال میری اگے وی یاری سی۔ پر اینی ڈونگھی نہیں سی۔ ایناں مضموناں توں پورا پورا سواد لین لئی تہانوں اپنے اندر دے کئی گدڑ تے اپنی ذات دے کئی پتو پھڑ کے نال بہانے پین گے تے اوہناں نوں اپنے مطالعے وچ شامل تفتیش کرنا پئے گا۔

پنجابی زبان وچ ایسی شرارتی لخت ایتوں پہلاں میری نگاہ توں نہیں گزری۔ اک واری مڈھ توں لے کے آخر تک ایہہ کتاب آپ پڑھی، فیر بانو نوں سنائی۔ اخیر اسیں دونویں ایس نتیجے تے اپڑے بئی ایس ملک وچ ہسن دا تے کھلیاں مارن دا تے صدر مملکت نہ بنن دا ہر ایک نوں پورا پورا اختیار اے بشرطیکہ اوہ صدر مملکت بنن دی خواہش نہ رکھدا ہووے۔

ارشد میر ایناں مضموناں دی راہیں بڑے بڑے اوکھے دلاں وچ بڑی آسانی نال اتر جائے گا تے کئی انجان لوک ایس جانکاری تے متر تا دی ڈور وچ نیڑے نیڑے ہو کے پروئے جان گے...... گورے آہندے نیں پئی جیڑے بھونکدے نیں اوہ وڈدے کدے نہیں ٹھیک ہووے گا۔ سچ ہووے گا۔ پر میرا تجربہ ایہہ ہے کہ جیڑے وڈھدے نہیں اوہناں دی پبلک ریلیشنگ بڑا ای کمزور ہندی اے...... بندا اوندی نہ وڈے چو ہندی تے وڈے۔

''نقوش کا طفیل نمبر''

زندگی کی اس طویل مدت میں طفیل صاحب کے ساتھ کوئی اڑتیس برس کا یارانہ رہا لیکن اس کے اولیں حصے میں، یعنی پہلی دہائی کے آخری برسوں میں (یا اس سے بھی قدرے بعد) پورے تیس برس تک ان سے کچھ خفگی رہی۔ خفگی کیا اچھی خاصی ناراضگی رہی۔ اچھی خاصی ناراضگی ان معنوں میں کہ ان کے ساتھ سلسلہ کلام بند رہا۔ اس عرصہ میں کچھ رقعہ بازی البتہ ہوئی لیکن ان کا مضمون بھی واحد تھا کہ مہربانی فرما کر مجھے خط نہ لکھا کریں اور اس خط و کتابت کو طول نہ دیں۔ میں نے تو اس پر سختی سے عمل کیا لیکن طفیل صاحب خطوط نویسی سے باز نہ آئے اور ہر بات کی باقاعدہ اطلاع دیتے رہے۔ اس دورانیئے کا سب سے مشکل وقت وہ ہوتا تھا جب گرمیوں میں ان کی آم پارٹی کا دعوت نامہ آتا تھا اور مجھے اس میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ میں ان سے بات نہیں کرتا تھا، صرف آم کھاتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بات نہیں کرتے تھے، صرف کاٹ کاٹ کے آگے رکھے جاتے تھے۔ میں چونکہ ان متکبر لوگوں میں سے ہوں جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا کرتے۔ اس لیے میں نے تجدید کلام میں پہل نہ کی۔ وہ چونکہ ماننے والے لوگوں میں سے تھے، اس لیے ایک روز میرے گھر آ کر سارا قصور اپنے ذمے ڈال کر مجھے منا کر چلے گئے۔ میں چونکہ ظالموں میں سے ہوں، اس لیے آخر دم تک قصوروار انہی کو گردانتا رہا۔ اپنی طرف سے معافی مانگنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لیے سلسلہ کلام بند کر کے چلے گئے۔ اب جو نقوش کا طفیل نمبر نکلا ہے تو خیال آتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے کتنا بڑا آدمی چپ چاپ آگے چلا گیا۔ یہ چپ چاپ آگے چلے جانا طفیل کے مزاج کا بنیادی خاصا تھا۔ وہ زندگی میں بھی جب سب لوگوں سے آگے نکلا تو اسی طرح خاموشی سے اور نرم مزاجی سے آگے نکلا ہے۔ ڈھول بجا کر اور جھنڈے ڈال کر اور للکار کر آگے نہیں نکلا۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے ہی ہم سب سے زیادہ کامیاب ہو گیا اور ہم میں سے کسی پر بھی بوجھ نہ پڑا۔ دراصل ترقی اور کامیابی محمد طفیل کا وہ لباس تھی جسے وہ پہن کر ہی سوجا تا رہا۔ اس کی استری ٹوٹتی رہی اور اس پر شکنوں اور سلوٹیں کے اتنے گہرے نشان پڑتے رہے کہ حلقہ یاراں میں ہم سب اس کے مقابلے میں زیادہ کلف یافتہ رہے۔ اگر آپ نے کبھی میجر کے بیٹ مین کو صاحب کی وردی سائیکل پر لاتے دیکھا ہو تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح سے

واضح ہوسکتی ہے کہ بیٹ مین کا بایاں ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر ہوتا ہے۔ دائیں ہاتھ میں ہینگر کا سوالیہ نشان پکڑا ہوتا ہے۔ ہینگر پر کلف شدہ وردی ہوتی ہے۔ وردی سر سے بلند بلکہ سارے ٹریفک سے بلند ہوتی ہے۔ پہنچنی میجر کو ہوتی ہے لیکن سینہ بیٹ مین کا اکڑا ہوتا ہے۔ آدھا پیڈل مارتا ہے اور پورے پیڈل والوں کا راستہ کاٹ کے Bea line بناتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اعزاز سارا طفیل کا اپنا ہوتا تھا لیکن عزت ہمیں عطا کیے جاتا تھا۔ کام وہ کرتا تھا، نام ہمارا چلتا تھا۔ میں نے اس جیسا عجیب وغریب آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ پڑھا ضرور ہے لیکن پڑھے ہوئے اور ملے ہوئے میں بڑا فرق ہے۔

ہمت اور کوشش اپنی جگہ، جدوجہد اور سعی کا اپنا ایک مقام، لیکن یہ کامیابی کے ضروری عنصر نہیں ہیں۔ اس دنیا کے کروڑ ہا انسان السر کروا کے بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس وقت زندہ میں ایک چھوڑ دو دو تین السر لیے پھرتے ہیں لیکن کامیابی ان سے ابھی تک کوسوں دور ہے۔ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کی منتظم بیوی کی سنبھال کے رکھی ہوئی چیز کو ڈھونڈنا مشکل ہے اسی طرح یہ راز پانا بھی بہت مشکل ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کا فارمولا کیا ہے۔ بس جسے اللہ دے اس معاملے میں طفیل مرحوم بہت ہی خوش نصیب تھے اور اس عطا کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ کہتے تھے میں کوشش، محنت، جدوجہد، مشقت بالکل نہیں کرتا بس ہمت نہیں ہارتا میں نے پوچھا وہ کیوں؟ کہنے لگے، ہمت چھوڑ دینے سے روح پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ مجھے چہرے کی جھریاں قبول ہیں لیکن روح کی جھریاں میری برداشت سے باہر کی چیز ہیں۔

چند برس پہلے میں ایک بزرگ سے ملنے چوہاسیدن شاہ گیا تو پتہ چلا کہ اس وقت شاہ صاحب اپنے مقبرے میں ہوں گے۔ میں چونکا تو انہوں نے بتایا کہ صاحب نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی بنالیا ہے اور اب اپنی قبر میں اتر کر صبح وشام تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں اپنی لحد کے اندر اتر کر اپنے مستقبل کا راستہ طے کرنا بڑے مضبوط لوگوں کا کام ہے۔ ان کو اپنے انجام کا علم تو ہوتا ہی ہے، انجام کے انجام کی آگہی وہ خود استوار کر لیتے ہیں۔ نقوش کا طفیل نمبر ہم نے طفیل کی غیر موجودگی میں تیار کیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہونے کے باوصف وہ کچھ نہیں ہے جو نمبروں والے محمد طفیل کے نمبروں میں ہوا کرتا تھا۔ اگر کہیں محمد طفیل کو اپنی زندگی میں طفیل نمبر نکالنے کا خیال آجاتا اور وہ حقیقت کی لحد میں اتر کر تلاوت وجود کی تمام تر جزئیاں بہم کرتے، پھر وہ صحیفہ اردو ادب میں حق سچ اور خود احتسابی کا پہلا جزو ہوتا جس پر آئندہ آپ بیتیوں، خودنوشت سوانحوں اور Memories کی مضبوط بنیادیں استوار ہوتی ... لیکن خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم نے نکالا ہے اور اس شخص کے حوالے سے نکالا ہے جس نے نمبروں کو ایک نئی فہم، ایک نئی شخصیت، پورا وجدان اور Total Gestalt عطا کیا۔

سعید اختر اور دیوان اختر (تبصرہ)

پچھلے دنوں شاعری کی ایک ایسی کتاب پڑھنے کو ملی کہ نگاہیں حیران سی ہو کر رہ گئیں۔ خوبصورت دبیز کاغذ، اعلیٰ درجے کی رنگین جلد، دیدہ زیب کتابت، کپوری طباعت اور صفحات پر نہ نمبر نہ شمار۔ دل ششدر اور نگاہیں حیران کہ یا اللہ جلد ساز نے صفحہ نمبر کے بغیر اس کی مسل کس طرح سے اٹھائی ہوگی اور اس کی جز بندی پر کتنے نگران دائرہ بنا کر بیٹھے ہوں گے اور کیونکر ایک نسخہ نک سک سے درست ہو کر فنشنگ سٹیج سے نیچے اترا ہوگا۔

شاعر اس کتاب کا میڈیا کے نقار خانے کے باوصف شفقت نقارچی سے محروم لیکن الفاظ کے استعمال میں دلی کا روڑہ کہ آدے جاوے پاوے وغیرہ کو بلا تکلف استعمال کرے اور جب پورے طور پر کامیابی سے استعمال کر چکے تو ادب سے سر جھکا کر کہے:

جی میں آئے تو شعر کہتا ہوں
میں کوئی صاحب زبان نہیں

اور یہ غیر صاحب زبان شاعر سعید اختر ہے جس نے اپنے مجموعہ کلام کو "دیوان اختر" کا نام دیا ہے اور یہ شاعری کی وہی کتاب ہے کہ پڑھنے کو ملی تو اسے دیکھ کر نگاہیں حیران رہ گئیں۔

تخلیقی عمل میں ہیئت کو موضوع کی تلاش ہوتی ہے اور موضوع وجود میں آنے کے لیے ہیئت کو تلاش کرتا ہے اور جب ان دونوں کا شبھ سنجوگ ہوتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے ورنہ پھکی پھکی شعر ایک نامکمل سے "جگ سو پزل" کی صورت میں پڑے رہتے ہیں کہ دور سے نظروں کو وہ بھی ناگوار نہیں گزرتا۔

دیوان اختر کے ترتیب وار مطالعے سے مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ اعلیٰ درجے کی شاعری ریاض کی Equation نہیں ہے کہ حل ہونے کے لیے شعوری سطح پر سمجھ میں آ جائے۔ نہ ہی یہ کمپیوٹر کا پروگرام ہے کہ متعلقہ بٹن دبانے سے سب کچھ سکرین پر روشن ہو جائے اور روشن سکرین کونے سے گرین آنکھ مار مار کر پھر بتائے کہ اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنی ہیں تو فلاں نمبر دبا کر فلاں کھٹکا اٹھا دو ...... لیکن شاعری میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو پڑھنے والے کو اشارے کنائے اور اظہار والہام سے اپنے قریب کرتی جاتی ہے اور

یہی قربت قاری کو آنند، سکون اور سرخوشی سے مالا مال کرنے کا باعث بنتی ہے اور اس مالا مال اور شہ بخشی میں سعید اختر کی شاعری اپنا الگ سے ایک مقام طے کیے بیٹھی ہے کہ:

طلسم شب میں ابھرتے ہیں نقش رنگا رنگ
ہر ایک خواب ہمارا سحر گزیدہ ہے
نظر نہ آوے کہیں کوئی شکل تسکیں کی
نا آفریدہ ہے عالم کہ آفریدہ ہے
جہاں ہے بتکدہ افکار کا مگر اس میں
مرا جنوں مرا درد برگزیدہ ہے

اور حضرت انسان کے ٹوٹل Gestalt پر یہ شعر تو بہت ہی توجہ طلب ہے کہ:

مجھے جو دیکھے تو جائے ہے دور آدم سے
سنے جو مجھ کو تو کہوے خدا رسیدہ ہے

حضرت آدم کی اس چیستاں پر فکر کرتے ہوئے اقبالؒ نے اپنے پیوستہ لمحات میں کیا تحیر انگیز بات کی ہے کہ:

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجود حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن

شاعری کا سٹرکچر کچھ کچھ رومن طرز تعمیر کا حامل ہے کہ نیچے دو ستون ہیں اور اوپر شاعری کی مثلث استراحت کر رہی ہے۔ ان میں ایک ستون حسن وعشق کے مسالے سے وجود میں آتا ہے اور دوسرا ذاتی دکھ درد اور اجتماعی ظلم وستم کے علی الاعلان اظہار سے تقویت پکڑتا ہے۔ دنیا جہاں کی شاعری بالعموم اور ہمارے یہاں کی بالخصوص انہی دو سہاروں کی مضبوطی پر پروان چڑھ کر اپنی رفعتوں کی تصدیق اور تصمیم کرتی ہے لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ دنیا کی عظیم ترین شاعری چاہے وہ ڈیوائن کامیڈی ہو، جاوید نامہ ہو یا مثنوی مولانا روم ہو ان ہر دو قسم کے سہاروں سے بے نیاز، قائم بذات ہے اور اپنی رفعتوں کا حوالہ خود بنتی ہے۔

میں خدانخواستہ سعید اختر کی شاعری کو اتنا بڑا درجہ دے کر آپ کو خوفزدہ اور اپنے آپ کو مطعون کروانا نہیں چاہتا لیکن ''اگر نہ ہو تجھے الجھن......'' والی معذرت پیش کر کے اتنا کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ شاعر کا رخ ادھر ہی کا ہے۔ اب چاہے راستے میں رہ جائے چاہے اپنی منزل کو پہنچ جائے لیکن منزل تک پہنچنا بڑا مشکل کام ہے کہ شاعری کی مسٹری جو روح پر اپنا جادو جگا کر اس کو اپنے دام میں کھینچتی ہے اور روح کو لبھا

لبھو کر کے اسے اغوا بھی کر لیتی ہے۔ساتھ کے ساتھ اسے مناتی بھی رہتی ہے، راضی بھی کرتی جاتی ہے اور روح کا دل پشوری بھی کرتی رہتی ہے۔تو یہ بجائے خود ایک بہت بڑی مسٹری اور ایک بہت بڑا راز ہے۔شاعری بھی روح کی طرح کا ایک امر ہے۔ایک ایسا امر جس کو منطقی اور مدلل ذہن ہمہ وقت تباہ و برباد کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن ہر مرتبہ نہیں! کیونکہ

خوبیٔ طرزِ مقالات سے کیا ہوتا ہے
بات کرتے رہے ہم بات سے کیا ہوتا ہے

کسی جانب سے جواب آئے تو کچھ بات چلے
کاوشِ حسنِ سوالات سے کیا ہوتا ہے

سامنے آؤ کسی روز تو کچھ بات کریں
عمر بھر حلِ معمات سے کیا ہوتا ہے

سعید اختر کے نزدیک اب یہ بات وہی "بات" ہے جو میر کے یہاں اندیشہ و تفکر کے معنوں میں ملتی ہے اور میاں محمد صاحب کے یہاں "سخن" کے روپ میں نظر آتی ہے اور بلھے شاہ کے نعرہ مستانہ میں "گل" کے اعلان سے سنائی دیتی ہے کہ "گل سمجھ لئی تاں رولا کی" اور ہمارے ولایتی پیر Robert Frost نے تو یہ بات اور کھول کر بیان کر دی ہے کہ

We dance round in a ring and suppose
But the secret sits in the middle and knows.

چنانچہ سعید اختر کی شاعری بھی بھیل کا اور سنتھال کا ناچ ہے۔تحریار کر کے کولیوں کا گھمسن گھیر والا رقص جس کے دائرے کے اندر "سر" موجود ہے۔اب جوں جوں شاعر اس دائرے کو تنگ کر کے "سر" کے قریب ہوتا جائے گا اس کی شاعری عظیم تر ہو کر قاری کو اس کا بخرہ فراہم کرتی جائے گی لیکن عظمت کے اس مقام کے ساتھ ایک اندیشہ بھی ہر وقت موجود رہتا ہے کہ شاعر مسٹری کی چوٹی سے اتر کر وضاحتوں اور تفسیروں کی وادیوں میں اتر جاتا ہے جہاں سے اس کی کارکردگیوں کی خبر تو ملتی رہتی ہے لیکن اس کی شاعری کی پیش رفت کے اثر آثار معدوم ہو جاتے ہیں۔میرا خیال ہے سعید اختر وادیوں والا راستہ اختیار نہیں کرے گا کہ اس کا کعبۂ دیوان اسے روک کر رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے لیکن انسانی زندگی کے لیے وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

اس دیوان کے وجود میں آنے پر مصنف کو مبارکباد اور پڑھنے والوں کو تہنیت و تبریک کہ ایک اچھی کتاب ان کے مطالعے میں آئی جو بڑی دیر تک اور بہت دور تک ان کا ساتھ دے گی۔

ساتواں در

ستواں در کھلنے کی کئی کہانیاں مشہور ہیں لیکن یہ سارے افسانے جس ایک حقیقت پر مبنی ہیں وہ یہ ہے کہ کسی کا ساتواں در کھلتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ چنانچہ ان نظموں اور غزلوں میں جا بجا امجد کا خون نظر آتا ہے جو واردات کے سارے موقعوں پر پھیلا ہوا ہے اور جس سے ساری فضا نمناک اور غمناک ہو گئی ہے۔

اچھی شاعری کے لیے پہلی اور آخری شرط اچھا شاعر ہونا ہے۔ حقیقت پسند، انسان دوست، انصاف پسند یا ارتقا پر یقین رکھنے والا ہونا نہیں۔ ان چیزوں پر ایمان رکھنے والا شاعر بہت سے بونس پوائنٹ تو اکٹھے کر لیتا ہے لیکن بونس پوائنٹوں کا اجتماع شاعری نہیں ہوتا۔ فلسنڈ ڈیپازٹ اکاؤنٹ ضرور کہلاتا ہے۔ امجد کی شاعری بونس پوائنٹوں کے فلسنڈ ڈیپازٹ سے الگ چیز ہے اور اس میں خود پرستی اور سلیف لو کی ایک اندی ہوئی ندی رواں ہے جو اپنی تلاش میں اندھا دھند کف اڑاتی جا رہی ہے۔ اگر آپ اس کی غزلوں کو (جو میرے حساب سے قطعہ بند ہیں) کسی کنج تنہائی میں آرام سے دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ محبوب کے اس سوال کے جواب میں کہ ''مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو'' امجد ''ہاں'' کہنے کے لیے ہمیشہ ''نہیں'' سے بات شروع کرتا ہے..... ''کیوں نہیں! کیوں نہیں!! مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ میں تمہارے وجود کو ملیا میٹ کر سکتا ہوں۔ تم میرے ہمزاد ہو۔ میرا اپنا سیلف ہو۔ میں تم سے حقیقی اور سچی محبت کرتا ہوں۔ جس طرح اپنی ذات سے کرتا ہوں۔''

جب محبوب مجسم تحیر بن جاتا ہے تو شاعر کہتا ہے ''میں اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اپنے آپ کو تلاش نہیں کر سکتا تاوقتیکہ میں اپنے آپ کو چھپا نہ لوں۔ تلاش کے لیے چیز کا پوشیدہ ہونا ضروری ہے اور ڈھونڈنے کے لیے اشارے اور حوالے کی ضرورت ہے اور وہ حوالہ، وہ اشارہ، وہ استعارہ تم ہو۔ میں آنکھ ہوں تم مچولی ہو اور جس قدر منتحسن ان دونوں میں ہوتا ہے اور جتنی تیزی سے یہ بلوتے ہیں اسی قدر محبت کا پھن اوپر اٹھتا ہے اور ہر اجنبی، منہ زور، بے وفا، حور شمائل، تنگ نظر، طوطا چشم اور تلخ کلام شے کے اندر میری اپنی نشاندہی ہونے لگتی ہے۔ ہاں یہ میری ذات ہے۔ میری اپنی ذات ہے۔ انا نہیں ذات! جو اس آنکھ مچولی میں صرف

تمہارے حوالے سے پہچانی جا سکتی ہے اور اسی استعارے سے تلاش کی جا سکتی ہے۔

میں امجد کی نظموں کا تو شروع سے دلدادہ تھا اب اس کی غزلوں کا بھی گرویدہ ہو گیا ہوں۔ ان پر بھی وہی کیفیت طاری ہے اور ان کا مہاندرہ بھی اس کی نظموں سے ملتا ہے۔ وہی ایک موڈ، وہی سوچ کا نیلا آسمان، ویسا ہی تانا پیٹا وہی بنت اور وہی شبنمیں لمس۔ ایسی غزلیں استادوں کے یہاں پہلے بھی ہوتی ہیں لیکن اس قدر تواتر کے ساتھ نہیں۔

امجد اسلام امجد، خوش رہو، زندہ رہو اور دیر تک جوان رہو کیونکہ جوانی میں بہت سے واضح اور انوکھے اور مختلف النوع تصورات یورش کر کے آتے ہیں اور جوان ذہن ان کو تیزی سے جذب کر لیتا ہے۔ جب بڑھاپا آتا ہے تو ذہن نہ اس قدر جلد متاثر ہوتا ہے نہ متاثر کرتا ہے۔ اس وقت تقابل اور تجزیے کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جوانی میں دروازہ کھلا ہوتا ہے اور ہر شخص اور ہر تاثر محبوب سماں ہوتا ہے۔ بعد میں یہ کھلا دروازہ ادھ کھلا رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کے اور چوکھٹ کے درمیان ایک جھری سی رہ جاتی ہے۔ بالاخر یہ ساتواں در پورے کا پورا بند ہو جاتا ہے۔ دھڑا کے زنانٹے کے ساتھ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ، ہولے ہولے اپنے قلابوں اور قبضوں پر رینگتے رینگتے، پھسلتے پھسلتے، کھسکتے کھسکتے اور اس بند ساتویں در کے اندر تلاش کا ایک اور عمل شروع ہو جاتا ہے۔

روشنیوں کا شاعر

پروفیسر آرے ساندرو باؤسانی کہ اب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، میں ایک شام رومن فورم کے پتھر پر بیٹھے تغزل کے رنگ میں ایسے ڈوبے کہ انہوں نے میری مرضی اور منشا کے خلاف جرأت کی شاعری پر گفتگو شروع کر دی۔ میں بالکل سننے کے موڈ میں نہیں تھا اور ان پر گفتگو وارد ہو رہی تھی۔ بیسویوں تو جرأت کے شعر سنا ڈالے اور ان کی نابینا زندگی کے اثرات ان کی شاعری پر جس طرح سے مرتب ہوئے تھے، ان کا ایسا اچھا نفسیاتی تجزیہ کیا کہ میرے سامنے جرأت اور اس کی شاعری کا ایک نیا باب کھل کر سامنے آ گیا......
آج جب کئی سال بعد میں نے سوزِ ازل کا مطالعہ کیا تو رنگ و نور کا ایک نیا دریچہ کھلا اور ایک ایسا دریچہ جس میں نور کے ساتھ ساتھ وہ روشنیاں بھی جھلملا رہی تھیں جو انسانی دانش نے اپنی اختراع کے آفتاب سے پیدا کی تھیں۔

نار نمرود ہو یا شعلہ سینائی ہو
تیرے ہی نور سے روشن میری بینائی ہو
گھپ اندھیروں میں بھی اک شکل منور دیکھوں
کس قدر آپ کی تنویر مجھے بھائی ہے!

یا......

ہر شے اندر سورج چمکن انھے فیض نہ پاون
کتھے نیں چانن دے عاشق کتھے نیں پروانے
نم نم چمکے لو بتیاں دی اکھیاں ہار پروون
حیدر لوکی کجھ نہ سمجھن گھڑن ایویں افسانے

کہکشاں سے پار اک تاروں کی بستی میں کہیں
چھوڑ آیا ہوں تیری یادوں کے نورانی محل

زندگی کی اس شب تاریک و طولانی میں اب
راس آتا ہے فقط اختر شماری کا عمل......!

الیومی نیشن انجیر کے اس تخلیقی عمل کے پیچھے روح کی وہ تلاش ہے جو ظلمات سے نور کی طرف آنے کے لیے بیقرار ہے۔ اس نے پہلے جب ایک ستارہ دیکھا تو پکار کر کہا حذر ارنی اور برقی انجینئرنگ کے اس شعبہ میں اتر گئی جہاں روشنی اور اس کا سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ اس سے تدریس سے پہنچی ہوئی تو عملی زندگی میں داخل ہو کر روشنیاں جھلکانے لگے اور کہنے لگے ہذا ربی لیکن پھر بھی کوئی راستہ نہ مل سکا اور روح ویسے ہی محبوس رہی۔ پھر ایک بڑے سے روزن سے بڑی سی روشنی آئی جیسے سورج کا تھال! یہ شاعری کی روشنی تھی روح نے پکارا حذا ربی...... خوشیاں منائی گئیں، شادیانے بجے کہ

ماند پڑ جائے گی سب چاند ستاروں کی ضیا
آ تو لینے دو ذرا ان کو لب بام ابھی

لیکن جب ان کے آ جانے پر بھی دل کے اندر روشنی نہ اتری تو روح نے ظلمات سے سر ٹکرا کر کہا یہ مسئلہ کچھ اور ہے اور نور تک پہنچنے کی یہ راہیں نہیں ہیں۔ پھر سید افتخار حیدر کا تخلیقی عمل رکا اور روحی اور سری عمل سرگرداں ہوا۔ یہ کھوج اب تک جاری ہے اور یہ سفر ساتھ ساتھ چل رہا ہے کہ......"از ہزاراں کعبہ یک دل" کس طرح بہتر ہوا۔

بس رہے ہوں جس میں حرص و آز کے لات و منات

دل بدست آور اگر خود را تو ذات خود بلند + خود فنا ہو کر بنے یک دل تو پھر بنتی ہے بات۔ سید افتخار حیدر اس عہد کا وہ شاعر ہے جس کی اس عہد کو تلاش ہے اور افتخار کی شاعری اس نور کی نشاندہی ہے جس کا تعلق ازل کی فلڈ لائٹ سے ہے اور جس کی شعاعیں اس راز سے برآمد ہو رہی ہیں جو موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود ہے اور جس کے آشکار ہو جانے کے بعد بھی اس کا کوئی بھید نہیں کھلتا۔

میں سید افتخار حیدر کو سوز ازل کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور خوش ہوں کہ سوز ازل سے اردو شاعری کے وسیع دامن میں ایک اور لہر کا اضافہ ہوا۔

سورج کی آنکھ

اس عہد کے شاعروں نے شاعری کے دھماتنتری محل میں بڑے خوبصورت چراغ روشن کیے ہیں جن میں ایک قندیل اعجاز فاروقی کی بھی ہے۔اس ڈی فیوز ڈلائٹ سے جو روشنی حال کے در و دیوار اور وقت کی مسطحات کو عطا ہو رہی ہے آپ اسے رمز و اشارہ یا علامت اور کنایہ جس نام سے چاہیں پکار لیں ہے وہ روشنی ہی۔ آگے آپ کے مزاج ہیں کہ آپ چکا چوند پسند فرماتے ہیں یا مدھم روشنی اور متحرک سائے!

اعجاز کی شاعری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ چھوٹی ہے۔ وادی کے جنگلی پھولوں اور گھاٹیوں کے درمیان اڑنے والے پرندوں کی طرح۔ یہ دونوں ہی انہیں اردگرد کی اونچائیوں اور بلندیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ کھلتے چہکتے رہتے ہیں۔ دیودار اور پہاڑی کوے کو اپنی بڑائی کی فکر ہوتی ہے۔ دیودار حرکی چنگاری پکڑ کر جلتا ہے اور ساتھیوں کو بھی خاک سیاہ کرتا ہے۔ پہاڑی کوا بوڑھے پنساری کی طرح کھانستا، کھولتا، بلکتا اور مشتری ہوشیار باش کہتا رہتا ہے لیکن اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کے کانوں میں بجتی رہتی ہے اور وہ اپنی ہی آواز سے خوفزدہ ہو کر پیڑوں کے درمیان ٹھہر ٹھہرا تا رہتا ہے۔ اعجاز کی نظمیں پڑھتے ہوئے میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ انسانی شاعری قد آور شاعری سے کس قدر تندیت اور اعلیٰ ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کیسی کیسی خوش وقتی اور خوش کامی کے سامان مہیا کرتی ہے۔

سورج کی آنکھ کا نصف وہ پلاسٹک سرجن ہے جو انسانی سائیکی کے کو جھے پن کو اپنے تعلق کی رفوگری سے دور کرنے میں مصروف ہے۔ میں نے حامد ڈرائیور کو اس تعلق کی بنا پر جانا ہے۔ اعجاز فاروقی سے بہتر جان لیا ہے کیونکہ جب وہ ''شہاب ثاقب'' کا وزٹنگ کارڈ لے کر میرے سامنے آیا تو اس پر شاعر کے ہاتھ کا With Compliments اس طرح سے لکھا تھا کہ اجنبیت کی ساری راکھ منتشر ہوگئی اور ہمارے درمیان ٹھنڈی اور گرم تار کا کنکشن لگ گیا۔ جب تک میرے اور حامد ڈرائیور کے درمیان شاعر کا فیوز موجود ہے Complements کی رو چلتی رہے گی اور جب ہم دونوں میں سے کسی ایک نے اس فیوز کو Disown

کر دیا، ہماری یگانگت ختم ہو جائے گی اور بھئی اعجاز فاروقی جو ہم سے سچ پوچھو تو حقی بات یہ ہے کہ تمہاری شاعری اور ہمارے مضمون اور ایسی محفلیں یہ سب چھوٹے چھوٹے مظہر ہیں، اس کے جس کی آنکھوں سے ۔ شعائیں برسیں

ریت کی دھند چھٹی

جس کے ہونٹوں سے ترنم کی وہ لہریں پھوٹیں

لفظ پھر زندہ ہوئے

لفظ......جن میں ہے خدا کا سایہ

لفظ......جن میں پڑی میری تصویر

چھوٹی لڑکی کی بڑی شاعری

جب آپ اچھے موڈ میں ہوں اور آپ کے ذہن سے ایک بہت ہی پرانا بوجھ اتر کر آپ کو تتلی کی طرح ہلکا، تازہ دم اور خوش وخرم کر گیا ہو تو آپ کو دنیا کی ہر شے اچھی لگنے لگتی ہے اور آپ اپنے کو جھڑکیاں دینا بند کر کے اپنے آپ سے دوستی کر لیتے ہیں۔ ایسی دوستی جہاں آگے چل کر بہت سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہو۔

کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں دھوپ میں پاؤں پسارے، سر چھاؤں میں چھپائے، میٹھا دہی کھا چکنے کے بعد اپنی عینک صاف کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر اخبار کی اس خبر پر پڑی کہ نوع انسانی نے تیرہویں اور چودھویں صدی میں جو جنگیں لڑی تھیں ان کے سارے قرضے اور سارے خرچے پچھلے بدھ کے روز برابر ہو گئے ہیں اور اب کسی کے ذمہ کچھ بھی باقی نہیں رہا...... اس خبر کو پڑھ کر میں تتلی کی طرح ہلکا پھلکا، تازہ دم اور خوش وخرم ہو گیا اور میرے اردگرد کا خوش رنگ ماحول مجھے بھی رنگ ترنگ عطا کر گیا۔ اتنے میں میری بیوی نے مجھے جب تک آنکھیں زندہ ہیں، کی ایک کاپی لا کر دی اور کہا مجھے تو اس لڑکی کی شاعری نے بڑا متاثر کیا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

اس وقت تو میں بہت اچھے موڈ میں تھا اور مجھے نیلما کا سارا کلام ہی بہت اچھا لگا لیکن بعد میں جب میں نے اسے بیزار کن حالات میں اور مشکل موڈ میں دوبارہ پڑھا تو پہلے سے بھی اچھا لگا...... میں اس وقت سے لے کر اب تک حیران ہوں کہ یہ لڑکی ایسی اچھی شاعرہ کس طرح سے بن گئی! بغیر کسی خصوصی تربیت اور بغیر کسی تلمذ کے شرف کے شاعری کی گرامر اور عروض کی پابندیاں جانے بغیر...... لیکن پھر یہ عقدہ ننھی حنا نے کھولا اور مجھے پتہ چلا کہ نیلما کو شاعری کی روح سے آشنا کرانے والی حنا ہے جس نے بہت بڑی قربانی دے کر اپنی ماں کو اس کرب اور اس دردِ مسلسل کی آگہی عطا کی اور فرمانے والے فرماتے ہیں کہ درد کا ایک ریشہ جب کشتِ دل میں گہرا اُتر جاتا ہے تو اس کی شاخیں سارے وجود پر پھیل جاتی ہیں اور جب یہ شاخیں بیلوں کا روپ اختیار کرتی ہیں تو ساری کائنات ان کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ پھر درد آشنا دل اپنے سارے وجود کو ایسی بصیرت

سے ہمکنار کر دیتا ہے کہ سارے انسانوں کے سارے حادثات اس کا اپنا ذاتی دکھ بن جاتے ہیں۔

''جب تک آنکھیں زندہ ہیں'' کے کئی رنگ ہیں لیکن کوئی رنگ بھی شاعر کی کیفیت اور واردات سے باہر کا رنگ نہیں۔ ساری حسرتیں، ساری بلائیں، سارے طوفان اور ساری خوشیاں ایک واحد متکلم کی ہیں جو بہت سے حصوں میں بٹ کر دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

نیلما کی شاعری پڑھ کر مجھ پر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے یہاں عورت نام کی کوئی الگ جنس موجود نہیں۔ یہاں یا ماں ہے یا بہن ہے یا دلہن ہے یا محبوبہ ہے یا اور بے شمار رشتے اور نشانیاں ہیں جن میں عورت آباد ہے لیکن خالی عورت اور صرف عورت ہمارے یہاں کہیں نہیں ملتی۔ جس طرح ولایت میں اور مغرب کے بھرے پڑے شہروں میں آپ کو ہزاروں، لاکھوں عورتیں سڑکوں پر، ساحلوں پر، ٹیوب سٹیشنوں میں اور فلک بوس فلیٹوں میں مل جاتی ہیں، بغیر کسی حوالے یا رشتے کے، بغیر کسی تعلق یا وابستگی کے، ویسی عورت ہمارے معاشرے میں موجود نہیں آپ اس کتاب کا ایک ایک ورق الٹتے جائیے، ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرعہ دیکھتے جائیے۔ حنا کے لیے لکھی ہوئی ہر نظم ماں کا بین ہے۔ کھانستے ہوئے باپ کی نظم ایک مجبور بیٹی کی داستان غم ہے جو بڑھاپے کی منزل سے نکل کر موت کی وادی میں اترتے ہوئے باپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ ''ساجن اور سسرال'' ایک بہو کا نوحہ ہے جسے خاوند کی بے پناہ محبت کے درمیان زہریلے کانٹوں نے ڈس لیا ہے۔

باقی ساری نظمیں محبوبہ کی ہیں، بیوی کی ہیں، جن میں گلے شکوے بھی ہیں۔ رنج اور راحتوں کے ذکر بھی ہیں۔ محبتوں کی ذہنی رسائیاں اور بدنی قربتیں بھی ہیں۔ پھر زندگی کے تضادات اچھی طرح سے سمجھ میں آ جانے کے بعد اپنے آپ کے لیے یاددہانیاں بھی ہیں کہ

جب بھی پیار کسی سے کرنا
بالکل سچے ہو کر کرنا
پچھلی باتیں بھول ہی جانا
ان کا ذکر نہ اس سے کرنا
اپنی خوشی کے لیے نئے دنوں میں
پچھلے دکھوں کا زہر نہ بھرنا

عید آئی تو سارے آئے
سارے دوست ہمارے آئے
جن کی آس تھی
وہ نہ آئے

یا

جو لوگ مرے ہمراہ چلے
ان کو تو زمانہ جانتا ہے
جو لوگ مرے سینوں میں رہے
ان کو تو کوئی نہ جان سکا

یہ کیسی اندھی دنیا ہے
ظاہر کی باتیں کرتی ہے
جو اس کی سمجھ میں آ نہ سکے
اس شخص کو رسوا کرتی ہے

پھر اس میں ایک عقیدت بھری کنیز کے وہ احوال بھی ہیں جو وہ سلام کے رنگ میں اپنے آقا سے عرض کرتی ہے۔ امام عالی مقام اور مظلومانِ کربلا سے اپنی دست بستہ عقیدت کے اظہار نے نیلما کو ایک بڑی چاکری اور ایک اعلیٰ رتبے کی غلامی کا اعزاز عطا کیا ہے۔

لیکن اپنی ساری شاعری کر چکنے کے بعد اور اپنی ساری کیفیات کا اظہار کر لینے کے بعد نیلما کو لوک لاج کے خوف سے ایسی نظمیں لکھنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے جو خدا سے، اس کے نظام سے، اس کے انصاف سے قدرے گستاخانہ استفہام کا رنگ رکھتی ہیں۔ یہ نیلما کی اپنی بات نہیں، دوسرے مقبول شاعروں کے تتبع کی بات ہے۔ چونکہ یہ تتبع بے حد رسمی ہے اس لیے کتاب کا یہی حصہ کمزور ہے۔ مثلاً ''منکر نکیر وہ آؤ'' یا اسے تو ستر حوریں ملیں گی یا ''خالق کائنات کے نام'' کہی گئی باتوں کا اعادہ ہے اور یہ نیلما نے اس لیے کیا ہے کہ سبھی بڑے شاعر ایسا کرتے ہیں اور محترم ٹھہرتے ہیں۔ پھر میں بھی کیوں نہ جاتے جاتے ان کی بڑائی کا لکٹ اپنے سر پر سجا کر دیکھوں لیکن یہ اس کے مزاج اور اس کی سعید روح سے باہر کی بات ہے۔ جس طرح چھوٹے بچے بڑوں کے جوتے پہن کر شپ شپ صحن میں چلا کرتے ہیں، کچھ ایسا ہی واقعہ یہاں گزر گیا ہے اور پھر نیلما بھی تو ابھی چھوٹی ہے۔ بہت چھوٹی نہ سہی اتنی بڑی بھی تو نہیں، کم از کم میرے لیے تو ابھی حنا جتنی ہے!

جاتے جاتے اس کی ایک غزل بھی سن لیجیے۔ یہ غزل مجھے دل سے پسند ہے۔ غم، تسلیم، سپردگی اور انبساط کے ملے جلے موسم میں کومل سُر کی ہوا چلانا کسی بڑے شاعر کا کام ہوتا ہے اور وہ بھی زندگی میں کبھی کبھی، ایک آدھ مرتبہ...... لیکن نیلما نے اپنی اگلی کیفیت بھری سوچ کا اعلان ابھی سے کر دیا ہے۔ اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر!

اس لڑکی کی نظمیں پڑھ کر، سن کر اور دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور خوف بھی آتا ہے کہ آخر اس کے ارادے کیا ہیں! ہر ہر شعر میں ایک نیا تجربہ اور ہر ہر سطر میں ایک انوکھا سخن ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں سخن کے دارو

کا ایسا اہتمام کرنا اور اسے اس آسانی سے عام کر دینا میری دانست کے احاطے میں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں سے دور کسی نے ایسا کیا ہو تو معلوم نہیں۔

نیلما کی شاعری تربوں کی کپکپاہٹ ہے۔ جس طرح ستار کے تاروں سے زخمہ الجھ کر نیچے کے خاموش تاروں کو مرتعش کر دیتا ہے۔ اسی طرح واردات کا پنجہ دل و دماغ کو دھنک کر روح کی ساری تربوں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی لرزہ، یہی انجانے کا خوف اور پھر اسی مقام پر...... سکون کی تمنا نیلما کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔

یادوں کا موسم

رضی ترمذی ملنے والی روح ہیں۔ خوش لباس، خوش اطوار، خوش خلق اور خوش اندام۔ جہاں بیٹھتے ہیں اپنی تازگی اور تحفگی سے اک باغ لگا دیتے ہیں لیکن اگر آپ کو کسی وجہ سے ابھی تک ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تو پھر آپ ان سے ان کی شاعری کے رشتے سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ رضی کی شاعری اس صحن خانہ کا بھرپور منظر ہے جہاں غلام گردشوں کے لمبے سایوں کے پیچھے بے شمار کہانیاں "کیارو سکورو" میں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ کچھ فوراً سمجھ میں آنے والی، کچھ آہستہ آہستہ کھلنے والی اور کچھ حیرت میں گم کر کے خاموش کر دینے والی۔ رضی کی شاعری انہی کہانیوں اور کیفیتوں کی تصریح ہے جو دماغ کے بجائے دل سے اور سوچ کے بجائے گداز سے وجود میں آتی ہے۔

"یادوں کا موسم" سے گزرتے ہوئے جب آپ رضی کی شاعری کی رت میں اترتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ بیشک الفاظ بڑے اہم ہوتے ہیں اور خود شاعر بھی لفظ کو اور حرف کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ پھر بھی یہ اس کی شاعری کے معتبر اجزا نہیں ہیں۔ یوں تو شاعری میں لفظ ہی نظر آنے والی اور لفظ ہی سنائی دینے والی چیز ہیں لیکن رضی کی شاعری میں الفاظ ہمیشہ ان غیر مرئی چیزوں کی ماتحتی میں رہتے ہیں جو بعد میں الفاظ ہی کی بدولت اجاگر کی جا سکتی ہیں۔

رضی ترمذی کی غزلوں اور نظموں، خاص طور پر نعتوں، منقبتوں اور مرثیوں میں بھی ہم لفظوں کی وجہ سے کیفیات اور محسوسات کی دنیا میں داخل نہیں ہوتے بلکہ ان واردات کی وجہ سے ہوتے ہیں جو تخلیقی عمل کے وقت شاعر کی ذات کا واحد ذریعہ اظہار تھا۔

"یادوں کا موسم" رضی کی شاعری کا فقط ایک حصہ ہے۔ اس کی تکمیل ان یادگار منظوم تماثیل سے ہوتی ہے جو "مثال کے طور پر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح رضی ترمذی کی شاعری غنا بھی ہے اور مکالمہ بھی۔ راگ بھی ہے اور ڈائیلاگ بھی! اور اس کے بدلتے موسموں میں انسان کے دکھ درد کی اور خوشیوں کی لاتعداد کہانیاں مستور ہیں۔ ان خوشیوں کی کہانیاں جو جب بھی جدا ہوتی ہیں، دکھ دے کر جدا ہوتی ہیں۔

عرفان علی شاد

آج تک میں نے جن کتابوں کی رونمائی میں شرکت کی ہے، وہ عام طور پر ایک وقت میں ایک کتاب ہوتی تھی لیکن آج کا دن بڑا مبارک ہے کہ اس نشست میں ایک ساتھ دو کتابیں بھگتائی جا رہی ہیں۔ میں نے ایسی کئی شادیوں میں شرکت کی ہے جہاں بیک وقت دو باراتیں آتی تھیں اور دو لڑکیاں ایک ساتھ بیاہی جاتی تھیں۔ ان شادیوں میں دو بہنوں کے الگ الگ دولہے ہوتے تھے لیکن آج ایک ہی دولہا کے بیک وقت دو نکاح ہو رہے ہیں اور ہم اس کے لیے ڈبل سہرے لکھ کر لائے ہیں۔

عرفان علی شاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شکل و صورت سے نہ تو پروفیسر لگتے ہیں نہ افسانہ نگار، نہ اہلِ زبان نظر آتے ہیں نہ ٹھیٹھ دہقان۔ بس ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے آدھے فرلانگ دور کا انسان کہ ہوتا ضرور ہے لیکن نہ ہونے کے برابر اور نظر آتا ہے لیکن نہ پہچانے جانے کے لیے۔ شکل ہوتی ہے لیکن ناآشنا۔ میں ایسے شخص کو نامانوس قرابت دار کہا کرتا ہوں اور ناصر کاظمی ایسے آدمی کو مانوس اجنبی کا نام دیا کرتا تھا۔ ایسے لوگ اگر لکھنے لگ جائیں تو ان کی تحریروں کا محاکمہ کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

عرفان علی شاد اس قدر آسان لکھتا ہے اور اس کی کہانی میں اتنی کہانیت ہوتی ہے کہ اس کے سحر سے باہر نکل کر اس کے جادو کو پکڑنا، کیلنا یا اس کے ماترے گننا ناممکن سا کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور یہ میرا تجربہ ہے کہ اس دنیا میں آسان چیزوں کو اپنی گرفت میں لینا سب سے مشکل کام ہے۔ ایک خونخوار بل ڈاگ کو زنجیر میں تان کر چلنا آسان ہے، ایک تتلی کو مٹھی میں بند کر کے باغ کی سامنی سڑک عبور کرنا مشکل مرحلہ ہے۔ اور اس افسانہ نگار نے بھرے میلے میں بلور کے جھاڑ فانوس اٹھا رکھے ہیں اور بڑی دیدہ دلیری سے ایسے ہجوم میں سے گزر رہا ہے جہاں انسانوں کے بھنور گھوم رہے ہیں۔ نہ آنے والوں کے لیے کوئی راستہ ہے، نہ جانے والوں کے لیے۔ ایسی جرأت کا مظاہرہ یا تو کوئی بلوان کر سکتا ہے یا پھر کوئی بہت ہی بڑا احمق اور بڑے کام کرنے کے لیے بڑے لوگوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے محتاط موقع شناس اور پکی لوگوں کی نہیں۔

جب آپ عرفان علی شاد کے افسانے پڑھیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ اس کی ہر کہانی کا سب

سے اہم کرداراس واقع کا ماحول ہے جس نے اپنے اندر گھومنے والے باقی سارے کرداروں کو اپنی برتری سے مرعوب کرر کھا ہے اور جس کا ہر کہانی میں ایک میجر رول ہے۔ کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں بھی یہی منفرد خصوصیت تھی جس نے اسے آن واحد میں اردو کا ایک عظیم افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ اس کے بعد کرشن اپنی ادبی زندگی کے ایک نئے موڑ پر مڑ گیا اور اس نے اپنے سفر میں ایک واضح تبدیلی پیدا کر کے ایک اونچے اور ارفع آدرش کو اپنا لیا۔ عرفان کے افسانے پڑھ کر بھی یہ شک گزرنے لگتا ہے کہ بہت جلد یہ افسانہ نگار بھی زندگی کی عکاسی چھوڑ کر کسی اونچے اور اعلیٰ آدرش کی طرف نکل جائے گا اور زندگی سے اس کا تعلق بہت ہی مرحوم سا ہو کر رہ جائے گا۔ اعلیٰ آدرش کتنے بھی اعلیٰ کیوں نہ ہوں، زندگی سے بہر کیف چھوٹے اور لائف سائز سے ہمیشہ کمتر ہوتے ہیں اور فنکار کے لیے فیصلے کا وہ مقام بہت ہی پیچیدہ ہو جاتا ہے جب اصل کے مقابلے میں عکس کی داد زیادہ ملنے لگے اور زندگی بخش پھولوں اور پھلوں کے مقابلے میں ان کی شبیہوں اور تمثیلوں کے دام زیادہ پڑنے لگیں۔ جب وسیع تر اور عظیم تر اور زندہ تر زندگی تو پیچھے رہ جائے اور اس کا مقدمہ اور اس کا سلوگن اور اس کا جنگل آگے نکل جائے۔ یہ ایک ایسا خوفناک عہد ہے کہ اس میں پراڈکٹ سے زیادہ پراڈکٹ کا اشتہار زیادہ مقبول اور شاید زیادہ مفید بھی ہوتا ہے۔ ابھی تو ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ عرفان دھوپ کی کہانیاں لکھتا ہے یا صرف اس کی لکیر تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ...... لیکن میں اپنے اندیشے کا آج کی محفل میں کیوں ذکر کروں۔ کیوں نہ کوئی خوشگوار بات کروں۔

عرفان کے فن کا سب سے بڑا کمال زندگی کے تضادات کو تسلیم کر کے آگے چلنے کا نام ہے۔ پتہ نہیں اس عمر میں اسے اس حقیقت کی نشاندہی کس طرح سے ہوگئی ہے کہ دن بھی زندگی ہے اور رات بھی زندگی ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ بھی اس زندگی کا ایک حصہ ہیں جو گہرے سمندروں کے ساتھ وابستہ ہے۔ دکھ اور سکھ بلکہ دکھ اور شادیانے بلکہ دکھ کے شادیانے یہ سب زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ مرکز بھی زندگی اور پیری فری بھی زندگی ہے۔ اس کے لیے کوئی گالی، کوئی جھڑکی کوئی نعرہ، کوئی للکار ادب کے ذیل میں نہیں آتی۔ سسکی آہ کراہ اور آنسو اس کی ترجمانی البتہ کر سکتے ہیں اور وہی اس کے مجاز ہیں۔

ذرا گرداب کی عمارت ملاحظہ فرمائیں، اس بلڈنگ میں دائیں بائیں اوپر نیچے تاریک اور سیلے اور بدبودار کمرے تھے جن میں پندرہ پندرہ بیس بیس آدمی رہتے تھے۔ بڈھے، بڑھیاں پلنگوں پڑے کھانستے رہتے تھے۔ عورتیں ایک دوسرے کے جوئیں دیکھتی تھیں یا لڑتی رہتی تھیں اور بچے آوارہ کتوں کی طرح گلیوں میں کھیلتے رہتے تھے۔ اس بلڈنگ میں نماز بھی پڑھی جاتی تھی اور ٹھرا بھی پیا جاتا تھا۔ روزہ بھی رکھا جاتا تھا اور سٹہ بھی کھیلا جاتا تھا۔ عورتیں گھونگھٹ بھی کاڑھتی تھیں اور جسم بھی بیچتی تھیں، مرد لوگ سڑک کنارے چارپائیوں پر بیٹھے گپیں مارتے رہتے تھے یا چرس کے دم لگا لگا کر جوا کھیلتے تھے یا پولیس والوں کو گندی گالیاں دیتے رہتے تھے...... ہر بڈھا کبوتر بازی اور ہر نوجوان نظر بازی کا شوقین تھا۔

عرفان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاید یہ افسانے ان واقعات پر مشتمل ہیں جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی خبروں کی صورت میں موجود ہیں اور شاید یہی وجہ ہے جس کی بنا پر یہ کہانیاں ایک مضبوط اساس پر اُستی چلی گئی ہیں لیکن حقیقت میں یوں نہیں ہے۔ ایک عام قاری کے لیے تو شاید ان کا کسی واقع سے کوئی قریبی تعلق ہو لیکن ایک افسانہ نگار کے لیے جو کہانی کہنے کے فن سے واقف ہے اور جس نے ان گلیوں کے طاقچوں اور دریچوں میں تاک جھانک کی ہو اس کے لیے کہانی کی بنت اور وقوعے کی تفصیل میں فرق تلاش کرنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ عرفان کے افسانے اس کے تخیل کی ایسی جیتی جاگتی پیداوار ہیں جن پر ہر کسی کو حقیقت کا قوی شبہ ہونے لگتا ہے اور یہی ان افسانوں کی برتری کا طرہ امتیاز ہے۔

اگر میں افسانے لکھتا رہتا اور میرے پاس ایک مضبوط قلم اور زرخیز تخیل ہوتا تو میرے افسانے عرفان کی کہانیوں سے اگر اچھے نہ ہوتے تو ان کے لگ بھگ ضرور ہوتے..... لیکن مجھ سے تو لکھنا لکھانا ہی چھٹ چھٹا گیا۔

بھارت پر اب تک جتنے بھی رپورتاژ آئے ہیں ان میں قدم بہ قدم سب سے نرالا ٹرویلاگ ہے۔ گو مصنف نے اس کو سفرنامہ کا نام دیا ہے لیکن اس میں متداول سفرناموں والی کوئی بات نہیں۔ ایک جانا ہے اور ایک آنا ہے اور درمیان میں کچھ ملنا ملانا ہے اور اس میل ملاپ میں کوئی فلسفہ نہیں، کوئی تحقیق نہیں، کوئی تت نہیں نکالا گیا۔ کچھ پرانے مکان ہیں، کچھ پرانے لوگ ہیں، کچھ محبت کی باتیں ہیں، کچھ ادب کے قصے ہیں۔ کچھ عزیز و اقارب کی باتیں ہیں جو پرل پرل منہ سے نکل رہی ہیں۔ کسی کو خیال ہی نہیں کہ ادب کی اور دانش کی اور تحقیق کی یا برتری کی بات کرنی ہے۔ ماموں ہیں ممانیاں ہیں، خلیرے ممیرے چچیرے بھائی ہیں۔ ملازم ہیں، پڑوسی ہیں۔ دکاندار ہیں اور ان کے درمیان باتوں کا رابطہ ہے۔ معمولی روزمرہ سیدھی سادی خیر خیریت کی باتیں، بے حد معمولی باتیں اور ان کے پس منظر میں ایک عجیب طرح کے دکھ اور بے سکونی کی فضا ہے جس کا نہ لکھنے والے نے نقشہ کھینچا ہے اور نہ پڑھنے والے نے اس کی بابت کچھ سنا ہے لیکن دونوں ہی کو اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں ایک عجیب سی فضا اور ایک عجیب سارنگ پیدا ہو گیا ہے جس میں خوشیاں کم اور دکھ زیادہ ہیں۔ روشنی تھوڑی اور دھند کے ڈھیر ہیں۔

اگر آپ کو فوٹوگرافی سے گہرا شغف ہو یا آپ نے کبھی فلم کی شوٹنگ کی ہو تو آپ اس رپورتاژ سے بڑا لطف لے سکیں گے۔ مصنف کو اپنے اس کمال فن کی خود خبر نہیں (اور اس کو ہونی بھی نہیں چاہیے ورنہ اس کی اگلی تخلیق شعوری ہو جائے گی) کہ اس کی تحریر نے اس رپورتاژ میں ایک سیلف کنٹینڈ اپرچر کا کام کیا ہے۔ جب بات گھر کے اندر پرانے محلوں اور دھنسی ہوئی حویلیوں کے کمروں اور دالانوں میں ہوتی ہے تو تحریر کا اپرچر خود بخود کھل جاتا ہے اور ماحول کی تفصیلات خود بخود مبہم ہونے لگتی ہیں اور جب بازاروں، سڑکوں اور کوچوں کا ذکر ہوتا ہے تو اپرچر بند ہو کر غیر ضروری لائٹ کے ساتھ غیر ضروری جزئیات کو خود ہی کاٹ دیتا ہے اور صرف

ضروری ضروری ڈاکومنٹیشن رہ جاتی ہے۔ قدم بہ قدم ایک خوبصورت ڈاکومنٹری فلم ہے جسے سکرپٹ رائٹر نے اپنے زورِ بیانی سے کہیں بھی سجانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف ہندوستان میں اپنے رستوں پر کیمرے کی آنکھ کھول دی ہے اور اس میں کسی ٹرک شاٹ کا اضافہ نہیں کیا۔

کبھی کبھی البتہ پڑھنے والے کا یہ دل ضرور چاہتا رہتا ہے کہ کاش ''پگڈیوں'' کے بارے میں کچھ اور تفصیل سے لکھا ہوتا یا بھارت کی ادبی محفلوں کی کچھ اور تفصیلات بہم کی ہوتیں لیکن اگر یوں ہوتا تو پھر یہ سکرپٹ اس انداز کا دستاویزی نہ رہتا۔ عام سفرناموں کے انداز کا ایک ادبی تحقیقی تاریخی مقالہ بن جاتا۔

ان دونوں کتابوں کی اشاعت پر اور آج ان کی تقریبِ رونمائی پر میں مصنف کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جس طرح محبت میں انسان اپنے محبوب کے بارے میں ایسے ہی سوچنے لگ جاتا ہے جیسے محبت کرنے سے پہلے اپنے بارے میں سوچا کرتا تھا اس طرح عرفان اپنی کہانیت کے اندر اس طرح ڈوبا رہے جیسے وہ اپنا پہلا افسانہ لکھتے وقت ڈوبا تھا۔

تادمِ تحریر

بڑی عمر کے بڑے بزرگ ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان چھوٹوں کے ساتھ مکینکل قسم کی شفقت کر کے انہیں اپنے پیچھے لگا سکتا ہے اور پھر ان سے ہر طرح کے کام نکال سکتا ہے۔ میں ینگر ادیبوں کے ساتھ ہمیشہ مربیانہ انداز میں پیش آتا ہوں اور ان کے ہر کام کی حوصلہ افزائی کیا کرتا ہوں۔ اس سے وہ بھی خوش رہتے ہیں، میرا وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے اور لوگوں کو بھی شکایت کا موقع نہیں ملتا۔

''تادمِ تحریر'' کی اشاعت سے پہلے تک مصنف عزیز کے ساتھ میرا کچھ اس قسم کا رشتہ تھا کہ میں اس کی ٹھوڑی سے ذرا اوپر اور نچلے ہونٹ سے ذرا نیچے اپنی الٹی انگلی رکھ کر ''شت'' کر کے اس کی باچھیں کھلا دیتا تھا اور وہ اری (ایک قسم کا چاول ہے) چاول سے دو دانت نکال کر کلکاریاں مارنے لگتا تھا۔ پھر جدھر جدھر میں گھومتا بچے کی گردن اور اس کی نظریں ایک ایز گن کی طرح مجھے اپنے فوکس میں رکھتیں لیکن ...... ''تادمِ تحریر'' نے جان شکنجے میں کس کر ٹھیک نشانے پر گولہ مارا اور مجھے ہٹ کر دیا۔

مجھے اس کتاب کے نہ تو سفرناموں سے خوف آتا ہے کہ میں نے ایام جوانی میں خود ایسے سفرنامے لکھ کر دیکھے ہیں اور حال ان کا اچھا پایا۔ نہ قند مکرر وغیرہ سے کمتی لڑتا ہوں کہ ایسے مضامین اگر لکھے نہیں تو پڑھے ضرور ہیں۔ نہ ہی مجھے ریڈی میڈ تقریریں ڈراتی ہیں کہ ایسی تقریریں روز ہی سننے میں آتی ہیں۔ ابھی سن رہا تھا اور جب میں واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھوں گا تو باقی کی بھی سننی پڑیں گی۔ یہ تو ہمارا ایک ادنیٰ معمول ہے لیکن جس عبارت نے مجھے خوفزدہ کیا ہے اور اس بڑی بزرگی میں سوچنے پر مجبور کیا ہے، وہ اس کتاب کا اولیں دریچہ ہے جسے صدیق سالک نے ایکسرے رپورٹ کا نام دیا ہے۔

ہمارے یہاں ...... تیسری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص ادیب اور مصنف ان باتوں کے خلاف کلمۂ حق نہیں کہا کرتے جن پر دو سپر پاوروں میں سے کسی ایک کی مہر تصدیق ثبت ہو اور جس کو انہوں نے اپنی مہر لگا کر ہماری منڈی میں پھینک دیا ہو۔ ان مہروں کا تہور ہی اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ کوئی دیسی دانشور نہ تو ان کا تجزیہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ان کے بارے میں اپنی رائے دینے کی

جرأت کر سکتا ہے۔ اپنے تمام تر علم کے باوجود اس میں سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے ادب میں ایسے کی صنف، ہزار کوشش کے باوجود، ابھرنے نہیں پاتی۔ کچھ مخولیا سے جواب مضمون یا مارکھنڈ چونڈی وڈھ کالم ضرور مل جاتے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہوتے۔ اگر آپ ''نادم تحریر'' کے جمہوریت، آئین، مارشل لا، اسلامی جمہوریہ، بیوروکریسی وغیرہ کے مضامین کی روح میں اتر کر دیکھیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ صدیق سالک نے اپنے حال کے حوالے سے ان اہم موضوعات پر لنگر کھینچ کر چوٹ ماری ہے لیکن ہر ضرب شدید کے بعد اپنے کسے ہوئے لنگر کے ساتھ بھاگ گیا ہے جس ظالم کے ساتھ لاکھوں مظلوم اس کی سبھا کو موجود ہوں اس کو سامنے کی چوٹ مارنا اور پھر میدان میں کھڑے رہ کر اپنے آپ کو لنچ کروانا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ اس لیے صدیق سالک نے یہ التزام کیا ہے کہ اگر مظلوم اسے پکڑ کر اپنے پیارے اور محبوب ظالم کو ہٹ کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لنچ کرنا چاہیں تو وہ اونچی آواز میں کھسیانی ہنسی ہنس کر کہہ سکے کہ میں نے تو باسے باسے میں یہ کام کیا تھا۔ آپ اس کو سیریسلی لے کر بیٹھ گئے لیکن یہ بھی مجھے مصنف کا ایک ٹرک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تیور کڑے پڑتے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ آگے چل کر یہ سیدھے سبھاؤ وار کرنا شروع نہ کردے اور اردو ادب میں پہلے بغاوتی کے نام سے داخل نہ ہو جائے۔ مصنف کا یہیں روک دیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اسی لیے اس کا رخ یتیم کے آنسو، بیوہ کی آہوں، جمہوریت کی برکتوں اور اظہار برملا کی خوشیوں کی طرف فوراً پھیر دینا لازمی ٹھہرتا ہے۔ صدیق سالک اپنی حد سے باہر ہوا جا رہا ہے اور اس نے کلیشے کی دنیا سے نکل کر خیال انگیز باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ اردو ادب کو اس کا نوٹس لینا چاہیے اور اسے قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔

مدعی کے طور پر میں اپنا استغاثہ دائر کرتے ہوئے عدالت ادب کی توجہ اس کتاب کے ایک چھوٹے سے مضمون ''بابا خیرا'' کی طرف دلاتا ہوں۔ یہ نہ تو مزاحیہ مضمون ہے نہ سفرنامہ ہے نہ ہی شگفتہ خاکہ ہے۔ اس میں مدعا علیہ نے جان بوجھ کر، دیدہ و دانستہ، بہ سلامتی، ہوش و حواس ہم پڑھے لکھے، ذی علم، گنی گیانی زیرک اور ذہین تعلیم یافتہ لوگوں پر حملہ کیا ہے۔ کیا ہم پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگ جو ضلع کچہری میں روز مظلوموں کی دادرسی کرتے ہیں، لاٹ صاحب کے دفتر میں مخلوق خدا کو آسانیاں عطا کرتے ہیں۔ دانشگاہوں اور درسگاہوں میں ادب اور احترام کی دولت بانٹتے ہیں، محفلوں مجلسوں انجمنوں میں محبت، شفقت اور رحمت کی ٹھنڈکیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم وہ کہ جن کا ماٹو میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے ان کو بابا خیرا سے اس قدر ذلیل کروانا، اس قدر کمینہ اور سفلہ ہونا اور ہماری اس طرح سے ہتک اور تذلیل کروانا کہ اس سے پہلے آج تک مطبوعہ صورت میں کہیں بھی موجود نہیں۔ ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اس کے خلاف سارے پڑھے لکھے لوگوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیے اور حکومت وقت پر زور دینا چاہیے کہ وہ ''نادم تحریر'' کو ضرور سنسر کرے اور اس کے اگلے ایڈیشن سے ''بابا خیرا'' کا مضمون نکلوا دے۔

صدیق سالک! مصنف "تادمِ تحریر" آج سے میری اور تمہاری راہیں الگ ہوتی ہیں۔ تم سوچ اور پرکھ کی دنیا میں اتر کر اپنی سوچی ہوئی بات کہنے لگے ہو۔ میں سوچ اور پرکھ کی دنیا میں اتر کر ہمیشہ دوسروں کی سوچی ہوئی بات کہتا ہوں۔ تم اپنے حال کی بات کرنے لگے ہو۔ میں کتاب کی بات کرنے کا عادی ہوں۔ تم دمِ تحریر ہو، میں حدِ تحریر میں جمع ہو چکا ہوں۔ میں تم سے اس لیے الگ ہو رہا ہوں کہ جن ہونٹوں کے نیچے میں الٹی انگلی رکھ کر تمہیں خوش کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا "بابا خیرا" کے بعد اب ان ہونٹوں پر پہرا بیٹھنے والا ہے اور لوگوں کا پہرا حکومتوں کے پہرے سے زیادہ کڑا ہوتا ہے۔ میری نصیحت ہے کہ سوچو ضرور لیکن بات وہی کرو جو لوگوں کو پسند ہو...... خدا حافظ۔ اور شاباش!

جستجو

اردو کے تنقیدی مضامین پڑھتے ہوئے مجھ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے اور جب کبھی کسی محفل میں میں ایسے مضمون سنتا ہوں تو مجھ پر اس فقیر بچے کی شرمندگی طاری ہو جاتی ہے جس کو وہ خوش گفتار، خوش انداز اور خوش فکر نوجوان بار بار جھڑکی دے کر بھگاتے رہیں کہ دفع ہو، پیچھا چھوڑ، مر پرے مگروں لہہ۔ دراصل میں ایسے مضمونوں کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں لیکن صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتا اور مجھے نقادوں کی طرف سے اکثر جھڑکیاں ملتی رہتی ہیں۔ ان مضامین میں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اصول موضوع، معروضی جسارت، احیائی میلانات، تنقیدی منہاج اور تناظر جیسے الفاظ اتنی کثرت سے آتے ہیں کہ مجھے ان کو دوبارہ انگریزی میں ٹرانسلیٹ کر کے ان کے معانی کو اچھل اچھل کر پکڑنا پڑتا ہے۔ جگنو بڑی روشنی عطا کرتے ہیں لیکن ان کو مٹھی میں بند رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ایسے بامعنی پروقار اور خوش وضع روشن الفاظ میرے ذہن کی مٹھی سے نکل نکل جاتے ہیں اور میں گل محمد کی طرح ذہنی طور پر نہ جنبد بن کر رہ جاتا ہوں۔ ایسے مضامین چونکہ جدلیاتی مادیت سے لے کر تحلیل نفسی تک اور وجودیت سے لے کر رمزیت تک انگریزی کی انڈر کیرج کے سہارے ٹیک آف کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ان کے انگریزی تراجم بھی ساتھ ہی مل جایا کریں تو سمجھنے میں بڑی آسانی رہے لیکن وقت کی تنگی کے پیش نظر نقاد حضرات ایسا نہیں کر پاتے۔

تحسین فراقی کی ''جستجو'' نے البتہ مجھے اس شرمندگی سے کافی حد تک بچائے رکھا اور میں اس کتاب کے سارے مضامین آسودگی سے پڑھ گیا۔ گو تنقید کی اس سواری کے سارے کل پرزے ولایتی اور اس کا رنگ و روغن دساوری ہے لیکن اس کا رخ اپنی منزل کی طرف ہے اور علم اور عمل دونوں پر رخ کو فضیلت حاصل ہے۔ کومٹ منٹ تو بڑی چیز ہے اور بڑے لوگوں کا کام ہے۔ ہم سے تو کومٹ منٹ کی طرف رخ بھی نہیں ہو پاتا۔ میرے جیسے کم ہمت لوگ کومٹ منٹ کی کھڑکی کی طرف منہ کرنے کے بجائے ادھر دم کر کے کھڑے رہنے کو بھی کومٹ منٹ ہی سمجھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ کنکشن لگا ہوا ہے۔ مجھے جس طرح نئی نسل کے غزل گو شعراء نے گھٹنے ٹیک کر بار بار سلام کرنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ اسی طرح تحسین فراقی کی جستجو نے الٹا کے رکھ دیا ہے۔

تحسین کی تنقید کا سب سے بڑا کمال ٹھیک ٹھیک نشانے پر تیر مارنا ہے اور ہدف کو ہر وقت نگاہ میں رکھنا ہے۔ ترکش سے تیر نکالتے ہوئے شست پر بٹھاتے ہوئے چلّہ چڑھاتے ہوئے، تیر چھوڑتے ہوئے ہدف ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا اور یہ منہ زور نقادوں کی طرح موضوع کے کرّے سے سینٹری فیوگلی باہر نہیں جا پڑتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی مشکل بھی ان کی راہ میں ہے کہ انہوں نے ادب اور بہت سے متعلقہ سماجی علوم کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے جو ان کے تعین کی راہ میں تلون پیدا کرتا ہے۔ اصل میں اگر ایک ہی معیار سامنے ہو تو یکسوئی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ ہر ایک جگہ سے معیار کے نمونے پسند اور ناپسند کرتے پھرنا اور ان کی ترتیب و تدوین میں لگے رہنے سے بے چینی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

جستجو کا مطالعہ کرنے کے بعد جسے میں ایک بار پھر اسی شوق اور توجہ کے ساتھ پڑھوں گا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تحسین فراقی ہمارے یہاں کا وہ پہلا نقاد ہے جس نے پاکستان کے ادبی مسائل کو دیسی طریق پر آنکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بازوے پدر نہ ہونے کی وجہ سے یہ لڑائی ولایتی شمشیر سے بھی لڑنی پڑی ہے لیکن اس مبارزت میں اس نے انداز بازوے پدر والا بھی اختیار کیا ہے۔ تحسین چونکہ خالص قلب کا سپاہی ہے اس لیے محافظت نہ ہونے کی وجہ سے میمنہ میسرہ کے زخم کھا گیا ہے۔ ''حرفِ چند'' میں اس نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ داخل کر کے فوجداری دعویٰ بھی دائر کیا ہے لیکن میدان چھوڑ کر بھاگتا نظر نہیں آتا۔ ہم سب اس کے اگلے معرکوں کے منتظر رہیں گے جو زیرِ طبع کتابوں کے میدانوں میں سر کیے جائیں گے۔ اس وقت تک ہم اس خوبرو، خوش نیت اور خودآرا سرہنگ زادے کے لیے دعا کرتے رہیں گے۔

ساتواں در

اب مجھے ٹھیک سے تو یاد نہیں کہ یہ کس کی بات ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ بات روم یونیورسٹی کے سٹاف روم میں ہوئی تھی کہ ایک اچھی نظم ایک مکمل صورتِ احوال ہوتی ہے۔ یادگار لہجے میں بات کرتی ہے اور الفاظ کا اسراف نہیں کرتی اور لکھی صرف اس لیے جاتی ہے کہ اتر رہی ہوتی ہے۔'' امجد کی نظمیں پڑھ کر مجھے ہر مرتبہ یہ بات یاد آ جاتی ہے۔ اس کی ساری نظمیں پڑھ کر نہیں، کوئی کوئی..... لیکن اس کوئی کوئی کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ امجد نے اتنے مانگ مطالبے کے زمانے میں شاعری صرف اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے کیوں اوڑھی اور اسے وسیع و عریض اور فوری شہرت حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ اپنایا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا اور مجھ میں شاعری کا ایسا ملکہ ہوتا تو میں اپنی شاعری کو احتجاج اور للکار اور تہی دامنی کی پکار بنا کر اس سے بہت کچھ حاصل کرتا اور ممکن ہے بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد اس سے بقائے دوام بھی حاصل کر جاتا لیکن یہاں چوائس میرا نہیں امجد اسلام امجد کا ہے۔

اب جوں جوں وقت گزر رہا ہے اور زندگی پر میری گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے اور کبھی کبھی مجھے امجد کی نظمیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں تو میں اس نتیجے پر پہنچنے لگا ہوں کہ وہ سچ جس کا اظہار ہم اتنے برس اتنی شد و مد سے پکار پکار کر کرتے رہے، وہ سچ نہیں تھا ایک پلیٹ فارم تھا جس پر کھڑے ہو کر ہم سچ کی سلائیڈیں دکھاتے رہتے ہیں۔ کسی مضمون کی تشریح کرنے والا ہمیشہ مضمون سے باہر ہوتا ہے۔ جبھی تو وہ اس کی تشریح کر سکتا ہے لیکن واقعہ جب کسی پر گزر رہا ہوتا ہے، کسی پر رول کرتا ہے۔ کسی کا حال بن جاتا ہے تو صاحبِ حال خود اس کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس لیے جن لوگوں پر سچ وارد ہوتا ہے وہ اس کی تفسیر کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ اندر سے ''رانجھا'' ''رانجھا'' کی ہلکی سی آواز ضرور آتی رہتی ہے جو آہستہ آہستہ دائروں کی صورت میں پھیل کر شاعری کا ہیولا سا بن جاتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ امجد پورے کا پورا ایسا شاعر ہے البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی بعض نظمیں انہی دائروں کی ہیئت سے وجود میں آئی ہیں۔ آپ نے اس مجموعے میں یہ نظم دیکھی ہوگی:

میں اپنے ہونے کے اور نہ ہونے کے مخمصے میں یہ سوچتا ہوں

یہ میرے چاروں طرف جو بکھری ہوئی خلاء ہے

میں اس کے اندر ہوں۔ اس سے باہر ہوں

اس کا حصہ ہوں

یا کہ کیا ہے؟

تحیر، تکبر کا دشمن ہے۔ تکبر کو سارے سوالوں کے جواب آتے ہیں۔ تحیر بالکل سیدھی اور سامنے کی چیزوں پر بھی اٹک کے رہ جاتا ہے۔ تکبر طاقت ہے، زعم ہے حکمرانی ہے، پکا یقین ہے۔ تحیر شاعری ہے، معرفت ہے، سپردگی ہے، تکبر کبھی بھی علم کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتا کیونکہ جو علم عاجز نہیں نربل نہیں منکسر المزاج نہیں وہ محض ایک دھوکا ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ علم چوری کا ہے اور دوسروں سے لوٹا گیا ہے۔ امجد اس سلسلے میں بہت ہی خوش قسمت ہے کہ اس کی شاعری میں لوٹ مار اور دھونس دھاندلی کے مال کی برآمدگی بہت ہی کم ہے۔ بہت کم میں نے اس لیے کہا کہ کہیں کہیں اپنے ہم عصروں کی ریس میں یہ بھی حاضر مال تیار کر کے دے دیتا ہے...... حالانکہ اندر سے اس کا دل نہیں مانتا۔

یہ بات آپ مجھ سے بہت بہتر جانتے ہیں کہ خیال کا عمل شروع ہونے سے پہلے کی کیفیت حیوانی اور ہیجانی ہوتی ہے۔ جب خیال کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان، انسان ہونے کے دائرے میں آ جاتا ہے لیکن جب خیال کا عمل ختم ہو جاتا ہے، اس وقت انسان معرفت میں داخل ہو جاتا ہے۔ میں خدانخواستہ یہ تو نہیں کہتا کہ امجد جیسا ماڈرن انسان جو جلد ہی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے معرفت جیسی رجعت پسند موج پر یقین رکھتا ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کی کسی واپری ہوئی نظم میں جب خیال کا عمل رکھتا ہے تو پھر ایک اور ہی مونٹم میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ جیسے ہوائی اڈے پر پہنچنے سے بہت پہلے جب جہاز کے انجن بند کر دیئے جاتے ہیں تو اس کی لپک میں ایک اور ہی طرح کی بڑھت پیدا ہو جاتی ہے۔ سفر کا یہ آخری ٹوٹا ہی امجد کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ بریڈلاف کی رائٹرز ورکشاپ میں رابرٹ فراسٹ کہا کرتے تھے کہ ایک نظم ترنگ میں شروع ہوتی ہے لیکن اس کا خاتمہ دانش کے اندر ہوتا ہے۔ امجد کی بے شمار نظمیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں اور ...... ''ذرا پھر سے کہنا'' میں تو ان کی تعداد بہت کافی ہے۔ میری طرح آپ کو بھی ''ایک کمرۂ امتحان میں'' سفر کا آخری ٹوٹا ساتھ بہا کر لے جاتا ہوگا کہ:

وقت کی عدالت میں ...... زندگی کی صورت میں

یہ جو تیرے ہاتھوں میں، ایک سوالنامہ ہے

کس نے یہ بنایا ہے...... ؟ کس لیے بنایا ہے؟'' کچھ سمجھ میں آیا ہے؟''

زندگی کے پرچے کے

سب سوال لازم ہیں، سب سوال مشکل ہیں
بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں، پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
ان بنے سے لفظوں پر انگلیاں گھماتا ہوں
حاشیے لگاتا ہوں..... دائرے بناتا ہوں
یا سوالنامے کو..... دیکھتا ہی جاتا ہوں
اسی طرح
''ابھی کچھ دنوں میں''..... یا پھر
روشنی اور تاریکی شاید، ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکا ہے
وقت کی اس ناوقتی کے سیلاب میں..... شاید
آج ہی واحد لمحہ ہے!!

لیکن میں ابھی اور کہاں تک گنواتا اور سنواتا جاؤں۔ شاعری تختہ سیاہ پر نہیں سمجھائی جاتی یہ دماغوں کی پراڈکٹ نہیں سویدا سے سویدا تک کا لاسلکی سلسلہ ہے اور جو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے سارے نیٹ ورک کو Jam کر دیتا ہے۔

برآبِ نیل

تہذیبی اعتبار سے دریائے نیل کی وادی ہمیشہ سے فیشن میں رہی ہے۔ آرٹ کے شیدائی جس تہذیب کو عروج بخشنا چاہیں۔ اس کے ڈانڈے مصری دفینوں سے ملا دیتے ہیں۔ ان دنوں امریکہ میں جدید ترین تت کا ہے۔ کہتے ہیں اس دسمبر میں می تتن خامن کے اصلی نوادرات کی نمائش نیو یارک میں ہوگی جس سے قریباً ایک لاکھ امریکی مشرف بہ مصری تہذیب ہوں گے۔ 1968ء میں پندرہ قبل مسیح کا ایک نادر مندرون ڈور اسی نیو یارک میں مستقل طور پر منتقل کیا گیا تھا۔ جس عمارت میں اس کو گھر کیا گیا اس شیشے جڑی عمارت پر ساڑھے اسی لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ ان دس سالوں میں مصری تہذیب سے امریکیوں کا شغف اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ نفرتیتی کے سگریٹوں سے لے کر خاص قسم کی بش شرٹ مرکز توجہ ہے۔ تت کی ٹی شرٹ کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک ٹی شرٹ کے لیے کئی گھنٹے قطار میں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔

علی اکبر عباس نے پتہ نہیں امریکی بش شرٹ سے متاثر ہو کر اپنی کتاب کا نام "برآبِ نیل" رکھا ہے کہ اس کے ذہن میں وہ صندوقچہ تھا جو الہام کی بجلی سے نیل کی لہروں پر تیرتا چلا آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عباس کو محض اس کا ساؤنڈ ایفکٹ اچھا لگا ہو لیکن اس نام کے چناؤ سے مجھے اس کے ذہن تک پہنچنے کا پہلا سائن ملا ہے۔ اس کے شعروں میں جو ایک خاص قسم کی مجذوبیت...... ایک بے پروا سچائی...... جگانے اور خود جاگ جانے کی آرزو...... چھوٹے سے ہمدرد انسان کا جھوٹا سچا عمومی کرب جو کچھ بھی ہے سارے کا سارا اسی نام کی بدولت نظر آتا ہے...... ملاحظہ کیجیے۔

کون مجھ کو سکھلائے طور آدمیت کے؟
میں کہ اک فرشتہ ہوں بھیڑیوں میں اترا ہوں

بے کار چٹانوں سے نہ ٹکرائیں کدالیں
تعمیر سے پہلے ہی نہ جسموں کو تھکا لیں

نہ جانے چہرے ہوں آئندہ نسل کے کیسے؟
بس ایک خوف سے میری رگیں سکڑتی ہیں

میرا بیٹا میرے دشمنوں کی ہی تصویریں بنائے
میرا ابا اس کی کاپی دیکھ کر گھبرا گئے!

نام ہی کے حوالے سے پھر بات جاری رکھتا ہوں۔ ہمارے زمانے میں ماں باپ عموماً بچے کا نام قرآن کریم سے رکھتے تھے۔ نام کے انتخاب میں بڑے، بوڑھے، پیرومرشد اور تاریخ اسلام سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ اسم کا اعادہ منتخب خاصیتوں کو مسمّی میں ابھارنے اور پھر پختہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شکر الحمدللہ اب بھی یہ روایت تو جاری ہے لیکن مغربی تہذیب کے اتباع میں کچھ ایسے نام رکھنے کا بھی رواج عام ہو چلا ہے جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو قابل تحسین نہیں ہوتے۔ مغربی لوگوں کا شعار ہے کہ وہ پس ماندہ ممالک کو اپنی ڈگر پر چلا کر بہت جلد کسی اور راستے پر چلے جاتے ہیں۔ آج کل وہاں یہ ریسرچ ہو رہی ہے کہ مریم نامی لڑکی اور ماریا نامی دوشیزہ میں نام کی رعایت سے کیا کچھ بنیادی فرق پڑتا ہے اور کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آئندہ بچوں کو چھوٹے بے معنی ناموں کے بجائے بامعنی ثقیل ناموں سے بلایا جائے۔

اگر علی اکبر عباس کی کتاب کا نام کچھ اور ہوتا مثلاً دیوار شام یا نیم باز دریچہ یا سوئے ہونٹ کا جادو تو غالباً اس کتاب کا مزاج بھی کچھ اور ہوتا یا یقیناً وہ ہوتا جواب نہیں ہے۔ اس وقت کتاب پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک آبگینے کی مانند ہے۔ دکھی دل کی طرح حساس ...... لطیف رنگوں کو منعکس کرنے والی، ریختہ رو دم سادھے ہوئے۔ عباس کے شعروں میں وہ لہریں بھی موجود نہ ہوتیں جو ہر وقت ٹوٹتی رہتی ہیں لیکن نہ کبھی ختم ہوتی ہیں نہ ان کے تواتر میں کمی آتی ہے۔ اس کی شعریت میں وہ روانی بھی موجود نہ ہوتی جو بہتے پانیوں کا فاصلہ ہے۔ جس طرح دریائے نیل تہذیب پارینہ کے عکس سے جھلکتا ہے۔ ایسے ہی عباس کے دل میں تہہ در تہہ ذاتی اور اجتماعی وقت آشنائی واقعات جھلملاتے ہیں۔ یہ غالباً نام ہی کی برکت ہے کہ وہ زمین کی طرح پھٹا نہیں / ہوا کی طرح آوارہ نہیں / بلکہ بہتا ہی چلا جاتا ہے ...... زیادہ پانیوں کی تلاش میں۔

عباس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جہاں کی اصل ہو پانی وہیں پہ مرتا ہے	ستارہ ٹوٹ خلاؤں میں ہی بکھرتا ہے

یا

لکھا گیا مرے ہاتھوں پہ قتل بھائیوں کا	یہ مجھ کو ورثے میں جلادیاں ملی کیسی؟
اپنا آپ نہیں ہے سب کچھ اپنے آپ سے نکلو	بدبوئیں پھیلا دیتا ہے پانی کا ٹھہراؤ
بوڑھی شام نے بالوں میں مہندی بکھرائی	کڑیل دن بھی پہر پہر رت کھیل رہا ہے

یہ شعر سنانے کے بعد اگر میں آپ سے کہوں کہ عباس بڑی منفرد سوچ کا شاعر ہے تو آپ کہیں گے

کہ سب شاعر سوچ کے شاعر ہوتے ہیں۔ جب سوچ بغیر شعر کی تخلیق ہی ممکن نہیں تو اس میں انفرادیت کی کیا بات ہے؟ لیکن میں پھر عرض کروں گا کہ واقعی عباس کی سوچ اس کی اپنی سکہ بند ہے۔ اس کی سوچ کے روپے پر دونوں طرف اس کی اپنی تصویر ہے۔ عموماً شعر اس وقت لکھا جاتا ہے یا نازل ہوتا ہے۔ جب محبوبہ کشف کا دریچہ کھلتا ہے لیکن عباس نے اس جھروکے کو محبوبہ کی اعانت کے بغیر اپنی سوچ کے پیچ کس سے کھولا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ عباس کی شاعری میں سوچ کی زیادتی اور جذبے کی کمی ہے نہیں بلکہ یہاں تو احساس کی بارش نے کھڑکی سے نظر آنے والے منظر کو خود دھو رکھا ہے۔ اس کے تو ہر ہر شعر میں گلوگیر جذبہ بین کرتا نظر آتا ہے لیکن عباس کا طریقہ واردات مختلف ہے۔ وہ جذبے کے نوکیلے پتھر کو اپنی سوچ کی کھنالی میں ڈال کر دافع المرکز حرکت سے اتنی دیر تک گھماتا رہتا ہے کہ جذبے کی شکل اس بلور کی سی ہو جاتی ہے۔ جس میں نیلے پانیوں کے لہریے رنگ بھی ہوتے ہیں اور اپنی گردش کا سارا سفر بھی ...... اسی لیے عباس کی شاعری میں نہ تو سوچ چٹان کی طرح خود نمائی پر مجبور ہے نہ بنجر سنسان علاقے کی طرح بے حس ...... وہ تو پانیوں کی طرح دھیرے دھیرے بیچ سبھاؤ سوچتا چلا جاتا ہے۔ دوسروں کا بوجھ لادے ...... کناروں سے ٹکراتا اپنی سطح ہموار کرتا۔ اس لیے جس طرح دریا کا منظر دوسرے منظر کے مقابلے میں تھکا دینے والا نہیں ہوتا، عباس کی سوچ بھی اکتانے والی نہیں بلکہ قطرہ قطرہ نمناک کرنے سے لے کر مکمل طور پر غرقاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عباس نے بر آب نیل میں بڑا بھاری اور بہت لطیف بوجھ اٹھالیا ہے۔ اب دیکھیے وہ کسی فرعون کے ماتھے لگتا ہے کہ بی بی آسیہ کے اس کو قتل کرنے کا حکم ملتا ہے کہ ابدیت سے ہمکنار ہونے کا کیونکہ شہر والے رحم دل بھی ہیں اور ہاتھوں کو پیس ڈالنے والے کوہ گراں بھی ...... لیکن بات شاید مبارک لمحے فرخندہ ساعت اور شبھ گھڑی کی ہوتی ہے ...... خدا کرے یہ لمحہ اس کتاب کے لیے لمحہ سعید ہو۔ آخر میں عباس کی ایک نظم سنا کر رخصت ہوتا ہوں۔

مائیوں بیٹھی دلہن سرسوں دار کماد
جھمکے پہن کپاسیں ناچیں دلہن کی غم زاد

بیری مائی تسبی تھامے دانہ دانہ پھینکے
من ہی من میں کہتی جائے کر اپنے دن یاد

مست ملنگ گلے میں مالا بال بکھیرے
وجد میں آ کر جھوم رہے ہیں ہر غم سے آزاد

کوے بھانڈ فقیر کبوتر ٹولی ٹولی آئیں
اور دعائیں مانگیں ویہڑا سدا رہے آباد

جذبوں کا شاعر

جناب والا..... میں عدم صاحب کو زیادہ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ وہ میرے ہمعصر مصنف تھے اور مجھ سے عمر میں ذرا سے سینئر تھے۔ اس زمانے میں اپنے سے سینئر لوگوں سے بے تکلفی کا اظہار اور انہیں دوستی کے لیول پر اتار کے رکھنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ہم احترام کے طے شدہ درجے پر ہی رہتے تھے حالانکہ اپنے سے بڑوں کی پگڑی اچھالنے کو اس وقت بھی بڑا دل چاہتا تھا۔

میں عدم صاحب سے ان کے ملٹری اکاؤنٹس والے دفتر میں بھی ملتا رہا اور ان کے گھر پر بھی حاضر ہوتا رہا لیکن ہماری یہ ملاقاتیں دوستی کی حدود میں کبھی داخل نہ ہوئیں۔

عبدالحمید عدم اردو کے ایک بہت بڑے شاعر تھے جن کو میرے حساب سے اتنی توجہ نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ویسے یہ المیہ ہر اعلیٰ پائے کے تخلیقی فنکار کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور ہر بڑے قلمکار نے اس کو بہ رضا و رغبت قبول کیا ہے۔ عدم کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہے اور اس کے وژن نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ وہ انسان کے آفاقی اور سماوی اور ان دونوں کے درمیان اور بھی جو کچھ ہو سکتا، ان سارے دکھوں سے واقف ہے اور انسانی آہوں اور کراہوں میں گریک ٹریجڈی کے کرداروں کی طرح شامل ہے۔ اگر اس نے اپنی نگاہیں صرف اکنامکس تک محدود رکھی ہوتیں اور انسان کے صرف معاشی حالات کا رونا رویا ہوتا تو آج اس کی دھوم چاردانگ عالم میں ہوتی..... لیکن ایک لکھنے والے کے لیے سب سے مشکل فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تالی بجوانے کے لیے لکھے یا جو کچھ وہ اندر سے محسوس کرتا ہے اس کے متعلق لکھے اور اس جہان گزراں میں اکثر یہ ہوا ہے کہ جب کسی نے اندر کے محسوسات پر نظر ڈالنے کی کوشش کی تو وہاں سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ نہ محسوسات ملے نہ اندر کا پتہ ہی چل سکا۔ چنانچہ منڈی کا بھاؤ معلوم کر کے نئے شاعر نے بھی وہی شملا بیچنا شروع کر دیا جس کا ڈنٹھل موٹا، وزن زیادہ اور منڈی میں مانگ زیادہ تھی۔

آپ میری بات مانیں گے تو نہیں کیونکہ آپ نے ہمیشہ یہی کہہ کر مجھے بڑی محبت سے ٹال دیا کہ آپ کی باتیں ہمارے سر سے گزر جاتی ہیں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ اختر شیرانی کے بعد جس

شاعر نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی وہ عبدالحمید عدم ہی تھا۔ عدم کے بعد کی آنے والی شاعری بیشتر دماغی ہے اور دماغوں پر قبضہ کرنے کا پلان بنا کر آئی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہے لیکن جس شاعری کے دلوں پر نازک جذبوں پر اور کامناؤں کے ہنکوروں پر ہونٹ نہ ہوں وہ شاعری نہیں اور بہت کچھ ضرور ہوتی ہے۔

عبدالحمید اپنے زمانہ حال کا بڑا شاعر تھا اور آنے والی نسلوں کے حال کا اس سے بھی بڑا شاعر ہوگا۔ یہ بات الگ ہے کہ موجودہ فعل حال میں ہمارے جذبوں کی کمی کے باعث وہ خط کشیدہ الفاظ نظر نہیں آتا لیکن اس میں سارا قصور ہمارا اور ہمارے رخ کی نیز دھکا ہے۔ شکریہ

نکلے تری تلاش میں

ہمارے ملک میں سیاحوں کی اور نیک آدمیوں کی بڑی کمی ہے لیکن خدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس نے یہ دونوں خاصیتیں ایک ہی شخص میں جمع کر دی ہیں۔ مستنصر نیک اور شریف بھی ہے اور سیاح بھی اور جاننے والے کے لیے ان دونوں صفات کے درمیان حد فاصل قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مستنصر کی کتاب (نکلے تری تلاش میں) پڑھتے ہوئے مجھے بار بار اس بات کا احساس ہوا کہ کسی شہر میں نیک شریف نوجوان نے سیاح کو آگے لگایا ہوا ہے اور کہیں سیاح ہے بچے کو ولیا کرر یکا سے عشق کرنے گیا ہوا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان دونوں نوجوانوں میں قوی تر، نیک نوجوان ہے جو سیاح کو وجود کے تجربات سے دو چار ہونے نہیں دیتا۔ یہ مشرق کا مزاج ہے اور مستنصر کے سفرناموں کا امتیازی رہنما ہے۔

ہمارے یہاں آج تک جتنے بھی سفرنامے لکھے گئے ہیں، ان میں قاری کو مسافر نے اپنی ذہنی، جذباتی اور جسمانی واردات سے کم روشناس کرایا ہے اور قاری کی رال زیادہ ٹپکوائی ہے۔ ہر سفرنامہ پڑھنے کے بعد قاری کو اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ سیاح کو ایک خوش قسمت، برگزیدہ اور Prirledged شخص سمجھ کر اس سے اس درجہ سے مرعوب ہوتا ہے کہ نہ تو وہ سیاح کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر ملکوں، شہروں، باغوں اور راغوں کی سیر کر سکتا ہے اور نہ اس کی تحریر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس میں قاری کا قصور نہیں ہوتا۔ وہ بے چارہ تو جہاں گرد کے رعب سیاحت کے آگے گل محمد بنا رہتا ہے اور یہی مقصد شاید رپورتاژ لکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ اردو کے اکثر سفرنامے جو میری نظر سے گزرے ہیں، تھانہ ٹبی کی ضمنیوں سے مشابہ تھے جن میں ایک روانگی ایک واپسی اور ان دونوں رپوٹوں کے درمیان درج شدہ واقعات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایسے رپورتاژ رائٹر چھوٹے تھانیداروں کی طرح ہوتے ہیں جو رعب بھی گانٹھتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلنے دیتے کہ وہ رعب گانٹھ رہے ہیں۔ ان کالی کالی بڑی عمر کی محبوباؤں کی طرح جو محبت کا دم بھی بھرواتی ہیں اور محبت کرنے والے کو احساس بھی نہیں ہونے دیتیں کہ وہ محبت کر رہا ہے۔ ایسے لوگوں سے مجھے بڑی چڑ ہے۔ اگر میں نے اخبار پڑھنے کے سوا ذرا سی بھی سیاسی زندگی گزاری

ہوتی تو ان لوگوں کے خلاف ضرور احتجاج کرتا۔

مستنصر کے سفرناموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہوائی کمپنیوں کے پوسٹروں اور ٹورسٹ بیوروز کے رنگین کتابچوں کی طرح سفر پر آمادہ نہیں کرتا۔ آپ کا دل نہیں جلاتا، آپ کی رال نہیں ٹپکواتا بلکہ کہیں کہیں تو آپ کلمہ شکر ادا کرتے ہیں کہ الحمدللہ اس سفر میں شریک نہیں تھا یا خدانخواستہ مجھے ایسا سفر درپیش نہیں تھا...... اس نوجوان کے سفرناموں نے اردو ادب میں سفرناموں اور رپورتاژوں کے بعد ایک نئی صنف ادب کی بنیاد رکھی ہے جسے میں Arm chair Travalouge کا نام دوں گا۔ ان میں کچھ سندباد جہازی کے سفروں کا مزا ہے۔ کچھ حاتم طائی کی دشت نوردیوں کا اور کچھ یوسف خاں کمبل پوش کی سیاحتوں کا۔ پتہ نہیں آدمی پہلے سیاح بنتا ہے اور پھر ایسی لذیذ حکایتیں بیان کرتا یا پہلے داستان گو ہوتا ہے اور پھر کہانیاں جمع کرنے کا شوق اسے سیاحی پر مائل کرتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو مستنصر سیاح بھی ہے اور داستان گو بھی، نوجوان بھی ہے اور نیک بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چھوٹا تھانیدار نہیں!

آج سے چند برس پیشتر میں نے بھی کچھ سفرنامے لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ اچھے بھی تھے لیکن ان میں وہ بات نہ آسکی تھی جس کے آنے کی مجھے شدید آرزو تھی۔ الحمدللہ کہ میری وہ آرزو پوری ہوئی لیکن ایک دوسرے شخص کی تحریر میں۔ اس اعتبار سے مجھے مستنصر کی کتاب '' نکلے تری تلاش میں'' اچھی بھی لگتی ہے اور زہر بھی دکھائی دیتی ہے۔ خدا اس کو مزید سفر اختیار کرنے کی سعادت نصیب کرے اور مجھ کو مزید لکھنے کی۔

نذیر ناجی کی کالم نویسی

دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی نذیر ناجی کے فن کا قائل ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اس کی خوبیوں اور باریکیوں کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح پرندوں کی چہکار، پہاڑوں کے حسن اور طلوع سحر کی دلفریبی کے خصائص بیان نہیں کیے جا سکتے۔ اسی طرح ''سویرے سویرے'' کے کمال فن کو بھی کسی خورد بینی عمل سے آنکا نہیں جا سکتا۔ ہر روز کے اس چھپنے والے کالم کے بارے میں البتہ ایک بات بڑے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو قاری کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ ناجی، دراصل کالم نویسی کے بغداد کی وہ مرجینا ہے جو ہر رات احوال کے دروازے پر ایسا کا ٹا مار جاتی ہے جس کے پیچھے واقعات کی کئی لاشیں چھپی ہوتی ہیں اور جنہیں محفوظ رکھنے کے لیے چوروں نے بڑے اہتمام کیے ہوتے ہیں۔ ایسے نہاں خانوں کی کئی دوسرے لوگ بھی نشاندہی کرتے ہیں لیکن بڑی ناپختگی کے ساتھ اور نہایت اکھڑ پن کے ساتھ۔ ان میں نہ تو مرجینا کا سا حسن ہوتا ہے اور نہ ہی ''وقوعے'' کے ساتھ وہ سلوک جو بادشاہ بادشاہوں سے کیا کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا ہے اور پھر ایک قاری کی حیثیت سے محسوس بھی کیا ہے کہ کچھ لوگ تو علم کے چشموں سے خوب سیراب ہوتے ہیں لیکن باقی کے غرارے سے کر کے آ جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ان غرارے کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہمیں اکثر و بیشتر انہی سے پالا پڑتا ہے۔ ان کی آواز تو بہت اونچی ہوتی ہے لیکن معنی مفقود ہوتے ہیں۔ مخرج بڑا واضح ہوتا ہے مگر بات بڑی نحیف ہوتی ہے۔ ناجی کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بیان، پرل پرل یوں آگے بڑھتا ہے جیسے مداری کے منہ سے فیتہ نکل رہا ہو۔ پتہ اس وقت لگتا ہے جب حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ آپ خود بھی اس فیتے سے ماپے جا چکے ہوتے ہیں اور $E=mc^2$ کی پوری ایکویشن حل ہو کر آپ پر اضافیت کا رشتہ واضح کر چکی ہوتی ہے۔ اکثر یوں بھی ہوا کہ ناجی کا کالم پڑھ کر میرا یہ احساس بھی جاگا کہ ایسا لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں بھی ایک لکھنے والا ہوں۔ میں بھی ایسا لکھ سکتا ہوں لیکن پھر ساتھ ہی ہمیشہ مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کا ''انڈیا بہادر سرکس'' کا وہ شو یاد آ جاتا ہے جس میں شیروں اور باگھوں کے انکلوژر میں ایک خوبصورت اور دلفریب لیڈی کو کھڑا کر دیا جاتا تھا جو اپنی

سکرٹ کی جیب سے مصری کی ایک ڈلی نکال کر منہ میں پکڑ لیتی تھی اور رنگ ماسٹر اپنا چھانا زور سے پٹختا تھا۔ ببر شیر اپنی جگہ سے اچھل کر لیڈی کے دونوں کندھوں پر اپنے پنجے رکھ کر اپنے منہ سے لیڈی کے منہ کی مصری کی ڈلی پکڑ لیتا تھا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ لیڈی اپنی سکرٹ کی جیب سے مصری کی دوسری ڈلی نکال کر منہ میں پکڑتی تھی اور رنگ ماسٹر کے ہنٹر کی آواز پر بنگالی ٹائیگر اچھل کر اپنے منہ سے مصری کی ڈلی پکڑ لیتا تھا۔ اس کے بعد چیتا اور چیتے کے بعد بھگیرا اپنے اپنے حصے کی شاخِ نبات لے جاتے تھے۔ تماشائیوں میں سے سرخ پگڑی باندھے ایک خوبرو جاٹ نے اٹھ کر زور سے کہا۔

''اوئے صاحب یہ کونسی مشکل بات ہے۔ یہ کھیل تو میں بھی کر سکتا ہوں۔'' رنگ ماسٹر نے غصے سے چھانٹا جھٹکا کر کہا ''تو آؤ پھر میدان میں اور کر کے دکھاؤ'' دہقان زادے نے کہا ''پہلے ان شیر جیسے جھیڑیوں کو تو ایک طرف بند کرو، پھر میں ڈلی منہ سے پکڑ کر دکھتا ہوں۔'' تو جناب میں بھی سویرے سویرے جیسا کالم لکھ سکتا ہوں، بشرطیکہ مجھے حالات، واقعات، خوفناک ارادہ جات اور انہونی واردات کا خوف نہ ہو۔ چونکہ میں ناجی جیسا دلیر اور حوصلہ مند رائٹر نہیں ہوں، اس لیے مجھ پر ہمیشہ خوف کا غلبہ طاری رہتا ہے۔ خاص طور پر میں اپنی قوم کی شاباشیوں اور تھپکیوں سے بہت ڈرتا ہوں کیونکہ تھپکی دینے والی جگہ اور ٹھڈا مارنے والی جگہ کے درمیان مشکل سے فٹ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس قوم کا کوئی بھروسہ نہیں، میں نہیں لکھتا کالم۔

اصل میں کالم لکھنے کے لیے ایک خاص وضع قطع، خاص قد بت، الگ چال ڈھال اور مختلف قسم کی شکل و صورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ نذیر ناجی کے چہرے کو غور سے دیکھیں اور کافی دیر تک دیکھتے رہیں تو اس کی مسلسل مسکراہٹ کی وجہ سے آپ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جائے گی۔ بس یہی ایک عظیم کالم نویس کا کمال ہے کہ وہ آپ سے کچھ کہے نہیں۔ آپ سے مخاطب نہ ہو، آپ کا نام نہ لے۔ آپ کو بلائے نہیں لیکن آپ پر ہر وقت ایک ایسی تھرتھری سی جاری ہو جائے جیسے بزرگوں کا قلب چالو ہو جایا کرتا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے ذرائع ابلاغ اتنے وسیع ہو گئے ہیں کہ آج کل دن کے بارہ بجے سے پہلے پہلے آدھی دنیا دوسری آدھی دنیا کی بے عزتی بڑی آسانی سے کر لیتی ہے اور یہ کام زیادہ تر کالم نویس ہی سرانجام دیتے ہیں۔

نذیر ناجی کے کالم سے مجھے ہر روز دو مرتبہ گزرنا پڑتا ہے۔ سویرے سویرے میں خود پڑھتا ہوں۔ دن کے گیارہ بجے میرے ایک دوست بلاناغہ میرے دفتر تشریف لاتے ہیں اور مجھے یہ کالم پڑھ کر سناتے ہیں۔ داد طلب فقروں پر رک کر مجھ سے داد طلب کرتے ہیں اور اگر داد دینے میں مجھ سے ذرا دیر ہو جائے تو ان کے چہرے کی رنگت غیر ہو جاتی ہے۔ اگر میں ان کی خوشنودی کے لیے غلط جگہ پر مسکرا دوں تو وہ فقرہ روک کر خشمگیں ہو جاتے ہیں۔ میں معذرت کر کے اپنی مسکراہٹ واپس لے لیتا ہوں۔ تب وہ آگے چلتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ نذیر ناجی ٹیلی پیتھی کے فن سے بخوبی آگاہ ہے اور رات کے وقت ان کے خیالات چوس کر صبح کالم کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔

میں ابھی نذیر ناجی کی تعریف وتوصیف میں اور بھی بہت کچھ کہتا لیکن اس وقت مجھے روم یونیورسٹی کے بزرگ پروفیسر انگاریتی کا ایک قول یاد آ رہا ہے جو انہوں نے روم یونیورسٹی کی خوش گل لائبریرین ماریا پیاوریتی سے مجھے مشارمشار کر باتیں کرتے دیکھ کر صادر فرمایا تھا۔ ماریا پیاوریتی ہماری یونیورسٹی کی بس صوفیہ اورین ہی تھی۔ پروفیسر انگاریتی نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا ''دیکھو میاں زادے محبوب کی اتنی تعریف نہیں کیا کرتے کہ کسی وقت اگر نہ کر سکو تو اس کو یہ گمان گزرنے لگے کہ تم نے اس سے محبت کرنا بند کر دی ہے اور اتنی مسلسل بھی نہ کرتے جاؤ کہ وہ واقعی اپنے آپ کو تم سے سپریئر سمجھنے لگے۔ اس لیے میانہ روی ہی ٹھیک ہے۔'' تو جناب اب میں بہ امر مجبوری نذیر ناجی اور اس کی تحریر کی تعریف وتوصیف کا سلسلہ بند کرتا ہوں اور اسے یقین دلاتا ہوں کہ جب میں واپس اپنی نشست پر بیٹھا ہوں گا، اس وقت بھی اظہار کے بغیر تمہاری مدح سرائی سے وابستہ ہوں گا۔

شکریہ۔ خدا حافظ۔

جسٹس ایس اے رحمٰن

ایک مختصر سے مضمون میں کسی شاعر کے نصف صدی پر پھیلے ہوئے افکار و آثار کا احاطہ کرنا ایک پیچیدہ عمل سے گزرنا ہے۔ ایک ایسے عمل سے جس کے آخر میں وثوق کے ساتھ یہ بھی نہ کہا جا سکے کہ شاعر کے ساتھ انصاف ہوا اور اس کی شاعری کے بارے میں قول کی حد تک صحیح اعلان ہوا اور اگر شاعر بھی ایسا ہو جس کی ساری زندگی انصاف کی میزان سامنے رکھ کر عدل کی کرسی پر گزری ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت کچھ ایسا ہی مرحلہ درپیش ہے۔

جسٹس ایس اے رحمٰن کی شاعری کی ابتداء اس صدی کے اولیں حصے میں ہوئی اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فکرِ سخن میں مصروف رہے۔ ان کی شاعری کا کچھ حصہ تو ان کی زندگی میں اخبار و رسائل میں شائع ہوا لیکن ان کا بیشتر کلام قارئین کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ سامعین البتہ نجی محفلوں میں اور ادبی نشستوں میں اس سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن کسی شاعر کے کلام کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے تخلیقی عمل کی پرتوں سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے کلام کے تمام سیاق و سباق سے واقف ہوں۔ اس کے لیے اس کے زمانے کے حالات، اس کی زندگی کی تفصیل اور اس دور کے سیاسی شعور کا علم ہی ضروری نہیں بلکہ اس عہد کی ادبی روایات اور سرمائے کا علم بھی ضروری ہے۔

رحمٰن صاحب کی شاعری کی ابتداء اردو زبان کے اس طاقتور دور کی پیداوار ہے۔ جب برصغیر کے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے مجتمع ہو رہے تھے اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح کے خطرے میں اترنے اور ہر نوع کی بلاؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونے لگے تھے۔ یہ اجتماعی فیصلہ، پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ مسلمان کے شعوری اور عامۃ الناس کی غیر شعوری پیش قدمی کی مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔ یہ وہی عہد تھا جس میں مسلم مفکرین نے مشرق و مغرب کے علوم سے استفادہ کر کے نئے خیالات کو اپنی روایت سے باندھ کر نظم و نثر میں عام کرنا شروع کر دیا تھا۔ علم کے بے شمار چشموں الہلال، الوکیل، الندوہ، مخزن، تعارف اور منادی وغیرہ کے راستے پنجاب میں میٹھے پانی کی بہت سی جھیلیں مجتمع ہو چکی تھیں اور ان

پانیوں کی بدولت پنجاب کے دوردراز علاقوں میں دانش وبینش کے چھوٹے چھوٹے نخلستان جگہ جگہ پیدا ہو گئے جن کی سرسبزی اور شادابی میں شاعری کا رنگ غالب تھا۔

جسٹس رحمٰن کے اردو، فارسی شاعری میں داخل ہونے کا یہ وہی زمانہ ہے جب اس وادی میں اقبال، حفیظ، ظفر علی خان کی نمایاں آوازوں کے ساتھ ''جوگی'' والے خوشی محمد ناظر اور شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمہ کرنے والے شاعروں کی ملی جلی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گو رحمٰن نے اپنے عہد کے ان عظیم شاعروں کا دلجمعی سے مطالعہ کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا اثر قبول کیا لیکن انہوں نے ان عظیم آوازوں میں اپنی آواز دبنے نہیں دی۔ کم کہا لیکن جتنا بھی کہا اس میں اپنے لحن کو محفوظ رکھا اور اپنی لے کا امتیازی وصف نمایاں رہنے دیا۔ مثلاً!

آنکھ بھر آئی، دل بھی بھر آیا
اک شجر راہ میں نظر آیا
تھی سراب آفریں رہِ امید
گزرا اکثر گماں کہ گھر آیا

زندگی کی کتاب باقی ہے
آسماں کو ورق الٹنے دو

حسن جذباتی ہے اور عشق خراباتی ہے
بات سے بات نکلتی ہی چلی جاتی ہے

غم سے سینہ شق ہے ساقی
غم کا مجھ پر حق ہے ساقی
غم ہی سے رونق ہے باقی
دل کے سونے ایوانوں میں

روبرو دشت بے نشاں خاموش
دل میں طوفان ہے اور زباں خاموش
رات بھر گزرے دل کی وادی سے
پے بہ پے کتنے کارواں خاموش

رستے بستے شہر میں جیسے کھنڈر
ہم بھی گویا ہیں داستاں خاموش

دل کی وادی میں رہا اندھے اندھیروں کا عمل
ہر سحر ویسے تو پورب ہی سے پو پھٹتی رہی
بوندیوں کو آس کی کھیتی ترستی رہ گئی
رت میں برکھا کے گھٹا چھاتی رہی، چھٹتی رہی

ہوئے صید ستم چپ، چشم نم چپ
ہے چپ ہر سو، زبانیں چپ، قلم چپ
جفا کا ہاتھ جب اٹھے کسی پر
نہیں ممکن رہیں تادیر ہم چپ
جھکیں گے سر وہیں سب خود سروں کے
جہاں ہوتا ہے ہر دارا و جم چپ
کبھی جرم ضعیفی کا ہے پردہ
کبھی عہد وفا کی ہے قسم چپ
پتہ منزل کا پوچھا ہی کئے ہم
رہے رستے کے سارے پیچ و خم چپ

باوجود اس کے کہ رحمٰن صاحب اپنے عہد کی شاعری سے غایت درجہ متاثر ہیں اور ان کے کلام میں اپنے دور کے سارے رنگ نمایاں ہیں لیکن ان کی شاعری کی دو باتیں ان کو اپنے عہد کے سارے شاعروں سے ممیز کرتی ہیں۔ ایک تو ان کا بے انصافی اور ظلم کے خلاف شدت کے کرب میں مبتلا ہونا اور دوسرے اپنے وطن، اپنے پاکستان کے ساتھ شاعر کی غیر مشروط محبت۔ بے پناہ اور لامحدود محبت: ایسی محبت کہ اس کے نزدیک اس کی ہر نادرست بات بھی درست ٹھہرے؟

ظلم، ناانصافی، زورزبردستی اور دھونس دھاندلی کے خلاف ایک تو روایتی قسم کی شاعری ہے جو بے حد مقبول اور جاذب توجہ صنف سخن تسلیم کی جاتی ہیں اور جس کے لیے شاعر حضرات کم سے کم کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ معروف ہو جاتے ہیں اور پھر مقبولیت کے اس حلقہ سے برآمد ہی نہیں ہو سکتے اور دوسری قسم

واردات اور محسوسات سے تعلق رکھتی ہے کہ جب تک گزرے ہوئے واقعے یا سانحے کا لکھنے والے پر گہرا اثر نہ ہو اور اس کی زندگی (خواہ وقتی طور پر ہی کیوں نہ ہو) قال سے حال میں نہ ڈھل جائے وہ جور واستبداد کے خلاف اپنے قلم کو روایتی انداز میں جنبش نہ دے سکے۔ رحمٰن صاحب کا تعلق اس دوسری قسم سے ہے۔ ان کو زندگی بھر ایک ایسی نشست پر بیٹھ کر ان ظلم وزیادتیوں کا مشاہدہ کرنا پڑا جن کی جزئیات ایک عام شاعر کی نظر سے اور پوری تفصیلات اس کے مطالعہ سے نہیں گزرتیں۔ ان کے سامنے بڑے واضح اور خط کشیدہ انداز میں زیادتیوں اور دراز دستیوں کے واقعات پیش کیے جاتے تھے اور ان کو معاشرے کے طے شدہ قانون کے مطابق اپنا قول فیصل دینا ہوتا ہے۔ اگر تو وہ صرف ایک انصاف پسند، نیک دل منصف مزاج جج ہوتے تو یہ ساری زندگی بڑی آسانی سے طے ہو جاتی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس جج کے پہلو میں ایک شاعر کا دل تھا جس کی محض ضابطے کی کارروائی سے تسلی نہیں ہوتی تھی اور وہ قانونی فیصلے سن چکنے کے بعد بھی ملول اور پریشان رہتا تھا۔ ہر لحظہ ایسے بوجھ تلے دبا رہتا تھا جس کا مداوا نہ تو ضابطے اور قانون کے پاس ہو اور نہ ہی کسی ''کرنی والے'' کے ہاتھ میں ہو:

جدتوں کی حد، نہ باقی شدتوں کی کوئی حد
ہوگئی مشکل زمانے میں تمیز نیک و بد

کہنہ قدریں خواب ہیں آئے ہیں پیمانے نئے
زر کی نسبت سے بڑھا اس دور میں آدم کا قد

تجربہ کاروں کی نظروں میں دیانت احمقی
راستبازی عصر کے کھاتے میں ہے بیکار مد

جس میں تھی یہ اہلیت، بن جائے کونے کی اساس
آج کے معمار کرتے ہیں اسی پتھر کو رد

میں نے چاہا تن کو ڈھانکوں
کپڑوں کی بھرمار تھی ہر سو
رنگوں کی برسات!
پر سب اپنے بس سے باہر
دام اونچے اور کیسہ خالی
مرنا سستا، کفنی مہنگی
یہ کیسی خوشحالی بابا؟

یہ کیسی خوشحالی

من میلا تھا، میلا ہی ہے
سو سو جج کر آئے حاج
جس کی لاٹھی اس کی بھینس
جس کی سینا اس کا راج

اسی کے ساتھ ساتھ اب ذرا وطن سے محبت اور اپنی سرزمین سے گہری وابستگی کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ کی راہ میں کر کے سفر جو جام شہادت پیتے ہیں
وہ دیس کی آنکھ کا تارا ہیں، وہ ختم رسلؐ کے چہیتے ہیں
وہ چاک گریباں زندگی کا سوزن سے وفا کی سیتے ہیں
دیتے ہیں موت کو مات وہی اور سدا سلامت جیتے ہیں
اللہ اکبر ...... اللہ اکبر

''یہ میرا وطن ہے'' کا ابتدائی بند ہے:

بے مثل زمانے میں مرا پاک وطن ہے
ظلمات کے آفاق میں ایماں کی کرن ہے
فردوس زمینی ہے، مرا باغ عدن ہے
یہ تن ہے مرا، من ہے مرا، یہ میرا دھن ہے
یہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

اسلامی سربراہی کانفرنس پر لکھی گئی نظم اس بند سے شروع ہوتی ہے:

رکھتے ہیں کتاب ایک، رسولؐ ایک، خدا ایک
مسلم کا حرم ایک، اذاں ایک، دعا ایک
اپنے ہیں کئی قافلے، ہے بانگ درا ایک
گو ساز کئی ہیں مگر ان کی ہے نوا ایک
ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں، ہم ایک
ہم ایک ہیں ہم ایک

ستمبر 1965ء میں لاہور پر حملے کی خبر سن کر جس نظم کا آغاز ہوا اس کے شعر ملاحظہ فرمائیے:

پھر اٹھا فتنہ کنارِ وادیٔ گنگ و جمن
آئے شبخوں مارنے چھپ کر اہنسا کے رتن

غیرتِ توحید کو طاغوت نے دی پھر صلا
گونج اٹھے نعرۂ تکبیر سے کوہ و دمن

فیل پیکر ٹینک آئے ہیں قطار اندر قطار
پھر ابابیلوں کو ہے حکمِ خداوندی "بزن"

ٹکنے دیں کیسے یہاں ناپاک دشمن کے قدم
ذرہ ذرہ ہے مقدس تیرا اے خاکِ وطن

کثرتِ افراد و ساماں وجہِ مستی ہے اسے
ایک ضربِ حیدری اور اس کا سب نشہ ہرن

وطن سے محبت اور اپنے دین سے غایت درجہ عشق جسٹس رحمٰن کی شاعری کی اصل اساس ہے لیکن نہ وہ اپنے خیالات میں جامد ہیں اور نہ ہی اپنے انداز میں فرسودہ۔ ان کی شاعری ترقی اور ترقی پسندی کی اصل روح کو اپنے معانی اور بیان کے ساتھ شدت سے سموئے ہوئے ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی شاعری نے ترقی کے ساتھ کوئی سودا نہیں کیا۔ اپنی پرانی اقدار کو سلور کے برتنوں کی طرح دے کر ان کے بدلے نافیاں، لیمن ڈراپس نہیں لیے جو ٹھیک سمجھا وہی کہا۔ جو ٹھیک جانا اسی کا اعلان کیا۔ اس حقیقت پسندی اور تلخ نوائی کے اظہار میں کچھ ایسی معروف اور مقبول شخصیتیں بھی زد میں آ گئی ہیں جن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ہر کوئی ہچکچاتا ہے اور ان کے چاہنے والوں کے ردعمل سے تھوڑا بہت خائف بھی ہے لیکن رحمٰن صاحب کو اس مقام پر بھی ان کی منصفی اور عدالتی اعلان کی تربیت کام دے گئی ہے اور انہوں نے جو کچھ ٹھیک سمجھا ہے اور جو کچھ راست جانا ہے، اس کا دوٹوک فیصلہ اپنے اشعار میں رقم کر دیا ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ رحمٰن صاحب اپنے اظہار، اپنے موضوع کے انتخاب اور اپنے حال اور موجود کے ساتھ بہت قریبی رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ بے حد جدید اور ہر لحظہ نو بہ نو ہیں۔ اس کتاب میں ان کی بے شمار نظمیں، غزلیں، رباعیاں اور قطعے ایسے ہیں کہ جن پر کسی بہت ہی ماڈرن اور جدید تر شاعر کے افکار و تجربات کا گماں گزرتا ہے۔ یہاں ان کی مزاحیہ، طربیہ اور فکاہیہ نظموں کو چھوڑ کر ان تازہ تجرباتی نظموں کو دیکھئے جو ایک نئی طرح کے تخلیقی عمل سے گزر کر کچھ الگ سمتیں تلاش کر رہی ہیں۔ ان کی ایک نظم "تجربہ" اور دوسری "سب اچھا" قاری کو ایک اور زاویئے سے دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ ان کی ایسی نظمیں ہماری آزاد نظم کے ارتقاء کی تازہ ترین صورتحال ہیں۔ "سب اچھا" کی گونج گویا الجیریا کے محکوموں اور فلسطین کے ستم رسیدہ

خانماں برباد اور بے یار و مددگار لوگوں کی ٹکڑیوں سے نکل کر افریقہ کے لئے ہوئے کچے گھروندوں سے چمٹ گئی ہے۔ ایسی کربناک پکار جو مسلسل گونج کر آباد بستیوں کو تاراج کرتی رہے، اسے متشکل کرنا یقیناً ایک تکلیف دہ تخلیقی عمل ہوگا جس نے نظم لکھے جانے سے پہلے شاعر کو بانٹ کیا ہوگا اور لکھے جانے کے بعد اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا ہوگا۔ اس طرح کی ایک نظم تجربہ ہے جس کا موضوع جذباتی اور نفسیاتی ہے لیکن جس کا انداز جدید شاعری کی جدید ترین آزاد نظم کا ہے کہ:

انگ میں رنگ میں آہنگ میں
مسکراتی ہوئی نظر
گنگناتی سی نظر
تم!
رم جھم۔ رم جھم۔
بوندیاں پیاسی زمیں پر ٹپکیں
بجلیاں چمکیں
بڑھتا ہوں دے کے صدا
میں
لمحات میں ضم
اور تم
گم

ان جدید نظموں میں ایک نظم ''دیواریں'' بھی ہے جس کے کئی رخ ہیں۔ شاعر کی خود احتسابی کے عمل سے نکلی ہوئی ایک نظم ہے جو اپنی انا، خود پسندی، تبحر علمی اور نظر نہ آنے والے پندار اور تملک پتھریلی دیوار سے وجود میں آئی ہے۔ سوچنے والے شاعر پر خود ستائی اور خود پرستی کے باوصف ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب وہ اپنی انا کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہے۔ کھلی اور آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔ اوروں کو خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی خوش رہنا چاہتا ہے۔

جسٹس رحمٰن کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد میں ایک ایسے سوال پر پہنچ گیا ہوں جس کا واضح اور شافی جواب ابھی تک مجھ سے بن نہیں پڑا۔ بہت ممکن ہے تھوڑا سا آگے چل کر اور اس عہد کو ایک نئے عہد میں ڈھل جانے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو اور میں اس مسئلے کی ساری جزئیات سے اچھی طرح واقف ہو جاؤں۔ سوال یہ ہے کہ جسٹس رحمٰن اپنے عہد میں ایسی دلکش اور توجہ طلب شاعری کرنے کے باوجود شہرت کے

اس مقام پر نہ پہنچ سکے جو ان کا حق تھا اور تاریخ ادب میں اس طرح سے داخل نہ ہوئے جس طرح کہ انہیں اپنے کمالِ فن کے زور پر ہونا چاہیے تھا۔ میں خود سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر فل ٹائم شاعر نہ تھے اور اپنے شوق اور خود پر کیفیتوں اور وارداتوں کے سائے گزر جانے سے شاعری کرتے تھے۔ یہ ان کی مجبوری تھی، پیشہ نہیں تھا۔ ان کے پاس ایک بڑا کام اور خصوصی نوعیت کا ایک بڑا عہدہ تھا جو ان کے سارے وقت اور توجہ پر محیط تھا۔ خود ستائی اور خود فروشی نہ ان کا منصب تھا نہ ان کی ضرورت۔ وہ اپنے یا اپنے قریبی دوستوں کو سنانے کے لیے لکھتے رہے اور اسی پر خوش رہے۔ شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت یا وجہ شہرت نہیں تھی۔ اظہار کا ایک ذریعہ تھی اور اس اظہار کو انہوں نے میڈیا کے حوالے نہیں کیا۔ اصل میں وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کا ان کی زندگی کے بعد شائع ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا اسے رکھتے رہے، کسی کو دیا نہیں۔ کسی ناشر یا ایڈیٹر نے سن سنا کر کچھ طلب کر لیا تو دے دیا ورنہ مال عرب پیش عرب ہی رہنے دیا اور اپنی کہی ہوئی چیزیں طباعتی اداروں تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

دوسری ایک اور وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان کی شاعری چونکہ مثبت انداز کی ہے اور اس میں وطن دوستی، اخلاق پرستی، میانہ روی اور سخت کوشی کی تعلیم ہے۔ اس لیے یہ دورِ جدید کی ''قدروں'' پر پوری نہیں اترتی۔ دورِ جدید احتجاجی ادب کا دور ہے۔ اس میں جب تک اعتراض، حجت اور انکار نہیں ہوگا۔ دہائی نہیں ہوگی۔ اسے پسند نہیں کیا جائے گا۔ اس میں جب تک دوسروں کا احتساب نہیں ہوگا۔ یہ مقبول نہیں ہو سکے گا۔ اس میں جب تک خود ستائی کو خود سوزی کے پردے میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا جائے گا، شاعر محترم نہیں ٹھہر سکے گا۔

تیسری ایک اور باریک اور لطیف وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ...... لیکن چھوڑیے ان وجوہات کے چکر کو اور کلام کا مطالعہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کلام میں وہ سب کچھ ملے گا جو آپ کے کلاسیکی ورثے میں موجود، آپ کے تجربات میں محفوظ اور آپ کی آبائی تربیت میں مامون ہے۔

"عشقوں حاصل ہے نرواں"

چاند پر انسان کے قدموں کے نشان، مریخ تک آہن و آتش سے بنی ہوئی مشینوں کی رسائی اور آن واحد میں ہنستے بستے شہروں کو خاکستر کر دینے کی صلاحیت اور صرف اشیاء ہی کو زندگی سمجھ لینے کی "ترقی" نے انسانی فکر کو اپنے مقناطیسی جال میں جکڑ لیا۔ پھر برق رفتار ذرائع ابلاغ نے ہر ترقی یافتہ ملک کو یہ صلاحیت عطا کر دی کہ وہ ایک گھنٹے کی قلیل مدت میں آدھی سے زیادہ دنیا کی تذلیل کر کے اس کی نیندیں حرام کر سکے۔ پھر چہکتی چڑیا، امڈتا بادل، نغمۂ نے اور چودھویں کے چاند کی لطافتیں معدومیت اور کثافت کا شکار ہو گئیں۔

لیکن جب تپتی ہوئی اذیتوں کے درمیان حضرت خواجہ غلام فرید کا کوئی بول زبان پر آتا ہے تو سلگتے ہوئے ماحول کے باوصف روح میں ایک شبنمی سکون اتر جاتا ہے۔ گو ہر مقصود ہاتھ آئے نہ آئے لیکن یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

عشق ہے ہادی پریم نگر دا عشق ہے رہبر راہ فقر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان

لیکن اس ہادی اور راہبر کی طرف رجوع کرنے کے لیے ہم کونسی لیبارٹری سے گزریں اور کس علم کی کمند پھینک کر اس چوٹی پر پہنچیں جہاں سے اصل صورتحال ہم پر منکشف ہو سکے۔ یہ کام بابا لوگوں کا ہے اور ابھی جو بابا حال ہی میں ہمارے درمیان سے تشریف لے گیا ہے وہ حضرت خواجہ غلام فریدؒ ہے جس کے وجود سے لوگوں کی ذات کے مٹھن بھی روشن ہیں اور جس کے نور سے صفات کی چاچڑاں میں بھی ہر وقت کا اجالا ہے۔

خواجہ فرید نے سرائیکی زبان کو اپنی شاعری کے ذریعے جو مٹھاس، درد اور سوز عطا کیا ہے، وہ تو کسی سے مخفی نہیں کہ آج بھی سندھ کے ریگزار، پنجاب کے میدان، بلوچستان کی چٹانیں اور سرحد کی آبشاریں ان کی کافیوں سے نغمگی کشید کر رہی ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ انہوں نے اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کی اردو شاعری بظاہر بڑی سادہ اور سیدھی سی ہے لیکن اس لفظی سادگی کے پیچھے معنویت کے جو دھارے رواں ہیں، ان میں گہرا اترنے والا ہی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس دھرتی سے پھوٹنے والے شعری سرچشمے عام طور پر مرغان خوش گلو کا رزق ٹھہرے، یہ بھی غنیمت ہے کہ نے نوازوں نے یہ آگ سنبھالے رکھی ورنہ شاید..... آنے والے زمانے دلسوزی کی ان سرمدی ٹھنڈکوں سے محروم رہتے۔ خدا جانے یہ رویہ کہاں سے نازل ہوا کہ کالے کوسوں دور طلوع ہونے والی آوازیں خوبصورت کتابوں کی صورت میں لائبریریوں کی زینت ہوتی رہیں اور اپنے یہاں سے ابھرنے والے پرسوز نغمے میلوں ٹھیلوں میں گانے والوں اور مغنیوں کے ہونٹوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔

مقام شکر ہے کہ اب اس طرف توجہ دی جا رہی ہے اور حضرت خواجہ کے کلام کو ایک مرتبہ پھر دلآویز کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ادارہ..... ہزاروں محبتوں اور مبارکوں کا حقدار ہے۔

مولانا عظامی

میں فارسی کے میدان کا کوئی اچھا شہسوار نہیں ہوں اور مجھے اس کے قلب تک پہنچنے کا کبھی بھی یارا نہیں ہوا۔ البتہ اس کی پیری فری پر گھومنا اور مسلسل گھومتے رہنا میری زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے۔ جب میں فارسی کی بات کرتا ہوں یا میرے جیسے کچھ اور لوگ، جو کچھ میرے جیسی استعداد رکھتے ہیں۔ فارسی کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد زیادہ تر فارسی شاعری سے ہوتا ہے۔ نثری فارسی ہمارے بزرگوں سے آشنائی کا دم ضرور بھرتی تھی۔ ہمارے قبضہ قدرت سے کب کی نکل چکی ہے اور اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ملک میں فارسی کے مقابلے میں فرانسیسی یا فنس کا سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے اور جو شخص یہاں فارسی جانتا ہے، اسے دکھانے کو بڑے بزرگ اپنی اولاد کو دور دور سے لاتے ہیں۔ ایک زمانے میں اس شہر کے سکھ فارسی لکھتے اور پڑھتے تھے اور اب اس شہر کے آنے اور قزلباش فارسی کی بات انگریزی میں ترجمہ کروا کے سنتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسکرانے کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ گو میں بھی انہی مسکرانے والے لوگوں میں سے ایک ہوں لیکن مجھ میں رونے کے مقامات کی آگہی ضرور باقی رہ گئی ہے۔

ایسے حالات اور اس قسم کی فضا کے اندر فارسی کے ایک بڑے بلکہ بہت ہی بڑے شاعر کے دیوان کی رسم رونمائی کا طے پانا بڑی حیرانی کی بات ہے۔ اللہ ان لوگوں کو خوش رکھے جنہوں نے عظامی صاحب کے فن، ان کی شاعری اور ان کے رموز کلام سے ہم کو آگاہ کیا۔ اس دوران میں ان کا دم غنیمت اور ان کی موجودگی ہم سب کی استقامت کا باعث ہے لیکن آگے چل کر یہ بھی نظر نہیں آتا۔ میں بے حد پرامید مزاج رکھنے کے باوصف اس وقت ایک عجب طرح کے کلچرل لوڈ شیڈنگ سے گزر رہا ہوں۔ پاکستان کے وسیع و عریض افرادی ڈیم میں نئی زبانوں کی لہری بڑھت کے باوجود مجھے یہاں فارسی کی ٹربائن چلتی نظر نہیں آتی۔

گو میں ہوشیارپور میں بھی عظامی صاحب سے دو مرتبہ ملا تھا لیکن وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں سوائے ہمیں بزرگوں کی عزت کرنے کے اور کسی بات کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی۔ میں اپنے بڑوں کے ساتھ ان سے ملا اور ادب کے ہاتھ اپنی عقیدت کے دل پر باندھ کر کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے واپس

آ گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب بھی ساہیوال جانا ہوا۔ عظامی صاحب سے کم از کم ایک ملاقات ضرور ہوتی رہی۔ یہ ملاقات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عددی لحاظ سے تو ٹھیک رہی البتہ اس کے دورانیے میں شدت سے کمی واقع ہونے لگی اور آخر میں علیک سلیک، مزاج پرسی اور خدا حافظ تک محدود ہو کر رہ گئی۔

ساہیوال میں اکرم خان صاحب اپنے دولت کدے پر مشاعرے کیا کرتے تھے جن میں مقامی شاعروں کے علاوہ کبھی کبھار باہر سے آئے ہوئے شاعر بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں عظامی صاحب باقاعدگی سے تشریف لاتے۔ مجھے مجھے سے بیٹھتے۔ گفتگو سے پرہیز کرتے، عینک کے پیچھے بہت ہی روشن، خاموش اور نور بار آنکھوں سے سانس لیتے دکھائی دیتے اور جب کوئی اچھا شعر ابھی ادھر جھولے کی از ان میں ہی ابھرا ہوتا تو تڑپ کر داد دیتے، خوش ہو کر، دل کھول کر، مزا لے کر، شعر کو اپنا کر۔ اس وثوق سے سبحان اللہ کہتے کہ شعر کے وہ معانی جو بطن شاعر میں بھی موجود نہ ہوتے خود بخود کھلنے لگتے اور شاعری پر ایک عجیب طرح کا تحیر وارد ہو جاتا۔

مشاعرے کے آخر میں ان سے کلام کی درخواست کی جاتی تو وہ اپنی یہی بیاض کھولتے جس کی عکس چاپ آپ ان کے مطبوعہ دیوان میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہولے سے کھنکارتے، آہستہ سے متوجہ کرتے اور پھر صحیح مخرج کے ساتھ، وضاحت کے انداز میں مطلع اس طرح سے ادا کرتے جیسے کوئی درویش اپنے مرشد کا قصہ بیان کرنے لگا ہو۔

عظامی صاحب کی شاعری کا فارسی کی کلاسیکی شاعری سے گہرا رابطہ ہے۔ تصور، تخیل، تحیر سب اسی فارسی کے عطیات ہیں لیکن ان کی شاعری کا لہجہ خالص پاکستانی جو دوآبے اور بار کے درمیانی علاقے سے خصوصی نسبت رکھتا ہے۔ آپ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار نئی ترکیبوں سے روشناس ہوں گے اور ان نوطرز مرصع ترکیبوں میں اس شخصی خوشبو سے شناسائی حاصل کریں گے جو اس علاقے کے لہجے کی پہچان ہے۔ تشنہ نوازی، مختصر حکایت، طوبیٰ خرام، برہمی کار اور صورت شیخانہ اور ایسی اور بے شمار ترکیبیں عظامی صاحب کے اس تخلیقی عمل کی پیداوار ہیں جو خالص ان کا ان کے عہد کا اور ان کے جغرافیائی ماحول کا حصہ ہے۔

آپ نے عظامی شاعر کے بارے میں چند بصیرت افروز مقالے سنے۔ ان میں بڑی خیال انگیز باتیں تھیں اور چند نئے اور توجہ طلب نکتے تھے۔ میں آپ کو عظامی استاد کی بات سناتا ہوں کہ ایک مرتبہ جب ہم ڈاکٹر عبدالقادر صاحب کی ڈسپنسری میں اس بات پر شدت سے الجھ گئے کہ ہمت، کوشش اور عمل سے ہی بند راہیں کھلتی ہیں اور نئی منزلوں کا سراغ کام کرنے اور کرتے رہنے سے ملتا ہے تو وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے تجربات اور مشاہدات کے درجنوں سال زندگی کے مختلف کارگہوں میں گزار کر اب اصحاب رخصت بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا بلندی اور پستی، منزل اور بے منزلی یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ جس کے لیے جو طے ہو جاتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے اور وہی کچھ ہو کر رہتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھے مستقبل اور درخشاں

زندگی کے لیے دعا کی جائے اور اپنی فرمائش کا کشکول ہمیشہ داتا کے سامنے تان کر رکھا جائے۔ اس زمانے میں ہم نوجوان تھے، ہمارے لڑکپن کے سارے مضبوط اور من مانی والے مردان آہن دیواروں کا سہارا لے کر چلنے لگے تھے۔ ہم نے مل کر ایک پرزور کورس گایا کہ

الو العزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

اور پھر اس کے ساتھ عمل عمل عمل کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ جن بڈھوں میں جان تو باقی نہ تھی البتہ آنکھ باقی تھی انہوں نے اپنی مریضانہ دردناک آواز میں دعا دعا دعا پکارنا شروع کر دیا۔ عظامی صاحب خاموش سے کرسی پر بیٹھے یہ مناظرہ دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ جب اس مناظرے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کھنکار کر کہا ''حضرات! زندگی ایک کشتی ہے ناں۔ ایک ناؤ۔ ایک روز تو اس کو منزل تک لے جانے کے لیے دونوں چپوؤں کی ضرورت پڑے گی۔ دعا کی بھی اور عمل کی بھی...... پھر انہوں نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ اگر اسے خالی عمل کے چپو سے کھینے کی کوشش کرو گے تو اپنے مقام پر گول گول گھومنے لگے گی، آگے نہیں جائے گی اور اگر صرف دعا کے چپو سے چلانے کی سعی کرو گے تو دوسری طرف چکر کھا کر دوسری طرف گھومنے لگے گی۔ اس کو آگے لے جانے اور آگے بڑھانے کے لیے دونوں چپوؤں کا ایک سا استعمال کرنا ہوگا۔ پھر انہوں نے بڑے دکھ سے کہا ''مغرب والوں کی کشتی عمل کے چپو سے ایک ہی مقام پر گھوم رہی ہے اور مشرق کی خالی آرزو کے زور پر دوسری طرف کے چکر کاٹ رہی ہے۔ منزل تک ابھی کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔''

اس وقت تو ہم نے ان کی بات بھی اپنے نعروں کے تیروں سے اڑا دی لیکن اب جوں جوں وقت گزر رہا ہے اور ہماری زندگیوں میں بھی مہ وسال کا بوجھ بڑھ گیا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ان کی بات میں کتنی دانش تھی...... دراصل ایک شاعر شاعر ہی نہیں ہوتا، وہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ پورا سعدی یا پورا رومی نہ ہو پھر بھی اس سے صحراؤں کی اور بھیڑوں کی اون کی خوشبو آتی ہی رہتی ہے...... عظامی، نہ گرامی ہیں نہ اقبال لیکن ہیں انہی کے قبیل کا چاند، چاند تو نہیں ہوتا لیکن ہوتا اسی کی وجہ سے ہے۔

دیوان غالب۔پنجابی ترجمہ

سکول کے زمانے میں جہاں ہمیں پانچ نمبر خوشخطی کے ملتے تھے وہاں غالب کے شعروں کی نثر بنانے پر بھی بیس نمبر ملا کرتے تھے لیکن کبھی کسی نے آٹھ سے زیادہ نمبر حاصل نہیں کیے۔فرسٹ آنے والا نریندر کمار ایک مرتبہ بارہ نمبر لے گیا تھا مگر بیولہ برق خیر من کا ہے خون گرم دہقاں کا، میں ایسا الجھا کہ لیے ہوئے نمبر بھی گنوا گیا...... امیر عابد صاحب کا بڑا حوصلہ ہے کہ غالب کے کلام کو پنجابی میں منتقل کر دیا اور اس خوبی اور سجاوٹ کے ساتھ کیا کہ رگ کو رگ کے ساتھ ملا دیا اور شیڈ میں تبدیلی پیدا ہی نہیں ہونے دی۔چینی ڈاکٹروں نے جب پہلی مرتبہ کٹے ہوئے ہاتھ کو کلائی سے جوڑا تھا تو بڑے سرجن نے یہی کہا تھا کہ اتنی دیر کے کٹے ہوئے ہاتھ کو پھر سے کلائی کے ساتھ پیوست کرنے کا کام اعلیٰ درجے کے ٹرانسلیشن کی طرح ہے۔شریانوں کے ساتھ شریانیں، وریدوں کے ساتھ وریدیں اور اعصاب کے ساتھ اعصاب اس طرح سے وابستہ ہو جائیں کہ زندگی کو ناخن کے آخری سرے تک پہنچنے میں کوئی وقت نہ ہو۔زندگی جو خود کسی جوڑ اور رشتے کی پابند نہیں، اپنے چلن کے لیے وجود کے تعلقات میں راستی کی ضرور متلاشی ہے۔دیوان غالب کا منظوم پنجابی ترجمہ پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ اچھا کبوتر باز روح کی تتی کو کس طرح سلیقے کے ساتھ چھتری پر اتار لیتا ہے۔

مینوں فن دا بریکیاں دا ٹھیک لا ہنا نئیں آندا پر مینوں اینا ں ضرور مان اے کہ میں شاعری دا حرف شناس ایں تے ایس دی شتری چال نوں خوب سمجھنا ایں۔شاعری دے چار قلبوت تے میریاں بہت گھنوویاں چھمیاں چوں لنگھے نیں۔فرانسیسی ہالے مینوں پولا پولا جہا ای پھڑان لگی اے کالا وے وچ نئیں آئی۔پر ایدھا ایہہ مطلب نئیں کہ میں اوہدی روح دا سیانو نئیں۔اردو غزل دی تے پنجابی لوک بیتیاں دی راہیں میں اوہنوں ڈاہڈا جاناواں، کے جدوں میں ایڈی دوراڑیاں کھڑا آں تے فیر تیقن نال کہہ سکدا آں کہ امیر عابد نے حد کر چھڈی اے تے قاعدہ معلئے بیٹھیاں وچیر دار انگلا پلنگ ڈاہ کے اوہدی کرسی ہورا چی کر چھڈی اے۔بڑا اوکھا کم سی تے بڑا ای سوکھا کر دتا اے...... وہائی خدا دی: کہندا اے۔

بانہ کنبدی کنگ دی تاروانگوں، لشکے سورجوں ایڈیاں کھچلاں تے

میں تے انج وا آپ تریں قطرہ بیلے تنگیا سولاں دی سولیاں تے
یوسف او تھے وی لکیاں ،لکیا میں کال کوٹھڑی پئی سہاندری اے
پونی اکھ یعقوب دی رئی پھر دی قید خانے دے کندھ بنریاں تے
درس مستی دے اوہناں زمانیاں دی پئی میں فتاوی پڑھنی بیٹھاں
لام الف دے پورنے پورداسی مجنوں کندھ میت پچھو کڑاں تے

اب جنھوں نے پرائمری سکول کے زمانے میں پورے پورے اور بڑے ہو کر اس علم کی باریکی کو اپنی ثقافت کے پس منظر میں پرکھا ہے وہ اس شعر سے مزالے سکتے ہیں کہ اصل سے بھی چھپاتا ہوا اوپر کو چڑھ گیا ۔ حالانکہ اصل کی بھی تاب برداشت نہیں ہوتی کہ

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اور سہل ممتنع کی جان غالب کا یہ مقطع کلیجہ ہی نکال کے لے جایا کرتا ہے کہ......

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لیکن ہماری پنجابی تو ایسے سہلوں اور ممتنوں کی عادی نہیں ہے ۔ نہ اس کے پاس ایسا مزاج ہے اور نہ ہی وہ ایسے تجربات سے گزری ہے ۔ امیر عابد کی استادی ملاحظہ کیجیے کہ ترجمہ کرتے ہوئے کیسا خوبصورت کبڈی کا پھرا ڈال گیا ہے کہ نہ سانس ٹوٹی ہے نہ کسی کو بدن چھونے دیا ہے نہ خوفزدہ ہوا اور نہ ہی تیزی سے بھاگ جانے کی کی ہے ۔ کہتا ہے

غالب جیہڑی سرتے پے گئی او وتے سہنی پئی + اوکھی بھاری وی لگدی اے ۔ اتوں جان پیاری ۔

اصل میں اس ترجمے پر کوئی لمبی اور گہری بات کہنے کا نہ تو یہ موقع ہے اور نہ ہی میں ابھی وہ ساری باتیں عرض کر سکتا ہوں جو اس ترجمے کا مطالعہ کرتے ہوئے دھوپ اور چھاؤں کی طرح میرے وجود سے گزر رہی ہیں ۔ فی الحال تو میں اسی قدر عرض کر سکتا ہوں کہ اس ترجمے میں غالب کا انگ رنگ اس کا مزاج اس کی چاشنی ،تنگ مزاجی اور انا کا خاص انداز اور اس کی کاٹ موجود ہے ۔ یہ پنجابی شاعری کی الگ سے ایک کتاب ہے اور خوبی اس کی یہ ہے کہ اس میں ترجمے کی شان موجود ہے ۔ نفس مضمون کی Grave نہیں ہوئی ۔

ساڈے بابے ہوری حضرت سائیں صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کردے سن کہ بیٹا جدوں ترجمہ کرو تے ایسا کرو جی ترجمہ ہووے تے ترجمہ لگے اپنی شکل ای وگاڑ کے نہ بہہ جائے ۔ ایہ نہ کریا کرو کہ ترجمے کر کے شیخی مارن ڈیہہ پوو کہ لوؤ جی اسے ہوراں نوں ایسا کوٹ پوایا اے جو اے ہوری ای نئیں

لگدے کُش ہورای لگدے نیں۔ اینے کو" کُش ہور" کہ دھیاں بہناں ساریاں ای گھنڈ کڈھ کے بہ گئیاں نیں۔

پروفیسر امیر عابد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ترجمے کا شاعری کا، غالب کا اور خود اپنی ذات کا حق ادا کر دیا ہے اور کسی سے رعایت طلب نہیں کی۔

علی پور کا ایلی کی داستان

جناب والا! آپ ممتاز مفتی صاحب کے فن اور ان کی ذات کے بارے میں ان کے قریبی دوستوں اور جانکاروں سے بہت کچھ سن چکے ہیں اور اس وقت تک آپ پر یہ بات اچھی طرح سے روشن ہو چکی ہے کہ مفتی صاحب کس مزاج اور کس قماش کے بزرگ ہیں۔ میں چونکہ انہیں اتنا قریب سے نہیں جانتا، اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت میں آپ کے سامنے علی پور کے ایلی کے پہلے ایڈیشن کے ناشر کی حیثیت سے حاضر ہوں اور آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری پیاری اردو جو تورخم سے لے کر چنا گانگ ٹریکس تک بولی، لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس بھاری بھرکم ناول کی متحمل نہ ہو سکی اور پچاس ساٹھ کروڑ اداراور اردو خزانوں میں سے ہمیں 246 گاہک بھی عطا نہ کر سکی۔ 246 گاہک میں نے اس لیے عرض کیے کہ چار کتابیں ہماری کھیپ میں سے پریس برانچ والوں نے اٹھا کر یہ کہا کہ سکرٹریٹ کا تانگہ کرا دو، کتابیں لادنے اور اتروانے کی مزدوری ہم خود ادا کر دیں گے۔

جب یہ ناول پہلی مرتبہ چھپا تو سوائے دیر چترال سوات کے پاکستان کی دوسری ریاستیں پاکستان میں ضم ہو چکی تھیں اور ہم والیان ریاست سے سو روپیہ فی نسخہ ہدیہ وصول کرنے سے قاصر تھے۔ روسائے شہر سے ایک سو روپیہ فی کتاب ملنے کی توقع تھی لیکن جب ہم جنس کمیاب لے کر بازار میں نکلے تو پتہ چلا کہ کراچی لاہور پنڈی پشور میں اب وہ پہلے والے روسا نہیں رہے۔ ان کے بیٹے پوتے البتہ ہیں جو کتاب کے حوالے سے صرف پاس بک کو سمجھتے ہیں اور ان کے فہم میں کچھ نہیں آتا۔ تب مفتی صاحب نے یہ رائے دی کہ دس دس بیس بیس نسخے ان دوستوں میں بانٹ دیتے ہیں جو صاحب اختیار و تعلقات ہیں، وہ ان کتابوں کو اپنے دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں کے ہاتھ بیچ کر رقم ہمیں پہنچا دیں گے۔ اور ہم تینتیس فیصد کمیشن دینے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ وہ رقم بھی ہماری جیب ہی میں رہے گی۔ چونکہ یہ رائے بہت صائب تھی۔ اس پر فوراً عمل کیا گیا اور 246 کے پہلے ایڈیشن میں سے ڈیڑھ سو نسخے گتے کے مضبوط ڈبوں میں بند کر کے ان پر تین رنگی لہریا ڈوری باندھ کر دوستوں کو روانہ کر دیئے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ میں آپ کی خدمت میں اس لیے

عرض نہیں کروں گا کہ ڈبے وصول کرنے والے دوستوں میں سے بہت سے اس وقت میرے سامنے تشریف فرما ہیں اور بڑی محبت سے مسکرا رہے ہیں۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ ان کی محبت اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے سکوں۔

1961ء میں جب ہم نے اس کتاب کے چھ نسخے آدم جی انعام حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان رائٹرز گلڈ میں بھیجے تو میں نے مصنف سے یہ کہہ کر بات کھول لی کہ شرع میں شرم نہیں ہونی چاہیے۔ دس ہزار روپیہ انعام جو مصنف کو ملے گا، اس میں سے آدھا یعنی پانچ ہزار ناشر کا حصہ ہوگا۔ مصنف نے کمال خندہ پیشانی سے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ ایک ہزار مزید ناشر کو عطا کرنے کی خوشخبری بھی دی کیونکہ اس زمانے میں مصنف کو صرف چار ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ تین ہزار مری روڈ پر ڈھائی مرلے کا ایک گھر کا پی ٹی ڈی لینے کے لیے اور ایک ہزار روپیہ نئے کپڑے بنوانے اور نئی سائیکل خریدنے کے لیے۔ وہ زمانہ ناشر اور مصنف دونوں کی انتہائی خوشی کا زمانہ تھا اور اعلان کے انتظار میں ہمارے کان کاٹے سے نہ کٹتے تھے۔ انہی ایام میں اخباروں کے پھبتی کالم میں اکثر چھپا کرتا تھا کہ اب کے انعام علی پور کے ایلی ہی کو ملے گا کیونکہ اس کا ناشر بڑے تعلقات کا آدمی ہے اور بھاگ مضبوط کرنے کی تمام تر صلاحیت رکھتا ہے۔ خود مصنف کا اپنا گھوڑا بہت مضبوط ہے۔ دوسرے مصنف منہ دھو رکھیں کیونکہ اردو کے اس گورو گرنتھ کے سامنے باقی کی کتابیں پیاز کے پرت ہیں۔ ایسے کالموں کے تراشے میں مصنف کو بھیجتا رہا اور مصنف اپنے شہر سے مجھے انعام کا بورڈ بھیجتا۔ میں نے کتابوں کی کیپ کے بارے میں اپنی رائے دی۔ ہمارا گھوڑا اس قدر صحت مند، موٹا تازہ، طرحدار اور بھڑ کیلا تھا کہ کسی نے اس کا منہ کھول کر دانت گننے کی کوشش نہ کی۔ میرے خیال میں سب ہم خیال تھے کہ فسانہ آزاد کے بعد اردو زبان میں اس کینڈے کا ناول نظر نہیں آتا۔ اس سال کا انعام یہی مارے گا اور رائٹرز گلڈ کو فخر رہے گا کہ اس نے کم از کم ایک تخلیق کے ساتھ تو انصاف کیا لیکن جب بورڈ کے ممبروں میں سے ایک صاحب واپس لاہور پہنچے اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے فیصلے کی کنسوئی لی تو انہوں نے کہا کہ بھئی آپ کا ناول ہے تو بہت ضخیم لیکن اس میں زبان کی غلطیاں ہیں۔ تمہارے مصنف نے متعدد بار لکھا ہے کہ میرا سامان باندھ دو۔ میں نے علی پور جانا ہے۔ اب یہ اردو تو نہیں ہے۔ پھر اس نے سوانح عمری کو مونث لکھا ہے حالانکہ یہ جمع ہے اور جمع کے طور پر فقرے میں استعمال ہونا چاہیے لیکن میں نے ان کی اس بات پر توجہ نہ دی۔ صرف ممتاز مفتی کو ایک تار دے دیا۔

جس کے جواب میں انہوں نے مجھے تار بھیجا۔ میں نے ان کو فتح محمد خان جالندھری کی قواعد اور عارف صاحب کی زباندانی بھجوا دی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ریڈیو پاکستان کے دوپہر کے بلیٹن سے خبر نشر ہوئی کہ آدم جی پرائز بورڈ کے ججوں نے اس سال کی اردو کی جس بہترین کتاب پر اول درجے کا انعام دیا ہے اس کا نام......اور لقمہ میرے ہاتھ میں ذرا سا کانپا لیکن گرا نہیں چونکہ مجھے بھنڈی گوشت بہت مرغوب ہے اس

لیے میں نے نوالہ منہ میں ڈال لیا۔

جناب والا میں نے جوان ایف کینڈی کے واقعہ قتل پر سخت جلد کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک فرانسیسی کتاب کا مضمون اٹھانے کی بھی کوشش کی ہے لیکن یہ عقدہ اب تک مجھ پر وانہیں ہوا کہ اس سازش کے پیچھے کیا ڈرامہ کھیلا گیا اور اس میں کون کون لوگ شریک تھے۔ آپ نے تصویروں اور فلموں میں دیکھا ہوگا کہ کینڈی کا تابوت جا رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک سیاہ گھوڑا کینڈی کے الٹے بوٹ اپنی رکابوں میں لیے چلا آ رہا ہے۔ جب کبھی میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف جھلاہٹ کا اظہار کرتا ہوں تو میرا سائیکسٹرسٹ کہتا ہے ''ظلم اور ناانصافی بنی نوع انسان کی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ہر ملک ہر شہر اور ہر بستی میں ہائیکورٹیں، چیف کورٹیں اور سپریم کورٹیں اس بات کا واضح اعلان ہیں کہ یہاں کے لوگ ظلم اور ناانصافی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ پھر تم لوٹتے ہوئے سیاہ گھوڑے کو دیکھ کر اس قدر دکھی کیوں ہو جاتے ہیں، جس کی رکابوں میں الٹے بوٹ پھنسے ہوتے ہیں۔

تازہ بستیوں کا مہمان

ناصر قریشی نے اپنے فن کی ابتداء شاعری سے کی تھی لیکن جلد ہی اسے بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور پھر افسانہ نگاری کی طرف دھیان لگا کر اسی کمند کی بنتی شروع کر دی تھی۔ اس محنت کا نام دور دور تک تو شاید نہیں پھیلا مگر کہانی کی دنیا میں کلا بہت جچی۔ جس کسی نے ایک بار اس کی کہانی پڑھی دوسری پڑھنے کی خواہش ضرور کی...... وجہ میرے نزدیک اس کی یہ ہے کہ ناصر کی کہانیاں مختصر کہانی کی ڈیفی نیشن پر عین پوری اترتی ہیں اور ان کے ہمعصروں میں اور کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس ہُنر سے اس حد تک واقف ہو۔

کچھ لوگوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے بڑی دیر تک آپ کو ان کی باتیں سننا پڑتی ہیں کہ شاید باتوں کے ڈھیر میں سے کوئی کام کی بات نکل آئے اور اتنا سارا وقت ضائع کرنے کا کچھ تو مول پڑ جائے لیکن ناصر کے یہاں ذرا سا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اس کی کہانی گھوڑے کی چال چلتی ہے۔ ڈھائی پٹ کی لڑائی اور معاملہ ختم۔ فتح یا شکست۔ زندگی یا موت۔ فیصلہ نا معلوم۔

ناصر قریشی کی کتاب تازہ بستیاں کے افسانے میں نے اس وقت بھی پڑھے تھے جب یہ الگ الگ شائع ہوئے اور اب کی بار انہیں ایک مرتبہ پھر ایک ساتھ بھی پڑھا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان چھوٹے چھوٹے کرداروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہونے سے دنیائے آگہی میں ایک ایسی نوطرز مرصع عمارت کا ڈول پڑا ہے کہ اس شکل وصورت کی اور کوئی عمارت نظر نہیں آتی۔ ہے تو چھوٹی سی اور رقبہ بھی معمولی ہے لیکن اس ڈھب کا اور کوئی رقبہ نظر نہیں آتا۔ بہت سی باتوں کو اپنے انداز تحریر سے توجہ طلب بنا کر مصنف نے اس حقیقت کا بار بار اعادہ کیا ہے کہ ہر سوال اتنا اہم نہیں ہوتا کہ اس کا جواب دیا جائے یا اس کے گرد فلسفے کا ایک کو لپٹا جائے۔ یہ کچھ واقعات ہیں جو میرے سامنے کے ہیں۔ کچھ میں نے اختراع کیے ہیں۔ کچھ آدھے آدھے کے تھے انہیں میں نے اپنی امیجنیشن سے مکمل کیا ہے کچھ نہ پیش آئے نہ سوچے گئے نہ خوابوں میں اترے نہ امیجن کیے بس بیٹھے بیٹھے نوکِ قلم سے رسنے لگے اور آنوینک لکھائی ہوتی رہی۔

ناصر قریشی کہتا ہے میں ان تازہ بستیوں کا بسیا نہیں ہوں، ان کا مہمان ہوں۔ جیسے یہ میرے آنے

سے پہلے تھیں ویسے ہی بعد میں ہوں گی۔ لے دے کے میری ایک خوشبو سی ہے جو تھوڑی دیر کو ہوگی، پھر وہ بھی نہیں رہے۔ دراصل مجھے اپنے مقابلے میں دوسروں کو اہمیت دینے میں زیادہ مزا آتا ہے کیونکہ کئی کیڑے اپنی نظر میں امرود سے بھی زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ آپ بھی ذرا میرے ان کرداروں کو دیکھ کر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ خالق کے مقابلے میں کس قدر اہم ہیں۔ یہ جب بھی آپس میں مل بیٹھتے ہیں ایک کہانی سی بنا دیتے ہیں اور میں ان کے چلے جانے کے بعد خالی لفافے، ٹشو پیپر، سگریٹ کی ڈبیاں، ٹافیوں کے ریپر، ربر بینڈ اور لال ربن اکٹھے کرتا رہتا ہوں۔

میں چاہے ان کو کیسا بھی لگوں یہ مجھے بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔ میرا اور ان کا رشتہ اسی دائرے کا رشتہ ہے اور ہم کو پتہ نہیں چلتا کہ اس دائرے کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے۔

ایک مسافر چار ملک

میں نے اردو انگریزی اطالوی کے بہت سے سفرنامے پڑھے ہیں۔ خود بھی لمبے لمبے سفر کیے ہیں اور بہت ہی اچھے اور بے حد کامیاب رپورتاژ تحریر کیے ہیں لیکن حکیم سعید صاحب کا ''ایک مسافر اور چار ملک'' نے مجھے کچھ عجیب طرح سے پریشان کر دیا ہے۔ یہ نہ تو سفرنامہ ہے نہ ڈائری۔ نہ سیاحتی احوال نہ Inemoir نہ رپورٹ نہ مراسلہ نگاری۔ نہ ہی ان کے درمیان کی کوئی چیز نہ ہی ان کے اردگرد سے متعلق۔ یہ تو صنف ادب کی ایک نئی چیز ہے جس کو آنکنے اور پرکھنے کے لیے اسی قسم کے ذہن اور اسی قسم کی روح کی ضرورت ہے جو مصنف کے مزاج کی اساس ہیں..... گو آپ نے ابھی ابھی ہمارے بہت ہی عظیم دانشوروں سے اس کتاب کے متعلق بہت ہی کمال کی باتیں سنی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی بھی اس تصنیف کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہوا۔ حکیم صاحب کو اپنی کتاب پر صحیح تبصرہ سننے کے لیے ابھی کافی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم اتنی دیر اور جب تک ہم لکھنے والوں میں سے کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہو جاتا جو حکیم صاحب جیسا کارکن، ان جیسا منظم، ان کی طرح کا محنتی، ہمتی، جفاکش اور ان جیسا کارکن اور کارساز اور ہمہ وقت آمادہ بہ کار نہ ہو۔ ہم ادیب لوگ مشقت سے بہت گھبراتے ہیں اور تھوڑے کیے کو ہمیشہ بہت سمجھتے ہیں اور اس بہت کی وسیع و عریض مملکت میں اپنی بادشاہت کے باقی ماندہ ایام گزارتے ہیں۔

جس طرح میری بیٹی پاکستانی دسترخوان سامنے رکھ کر کوفتے نہیں پکا سکتی اور میں گریز اناٹومی سامنے کھول کر اپنڈکس کا آپریشن نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہم اپنے تمام تر تبحر علمی کے باوجود ''ایک مسافر چار ملک'' پر تبصرہ کرنے سے معذور ہیں کیونکہ یہ ایک اور چینتر ے کی کتاب ہے۔ میں اس پر کچھ کہنے کی ضرور کوشش کرتا اور ایمانداری کے ساتھ اپنے تاثرات بیان کرتا لیکن میرے اور حکیم صاحب کے شروع ہی سے بنیادی اختلاف ہیں اور ہم ان پر آج تک ایک دوسرے سے سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ حکیم صاحب بہت دھیمے انداز میں گفتگو کرتے ہیں، اتنی مدھم ٹون میں کہ مجھے ان کی بات مشکل ہی سے سمجھ آتی ہے۔ بے حد خوفناک انداز میں سوچتے ہیں اور اپنی فکر میں ایک تیغ کی کیفیت رکھتے ہیں۔ میں بے حد کمزور دھیان کے ساتھ سوچتا ہوں

اور بڑی بودی اور مازی فکر رکھتا ہوں لیکن جب بولنے پر آتا ہوں تو میری آواز لاؤڈ سپیکر کے بغیر چار چار بلاک طے کر جاتی ہے اور لوگ اس کھڑ کے دھڑ کے سے ہی میرے ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے ہم دونوں کی سطحیں بالکل مختلف ہیں اور میں مصنف کی فریکوئنسی پر پہنچ کر اس کی آواز سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

آواز میں نے اس لیے کہا ہے کہ میں ''ایک مسافر چار ملک'' کو خالی ایک کتاب ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک کیسٹ کا درجہ دیتا ہوں جس سے مصنف کی آواز اتنی صاف سنائی دیتی ہے کہ اس کی باتوں پر اعتماد ہونے لگتا ہے۔ جس طرح عورت کا تمام تر حسن اس کا جسم ہے اسی طرح مرد کا سارا حسن اس کا لہجہ ہے۔ داتا صاحب فصاحت کو مرد کا سب سے بڑا حسن سمجھتے ہیں اور فصاحت لہجے کے بغیر ممکن نہیں اور لہجہ اعتماد کے بغیر نہیں بنتا اور اعتماد تشخص کا نیوکلیئر ہے۔ اس لیے ''ایک مسافر چار ملک'' جیسی کتاب لکھے جانے کے لیے اپنی ذات کی پہچان اپنی سادھی سے ضروری ہے۔ دوسروں کی دی ہوئی ڈیفی نیشن سے نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ادب کے صاحب طرز نقاد اور علم کے پنڈت میری اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن یہ ہے حقیقت کہ اس کتاب کی دو بنیادی خصوصیتیں ایسی ہیں جو مجھے کم از کم اردو کی کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتیں۔ ایک تو بات کہنے کا بے بانہ انداز جو ایک لاڈلے بچے کا خصوصی وصف ہوتا ہے اور حکیم صاحب چونکہ خود بھی زود رنجی اور زود حسی کے معاملے میں سعدیہ سے کسی صورت میں کم نہیں اس لیے بے سوچے بے گھبرائے ٹھا سے ایسی باتیں کر دیتے ہیں کہ ''امریکہ کا معاملہ خاص طور پر نازک ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ امریکہ پاکستان کی موجودہ قیادت کو بدلنا چاہتا ہے۔ میں پاکستان کے بجٹ اور اس کے بعد کے حالات کو امریکی پالیسی سے الگ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔'' یا بیوروکریسی کے پرانے اور خطرناک خفیہ رازوں سے پردے اٹھا اٹھا کر انہیں سر بازار ننگے کرتے جانا اور افسوس کرتے رہنا کہ کاش بیوروکریسی فراخ دل ہوتی اور عقل سلیم سے عاری نہ ہوتی وغیرہ وغیرہ...... یا پھر کسی خوف و خطر کے بغیر دنیا کی ان عظیم شخصیتوں کا اپنے تجربے اور اپنے حوالے سے تجزیہ کر کے انہیں پرستاروں کے سامنے پیش کرنا جو عرصہ دراز سے ان شخصیتوں کی پوجا پاٹھ میں مصروف ہیں...... دوسرا کمال اس تحریر کا یہ ہے کہ یہ بندھے ٹکے پرانے فرمے میں فٹ نوک پلک سے درست سلسلہ وار پیراگرافوں میں مقید نہیں، ہر تحریر لکھی تو روزنامچے میں جا رہی ہے لیکن اتر میرے دل میں رہی ہے۔ جیسے مصنف ہمارے سامنے کرسی ڈالے ہم سے باتیں کرنے میں مصروف ہو اور اسے اس بات کا ہوش ہی نہ ہو کہ بیان کو قیتش اور جھالریں بھی لگا کرتی ہیں اور لوگ جنگی میڑھی پرانی باتوں کے ڈینٹ نکال کر اور ان پر مبہم ساؤ کو پینٹ کر کے صاحب بیان بن جاتے ہیں۔ حکیم صاحب کو واقعے کا نہ تو ڈینٹ نکالنا آتا ہے اور نہ ہی ملمع پینٹ کا فن جانتے ہیں جو بات کہنی ہوتی ہے فکر کے بغیر کہہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ حکومت کی تعریف بھی کھلے بندوں کر جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک معمولی درجے کا منشی بھی اچھی طرح سے جانتا ہے کہ حکومت یا حاکم کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو، اس کی کھلے بندوں تعریف کرنے سے انسان کی شہرت اور نیک نامی کو بٹہ لگتا ہے اور

معاشرے میں اس کی مقبولیت کم ہونے لگتی ہے۔ اپنی مقبولیت قائم رکھنے اور اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا سب سے موثر طریق حکومتوں پر تنقید کرتے رہنا ہے۔ اگر انسان مالی طور پر آسائش میں ہے اور معاشرتی طور پر اونچا درجہ رکھتا ہے تو اس کو اور زیادہ تنقید کرنی چاہیے۔ اس سے وہ روحانی اور اخلاقی طور پر بھی اونچا ہو جائے گا اور سب لوگ اس کی عزت کرنے لگیں گے۔ لیکن "ایک مسافر چار ملک" کا مصنف اس باریک نکتے سے کم ہی واقف ہے۔

لیکن اتنا سب کچھ کہنے کے بعد میں ایک بات کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ اس کتاب میں ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس نے مجھے اور میرے گھر والوں کو بہت ہی شرمندہ کیا۔ یہ واقعہ ماہنامہ "ہمسفر" کے اس شمارے سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے حکیم صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا اور جس کے جواب میں رسالے والوں نے اٹھارہ سو روپے کی خطیر رقم حکیم صاحب کو اعزازیے کے طور پر بھجوائی تھی لیکن حکیم صاحب نے آسٹریلین سفیر کو یہ کہہ کر اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا تھا کہ "میں علمی خدمت کا معاوضہ نہیں لیا کرتا۔" اب میرا سارا گھرانہ ہے ہی علم فروش۔ میں لکھ لکھا کر روپیہ کماتا ہوں۔ میرا بیٹا کالج میں پڑھا کر تنخواہ لاتا ہے۔ میری بیوی افسانے، ڈرامے لکھ کر ان کا معاوضہ لیتی ہے اور گیس پانی بجلی فون کے سارے بل اپنے پلے سے ادا کرتی ہے۔ یہ بات البتہ ہم سارے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا گھرانہ علم غیر نافع فروخت کرتا ہے کیونکہ علم نافع نہ تو ہمارے پاس ہے اور نہ ہی ہمیں کسی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یہی مدرسے کالج یونیورسٹی کا علم ہمارے پاس ہے اور اسے پانی ڈال ڈال کر پھینٹ پھینٹ کر ہم چار روپے فی گڑوی کے حساب سے بیچ رہے ہیں۔ ہے تو بری بات لیکن کیا کیا جائے۔ یہ زمانہ ہی علم فروشی کا ہے۔ یو این او سے لے کر یوگنڈا تک علم ہی فروخت ہو رہا ہے۔ محبت کی چنگی تو اب قیس عامری کے قبیلے سے بھی نہیں ملتی۔ کہتے ہیں وہ خاندانی نسخہ تو کہیں ضائع ہو گیا۔ اب تو ہم سپر پاوروں کے عطار خانوں سے طاقت کی ایسی پینٹ گولیاں حاصل کر رہے ہیں جن کا ایک قرص تو حسن و عشق اور دستانِ تسلیم و وفا کے فرسودہ واقعات اور محبت کی لایعنی روایات کو آن واحد میں ختم کر کے انسان کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر دیتا ہے۔

میں "ایک مسافر چار ملک" کو اردو زبان کے ذخیرہ کتب میں ایک اہم اضافہ متصور کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس نوع کی چند اور کتابیں لکھی اور چھاپی گئیں تو ہمارے قاری کے ذہن میں ایک خوش آئند تبدیلی پیدا ہو گی اور سوچ کی نئی راہیں دریافت ہوں گی۔

''کرن، تتلی، بگولے''

نئے لکھنے والے اکثر ایک کوتاہی کا شکار ہوتے ہیں اور یہ کوتاہی ان سے بے خیالی میں سرزد ہوتی ہے، لیکن اس کے اثرات بڑے دوررس و نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ پروین عاطف میں بھی یہ خرابی موجود ہے کہ اس کا دائرہ اس کی ابتدائی تحریروں سے لے کر اب تک وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے لیکن مصنف نے اب تک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میری دانست میں اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے ورنہ آگے چل کر اس کے اثرات لکھنے والی کے مزاج اور تحریر کو متاثر بھی کریں گے اور اس پر بوجھ بھی ڈالیں گے۔

''کرن، تتلی، بگولے'' پروین کے سفرناموں پر مشتمل اس کی پہلی کتاب ہے لیکن اس کے مندرجات میں الگ الگ صورتوں میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ ایک آدھ سفرنامہ میری نظر سے اوجھل رہ گیا تھا جو میں نے اس کتاب کے مطالعے سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ پروین کے پاس بات کرنے کا ایک عجیب ڈھنگ ہے۔ یہ ڈھنگ ہماری پرانی دھرانی ماؤں ماسیوں کے پاس تو تھا لیکن جس طرح علم نے آ کر دانش کو متروک کر دیا۔ اسی طرح تحریر نے پھیل کر بات کرنے کے ڈھنگ کو ختم کر دیا۔ کوئی کوئی لکھنے والا البتہ ہر دور میں ایسا ضرور نکل آتا ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر تحریر میں بھی بات ہی کرتا ہے اور منہ زبانی روایت کا حامل ہوتا ہے۔ پچھلے دور میں شعوری طور پر ''بات کرنے'' ''بات بنانے'' اور ''سخن کا دارو'' عام کرنے کا احساس میر صاحب، میاں محمد صاحب، حضرت شاہ حسین کو تھا اور اس دور میں تحریر میں باتیں ریکارڈ کرنے کا شرف ایک افسانہ نگار اور دو سفرنامہ نگاروں کو حاصل ہے جس میں ایک پروین عاطف بھی ہے۔ پروین عاطف کی سوچ، اس کے انداز تکلم، اس کے بیان اور بیان کے اندر ذکر افکار کو آپ اس کی تحریر سے الگ نہیں پائیں گے۔ چاہے آپ اسے بولتے ہوئے سن لیں چاہے اس کی لکھی ہوئی تحریر پڑھ لیں۔ آپ بڑی آسانی سے پروین کے اس ذہنی عمل تک پہنچ جائیں گے جہاں سے یہ ساری مصیبت شروع ہوتی ہے۔

اس سفرناموں میں آپ کو دھرتی کے سینے پر جگہ جگہ پھیلے ہوئے انسان ملیں گے جو طبعی کیمیاوی نظام یعنی فزیو کیمیکل سسٹم کے مطابق تو آسانی سے جانچے جا سکیں گے، ایک زندہ وجود کے طور پر تو بہت حد

تک آ نکلے جا سکیں گے یا پھر ایک باشعور وجود کے حساب سے تو کسی حد تک پہچانے جا سکیں گے لیکن یہ کہ وہ خود آ گاہ بھی ہوں، ایسا کوئی گروہ ان سارے سفر ناموں میں آ پ کو کہیں بھی نہیں ملے گا۔ میں تو بنکاک، منیلا، ہانگ کانگ اور ٹوکیو کے سفر ناموں کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج کا انسان اپنے ذرائع کے اعتبار سے تو بہت کشادہ، سوکھا اور فارغ البال ہے۔ البتہ اپنے مدعا اور غایت کے معاملے میں بہت ہی گھبرایا، الجھا اور اوکھا ہے اور بڑی ناشناسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ٹوکیو اور کیلاش کو لاشعوری طور پر ایک ساتھ رکھنے کی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ مصنفہ کا مشاہدہ غیر شعوری طور پر اس کلیئے کی طرف منتقل ہو گیا ہے کہ انسانوں پر ہمیشہ دیوتا ہی حکمرانی کرتے ہیں۔ جن گروہوں نے پرانے لاطینی اور یونانی دیوتاؤں کو ترک کر دیا ہے، وہ ایک نئی دیو مالا میں داخل ہو گئے ہیں جہاں ترقی، مشینی، مقابلہ، ابلاغ وغیرہ نئے سائنسی، سماجی اور سیاسی اساطیر ہیں۔ لوگ کافروں اور کیلاش لوگوں کے بے معنی اور بیہودہ دیوتاؤں سے کنارہ کر کے نئے دیوتاؤں کے مسلک میں داخل ہو گئے ہیں لیکن ان سفر ناموں میں نئے دیوتاؤں کی آرتی کے پیچھے ایک دکھ بھری تان بھی سنائی جاتی ہے کہ ''دیوتا نئے ہوں یا پرانے ان میں جب بھی لڑائی ہوتی ہے خون ہمیشہ انسانوں کا بہتا ہے۔'' ...... پروین اپنے زورِ بیان میں اور بے خیالی میں اور اپنی سادہ لوحی میں بڑے کمال کی باتیں کر گئی ہے جس کا احساس اس کو دس پندرہ سال بعد ہو گا۔ بشرطیکہ یہ تحیر کے عالم میں رہی اور اس نے کسی مخصوص دیوتا کی پجارن بننا پسند نہ کیا۔

اور وہ بات جو میں نے پہلے کہی تھی اور جس کوتاہی کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا، وہ بھی اتنی ہی ہے کہ کچھ نئے لکھنے والے اس زور سے ادب کے میدان میں نکلتے ہیں کہ انہیں بات کا احساس ہی نہیں رہتا کہ کچھ بڑے اور پرانے کچھ میرے جیسے عزت کی پگڑیاں سر پر سجائے اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ ان اصحابِ رخصت کو چھوتے ہی اپنی تحریروں سے اس قدر نیچے دبا دینا کوئی خوبی کی بات نہیں۔ اس سے بے عملی پیدا ہوتی ہے اور پرانے لکھنے والوں کا دھارا تیزی سے سوکھنے لگتا ہے۔ کھیلوں میں اور جسمانی زور آزمائی میں تو فطرت کی طرف سے اس کی آزادی ہے لیکن ذہنی عمل میں پرانے اور کمزور لوگ بھی اپنی شنوائی کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس میدان میں نئے آنے والے پرانے لوگوں کو اپنے کمالِ فن سے زیادہ خائف نہ کریں اور ان کو قدم قدم پر یہ باور نہ کرائیں کہ اب ان کی گرفت فن پر اور موضوع پر ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

ویلکم......گاڈ سپیڈ

کسی کے لکھے ہوئے سفرنامے کو میں اس لیے خاطر میں نہیں لاتا کہ کسی کو سفرنامہ لکھنا نہیں آتا۔ سفرنامہ لکھنا بڑے خاصے کا کام ہے اور اس مرحلے سے ہر کوئی آسانی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔ راستے میں ہی بن نکلا پکڑا جاتا ہے۔ اس سال بہت سے سفرنامے طبع ہو کر سامنے آئے لیکن کوئی بھی گرفت میں نہ لے سکا۔ سب پاس سے ہو کر گزر گئے۔

چند روز پیشتر کیف جاوید اپنا سفرنامہ میرا دل میرا کولمبس دے گئے۔ میں نے اس یرقان زدہ پیلے سے سفرنامے کو دیکھا اور پھر دوسری کتابوں میں چھوڑ دیا۔ جس کتاب کی رونمائی کا میں صدر نہیں ہوتا، میں اس کو عام طور پر پڑھا نہیں کرتا۔ میرا دل میرا کولمبس بھی انہی کتابوں میں سے ایک تھی لیکن اچانک اس کی حیثیت عرضی بدل گئی اور یہ پیلی سی کتاب میرے ہاتھوں میں پہنچ کر تندرست و توانا نظر آنے لگی۔

آپ بھی میری طرح ''زندگی کیا ہے'' اور ''انسان کیا ہے'' اور ہست و بود کا کیا چکر ہے۔ اسی گتھی کو سلجھانے کے لیے کنفیوشس سے لے کر خلیل جبران تک سبھی کو کھنگال چکے ہوں گے اور بہت سے ذہنی نوٹ مرتب کر کے سبھی کو پامال کر چکے ہوں گے اور ابھی تک کافی پریشان ہوں گے لیکن میری پریشانی کم از کم اس معاملے میں خدا کے فضل سے دور ہو چکی ہے اور میں پہلے کے مقابلے میں تندرست اور توانا ہو گیا ہوں۔ زندگی کا یہ تت نوجوان کیف جاوید نے چپکے سے نکال کر میری عمر رسیدہ ہتھیلی پر رکھ دیا ہے اور کہا ہے ''لو وَ باباجی مزے کرو، سکھی رہو اور ہمارے حق میں دعا کیا کرو۔ زندگی کا فلسفہ بس اتنا ہی ہے کہ:

آذر کے ساتھ پیسے دو

کھاؤ پیو گند مچاؤ

سمیٹو، اٹھو، پھینکو...... خلاص!

لیکن کیف جاوید کو ہرگز علم نہیں کہ ''ہم برگر'' کھاتے ہوئے اس سے زندگی کا تت نکل گیا ہے

جس طرح پیروں بھار بیٹھے ہوئے شخص کو خود علم نہیں ہوتا کہ وہ ننگا ہو رہا ہے، دوسرے اس سے فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔

ایسی صورت میں اس ہیئت کذائی کے ساتھ میں اس کتاب کو کسی صورت میں بھی پڑھنے کو تیار نہ تھا کیونکہ اس میں کوئی بات قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہے ہی نہیں۔ میں نے اس کو صرف اس کی کتابت اور اس کی لکھائی چھپائی کی خوبی کی بنا پر پڑھنا شروع کیا کہ اس کی ہر ہر سطر میں تین تین قسم کا قلم لگا ہے اور اس کا ہر ہر صفحہ پیرا بعد پیرا مختلف پریسوں میں چھاپا گیا ہے۔ کتاب کی اس صوری خوبی نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں برضا و رغبت اس کے مضمون میں اترنے پر مجبور ہو گیا اور پھر آگے جو دیکھا تو اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اپنے انمل بے جوڑ اپنی مرضی کے مالک، چرس نوش امیر زادے فقرے میں نے آج تک اور کسی تحریر میں نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور پھر اس وقت تک بٹھائے رکھا جب تک شام گہری نہ ہوگئی اور مجھ سے حروف اٹھانے مشکل ہو گئے۔ اٹھا بھی تو اس قدر کہ ذرا سا کبڑا ہو کر بٹن تک پہنچا اور بتی جلا کر پھر ان فقروں کی سنگت میں بیٹھ گیا۔

کیا کتاب ہے اور کیا انداز ہے اور کیا دستاویزی فلم ہے لیکن اس سے کچھ وہی لوگ لطف اندوز ہو سکیں گے جو ہینڈ ہیلڈ کیمرے کی اہمیت اور اس کی لذت سے واقف ہیں جس میں ہر ہر فریم پر جرک لگتا ہے اور جس میں ہر ہر چیز اپنے پورے Perspective کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس سفرنامے میں چونکہ مصنف اپنے وجود کے زور پر منظر میں گھوم رہا ہے، اس لیے اس کی ہر حرکت نیچرل اور انمل بے جوڑ ہے۔ اگر اس نے اپنا کیمرہ ہینڈ ہیلڈ کے بجائے واٹر لیول سے چیک کیے ہوئے سٹینڈ پر رکھا ہوتا تو اس کا انداز دوسرے سفرناموں جیسا ہوتا جن میں ذہن کا وجود زیادہ اور جسم کا وجود کم ہوتا ہے۔ ذہن کے زور پر کہانی تیار ہوتی ہے اور جسم کے زور پر دستاویزی فلم اور سفرنامہ۔ جس دستاویزی فلم میں جرک اور جس سفرنامے میں ڈگمگاہٹ نہیں ہوگی وہ ہینڈ ہیلڈ نہیں ہوں گے۔ لیپے پوتے ہموار اور استوار ہوں گے۔ مختصر سا میرا دل میرا کولمبس ضخیم سفر در سفر پر اس وجہ سے برتری لے گیا ہے کہ یہ no mind ہے اسی لیے موجود ہے اور وہ دھیان ہی دھیان ہے اس لیے غیر موجود ہے۔

کیف جاوید کی مسز مارٹن کے ساتھ بے معنی اور لایعنی گفتگو کو چھوڑ کر جب یہ اپنے گھر والوں کے ساتھ یا اکیلا مارکیٹ میں بازار میں ڈاؤن ٹاؤن آتا ہے تو اس کے زاویہ نگاہ کا زور یا اس کی تاکید نظری یکسر بدل جاتی ہے۔ یہ ہم کو سامنے کی چیزیں سامنے کی عمارتیں سامنے کی ٹریفک سے روشناس نہیں کراتا بلکہ ان کے درمیانی گیپ کے کٹ آؤٹ دکھلاتا ہے اور یہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ اس قدر نئی کہ خود کیف جاوید کو بھی اس کا احساس نہیں کہ وہ اپنے منظر نامے میں چیزوں کے درمیانی خلاء اور گیپ کو اجاگر کر کے ایک نیا پیٹرن بنا رہا ہے یا یہ پیٹرن اس کے ہینڈ ہیلڈ کیمرے کی آنکھ سے خود بخود بن رہا ہے یا یہ سب کچھ اس کے سین میں خود ہونے

یعنی بہ نفس نفیس موجود ہونے اور دھیان (Mind) سے ماورا ہونے کی وجہ سے وجود میں آ رہا ہے۔

یہ عجیب سی، بیہودہ سی، بے خیالی میں لکھی گئی کمال کی کتاب ہے جیسے جولاہوں کی بلی کے گھر سیامی بلونگڑا پیدا ہو جائے۔ پھر میاں کیف جاوید سے ایسی تحریر نہیں لکھی جا سکے گی کیونکہ جوں جوں آگے بڑھیں گے، سیانے ہوں گے اور ہاتھ کا فریم بنا کر ہر چوکھٹا دیکھا کریں گے۔ پھر یہ بات نہ ہوگی۔

Then my dear Jay You will fail to hit the mystery of gaps and intervals. You will foll in line with us.

Welcome and Godspeed

معرکہ نمبر

ادبی معرکے نمبر پڑھ کر (ابھی سارا نہیں پڑھا کوئی کوئی معرکہ دیکھا ہے) مجھے یہ پتہ چلا کہ ہمارے بزرگ بھی بفضل تعالیٰ ہم سے بہتر نہیں تھے۔ لڑائی جھگڑے، دھینگا مشتی، دھول دھپے کے فن میں گنی لوگ تھے اور اپنے علاوہ دوسرے کو احمق اور لکڑا سرا سمجھتے تھے...... ان کے چہرے مہرے وضع قطع میلے لباس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذات کے اندر ایک چیز ایسی ضرور موجود تھی جو خوراک اور غذا کے بغیر اور آکسیجن اور وٹامن استعمال کیے بناسب سے زیادہ صحت مند، تنومند اور چیڑھی تھی اور وہ تھی ان کی انا اور ان کے نفس کی شوکت! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے۔ ہمارے بھی ایک بہت پیارے، علم دوست مرنجاں مرنج اور آزاد مرد قسم کے دوست للیانی میں رہتے تھے۔ وہ صبح سویرے بس میں بیٹھ کر لاہور آتے تھے اور سارا دن لائبریری میں گزار کر شام کی بس سے واپس گاؤں چلے جاتے تھے۔ وہ ہر طرح کی لاگت بازی اور تعصب سے پاک ہیں کیونکہ وہ ہر ایک سے یکساں طور پر نفرت کرتے ہیں اور ان کو کسی کا کوئی کام پسند نہیں آتا۔ میں نے ان کا ذکر اطلاعاً کیا ہے کہ وہ بھی ایک بہت بڑا ادبی معرکہ ہیں۔ گو محمد طفیل کو ابھی ان کی خبر نہیں ملی۔ ان کو یقین ہے کہ جن دو کتابوں کے نوٹس انہوں نے ہیروشیما کے بعد سے لے کر اب تک تیار کیے ہیں، ان ہزار ہا کتابوں سے بہتر ہیں جو احمق لوگ اب تک چھپوا چکے ہیں اور جن کو جاہل پبلشر بار بار شائع کر رہے ہیں۔

محمد طفیل ایک عجیب و غریب شے ہے جو ہر مرتبہ عجیب و غریب نمبر لے کر آجاتا ہے۔ سوائے اپنے ادارے کے ہر جگہ شرماتا لجاتا ٹھکتا بل کھاتا اپنا نمبر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے شرمیلا ٹیگور کا نام سن کر ہمیشہ محمد طفیل یاد آجاتا ہے۔ لکھنا پڑھنا شانتی نکیتن ٹیگور کا سا اور باقی سب کچھ شرمیلا جیسا...... جن دنوں میری اس کی بول چال تھی، میں بلاواسطہ طور پر بہت کچھ اس سے پوچھ لیتا تھا۔ اب ہم دونوں اپنی اپنی عزت کے مورچے میں اترے ہوئے ہیں اور لام بندی کے سترہ سال گزارنے کے باوجود خندق سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میرا بس چلے تو اس سے پوچھوں کہ تم یہ نمبر کس طرح سے نکالتے ہو؟ اور لوگ بھی نمبر نکالتے ہیں لیکن ان کے نمبروں میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو تمہارے نمبروں میں ہوتا ہے۔ جیسے سلاجیت اور پہاڑوں سے بھی نکلتی ہے لیکن

چلااس کے پہاڑوں کی سلاجیت بیٹھنے ہی نہیں دیتی...... کیا کوئی بہت بڑا ریسرچ سکالر یہ سارا سرمایہ چھوڑ کر مر گیا ہے اور اس کی کوٹھڑی کا بند راستہ اس علی بابا پر وا ہو گیا ہے یا سلیمانی ٹوپی والے جنوں اور موکلوں کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ اردو کی دنیا سے ایسے دفینے کھود کر لاتے رہیں اور محمد طفیل کے جانماز تلے جمع کرتے رہیں کہ صبح نماز فجر کے بعد جب وہ دایاں کونہ اٹھائے تو کاتب کو فیڈ کرنے کے لیے سات دن کا مواد وہاں رکھا ہو یا پھر یہ سارے نمبر کواس ہیں اور محمد طفیل نے اجتماعی نظر بندی کر کے ہم سب کو بھوند و بنا رکھا ہے۔ میں نے اس پر بڑا غور کیا ہے اور یہاں سے جانے کے بعد پھر غور کرنا شروع کر دوں گا لیکن مجھے اس گتھن کا ابھی تک ایک سرا ابھی نہیں ملا۔ میں نے ایم۔اے اردو کے ایک ذہین طالب علم سے بھی پچھلے سال درخواست کی کہ وہ محمد طفیل نمبروں والے کے طریقہ کارکردگی پر ایک مبسوط تھیسس لکھے اور پھر اس کو کتابی صورت میں شائع کرے لیکن اس نوجوان نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا کہ محمد طفیل چونکہ ابھی تک فوت نہیں ہوئے اس لیے ان پر تھیسس نہیں لکھا جا سکتا۔ یونیورسٹی نیم جاں لوگوں پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ یہ مشکل مسئلہ کیونکر حل ہوگا۔ محمد طفیل تو اس راز کو اپنے ساتھ ہی فوت کروا کے دم لیں گے۔

یوں تو نقوش کے ہر نمبر نے ایک نیا علم عطا کیا لیکن ادبی معرکے نمبر نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ پتہ یہ چلا کہ لکھائی پڑھائی ادب اور شاعری تنقید اور تحقیق بشر کو کسی ارفع سطح پر نہیں لے جاتیں بلکہ وہ بندے اور بشر کے مقام سے گر کر انسان بن جاتا ہے (یاد رہے کہ انسان کو قرآن اچھے معنوں میں یاد نہیں کرتا۔ جہاں بھی انسان کا ذکر آیا ہے تو ہین آمیز انداز میں ہی آیا ہے۔)

تو معلوم یہ ہوا کہ اپنے تمام تر علم اور ادب اور فن کے باوجود انسان پتھر اور دھات کے زمانے کے انسان سے آگے نہیں بڑھا۔ وہی حرص وہی طمع ویسی ہی چالاکی وہی عیاری۔ حسد، جلن، سینہ زوری وہی چھوٹا پن۔ کمینہ پن اور خونخواری...... لیکن یہ بھید نہ ہی کھلتا تو اچھا تھا۔ علم ادب شاعری فنکاری کا جو بھرم بنا ہوا تھا، بھرم ہی رہتا تو کیا بری بات تھی لیکن طفیل کو تو کسی کا بھرم بھی پسند نہیں اپنے نمبر عزیز ہیں۔

”اللہ معاف کرے“

اگر آپ کو کبھی نسیمہ ترمذی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو یوں لگا ہوگا کہ ایک ٹین ایجر (Teenager) ہے جو اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں کر رہی ہے۔ اگر کبھی نسیمہ بنت سراج کے کالم پڑھنے کی فرصت ملتی ہو تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ ایک دانائے راز، سرد گرم چشیدہ، جہاندیدہ اور شفیق خاتون ہے جو سینگ کٹا کر اس لیے بچھڑوں میں آ ملی ہے کہ آج کل کے بچھڑے کسی غیر بچھڑے کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے لیکن یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ نسیمہ دراصل نسیمہ ترمذی اور بنت سراج کے مابین کہیں چھپی ہوئی ہے۔ اپنے پیشے کے اعتبار سے جو گہری بصیرت اسے ملی ہے، اس نے نہ صرف نسیمہ کو گہرے سمندر، اتھاہ زندگی اور حیاتیات کے تحیر تک پہنچایا ہے بلکہ انسانی روح کی پردہ داریوں تک ایک Uncanny قسم کی رسائی بھی عطا کر دی ہے۔ اس کے کالم پڑھ کر لگتا ہے جیسے وہ سوسائٹی کے کربناک تضاد، اس کی ہولناک خودغرضی اور اس کی شرمناک افراط وتفریط پر ایک عرصہ سے کڑھ رہی ہے۔

کالم لکھنا ایک ایسے مہم جو انسان کا کام ہے جو ہر چوٹی کو سر کرنے کے بعد نشیب کی گہرائیوں پر تنقید کرتے ہوئے ایک ارفع واعلیٰ فراز کا سراغ بھی دے سکے۔ ہر چوٹی گو بظاہر آخری چوٹی ہونی چاہیے لیکن ہر بار ایک نئی چوٹی پر جھنڈا گاڑنے میں ایک نئی فتح کا احساس بھی باقی رہنا چاہیے...... کالم نگار عام طور پر نشیب کے غاروں پر بڑی اچھی تنقید کر لیتے ہیں۔ ان کو یہ تو دکھائی دے جاتا ہے کہ فلاں جگہ جوہڑ اور دلدل کی وجہ سے مچھر اور کیڑے مکوڑے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس جگہ زمین بے آب ہو کر ریگستان بن رہی ہے۔ اس مقام پر خوفناک دہانے کھل رہے ہیں لیکن اس کو حسن وخوبی کا کوئی منظر نظر نہیں آتا۔ اس کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ تازہ اور زندگی بخش ہوا مل رہی ہے اور مفت مل رہی ہے۔ بادلوں سے پانی برس رہا ہے اور بے دام برس رہا ہے۔ پودا اپنی نال پر کھڑا ہو رہا ہے اور ہمارے لیے ہو رہا ہے۔ سمندر ہمارے لیے خوراک پیدا کر رہے ہیں اور پہاڑوں کی چوٹیاں ہمارے لیے پانی کے ذخیرے جمع کر کے حکم کی منتظر کھڑی ہیں لیکن نسیمہ کے کالموں میں تمام تر کرب اور گہرے دکھ کے باوجود تلخی کی کوئی بات نہیں۔ اس کے کلبۂ احزن میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے

جاتے رہتے ہیں اور زندگی عطا کرتے رہتے ہیں۔نسیمہ کا حیات اور حیاتیات کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔اس کا نظارہ Panormaic ہوتا ہے۔وہ بات کو جہاں سے کرتی ہے وہاں سے یہ بھی دیکھ سکتی ہے کہ ایک اعلیٰ ارفع اور آئیڈیل سطح ہر مقام پر موجود ہے۔ جہاں پر پہنچا جا سکتا ہے...... یہی وہ خوبی ہے جو اسے باقی کالم نگاروں سے علیحدہ کرتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو اس کو کم ہر دلعزیز بھی بنا سکتی ہے کیونکہ آج کل کالم لکھنے والا اور کالم پڑھنے والا کچھ ایسے گمان میں لیے ہیں جیسے سوسائٹی کے وہی وہ افراد ایسے ہیں جن کو دوسروں پر ہنسنے اور ان کا مذاق اڑانے کا کھلا لائسنس ملا ہوا ہے۔

موجودہ دور میں جب سوت کی ڈوری سے لے کر ڈی سی ٹن تک ہر شے مارکیٹنگ کے رشتے سے منسلک ہو کر رہ گئی ہے، کالم بھی جنس خریدار بن گیا ہے۔اب اس میں قلب کی کیفیات اور واقعات کی بوقلمونی کا وہ رنگ نہیں رہا۔اب اس کے وجود میں آنے کی تین وجہیں ہیں۔ یہ جلد مشہور ہونے کا ایک وسیلہ ہے۔کالم نویسی کی بدولت آدمی کے پاس ایک ایسی شمشیر خارا شگاف آ جاتی ہے جس کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑتا اور تیسرے کالم کے توسط سے کالم نگار اپنی دانشوری کی سند فوراً حاصل کر لیتا ہے لیکن نسیمہ نے اپنے کالموں سے یہ تینوں کام نہیں لیے بلکہ اخبار جو ایک جنس خریدار ہے اور مارکیٹ کی تلاش میں روز صبح سویرے نکلتا ہے اور خریدے جانے کی خواہش میں شہر کے ہر دروازے پر سرنگوں ہوتا ہے، اس میں کچھ ہماری اپنی اقدار کو فروغ دینے کی کوشش ہے...... اس عہد میں جب اقدار کے نام پر اولڈ فیشنڈ ہونے کا ٹھپہ لگ سکتا ہے۔اپنے کلچر سے وابستہ رہنے کو لوگ دقیانوسی سمجھنے لگے ہیں اور اپنی روایت سے منسلک ہونا اپنے ناتعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہے تو ایسے میں اس طرح کے کالم لکھنا گویا اپنی شہرت سے کھیلنا اور اپنی Fame اور بڑی بہادری سے بڑے مہنگے داموں کیا ہے۔

آج کے کالم نگار کے پاس کچھ سیاہیاں ہیں، کچھ چھینٹے ہیں جن میں وہ اپنا قلم ڈبو کر لکھتا ہے۔طنز و مزاح، ٹھٹھول، فقرہ بازی، شیام گھات اور احمد محمود کی پگڑیوں کی ادلا بدلی......

"لیکن اللہ معاف کرے" میں سیدھی سادی زبان ہے جو بڑے سبھاؤ کے ساتھ حق بات کا اعلان کرتی ہے۔ دل آزاری کے بغیر، دکھ دیئے بغیر گئے دنوں کے محاورے اور روزمرہ کی زبان میں نسیمہ جو کچھ دیکھتی ہے، محسوس کرتی ہے وہ آپ تک پہنچا دیتی ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ وہ نک سک سے درست اردو لکھتی ہے اور اس میدان میں بالکل اکیلی ہے۔کوئی اس کا حریف نہیں، کوئی مدمقابل نہیں۔اس کالم نگار کے پاس اگر کوئی سیاہی ہے تو وہ ہے خونِ جگر...... اور اگر کوئی قلم ہے تو وہ اس کا لہجہ اور اس کا لحن ہے۔ایسی آواز ادب کی دنیا میں تو سنائی دے سکتی ہے لیکن صحافت کے میدان میں اکیلی اور انوکھی ہے۔

اک مری روح (تبصرہ)

اک گانا ہوتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی چلتا ہے یا نہیں' ہمارے زمانے میں تو اس کی بہت فرمائش ہوا کرتی تھی' 'اک تیری جند بدلے مینوں سارے مبرو یاں جھڑکاں''

جب میں نے افسانوں کی یہ کتاب ختم کی تو مجھے یوں لگا جیسے احسان بٹالوی شکایت کر رہا ہو کہ دیکھو جی اک میری روح کلی اتوں کل جہان دیاں جھڑکاں۔ میں کیا کروں اور کدھر جاؤں اور کس دیوار کے ساتھ سر پھوڑوں جو اس غم میں کوئی اور بھی میرا برابر کا شریک ہو۔ کوئی اور بھی ان دھڑکنوں کو سمجھے اور کوئی ایسی جگہ تو ہو جہاں اس درد کا مداوا ہو سکے۔ لیکن وارداتی کیفیتوں کو بیان کرنے والوں کے دکھ کا مداوا کبھی ہوا نہیں۔ یہ درد تو حساس دل کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔ تسلی تشفی کی کوئی اپنی بائیونک اور وضاحت کی کوئی مائی سین اس کا توڑ نہیں کر سکتی۔ یہ کھنگ تاپ عمر بھر کا روگ بن کر اسی طرح جزو بدن بنا رہتا ہے۔

اک مری روح' اپنے آپ اور اپنی ذات کو تلاش کرنے کا ایک عمل ہے۔ نہ یہ افسانے ہیں نہ کہانیاں' نہ داستانی ٹکڑے نہ ادب لطیف۔ نہ تو مصنف نے انہیں عبارت سے سجایا ہے نہ واقعات کا سیٹ لگا کر مزین کیا ہے۔ نہ کسی خاص تکنیک کا سہارا لے کر ان میں پھمن لٹکائے ہیں نہ الفاظ کا الا یچی دانہ پیش کر کے قاری کو قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو تلاش کا ایک عمل ہے جو بغیر کسی پلین کے اور بغیر کسی سراغ کے ہر بیرونی حرکت اور ہر اندرونی خاموشی کی تہہ کے اندر جاری ہے۔ یہاں بے چینی شکایت اور کرب کا اظہار ضرور ہے لیکن بالکل مختصر اور بے حد کوتاہ! کوئی آہ و بکا' نالہ و شیون' رام رولر نا با کار نہیں۔ بس ہلکا سا استفسار ہے۔ ''یہاں میری پنسل رکھی تھی'' اور اس کے بعد پھر تلاش کا عمل ہے' بے زبان' پر سکون' خاموش اور مسلسل! کوئی سرزنش طعنہ مہنا گلہ گزاری نہیں' خالی استفسار.....اور اس خالی استفسار نے احسان کے ان افسانوں کو توجہ طلب بنا دیا ہے اور Myth کی رو رواں کر دی ہے.....بڑی دیر کی بات ہے ہمارے زمانے میں ایک مصنف جبران ہوا کرتا تھا' جو اس قسم کی کانیاں دلوں پر پھینکا کرتا تھا اور بہت پریشان کیا کرتا تھا۔

مجھے احسان بٹالوی سے صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ ذات کی تلاش کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھیں اور ہم لوگوں کو اس کا دستاویزی ثبوت اسی طرح سے بہم کرتے رہیں لیکن مایوس کبھی نہ ہوں' کیونکہ سورج ہر صبح طلوع ہو کر اپنی سنہری کرنیں بکھیرتا ہے۔ ہر موسم بہار میں نہر کنارے پاپلر کے درختوں میں چکنے سبز پتے ٹھنڈی چھاؤں کا وعدہ لے کر آ جاتے ہیں۔ ہر رات شاہی مسجد کے مینارے اسی جگہ رہتے ہیں جہاں ٹھہرے رہنے کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ اٹھانوے فیصد بچے تابع فرمان ارزیک نام ہیں۔ بہت سے وعدے معیاد کے مطابق پورے ہو جاتے ہیں۔ ننانوے فیصد ڈاک ٹھیک ڈیلیور ہو رہی ہے۔ پینے کو پانی مل رہا ہے۔ پھر اس کا اخراج بھی بہ آسانی ہو رہا ہے۔ کیسا مزا ہے اور کس لطف سے بسر ہو رہی ہے۔ خوبصورت' کھلے کھلے' گل پوش باغوں اور لاکھوں ہزاروں خوش الحانی طائروں کے باوجود اگر ہم بور بھی ہونا چاہیں تو بھی آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ کتنے مزے ہیں' کیسی آسانیاں ہیں اور کس کس مشکل کام پر ہماری دسترس ہے..... خدا کا شکر ہے کہ اک مری روح کا مصنف نہ تو مایوس ہے اور نہ ہی یاس پسند ہے' بس ذرا سا شاکی ہے اور تھوڑا بہت شکوہ تو ہر شریف آدمی میں موجود ہوتا ہے خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو۔

ابھی چند روز پہلے میں فرینکلن انسٹی ٹیوٹ آف انتھرو پولوجی کی ایک رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ جس میں چھ ماہرین علم الانسان نے تین سال تک پانچ براعظموں اور ایک سو تین ملکوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ رپورٹ مرتب کی ہے۔ ان ماہرین کو ایک قدیم انسانی گروہ کی تلاش تھی جو اب ناپید ہے' لیکن جس کا ذکر صحیفوں اور کتابوں میں کہیں کہیں ملتا ہے ان ماہروں کا خیال تھا کہ اس گمشدہ کڑی یا اس ناپید گروہ کے چند اشخاص اکا دکا یا تو ایشیا میں مل سکیں گے یا افریقہ میں۔ لیکن ان کو اپنی تین سالہ تلاش کے بعد چنداں کامیابی نصیب نہ ہوئی..... ان ماہرین کو ایسے گروہ انسانی کی تلاش تھی جو اس بات کا علی الاعلان اظہار کرتا ہو کہ اس کا کام بہت کم ہے لیکن اس کے مقابلے میں اس کی تنخواہ یا مزدوری بہت زیادہ مل رہی ہے۔" ایک افسوس کہ ایسا گروہ کرۂ ارض پر کہیں بھی نہیں مل سکا۔

ہاں' ایک بات اور اس کتاب کی جلد بندی بہت مضبوط دھاگے سے کس کر ہوئی ہے۔ اگر آپ کو اس میں سے کوئی فقرہ نوٹ کرنا ہو تو ایک مددگار کی ضرورت ہوگی جو اس کے دونوں اطراف کو تھام کر رکھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ میں نے اس میں سے کوئی اقتباس نہیں دیا۔ وجہ یہ تھی کہ بوقت تحریر میرے پاس کوئی مضبوط قسم کا ملازم یا مددگار موجود نہ تھا۔

یوسف مثالی (تبصرہ)

یوسف مثالی کی شاعری زیادہ تر ''میں'' کی بستی کے گرد آباد ہے لیکن اس ''میں'' سے مراد ان کی اپنی ذات نہیں بلکہ زندگی کی ساری صعوبتیں اور اذیتیں اس ''میں'' میں سمٹ آئی ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے زمانے بھر کے مصائب کو ''میں'' کی کٹھالی میں ڈال کر کندن شعر تخلیق کیے ہیں۔

کہیں کہیں ان کا لہجہ سخت اور کرخت بھی ہو گیا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ مسائل انہوں نے شعر گوئی کے لیے منتخب نہیں کیے بلکہ انہیں اپنی جان پر وارد کر کے ان کا ذائقہ محسوس کیا ہے اور سچی شاعری کے لیے یہ وصف ایک خداداد سکہ ہے جو کہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ تاہم شکست و ریخت کی اذیتوں کے باوجود ان کی شاعری میں امید کی روشنی جھلملاتی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس امید کی کرنیں سمٹ کر چراغ راہگزر کا شعلہ تاباں بننے میں زیادہ عرصہ نہیں لیں گی۔

ادیب جاودانی

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس دور کے لکھنے والوں نے بڑی اچھی کہانیاں لکھی ہوں گی اور اپنے خوش قطع فن کی بدولت بڑی شہرت حاصل کی ہوگی لیکن یا تو ان کے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے یا پھر جاوداں کے افسانوں کا افسوں دھوئیں کی دیوار بن کر ان کے درمیان حائل ہو گیا۔

بہت سے لوگوں کو بات کہنے کا ایسا سلیقہ ہوتا ہے کہ معمولی سی بات بھی ان کے اظہار میں آ کر ایک شہ پارے کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ جاوداں بات کرنے کے فن سے خوب واقف ہے اور جانچ تول کے ایسی بات کرتی ہے کہ پھر سننے والے کے پاس پوچھنے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ جس طرح صحن چمن میں بہار کی دھوپ اتر آنے سے سارے رنگ آپ سے آپ نمایاں ہو جاتے ہیں اسی طرح جاوداں کے جادو کی چھڑی واقعات سے چھو جانے پر ہر تفصیل خود ہی لو دینے لگتی ہے۔

جاوداں کا اصل موضوع عورت ہے لیکن اس کی عورت ماضی کے لکھنے والوں اور مستقبل کی طرف نعرہ زنی کرنے والوں کی عورت سے بہت مختلف ہے۔ اس کے یہاں عورت کا سمبل بھی جیتی جاگتی، بھول بھلائی، محنت مرتی، آنسو بہاتی عورت کی طرح طاقتور اور زندہ ہے۔ عورت کے سارے دکھ اس نے بڑے قریب سے خود دیکھے ہیں، کسی کتاب میں نہیں پڑھے۔ حالات کو اپنے حال سے ڈھونڈا ہے، کسی سے سنا نہیں اور کرداروں کو خود زندگی عطا کی ہے، کہیں سے پلے پلائے نہیں منگوائے۔

میری آرزو ہے کہ جاوداں اب ایک ناول لکھیں اور اپنے گہرے مشاہدے کے لیے بڑا کینوس استعمال کریں۔ اس ہاتھ کو ناول کی وسعت اور ناول کو اس ہاتھ کی تحریر کی اشد ضرورت ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب لاہوری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے پاکستان کی اور پاکستان کی قومی زبان کی بہت خدمت کی ہے۔ لوگ عام طور پر انہیں مجاہدِ اردو کے نام سے جانتے ہیں اور اسی نام سے ڈاکٹر صاحب مخاطب ہونا پسند کرتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ''فرحت افزا لطائف'' کے تحت جو لطیفے لکھے ہیں وہ ہمیں بیربر اور ملا دو پیازہ کی یاد دلاتے ہیں۔ بچپن میں اس قسم کے لطیفے حنائی کاغذ کی صفحہ بند کتابوں میں چھپا کرتے تھے اور ہم چاقو سے ایک ایک صفحہ کھول کر انہیں شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ناپید ہو گیا اور لوگوں نے ٹریجڈی کی طرف رجوع کر لیا۔

مجاہدِ اردو نے اردو قارئین کی ٹریجڈی کو کربناک حصار سے نکال کر ہنسی ٹھٹول کے پر بہار میدان میں لا کھڑا کیا ہے اور سب کے ہنسانے کا سامان بہم کر دیا ہے۔ میری دانست میں ایسی کتاب اردو تو کیا کسی اور زبان میں بھی موجود نہیں۔ اس کا مطالعہ ہم سب کے لیے لازم ہے، تاکہ ہم ہنسیں اور لطف سے ہمکنار ہوں۔

محمد اسلام شاہ

محمد اسلام شاہ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہے جس نے تحریر و تکلم کی دنیا میں بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ ان معرکوں میں وہ تاریخ و تنقید اور شعر و نغمہ کی وادیوں سے ایک جیسے شوق اور ایک سے آہنگ کے ساتھ گزرا ہے...... لیکن اس بات کا کسی کو سان و گمان بھی نہیں تھا کہ وہ شخصیات نگاری کے کوچے سے بھی خواجہ بلند بام ثابت ہوگا۔ جب میں نے اسلام شاہ کا فریدہ خانم کی شخصیت کا خاکہ پڑھا تو بڑی خوشگوار حیرت کا احساس ہوا کہ اس طرز نگارش میں ایسی طرح بھی ڈالی جا سکتی ہے۔

اس کتاب میں اسلام شاہ نے جتنے فنکاروں کے سکیچ لکھے ہیں، ان میں سے بیشتر میرے دوست ہیں اور سب میرے پیارے ہیں۔ میں اسلام شاہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے پیاروں کی طرف اس التفات سے دیکھا اور ان کو محبت اور عقیدت کا ایسا سامان دیا۔ مجھے یقین ہے اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ابھی کچھ اور لوگ بھی شامل اشاعت ہوں گے۔ وہ لوگ جن کے بارے میں آپ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن مصنف ان کو ان کی ساری جزئیات کے ساتھ بڑی تفصیل سے جانتا ہے۔

مشتاق احمد قریشی

سادہ اور پرخلوص شاعری کا تحفہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے اور وہ شاعر بہت ہی خوش قسمت ٹھہرتا ہے جس کے صحن آہنگ میں واردات و کیفیات کے میلے لگے رہتے ہیں۔ میں مشتاق احمد قریشی کو انہی خوش قسمت شاعروں میں شمار کرتا ہوں۔ مشتاق کی یہ چھوٹی چھوٹی سیدھی سیدھی اور پیاری پیاری نظمیں اپنے اندر احساسات کے ایسے کارواں سرائے لیے بیٹھی ہیں جہاں کوچ اور قیام کے ان گنت قافلے اس تجل شاعری کا پس منظر بھی ہیں اور پیش منظر بھی۔ اگر آپ کبھی گرمیوں کی لمبی دوپہروں اور سردیوں کی مختصر سی شاموں کے اندر خاموشی اور برداشت کے کربناک لمحوں سے گزرے ہوں تو آپ پر ایسی شاعری کے پرت آہستہ آہستہ کر کے کھلیں گے اور پھر اس آہستگی کے ساتھ یہ معنی سایوں کی طرح طویل ہوتے جائیں گے اور یہی مشتاق کی اس مختصر نما شاعری کا اعجاز ہے کہ ان کے اسرار دور تک اور دیر تک کی وسعتوں پر محیط ہیں۔

ڈاکٹر محمد اعظم

اس عہد کی اردو شاعری میں بڑی مدت کے بعد اصل غزل کا ادب اپنے اصل رنگ میں ملا۔ ڈاکٹر محمد اعظم دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے کی ریس میں احتجاجی شاعری سے اعراض کر کے واردات قلبی کو سچ کی زبان عطا کی ہے۔

تلاطم کے شاعر کی زبان اور بیان پر بے پناہ قوت کے باوصف جب قاری ان غزلوں کے نخلستان سے گزرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض شاعری ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے درماندہ شخص کی کربناک صدا ہے جس کا سفر بھی پر پیچ، پر اسرار اور نمناک غلام گردشوں میں الجھ کر ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن چکا ہے۔

''تلاطم'' کی غزلوں نے مجھے متاثر ضرور کیا لیکن حیران نہیں کیا کیونکہ نان پروفیشنل مگر سچ مچ کے شاعر کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور شعری روح کی شباہت یہی ہوتی ہے۔

سلمٰی اعوان

میں نے ''تنہا'' کو پچھلے ہفتے دوبارہ پڑھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ چار سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی اس ناول کی تازگی، توجہ طلبی، سادگی اور سچائی اپنی جگہ پر جوں کی توں قائم ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان پر ڈھیر سارا ملکی اور غیر ملکی مواد پڑھ چکنے کے بعد بھی اگر آپ تحیر کے عالم میں ہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر سلمٰی اعوان کا یہ ناول ضرور پڑھیے۔ آپ پر ساری صورت حال واضح ہو جائے گی اور آپ کا تحیر ایک ایسے کرب میں بدل جائے گا جس کے ساتھ عمر بھر کی پشیمانی کا روگ لگا ہوتا ہے۔

جہاں، ہا نو اور میں اس عظیم ناول کے دل سے قائل ہیں۔ وہاں ہم اس کی تین بنیادی خرابیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ اول تو یہ کہ اس ناول پر ایک معروف مصنف کا نام درج نہیں۔ اس لیے یہ انتقاد کی دنیا میں رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرے، مصنفہ نے اسے رائج الوقت مغربی طرز فکر سے متاثر ہوئے بغیر صرف اپنے مشاہدات اور محسوسات کی بنیاد پر رقم کر دیا ہے اور تیسرے یہ کہ اس میں کسی مخصوص گروہ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کے بجائے سارا الزام اپنی کوتاہ نظری پر لے لیا گیا ہے۔

مانوس اجنبی

ڈرامہ ''بساط'' پڑھ چکنے کے بعد ایک مدت کی بھولی ہوئی بات سامنے آئی۔ یہ بات گرودجیف نے اپنے کسی لیکچر میں کہی تھی کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں تو وہ دو نہیں ہوتے بلکہ چار ہوتے ہیں۔ سامنے کی بات کے پیچھے ایک مکالمہ پیچھے کا بھی چل رہا ہوتا ہے۔ بڑے سالوں کے بعد ''بساط'' کے مطالعہ سے یہ عقدہ کھلا اور اس حقیقت کے کئی پہلو روشن ہوگئے۔

میں نقادوں کے خوف سے ایک بات چپکے سے آپ کے کان میں کہتا ہوں کہ ''بساط'' اردو ادب کے دو تین عظیم ڈراموں میں سے ایک ہے جس میں آپ کو پند و نصائح کا فن اپنے کمال پر ملے گا۔

''مانوس اجنبی'' کی واردات سے متعارف ہونے کے بعد میرے دل نے کہا کہ ایسا ماورائی اور مافوق الفطرت ڈرامہ تو مجھے لکھنا چاہیے تھا لیکن ''مانوس اجنبی'' نے یہ کہہ کر میرے دل کی تسلی کر دی کہ تیرے پاس باصر کا قلم نہیں ہے اور نہ ہی یہ تیری برات ہے۔

انگور کی بیل (تبصرہ)

سلیم آغا کو ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے تو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ البتہ ان کی کہانیوں نے اپنے مصنف کی اکائی میں ایک ایسی سمت کی نشاندہی کر دی ہے جس کے آثار ہم کو کسی اور میں نظر نہیں آتے۔ سلیم آغا پورے کا پورا اس عہد کا افسانہ نگار ہے اور اس کی سوچ میں وہ تمام تقاضے اپنی ساری وضاحتوں کے ساتھ موجود ہیں جو عہد حاضر کی پیداوار ہیں۔ ساتھ ہی اس کو اپنے یہاں کے پرانے قصوں کے کوچے اور کوچوں کے طاقچے بھی یاد ہیں۔ گویا اس مصنف کا سفر آج کا ہے اور روشنی کل کی ہے۔ راستہ سامنے کا ہے اور راہبری بعید کی ہے اور اس امتزاج نے سلیم آغا کو کہانی کی منزل کا ایک مضبوط اور خوش قدم مسافر بنا دیا ہے۔

جب آپ ''انگور کی بیل'' کے سارے افسانے پڑھیں گے تو آپ کو کتاب کے خاتمے پر ایک عجیب بات کا احساس ہوگا کہ آپ نے مصنف کے افسانے نہیں بلکہ اس کا ناول پڑھا ہے اور ان ساری کہانیوں کے اندر، تنوع کے باوصف، مصنف کی سوچ کا رشتہ ایک سا قائم رہا ہے اور اس نے کسی شعر سے، کسی نظریئے سے کسی گیت سے یا کسی خبر سے متاثر ہو کر کچھ نہیں لکھا۔

اپنی فکر کی دوکان پر مختلف گھڑت کے کوزے اس ہنرمندی سے پیش کرنا بزرگ کوزہ گروں کو تو آسکتا ہے البتہ اس عمر کے دستکاروں کے لیے یہ کار پختہ مشکل کام ہے۔

ہماری جگہوں پر ایسے تکڑے اور بلوان نوجوان کا قائم ہونا ایک نیک فال ہے۔

ابدال بیلا

ابدال بیلا کی پہلی کتاب پڑھنے کے بعد میں نے مصنف کے رخ کی جونشاندہی کی تھی، اس میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہوگئی ہے لیکن یہ تبدیلی اس خوشگوار اور خوش آئند جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے تخلیقی عمل سرعت پذیر ہوکر ایک نئے آہنگ سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ابدال بیلا اپنے پہلے افسانوں کی اشاعت کے بعد اب Fable کی وادی میں اتر گئے ہیں۔ Fable میں راسیں سنبھال کے رکھنا بڑے جوکھوں کا کام ہے، جس میں بڑے بڑوں کو تبے کمزور پڑ جاتے ہیں لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ابدال نے پہلے ہی رابطے میں اپنا لوہا منوالیا ہے اور اردو فکشن میں جدید کہاوتی افسانوں کا گراں بہا اضافہ کیا ہے۔

یہ افسانے مصنف کے گہرے مطالعے اور وسیع مشاہدے کے آئینہ دار ہیں اور ان میں زندگی کے وہ چھوٹے چھوٹے فلسفے ماخوذ ہیں جو پھیل کر ساری زندگی کو ملفوف کر لیتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ فکشن کی دنیا میں ڈاکٹر ابدال بیلا سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ان توقعات پر پورے اتریں گے۔

عارف سہانی

ایک زمانہ تھا جب انسان نے گھڑی کی ٹک ٹک سے وقت کو ریزہ ریزہ نہیں کیا تھا یا گزرتے لمحات کو کلاک کے ڈبے میں بند نہیں کر رکھا تھا۔ تب دن صدی بھر کا ہوتا تھا اور رات اس سے بھی گز بھر لمبی۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ سو خلاق ذہنوں اور فقروں کے مجموعہ بنانے والے داستان گو محبوب ترین ہیرو ہوتے تھے کہ رُکے ہوئے وقت کو جھانجھریں پہنا کر رواں کر دیتے تھے۔

تب لوگ تحیر اور ناممکنات سے لطف اٹھاتے تھے مگر اب انہونی باتیں نہیں بہلاتیں بلکہ آس پاس رونما ہونے والے واقعات زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اتنا ہے کہ آدمی ان میں براہ راست ملوث نہ ہو۔

عارف سہانی صاحب آس پاس بکھرے ہوئے واقعات کو اپنے دلچسپ انداز بیان سے کہانی بنا کر قاری کو محو کرنے کے عمل پر مامور ہیں۔ انہوں نے پسے ہوئے طبقوں کے مسائل کو اپنی کہانیوں میں زیادہ جگہ دی ہے لیکن کہیں بھی کہانی کی جاذبیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ کہانی پڑھتے پڑھتے دل میں کچھ شکست و ریخت کا احساس ضرورت ہوتا ہے مگر ذہن برانگیختہ نہیں ہوتا۔

کسی بھی صاحب کمال کہانی کار کا وصف یہی ہوتا ہے کہ کسی واقعے سے متاثر ہونے کے بعد اپنے بیان میں ذاتی احساس کو واضح نہ ہونے دے۔ عارف سہانی صاحب نے یہ مشکل مرحلہ بڑی آسانی اور روانی سے سر کیا ہے۔ ان کی کئی کہانیاں اتنی پر تاثر ہیں کہ اگلی کہانی پڑھنے کے لیے قاری کو اپنے بہت سے اندرونی اور بیرونی سفر کو سمیٹ کر فوراً واپس آنا پڑتا ہے۔

خدا کرے عارف سہانی صاحب ایسی اور بہت سی کہانیاں تخلیق کرتے رہیں۔

حفیظ تائب

اک سچے تے اچے شاعر دی پرکھ ایہہ اے کہ اوہدے موضوع نے وی اوہنوں اوسے طراں قبول کر لیا ہووے جنویں اوہنیں اپنے موضوع نوں دل نال لایا ہندا اے۔ حفیظ تائب اوہناں خوش قسمت شاعراں وچوں اے جیہڑے ایس قول تے پورے اتردے نیں۔ جس طراں حفیظ نے نعت نوں دلوں بجانوں قبول کر کے اوہدے اگے سیس نوائی اے ایسے طراں نعت نے وی اوہنوں قبول فرمایا اے تے بڑے مان آدر نال قبول فرمایا اے۔

حفیظ تائب پنجابی شاعری دا اوہ درویش شاعر اے جیہڑا بستیاں دیاں ٹھنڈیاں، لمیاں، کالیاں راتاں وچ گلی محلیاں وچوں ہولی ہولی بانی پڑھدا بے ملوما جیہا لنگھدا جاندا اے۔ ایہی بانی سن کے بھانویں کوئی بوہے تے آوے یاں نہ آوے پر ایہہ نماں نماں پرچھانواں بوہے باریاں دے دیویاں نال اوہ گل ضرور کر جاندا اے جنوں سیانے سخن دا دارو آکھدے نیں۔

ریڈیوکالم

گفٹ پیک

میرا مشاہدہ ہے کہ انسان اپنی اس مختصر سی زندگی میں جو کام بڑی لگن اور شدید محنت سے کرتا ہے اور جس پر اپنی چند روزہ زندگی کا سارا زور لگا دیتا ہے وہ خود کو ذلیل وخوار کر کے پریشان و دردمند ہونا ہے۔ کوئی شخص یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی زندگی سیدھے سجاؤ' پرسکون انداز میں اسی راہ پر چلتی جائے جس راہ کے لیے وہ طے کی گئی ہے اور جس منزل کے لیے اسے مقرر کیا گیا ہے۔ انسان ضرور اس میں کئی کاٹ کر اور جھپ کھا کر اور قلابازی لگا کر حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ سائیکل چلاتے وقت دونوں ہاتھ چھوڑ کر تالی بجا کر ٹھوڑی اٹھا کر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ دیکھو دیکھو بغیر ہاتھ کے' بغیر بریک کے بغیر پیڈل کے چل رہی ہے اور بغیر سب کچھ کے چلا رہا ہوں۔

اپنے آپ کو پامال خوار و پریشان اور دردمند بنانے کے ہزار ہا طریقے ہیں اور ہر نئی صبح ان میں اضافہ بھی کرتی رہتی ہے اور ہر روز ان کی تیکنیک بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن بنیادی طور پر چند آسان طریقوں میں سے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہر اس صورت حال کا فکرمندی کے ساتھ اور پیشگی پریشانی کے ساتھ سامنا کیا جائے جو آپ کی راہ کا پتھر نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف راہ ہی راہ ہے اس میں کوئی پتھر نہیں ہے۔

ہمارے گھر میں منجملہ اور پریشانیوں کے لیے پریشانی تقریباً ہر دسویں پندرہویں دن لوٹ لوٹ کے حملہ آور ہوتی ہے اور اس کی یورش نومبر دسمبر میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ دردناک' عذاب صورت' جان لیوا اور تباہ کن پریشانی تحفے کے انتخاب کے وقت پیش آتی ہے جب ذہن کی ساری قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موقع پر اس خاص شخص کو ایک خاص مالیت کے اندر کس قسم کا خصوصی تحفہ دیا جائے کہ ہمارا بھرم رہ جائے اور اس کی باچھیں کھل جائیں۔

جب ہم دونوں میاں بیوی تین چار تحفے سوچ کر اس کی خرید کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو سب سے پہلا خوف یہ ہوتا ہے کہ شاید ہمارا تحفہ اس قابل نہ ہو کہ اسے لینے والے کے حضور پیش کیا جائے۔ پھر اگر حوصلہ کر کے دینے کا پکا ارادہ بھی کر لیا جائے تو یہ احساس گہری ندامت میں ڈبو دیتا ہے کہ وہاں جو اتنے اتنے بڑے

بڑے اعلیٰ اور بیش قیمت تحفے ہوں گے تو ہمارا تحفہ ان کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائے گا اور اس ناقابلِ علاج اور خوفناک بیماری کی وجہ سے فوراً دوسرے تحفوں سے الگ کر دیا جائے گا۔

پھر یہ خوف بھی ستانے لگتا ہے کہ اگر ان کے پاس پہلے سے یہ چیز موجود ہوئی اور وہ اس کی قیمت سے واقف ہوئے اور اسے استعمال کر کے رد بھی کر چکے ہوئے تب کیا ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ملازم نے حال ہی میں یہ چیز خرید کر انہیں دکھائی ہو اور پوچھا ہو" کیوں صاحب جی اچھی ہے۔ جمعہ بازار سے خریدی ہے" پچاس مانگ رہا تھا تئیس میں سودا ہو گیا۔ ابھی بھی اس نے کچھ کمایا ہی ہوگا۔"

یہ اور اس قسم کے گیارہ خوف اور ہیں جو تحفہ خریدتے وقت اور تحفہ لپیٹتے وقت اور تحفہ دیتے وقت شوق کو ریشم کے کیڑے کی طرح کوے میں لپیٹے رکھتے ہیں۔

تحفہ دینا مشکل ہے تو تحفہ لینا مشکل تر ہے۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔ فی الحال پچھلے مہینے کا قصہ سن لیجیے۔ ہم پاکستان زدہ دوستوں نے چند سال سے یوم قائداعظم پر ایک دوسرے کو تحفے دینے اور دعوتیں کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اب کی بار ڈاکٹر مسعود نے یوم قائداعظم پر جو تحفہ ہمیں بھیجا وہ بانس کی کھپچیوں کی بنی ہوئی ایک خوبصورت ٹرے تھی جو تائی وان کے لوک فن کا کمال تھی۔ ایسی دو ٹرے اس سے پہلے ہمارے گھر میں موجود تھیں۔ بانو نے رائے دی کہ چونکہ پیکنگ سے پتہ چلتا ہے کہ ٹرے کس سٹور سے خریدی گئی ہے اس لیے ہم چل کر اس کے بدلے کچھ اور لے لیتے ہیں۔ کوئی اور شے ہمارے کام کی اور ہمارے مطلب کی..... معقول تجویز تھی اور ہماری نیک نامی اور ہر دلعزیزی کی بنا پر اس کے لوٹائے جانے اور اس کی جگہ کوئی اور شے مل جانے کی قوی امید تھی لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ جب ہم نے کاؤنٹر پر جا کر سیلز مین سے کہا کہ آپ کی یہ ٹرے ہم کو ڈاکٹر مسعود صاحب نے تحفے کے طور پر بھجوائی تھی۔ ہمارے پاس چونکہ دو ایسی ٹرے اس سے پہلے ہی موجود ہیں اس لیے ہم اس کے بدلے کوئی کام کی شے لینے آئے ہیں۔ کوئی بہتر اور اچھی چیز..... سیلز منیجر میری بات سن کر مسکرانے لگا اور اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ ہمیں اس کے دلسوز رویے پر بڑا غصہ آیا لیکن اس کی مسکراہٹ بدستور اس کے گلوں پر پھیلتی رہی۔ میں نے غصے اور نفرت کی حالت میں اس کے کاؤنٹر سے ہٹنا چاہا تو میرے پیچھے کھڑے ڈاکٹر مسعود نے کہا" کہیے اشفاق صاحب کیا خرید و فروخت ہو رہی ہے سال کے شروع شروع میں۔"

"اوہو آپ ہیں۔" میں نے لڑکھڑا کر کہا۔" یہ آپ کی ٹرے دکھانے آیا تھا کہ اس قسم کی ایک اور مل جائے تو جوڑا ہو جائے۔ بہت ہی خوبصورت ٹرے ہے۔"

سیلز مین ویسی ہی دوسری ٹرے لے آیا تو سیلز منیجر نے کہا:" سر اس کو گفٹ پیک کرنا ہے یا ایسے ہی لے جائیں گے بڑے شاپر میں ڈلوا کر!"

جہالت کا زمانہ

جب میں اپنے بچوں کا اوران بچوں کے بچوں کا مشاہدہ کرتا ہوں تو اپنا بچپن نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے کہ ہم کو کس قدر توہم پرستی اور خرافاتی تصور کے تحت پالا گیا تھا جس میں سائنس اور علم کا کوئی دخل ہی نہ تھا۔ مرد لوگ چونکہ محنت مزدوری میں مصروف رہتے تھے اور دن بھر گھر والوں کے لیے دانہ دنکا جمع کرتے رہتے تھے اس لیے بچوں کی تربیت کی ساری ذمہ داری عورتوں کے کندھوں پر تھی۔ میرے بچپن کی عورتیں ان پڑھ بھی تھیں اور مطالعے اور مشاہدے سے بھی عاری تھیں۔ ان کی کل دنیا ان کا گھر تھا اور اس دنیا کے باشندے ان کے بچے، بچوں کے دوست یا بچوں کے عزیز واقارب تھے۔ اس وقت عورتیں اپنے بچوں کی نسبت سے جانی جاتی تھیں اور اپنے گھروں سے پہچانی جاتی تھیں ان کے خود کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

الحمد للہ کہ اب ہم ویسے ان پڑھ اور توہم پرست نہیں رہے اور ہماری زندگیاں بڑی بھرپور اور صحت مند ہو گئی ہیں۔ اب ہمارے لباس پر سورج کی روشنی مشکل سے نکھرتی ہے اور ہماری پھینکی ہوئی خوراک سے کتوں بلیوں چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اب ہم خوشحال اور فارغ البال ہو گئے ہیں..... میری پوتی آواز دے کر کہتی ہے ''امی دودھ پھٹ گیا ہے'' اس کی ماں چلا کر جواب دیتی ہے ''پرے رہو جانی اس کو ہاتھ مت لگانا۔ غلام حسین سے کہو اسے سنک میں ڈال کر اوپر سے نلکا چھوڑ دے۔''

''ہائے آنٹی آپ کی سوفٹ ڈرنک میں کوئی کِک ہی نہیں ہے۔ بلبلے ہی نہیں اٹھے۔''

''دوسری بوتل لے لو بیٹا اس کو دفع کرو...... چھوڑ دو۔''

''امی کیلے کالے ہو گئے۔''

''ڈسٹ بن میں پھینک دو بیٹا۔ کھانے نہیں ہیں پلیز۔''

ہمارے گھر میں جب کیلے گل کر بالکل پلپلے ہو جاتے تھے اور انہیں چھیلنا مشکل ہو جاتا تھا تو میری ماں انہیں کھاتے ہوئے کہا کرتی تھی ''اونڈروں والے کیلے اصل میں یہی ہوتے ہیں۔'' میرے اباجی بھی انہیں بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ ہم ڈھائی آنے والا تربوز کندھے پر اٹھا کر طویلے کی

طرف جارہے ہوتے تو میری ماں آواز دے کر پوچھتی "تربوز کدھر لیے جارہے ہو؟"
میرا بھائی کہتا۔ "کچا نکلا ہے اماں اندر بیج بھی سفید ہیں۔ سارے کا سارا کدو ہے۔"
ماں جھڑک کر کہتی۔ "رک جاؤ انہی قدموں پر اور توبہ کرو۔ تربوز سرخ ہو یا سفید دونوں کے کھانے کا حکم ہے۔ بیج مرغیوں کا حصہ ہیں اوپر کا سبز کھاپر بکریوں کا۔"
پھر وہ کدو جیسے کچے تربوز میں نمک کی ڈلی پھیر پھیر کر کھاتیں اور خدا کی نعمتوں کا دل سے شکریہ ادا کیے جاتیں۔

ہمارے گھر میں جب بھی پانچ آم آئے اور ہم کل چھ ہوئے تو اماں نے ہمیشہ یہی کہا "آم کھا کر تو میرا کلیجہ سلگنے لگتا ہے۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ گرمی خشکی ہو جاتی ہے۔ میں نہیں کھاتی آم"..... کبھی نو مالٹے ہوئے اور گھر میں ہم دس افراد ہوئے تو اماں نے میرے والد سے ایک ہی بات کہی کہ پتہ نہیں جی مالٹا کھا کر میرے گھٹنوں میں درد کیوں شروع ہو جاتا ہے اور رات کے وقت نزلہ کیوں گرنے لگتا ہے۔ ایک پھانک بھی کھالوں تو دونوں نتھنے بند ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگ کھائیں مجھے یہ پھل موافق نہیں ہے۔"
آج اگر چمکتا کاغذ کھولتے وقت بچے کے ہاتھ سے ٹافی قالین پر گر جائے تو اس کی ماں رسالے سے نگاہیں اٹھا کر "ہوں ہوں" کر کے کہتی ہے۔ "بری بات۔ زمین سے اٹھا کر منہ میں نہیں ڈالنا جراثیم لگ گئے ہیں۔"
ہم جب گنا چوستے چوستے کسی ٹوری پر آ کر رک جاتے تھے کہ آگے کیڑا لگا ہوا ہے تو میری ماں چمٹا اٹھا کر کہتی تھی "خبردار جو اس ٹوری کو توڑ کر پھینکا۔ گنا پھرا کر کیڑے والا حصہ نیچے کر لو اور اوپر اوپر سے آدھی پوری لمبائی کے رخ چوس جاؤ۔ ناشکری کرو گے تو اللہ ناراض ہوگا بیٹے۔"
آج میری بہو اپنی بچی کو انگلی سے کھیر کھانے پر منع کرتی ہے کہ ناخن میں جراثیم ہوتے ہیں چمچ سے کھاؤ۔ رکابی کو کھرچ کر فرنی سے چمچ نہ بھرو بلکہ نیچے کی سطح سے اوپر اوپر رہو۔ نیچے دانے دار وزنی مواد ہوتا ہے جو صحت کے لیے اچھا نہیں۔ اس میں وائرس ہو سکتا ہے۔
ہمارے ہاتھ سے جب کبھی شاہی ٹکڑا چھوٹ کر کچے فرش پر گر جاتا تھا اور ہم اسے اٹھا کر پھر کھانے لگتے تھے تو اماں دور ہی سے سلیپر اٹھا کر کہتی تھیں "ناشکرے ندیدے پہلے چوم کر پھر ماتھے کو لگا کر کھاؤ رزق کی بے عزتی کری تو جان نکال دوں گی۔"
دراصل ہماری ماں اور اس کے زمانے کی عورتیں ان پڑھ اور جاہل عورتیں تھیں وہ جراثیموں کے مقابلے میں خدا سے زیادہ ڈرتی تھیں۔

سیلف میڈ شخصیتیں

زندگی کے اس کھلے بازار میں آپ کو رنگا رنگ شخصیتیں بے قیمت ملتی ہیں اور ان کے ردّے آپ کی ذات کے گرد جمع ہو کر اونچی اونچی دیواریں اٹھا لیتے ہیں اور آپ ان کے اندر محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت خود ساختہ انسانوں کی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو سیلف میڈ کہہ کر پکارتے ہیں اور اسی نام سے جانے جانے پر فخر کرتے ہیں۔

پہلے پہلے جب مجھے سیلف میڈ آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا ''جناب میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں'' تو مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ بات وہ فخریہ طور پر کہہ رہے ہیں یا عاجزانہ انداز میں اظہار کر رہے ہیں کہ جناب میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔'' لیکن آہستہ آہستہ یہ بات مجھ پر کھلنے لگی کہ وہ یہ بات بڑے تفاخر اور گھمنڈ کے ساتھ کرتے ہیں اور ان تمام نامساعد حالات اور مشکلات اور راستے کی ان چٹانوں پر توجہ دلاتے ہیں جن کے باوصف انہوں نے مضبوطی سے اپنی بنیاد رکھی اور پھر اس پر اپنی شخصیت کی عمارت کھڑی کر لی..... ایسے لوگوں سے جب آپ بار بار ملتے ہیں تو آپ کا دل کرتا ہے کہ کمیٹی میں ان کے خلاف رپورٹ دے دیں کہ جناب بغیر نقشہ پاس کرائے اس شخص نے اپنی ذات کی غیر قانونی تعمیر کر لی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے ڈھا دیا جائے تاکہ ارد گرد کے محلے دار کھلی فضا میں سانس لے سکیں۔

لیکن سیلف میڈ آدمی کے بارے میں ایک بات البتہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نعوذ باللہ ان کی تخلیق اور تعمیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ جو سامنے کھڑے ہیں خود ہی اپنے سب کچھ کے ذمہ دار ہیں جو کچھ پوچھنا ہو انہی سے پوچھ لیجیے۔ اور پوچھنے کے سلسلے میں بھی آپ کو کچھ ایسی زحمت نہیں کرنی پڑتی کیونکہ سیلف میڈ آدمی کی ایک بنیادی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود ہی سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے اور جب پورا جواب دے چکتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے۔ رکنے کے دوران ذرا سا مسکرا کر اور ایک آنکھ بند کر کے بڑی خاموشی سے گویا پوچھتا ہے کہ کیوں جناب کیسا جواب ہے؟ اور جب آپ اس جواب

کی شان میں قصیدہ کہنے کا عزم کرتے ہیں تو وہ آپ کے بولنے سے پہلے اس جواب کی خود اپنے دیئے ہوئے جواب کی تین بنیادی خرابیاں بیان کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اور آپ پر یہ سوال آہستہ آہستہ کھلنے لگتا ہے کہ سرکس کمپنیوں والے سارے مسخروں کو اپنے یہاں ملازمت کیوں نہیں دے دیتے۔ جہاں تک میرا مشاہدہ ہے سیلف میڈ لوگ زیادہ تر لاہور ہی میں ملتے ہیں لیکن باہر سے آنے والے بتاتے ہیں کہ دوسرے شہروں میں بھی یہ مصیبت ایسے ہی نازل ہوتی ہے' کوئی خاص فرق نہیں..... لیکن آپ اس سے خدانخواستہ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ سیلف میڈ آدمی کوئی بالکل ہی منفی یا غیر اہم سی چیز ہوتی ہے' وہ باقاعدہ ایک بھرپور فرد ہوتا ہے۔ ایک اکائی ہوتی ہے۔ اس کی ایک واضح شخصیت ہوتی ہے لیکن وہ شخصیت ایک انسان پر اچھی نہیں لگتی۔ انسان پر فٹ نہیں آتی۔

لندن سے میری بھانجی کا فون آیا کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اس کا خاوند سیالکوٹ کا رہنے والا ہے جو کئی سال سے لندن میں آباد ہے۔ میں نے پوچھا کیا کرتا ہے تو اس نے کہا "آیا تو ایک سٹوڈنٹ کی حیثیت سے تھا لیکن بعد میں اس نے یہاں تجارت شروع کر دی اور اب کروڑ پتی آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر تو وہ ایک سیلف میڈ انسان ہوا شاہدہ۔"

"سیلف میڈ شخص تو ہے ماموں۔" شاہدہ نے کہا لیکن میں اس میں آلٹریشن کر رہی ہوں۔ جب آپ اسے دیکھیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے..... لیکن ذرا صبر کے آیئے گا آلٹریشن پر تین چار مہینے لگ جائیں گے۔

شکایت کی گود میں.....شکوہ

عمر کے اس آخری حصے میں بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان اپنے آپ کو اونچا' بہتر' منفرد اور توجہ طلب ثابت کرنے کے لیے صرف ایک ہی چیز کا سہارا لے سکتا ہے اور وہ چیز ہے آزردگی' ناشکری' خوف اور اندیشہ ناک مزاج۔

آپ علم سے' دولت سے' شہرت اور نیک نامی سے اتنی توجہ حاصل نہیں کر سکتے جس قدر توجہ آپ ذرا سے کربناک' سوزناک اور شکایت ناک ہو کر کر سکتے ہیں۔ انسانی زندگی میں' تیسری دنیا کی انسانی زندگی یا کم از کم ہمارے معاشرے میں شاکی انسان بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے اس فعل کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آپ اپنے معاشرے کے لیے' اپنے خاندان کے لیے اپنے گھر کے لیے کوئی تعمیراتی کام کریں اور تن تنہا کریں' آپ کی کوئی توصیف نہیں ہوگی۔ آپ کچھ نہ کریں اور صرف شکایت کریں' حالات کی' زمانے کی' عزیز و اقارب کی' انتظامیہ کی' جامعہ کی' کوچہ و بازار کی' محبوب کی سرکار کی.....آپ کو ایک پسندیدہ شخصیت سمجھ کر پیروں کی طرح آپ کی مدارات کی جائیں گی.....لیکن شکایت کرنے اور سوگ منانے کے لیے ایک خاص رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں آپ اسے اپنی ذات یا اپنے جسم کے خلاف شکایت کرنے سے شروع کر سکتے ہیں۔ یہ آسان طریقہ ہے اور آپ کو اس فن میں جلد ہی پختہ کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ جب آپ نے اس میں پختگی حاصل کر لی پھر جلد ہی آپ عالمی شہرت کے شاکی اور سوگی بن جائیں گے۔

جسمانی شکایت کے سلسلے میں آپ سر سے ابتدا کر سکتے ہیں کہ میرے سر سے بال گر رہے ہیں اور کھیتی چھدری ہو رہی ہے۔ سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آپ اس خوف میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ بال پہلے کے مقابلے میں زیادہ گھنے ہو گئے ہیں اور ان کی جڑیں کھردری ہو گئی ہیں.....میری آنکھیں گرمی سردی میں زیادہ کھلی رہنے لگی ہیں اور ڈھیلے پہلے کے مقابلے میں زیادہ گول اور بڑے ہو گئے ہیں۔ اب آنکھیں ڈوبی ڈوبی سی رہتی ہیں اور ان پر غلافی پپوٹے گرے رہتے ہیں۔ کوشش کے باوجود آنکھیں کھل نہیں سکتیں.....زبان سفید سفید رہتی ہے۔ زبان بہت زیادہ لال لال ہوتی ہے۔ سانس ہلکی ہلکی آتی ہے سانس بھاری بھاری اور بھدی

عرضِ مصنف

بھدی آتی ہے۔ رات کو نیند کم آتی ہے۔ دن کے وقت بھی اونگھتا رہتا ہوں۔ جلد تیلیا ہوگئی ہے' جلد بالکل خشک رہتی ہے' جلد کی رنگت پیلی پیلی سی کیوں ہوگئی ہے' جلد کی رنگت لال لال کس لیے ہوگئی ہے' معدے میں درد ہے' معدہ بے جان ہے' بے کیف ہے' گھٹنے اکڑ گئے ہیں۔ گھٹنے ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ کوئی رگ نظر نہیں آتی۔ نہ نیلی نہ لال۔ رگیں پھول کر باہر نکلی رہتی ہیں۔ تلوے موٹے ہوگئے ہیں۔ تلوے باریک ہوگئے ہیں۔ ہتھیلی کے اندر بے شمار جھریاں پڑ گئی ہیں۔ ہتھیلی کے اندر زندگی کی لائن چھوٹی ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر نے جب سٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھا تو بنائن کے اوپر سے لگا کر دیکھتا تھا۔ اس کا ایک ایئرپیس کان سے باہر نکلا ہوا تھا' سٹیتھوسکوپ لگاتے وقت ڈاکٹر صاحب باتیں کر رہے تھے' سگریٹ پی رہے تھے چہرے سے پریشان نظر آتے تھے' مشکل سے خوش وخرم اور بے پرواہ دکھائی دیتے تھے..... جس انگلی سے خون لیا وہ صحیح انگلی نہیں تھی۔ اس میں خون کم تھا۔ اس میں خون زیادہ تھا۔ خون کا نمونہ دینے سے پہلے میں نے سوڈا واٹر پیا تھا۔ آئس کریم کھائی تھی۔ کافی پی بیٹھا تھا۔ کونین کی گولی کھائی تھی۔ ایسپرین کھائی تھی۔ مائی سین کھائی تھی۔ ٹافی کھائی تھی۔ میرے منہ میں بہل گم تھی۔ تمباکو والا پان تھا۔ نسوار تھی۔ خون کا نمونہ ٹھیک نہیں تھا۔ بروقت نہیں تھا۔ جب وہ ایکس رے لے رہا تھا تو میں ذرا سا ہل گیا تھا۔ جب ای سی جی ہو رہا تھا تو مجھے کھانسی آ گئی تھی۔ اچھو آ گیا تھا۔ ہنسی آ گئی تھی۔ رونا نکل گیا تھا۔

دل تیزی سے دھڑکتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ سست چلتا ہے۔ پیشاب ضرورت سے زیادہ آتا ہے' ضرورت سے کم آتا ہے۔ بینائی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے' بینائی ضرورت سے کم ہوگئی ہے۔ ضرورت' ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ضرورت' ضرورت سے کم ہوگئی ہے..... میری پریشانی اور بے چینی بڑھ گئی ہے۔ میری لاتعلقی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں وہ نہیں جو پچاس برس پہلے تھا۔ میں وہی ہوں جو پچاس برس پہلے تھا۔ میں اس وقت بھی کیا تھا۔ میں اس وقت بھی کیا ہوں۔

مجھے اپنے جسم سے شکایت ہے۔ اپنی صحت سے شکایت ہے۔ اپنی آب و ہوا سے شکایت ہے۔ دیسی دواؤں سے شکایت ہے۔ انگریزی علاج سے شکایت ہے۔ ہومیوپیتھی سے الرجی ہے۔ میں ایک دکھی اور روگی اور سوگی انسان ہوں اور شکایت کی گود میں ایک چھوٹے سے شکوے کے طور پر پرورش پا رہا ہوں اور میری نشوونما کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔

معجون مرکب (1)

بہاولپور کے علاقے میں تعلیم بالغاں کے ادارے بڑے فعال ہیں اور وہاں کے عمر رسیدہ طالب علم جلد ہی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں لیکن جب ان سے معلومات عامہ کے سوال پوچھے جاتے ہیں تو ان کے لیے یہ مرحلہ سب سے بڑی مشکل بن جاتا ہے۔ وہ سوالناموں کا جواب دینے سے کتراتے ہیں اور امتحانوں میں شریک ہونے سے اجتناب کرتے ہیں۔

حال ہی میں یزمان کے قریب ایک چک کے تعلیم بالغاں کے ادارے میں طالب علموں نے اپنا پرچہ حل کرنے سے انکار کر دیا اور ضلعی حاکم کو ایک عرضی گزاری کہ ہمیں مشکل پرچہ دیا گیا ہے جو سارے کا سارا نصاب سے باہر ہے اور جس کے سوال ہائی سکول کے طالب علم بھی آسانی سے حل نہیں کر سکتے۔ ہم اس پرچے کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں اور اپنے مدرسے میں آنے کی ہڑتال کرتے ہیں۔

ضلع کے آفیسر نے پرچہ منگوا کر دیکھا تو اسے دلی رنج ہوا کیونکہ یہ واقعی مشکل تھا اور تعلیم بالغاں کے معیار سے بہت اونچا تھا۔

پہلا سوال تھا کہ چاندی کا روپیہ کس دھات کا بنا ہوتا ہے؟

دوسرا سوال تھا: موسموں کے تغیر و تبدل کی وضاحت کریں یا اپنا نام خوشخط لکھ کر دکھائیں۔

تیسرا سوال تھا: ان الفاظ کی املا بتائیں اور جوڑ کے بتائیں کہ یہ کیا لکھا ہے۔ کرسی' بازار' قلم اور سنگترہ۔

چوتھا سوال تھا: رات نو بجے کی خبریں کس وقت نشر ہوتی ہیں۔

پانچواں سوال تھا: دن میں کتنی نمازیں ہوتی ہیں اور فجر ظہر عصر مغرب اور عشاء کے بعد کیا ہوتے ہیں۔

چھٹا سوال تھا: ایک سے لے کر دس تک گنتی لکھیں۔ (نوٹ اگر کسی نے ترتیب میں غلطی کی تو اس کے نمبر کاٹ لیے جائیں گے)۔

ساتواں سوال تھا: آنکھوں پر لگا کر پڑھنے والی عینک کو کیا کہتے ہیں اور اس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔
آٹھواں سوال تھا: رانجھا جب دکھی ہو کر بیلے میں بانسری بجایا کرتا تھا تو موسیقی کے اس آلے کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟
نواں سوال تھا: درختوں کے سبز پتوں کا کیا رنگ ہوتا ہے؟
اور دسواں سوال تھا: آٹے کی روٹی کس چیز سے بنائی جاتی ہے۔

ان دس سوالوں کے دس دس نمبر تھے اور پورا پرچہ سو نمبر کا تھا۔ پاس ہونے کے لیے سو میں سے دس نمبر لینے ضروری تھے لیکن بارہ کے بارہ طالب علم ایک گھنٹہ پرچے پر غور کرنے کے بعد کمرہ امتحان سے باہر آ گئے۔ انہوں نے تعلیم بالغاں کے ضلعی حاکم کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم کو تین گھنٹے سے زیادہ وقت دیا جاتا تو ہم یہ سارے سوال حل کر سکتے تھے لیکن چونکہ ہمارے پاس وقت کم تھا اس لیے ہم احتجاج کے طور پر باہر نکل آئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ احتجاج کیوں کرتے ہیں پرچہ کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے کہا کہ چونکہ سارے تعلیمی اداروں میں احتجاج ہوتا ہے اس لیے ہم بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہیں تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ تعلیم بالغاں دوسری تعلیم کے مقابلے میں کوئی گھٹیا اور بے وقعت تعلیم ہے۔

معجون مرکب (2)

خواتین کی جو تحریکیں ان دنوں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں میں ان کی بابت کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ مجھے آج تک تحریکوں سے کبھی روشناسی حاصل ہی نہیں ہو سکی۔ کتابوں میں ان کا ذکر ضرور دیکھا ہے مگر کبھی کسی زندہ تحریک کو نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھا انسانوں کو دیکھا۔ گروہ کی صورت میں' جماعت کی شکل میں' انبوہ کی حالت میں یا پھر الگ الگ علیحدہ علیحدہ۔ خوش و خرم' سیر گلشن میں مصروف یا پھر خوار و پریشان دردمند اور پائمال۔

پتہ نہیں آپ کے تجربے سے یہ بات گزری ہے کہ نہیں کہ اگر عورت کو مرد کی زندگی سے ایک لمحے کے لیے الگ کر دیا جائے تو مرد کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا وہ ہر وقت مسکراتا اور سر ہلاتا ہوا ایک جوکر بن کر رہ جاتا ہے جس کے اردگرد تالی بجانے والا بھی کوئی باقی نہیں رہ جاتا! اور ایسے جوکر کا کوئی کیا کرے جس کا کوئی تماشا کرنے والا بھی نہ ہو۔

اس دنیا میں عورت کا اہم ترین کام مرد کے قریب رہ کر ان کاموں کو نپٹانا ہے جن سے مرد کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ مرد سے آج تک ٹوٹے ہوئے بٹن نہیں لگائے جا سکے۔ بوٹوں کے تسمے توڑ کر اور ان کو دوبارہ گانٹھ دے کر پھر سے بوٹوں میں نہیں پرویا جا سکتا۔ پکی ہوئی گانٹھ نہیں کھولی جا سکتی۔ اپنی عینک رکھ کر بھول جائے تو اسے اکیلا تلاش نہیں کر سکتا۔ ہمیشہ اپنے ریز ر بلیڈ لانے بھول جاتا ہے۔ کبھی اپنا سگریٹ لائٹر نہیں ملتا۔ ابھی یہاں قلم کھول کر رکھا تھا' ابھی اس سے رسید پر دستخط کر کے ڈاکیے سے پارسل لیا تھا اور ابھی وہ گم ہو چکا ہے۔ سارے گھر میں پن نام کی کوئی چیز ہی نہیں.....کار کی چابیاں اگر اکیلے مرد کو تلاش کرنی پڑیں تو سارے مہینے میں سات دن سے زیادہ کار نہ چلے۔

کسی مرد کو آج تک اپنے گھر کے دھوبی کی شکل بھی یاد نہیں۔ کپڑے کب گندے ہوتے ہیں۔ کہاں کہاں سے اکٹھے ہوتے ہیں اور کدھر سے دھل کر آ جاتے ہیں اس راز کا عقدہ آج تک کسی مرد پر نہیں کھل سکا۔ مرد کو آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر اتنا شور کیوں مچاتا ہے اور جب وہ ذرا سی بات

طے کر دی جاتی ہے تو پھر بھی کیوں طیش میں آیا رہتا ہے۔ وہ نہ ہونے پر تو جھگڑتا ہے ہی مل جانے پر کیوں غراتا ہے اس کا بھید ابھی تک مرد پر نہیں کھلا۔ دراصل وہ کسی بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ اور صدیوں سے اس کوشش میں مصروف ہے لیکن ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس طرح کی ایک عجیب سی ناکامی بیوہ عورتوں کی زندگی کا بھی حصہ بن جاتی ہے اور وہ اس کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہو پاتیں۔ بیوہ عورت کی زندگی کا یہ المیہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک بہت ہی قریبی ساتھی سے محروم ہو گئی ہے اور یہ محرومی اس کی معاشرتی' نجی' جذباتی' روحانی اور مالی زندگی پر شدت سے اثر انداز ہو رہی ہے بلکہ اسے ایک ہی بات کا غم نوچ نوچ کے کھائے چلا جاتا ہے کہ اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس کے بغیر سارے کام بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ طے ہو رہے ہیں۔ اس وقت عورت تہیہ کر لیتی ہے کہ چونکہ کرنے کے چھوٹے چھوٹے کام باقی نہیں رہے اس لیے اس کا مزید زندہ رہنا بے معنی اور بے مصرف ہو گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے کام اور اونچے اونچے عزائم عورت کو زندہ رہنے پر اتنا مجبور نہیں کر سکتے جتنا چھوٹے بچے کا نیپی بدلنے اور خاوند کے بڑھتے ہوئے گنج میں روزانہ تیل جھسنے کا کام اسے حیات نو عطا کر سکتا ہے..... پتہ نہیں ہم اپنے اندر کا مطالعہ کرنے سے پہلے باہر کی بڑی بڑی تحریکیں کس طرح سے شروع کر لیتے ہیں۔

معجون مرکب (3)

میری بیوی میرے گھر سنبھالنے کی صلاحیت سے پوری طرح واقف ہے اس لیے اس نے میرے کندھوں پر کبھی ایسا بوجھ ڈالا ہی نہیں جس سے بوجھ کو بعد میں خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ ہر غمی اور خوشی کے موقع پر اپنے گھر اور اپنی روٹین کے قریب ہی رہتی ہے سوائے اس لمحے کے جب ہم دونوں کو ایک ساتھ باہر جانا پڑے۔

پرسوں ایک ایسی افتاد آ پڑی کہ اسے اور میری بہو کو ایک ساتھ گھر سے باہر جانا پڑا اور جاتے ہوئے وہ میری پوتی ارشیا میری تحویل میں دے گئیں کہ یہ مغرب کے بعد چونک کے اٹھے گی اس وقت فیڈر فوراً اس کے منہ میں دے دیا جائے اور اسے چھوٹا ہاتھی بڑا ہاتھی سیر کو گیا والا گانا سنایا جائے۔ یہ گانا میری بیوی نے خود بنایا ہے اور اس کے بول ہر ادائیگی کے وقت بدل جاتے ہیں سوائے اس کے مکھڑے کے کہ وہ ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔

ماتم والے گھر پہنچ کر میری بہو نے فون کیا کہ ابو ہم اس نمبر پر ہیں اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو تو ہمیں اس نمبر پر فون کر لیں اور اس نمبر کو احتیاط سے کسی کاپی پر لکھ لیں۔ میں نے اپنی بہو کا شکریہ ادا کیا اور فون نمبر اخبار کے ایک کونے پر لکھ لیا..... مغرب کے فوراً بعد ارشیا بی بی نے زور کی ایک چیخ ماری اور میں نے فیڈر ان کے منہ میں داخل کر کے چھوٹا ہاتھی والا گانا شروع کر دیا..... کچھ تو میرے گانے کی دھن دوسرے ارشیا بیٹی کی دودھ پیتے وقت دودھ پلانے والے کے منہ پر ہاتھ پھیرنے کی عادت۔ اس نے تو دو تین گھونٹ پی کر آزادی اظہار کا اعلان کر دیا۔ میں نے چھوٹا ہاتھی بڑا ہاتھی کی دھن تیز بھی کر دی اور اونچی بھی کر دی۔ ارشیا نے بھی اپنی آروھی امروھی درست کر کے لے تیز کر دی۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے ماتم والے گھر فون کر کے اپنی بیوی کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا تو اس نے غالباً مسکرا کر کہا آپ ارشیا کو ریڈیو سنائیں۔ اس سے وہ فوراً چپ ہو جاتی ہے۔ خواہ پروگرام کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ میں نے بلبلاتی ہوئی بلبل کو گود میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں جا کر ریڈیو آن کیا تو بتی جلی۔ کھیس کھیس کی سرگوشی بھی شروع ہوئی۔ لیکن ریڈیو سے کوئی آواز برآمد نہ

ہوئی۔ سارے بینڈ بدل کر اور والیوم فل کرنے کے بعد جب ریڈیو سے کوئی حرف تسلی برآمد نہ ہوا تو میں نے دوبارہ اپنی بیوی کو فون کیا کہ ریڈیو چل نہیں رہا اب کیا کیا جائے۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا مجھے بڑا افسوس ہے میں اس وقت بتانا بھول گئی کہ ریڈیو آن کرنے کے بعد جس میز پر ریڈیو پڑا ہے اس کے دراز کو پورا کھول کر تین مرتبہ زور سے ٹپاک کر کے بند کیا جائے تو پھر ریڈیو چلتا ہے۔ میں فون بند کر کے اس آپریشن کی طرف منتقل ہونے والا ہی تھا اور میں نے ابھی میز کی دراز کھولی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی بڑی لجاجت سے کہہ رہی تھی کہ آپ نے جلدی فون بند کر دیا اور میں اس وقت بتانا بھول گئی کہ میز کی تیسری دراز کھول کر تین دفعہ پٹاک سے بند کرنا ہے کوئی اور دراز کھول کر پٹاک سے بند کریں گے تو ریڈیو چالو نہیں ہوگا۔

میں نے تیسرے دراز کو تین مرتبہ کھول کر جب پٹاک سے بند کیا تو ریڈیو فوراً ریلوں اور ہوائی جہازوں کے بھاؤ بتلانے لگا۔ میرا خیال تھا اس ٹائم ٹیبل کو سنتے ہی ارشیا فوراً خاموش ہو جائے گی لیکن اس نے تو آسمان سر پر اٹھالیا اور پہلے کے مقابلے میں اور تیز ہوگئی۔ اب ایک کے بجائے دو آوازوں نے گھیر لیا۔ ایک سامنے سے ایک پہلو سے۔ میں نے پھر ماتم والے گھر میں فون کیا اور اپنی بیوی کو اس صورتحال سے آگاہ کیا تو اس نے پہلے ذرا سا تعجب کر کے پھر فوراً کہا اوہو ہو ہو..... آپ اس کو لاہور سنا رہے ہوں گے یہ لاہور دو کی عادی ہے.....لاہور ایک سن کر تو یہ نہ بھی رو رہی ہو تو بھی رونا شروع کر دیتی ہے.....

میں نے کہا آپ خدا کے لیے فوراً گھر آ جائیں ورنہ اس ایک دو کے چکر میں ہم دونوں جہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم پر مہربانی فرمائیں اور اس مشکل وقت میں ہماری مدد کریں۔

معجون مرکب (4)

چند دن پہلے میں نے کہیں سے یہ خبر سنی کہ ایک پٹرول پمپ کے پیچھے ایک ویران کھیت میں جھاڑیوں کے پیچھے تیرہ چودہ برس کے ایک نوجوان لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ لوگ جمع ہو گئے اور اوندھے لیٹے ہوئے مردہ لڑکے کو سیدھا کر کے اسے شناخت کرنے لگے لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکا اس علاقے کا نہیں ہے کسی قریبی بستی سے آیا ہے اور پھر یا تو قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے یا کسی نے کوئی ظلم توڑا ہے.....لوگ لاش اٹھا کر قریبی تھانے میں لے گئے جہاں اس کے فوٹو اتار کر اور اسے لاوارث قرار دے کر دفن کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

میت کو غسل دینے والوں نے محسوس کیا کہ لڑکا مردہ نہیں ہے اور اس میں زندگی کے آثار باقی ہیں گو وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ زندہ ہے چنانچہ میت کو وین میں ڈال کر بڑے ہسپتال لے جایا گیا جہاں سرجن نے اسے دیکھتے ہی فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کیا اور اس کے اپنڈیکس کا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کے ساتھ ہی اس کو فوری نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کر دیا گیا اور ڈاکٹروں کی دو دن کی ان تھک محنت کے بعد جو پہلا فقرہ اس لڑکے نے بولا وہ یہ تھا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔

انڈے دلیے کا ناشتہ کر چکنے کے بعد وہ لڑکا گہری نیند سو گیا اور کوئی اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل اسی طرح سویا رہا اور جب وہ ہسپتال سے چھٹی پا کر اپنے رشتہ داروں کے ساتھ روانہ ہونے لگا تو سرجن نے اسے تحفے کے طور پر ایک ڈیجیٹل گھڑی دی جو قیمت کے اعتبار سے تو سستی سی تھی لیکن قدر و منزلت کے طور پر بے بہا اور بیش قیمت تھی۔

ایسے واقعات زندگی میں بہت کم رونما ہوتے ہیں اور یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے کہ ہم اپنی روایتی تیزی اور جلد بازی سے اپنے فیصلوں پر عمل نہیں کرتے......

خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے اردگرد روحانی طور پر اور اخلاقی طور پر مردہ لوگوں کو مردہ نہیں سمجھتے اور ان سے یہ توقع وابستہ کر کے بیٹھے رہتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن پلٹ کر اور اپنا آپ جھٹک کر پھر یہ زندہ ہو جائیں

گے اور صاف ستھرے اور پاک لوگوں کے گروہ میں شریک ہو جائیں گے۔ اور ان کی وجہ سے معاشرے کے درجات اور بلند ہو جائیں گے۔

اصل میں کوئی شخص خواہ وہ کتنا بھی برا کیوں نہ ہو مکمل طور پر برا نہیں ہوتا اس کا کوئی نہ کوئی پہلو انسانیت سے لبریز ضرور ہوتا ہے اور اس کے اندھیرے میں سے نکل کر نور کی طرف لوٹ آنے کے بڑے چانس ہوتے ہیں۔ ایسے تمام اشخاص کی زندگی اور روحانی سربلندی پر پہنچنے کا تمام تر بوجھ ان لوگوں پر ہوتا ہے جو لمبے انتظار کا حوصلہ رکھتے ہیں اور جن کو خدا نے یہ صلاحیت عطا کی ہوتی ہے کہ وہ جلدی کوئی فیصلہ صادر نہیں فرماتے۔ وہ لوگ جو خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوتے اور انتظار اور صبر کے فن سے پورے طور پر آشنا ہوتے ہیں وہ ذہین سرجن کی طرح نہ صرف اپنے اردگرد کے بھٹکے ہوئے لوگوں کو نئی زندگیاں عطا کرتے ہیں بلکہ ان کو مستقبل کے لیے خوش آیند گھڑیوں سے نواز دیتے ہیں۔

معجون مرکب (5)

اس زندگی میں بڑے بڑے کام کرنا بڑی ہی آسان بات ہے اور بڑے کاموں کو نپٹانے میں ان کی راہ میں کوئی مشکل بھی حائل نہیں ہوتی۔ بس اک ذرا ارادے کی دیر ہوتی ہے اور ایورسٹ کی چوٹی سر ہو جاتی ہے۔ سمندروں کے نیچے سے تیل نکل آتا ہے۔ ذرا سی بھرپور لگن لینے سے آدمی چاند پر پہنچ جاتا ہے۔ معمولی سے ادارے سے ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں کو صفر میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن جو نہیں ہو پاتے اور چلنے پر نہیں چڑھتے وہ معمولی معمولی کام ہوتے ہیں۔

میرے لکھنے والے کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی جگہ عرصہ پانچ سال سے گتے کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہے لیکن یہاں مجھ سے شیشہ نہیں لگوایا جاتا۔ بارش کی وجہ سے یہ گتا تین مرتبہ تبدیل ضرور کیا جا چکا ہے لیکن اس کی جگہ شیشہ نہیں لے سکا..... میرے اس بریف کیس کا، یہ جو میری نظروں کے سامنے پڑا ہے، اس کا ایک تاعرصہ ڈیڑھ سال سے ناکارہ ہو چکا ہے۔ میں اس کو صرف ایک تو تے یا ایک ہوڑے کے سر پر بند کرتا اور کھولتا ہوں اور مجھے ہر گھڑی اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ کسی روز سر بازار اس کا دروازہ کھل جائے گا اور میری بکھری ہوئی چیزوں کو موٹروں سکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے پہیے سمیٹ کر لے جائیں گے لیکن مجھ سے یہ ہوڑہ مرمت نہیں کروایا جا سکے گا۔

آپ کے گھر کی ٹونٹی قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے۔ دن تو خیر جوں توں کر کے گزر جاتا ہے البتہ رات گزارنی بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ ہر روز اس ٹونٹی پر صاف شفاف دھجی کی نئی پگڑی باندھتے ہیں اور صبح سویرے اتار دیتے ہیں لیکن اس ٹونٹی کو نہ بدلوا سکتے ہیں نہ اس کی واشر تبدیل کر سکتے ہیں، اس لیے نہیں کہ یہ کوئی مشکل کام ہے بلکہ محض اس لیے کہ یہ ایک معمولی کام ہے اور کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔ راستے میں ایک دن آپ کو محمد دین پلمبر سائیکل پر جاتا ہوا ملا بھی تھا۔ آپ نے اسے ٹونٹی بدلنے کو کہا بھی تھا۔ اس نے ہامی بھی بھری تھی لیکن ٹونٹی ابھی تک ویسے ہی دستار باندھے موجود ہے اور اس نے اپنے اوپر کسی اور کو Supercede ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

میرے دونوں ہاتھوں کی متعدد انگلیاں اس پن سے بار بار خون آلود ہو چکی ہیں جو میں نے اپنی عینک کے فریم میں پیچ نکل جانے کے بعد وقتی طور پر ڈال دی تھی۔ اس بات کو کوئی چھ مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں اور پن نے میری ساری انگلیاں فگار اور تقریباً سارے پن خوں چکاں بنائے ہیں لیکن میں اس میں پیچ نہیں لگوا سکتا۔ اب بھی جب..... آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہ عینک اتاروں گا تو ہلکی سی "سی" میرے ہونٹوں سے ضرور برآمد ہو گی۔

میرے ٹائپ رائٹر کا حرف ڈبلیو کاغذ پر سجدہ کرنے کے بعد واپس نہیں آتا۔ مجھے ہر مرتبہ اسے انگلی سے جگا کر واپس لانا پڑتا ہے۔ یہ خرابی میرے ٹائپ رائٹر میں اس وقت سے ہے جب میں نے یہ مشین خریدی تھی۔ اب میں اسے ایک سیکنڈ ہینڈ مشین کے طور پر بیچنے کی فکر میں ہوں اور مجھے خریدنے والے کو بتانا پڑے گا کہ اس کا ڈبلیو عبادت گزار قسم کا حرف' اس لیے اسے مراقبے سے خود نکالنا پڑتا ہے۔

میرے بیڈ لیمپ کا پلگ اور اس کا سوئچ میرے پلنگ کے نیچے عین درمیان میں ہے۔ رات کو سوتے وقت مجھے اپنے پلنگ کے نیچے ایک نقب زن کی طرح داخل ہو کر اسے بجھانا پڑتا ہے اور جب میں واپس نکلتا ہوں تو میرا سر پلنگ کی پٹی سے ضرور ٹکراتا ہے اور ساتھ کی میز سے ایک شیشی ضرور نیچے گرتی ہے۔ اب تک کئی شیشیاں گر کر فانی ہو چکی ہیں اور کئی سر ٹوٹ چکے ہیں لیکن پلگ اور سوئچ اسی جگہ پر ہیں جہاں پہلے ہوا کرتے تھے۔

میرے اور آپ کے ان کاموں کو نپٹانے کے لیے ہزاروں مزدور اور کاریگر کام پر لگ سکتے ہیں اور ملک سے بیروزگاری کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بیروزگاری کا مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود ہے اور کھڑکی میں گتے کا ٹکڑا جوں کا توں چمٹا ہوا ہے۔

اصل میں یہ دور بڑائی کا' برتری کا' Bigners کا اور Macrocarn کا دور ہے۔ اس میں آپ کو ہارٹ اٹیک' کینسر' گردے کی تبدیلی اور بائی پاس کے لیے تو سینکڑوں ڈاکٹر فوراً مل جائیں گے لیکن پھنسی پر پھاہا لگانے' کان میں دوا ڈالنے' زکام کا علاج کرنے اور مکسچر تیار کرنے والا ایک ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے ساتھ آپ کو عمر بھر رہنا پڑے گا اور بڑے بڑے موذی امراض کے علاج کے لیے کلینک آپ کو آوازیں دے کر بلاتے رہیں گے اور ہوم سروس کی سہولتیں بہم پہنچاتے رہیں گے۔

یہ کیسا دلفریب' حوصلہ افزا اور دل خوش کن دور ہے کہ اس میں ہر شخص بڑا بن کر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن معمولی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتا۔

معجون مرکب (6)

کیا آپ کبھی دنیا کے کسی قانون ساز ادارے کے رکن رہے ہیں۔ میں بھی نہیں رہا! لیکن میری آرزو ہے کہ تھوڑا سا اختیار میرے پاس بھی ہوتا اور میں بھی اس دنیا کے لوگوں کی خدمت کر کے ہی آگے جاتا' لیکن جوں جوں وقت گزر رہا ہے میرا شک یقین میں تبدیل ہو رہا ہے کہ یہ دنیا مجھ سے فیض حاصل کیے بغیر ہی آدھے میں لٹکی رہے گی اور میں اپنا وقت پورا کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دراصل میری دلی آرزو تھی کہ میں کرۂ ارض کے رہنے والوں کے لیے کچھ قانون ایسے بنا جاتا جن سے ان کی زندگی آسان ہو جاتی اور وہ میرا کانسی کا بت ہر سال سوڈا کاسٹک کے ہلکے سلوشن سے چپکا کر کبوتروں کی نئی نسل کے بیٹھنے کے لیے تیار کر دیا کرتے' لیکن افسوس ابھی تک ایسا ہو نہیں سکا اور آگے بھی مجھے کم ہی امید ہے۔

میرے مسودہ قوانین میں سے چند ایک بین الاقوامی قانون یہ ہیں:

(1) کوئی شخص اکیس سال کی عمر سے پہلے تمبا کو نوشی نہیں کر سکتا.....اور کوئی شخص.....جس کی عمر اکیس سال سے زیادہ ہو تمبا کو نوشی کا مجاز نہیں ہے۔

(2) ٹیلی ویژن اپنے ایک گھنٹے کے پروگرام میں یا تو ایک مرتبہ اپنی اناؤنسر دکھا سکتا ہے یا ایک اشتہار چلا سکتا ہے۔

(3) دنیا میں کوئی خط یا کوئی عرضی یا کوئی رپورٹ ایک فل سکیپ کاغذ سے زیادہ ٹائپ نہیں کی جا سکتی البتہ ہاتھ سے لکھی ہوئی عرضی دو صفحات تک ہو سکتی ہے۔

(4) سیاستدان اپنی تقریروں میں ''استحصال' آزادی' خوشحالی اور غریب عوام'' کے الفاظ ایک سو مرتبہ سے زیادہ نہیں دہرا سکتے۔

(5) پانچ منٹ سے زیادہ ٹیلی فون پر بات کرنا جرم قرار دیا جاتا ہے اور اس کے مرتکب کو پانچ سو روپے جرمانہ سے لے کر ایک مہینہ قید با مشقت تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔

(6) پچاس سال سے بڑی عمر کی ہر عورت کو بال رنگنے کی مناہی ہوگی۔ ہر مرتبہ غیر قانونی طور پر بال رنگنے کے متعلقہ خاتون کو ایک سو ساٹھ روپے سرکاری خزانے میں جمع کرانے ہوں گے جس کی باقاعدہ رسید جاری کی جائے گی۔

(7) ہر گھڑی' کلاک اور ٹائم پیس پر ایک سے بارہ تک کے ہندسے لکھے جائیں گے نکتے اور نکتے نہیں ڈالے جائیں گے۔ جن گھڑیوں پر ہندسے نہیں ہوں گے صرف نقطے ہوں گے ان کے فروخت کنندگان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

(8) ساٹھ کلومیٹر سے کم رفتار پر گاڑی چلانے والے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اسی طرح اسی کلومیٹر فی گھنٹہ سے تیز چلانے والے کو بھی حوالہ پولیس کر دیا جائے گا۔

(9) پندرہ برس کی عمر کے بعد ہر شخص اپنی سالگرہ پانچ پانچ سال کے وقفے سے منا سکے گا ہر سال نہیں۔ ہیپی برتھ ڈے کے کیکوں پر پچھلی سالگرہ کی ڈیٹ ڈلوانا ضروری ہوگا تاکہ حکام کو پتہ چل سکے کہ پانچ سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس مرتبہ کی سالگرہ قانونی طور پر جائز ہے۔

(10) اگر ڈاکخانے کی آسانی کے لیے ہر شہر کے پیچھے زپ کوڈ نمبر لکھنا ضروری ہوگا تو ہر خط لکھنے والے کی آسانی کے لیے جس نے زپ کوڈ نمبر دیا ہو ڈاک کی شرح کم کر دی جائے گی۔

(11) بینکوں میں اپنا ہی جمع کرایا ہوا روپیہ واپس لینے کے لیے جن لوگوں کو قطار بنانی پڑتی ہے ان کو ہر سو روپے کی ادائیگی پر ایک روپیہ قطار بنائی اور انتظار کرائی کا بینک کی طرف سے دیا جائے گا۔

(12) کرکٹ کی کمنٹری ایک سو ستر الفاظ تک محدود ہو۔ اس سے باہر کا لفظ آ جانے پر براڈکاسٹ روک دی جائے اور جونہی کمنٹیٹر منظور شدہ الفاظ پر آ جائے براڈکاسٹ کھول دی جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ اتنی مختصری مدت میں میں اپنے سارے قانونی مسودات اور قانونی نکات آپ کو سنا نہیں سکتا لیکن اگر آپ نے انہیں پسند فرمایا تو ان کا سلسلہ آگے بھی چل سکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ فی الحال ان کا پاس کیا جانا ذرا مشکل ہے لیکن ان پر غور کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

معجون مرکب (7)

آج کل ہم نے اپنی زندگیوں کو اس لیے مصروف بنالیا ہے کہ ان دنوں ہم تفریح اور خوش وقتی کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ آجکل کوئی شخص اچھی صورت بنائے اور خوش وخرم وقت بتاتا نظر آئے تو اس کے بارے میں شک گزرنے لگتا ہے کہیں اس کو کوئی ذہنی عارضہ تو لاحق نہیں ہو گیا۔ کہیں یہ آدمی اپنے مستقبل سے بے فکر تو نہیں ہو گیا۔ کہیں یہ اپنے اردگرد کے لوگوں کا بوجھ اٹھانے سے تو عاری اور انکاری نہیں ہو گیا.....اس کا کیا بنے گا۔ یہ کیسے زندہ رہے گا اور کس طرح سے ترقی کرے گا اگر اس پر خوف طاری نہ رہا اور یہ تجویزوں اور منصوبوں کی زنجیروں میں نہ جکڑا رہا۔

میں خود تجویز کے اور خوف کے اور منصوبہ بندی کے حق میں ہوں اور ہنسنے اور خوش رہنے کو برا سمجھتا ہوں لیکن کبھی کبھی اپنی اس خشک اور خوف افزا پوزیشن میں سکول کے بچوں سے ملنے کا موقع مل جاتا ہے تو زندگی کے خوشگوار لمحے لوٹ کر آجاتے ہیں۔ گو چند لمحوں کے لیے ہوتے ہیں لیکن خوب ہوتے ہیں۔

چوتھی جماعت کی ایک پیاری سی اور بے حد معصوم بچی اپنی گود میں پریوں کی رنگین کہانیاں رکھے بیٹھی تھی اور چمکدار رنگدار تصویریں غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی کتاب کی بہت تعریف کی تو اس نے سر اوپر اٹھا کر کہا "بابا آپ کے زمانے کے لوگوں کو ایسی خوبصورت اور رنگین کتابیں پڑھنے کو اس لیے نہیں ملتی تھیں کہ اس زمانے میں کتابیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں تو اب ایجاد ہوئی ہیں جب ہم نے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

اس سکول کے ایک ذہین بچے سے جب میں نے پوچھا کہ تجارتی ہوائیں یعنی Trade winds کیا ہوتی ہیں تو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ سر تجارتی ہوائیں وہ ہوائیں تھیں جو سمندری تاجر اپنے ساتھ دساور کو لے جاتے تھے۔ لیکن یہ اگلے زمانے کی بات ہے آجکل تجارتی ہوائیں ہوتی ہی نہیں گورنمنٹ نے ان پر پابندی لگا دی ہے۔

"کس قسم کی پابندی" میں نے پوچھا تو اس نے کہا اب تجارتی ہوائیں لینے کے لیے ایکسپورٹ

لائسنس لینا پڑتا ہے۔ میرے ماموں کے پاس یہ لائسنس ہے اور وہ سیالکوٹ میں سرجیکل کا کام کرتے ہیں۔

تاریخ کی کلاس کے کچھ بچوں کا خیال تھا کہ دوسری جنگ عظیم اتنی عظیم تھی کہ وہ ساری دنیا کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی لڑی گئی تھی اور اس میں دوسرے علاقوں کے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔

جب میں نے مختلف خاکوں میں رنگ بھرتے ہوئے ایک بچے سے پوچھا کہ بھئی مربع کیا ہوتا ہے تو اس نے چہرہ اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پرلے درجے کا احمق سمجھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جب میں نے ذرا خوشامدانہ لہجے میں اپنے سوال کو دہرایا کہ مربع کیا ہوتا ہے تو اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا" بابا مربع بھی دائرہ ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے چار کونے ہوتے ہیں اور وہ دوسرے دائرے سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔"

ایک بچے کی لکھائی بہت ہی اچھی تھی اور وہ اردو زبان کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اس کی کاپی دیکھتے ہوئے پوچھا۔" بھئی یہ چنانچہ کے کیا معنی ہوتے ہیں؟" اس نے لاپروائی سے کہا۔" اشفاق صاحب چنانچہ کے معنی تب کے ہوتے ہیں' لیکن چنانچہ تب سے ذرا زیادہ پرانا ہوتا ہے اس لیے کم استعمال ہوتا ہے۔"

کبھی بچوں کے درمیان گھر کر دیکھئے اگر آپ زندہ ہیں تو ان کی سنگت چھوڑنے کو دل نہیں کرے گا لیکن اس میں لازمی شرط زندگی کی ہے۔

معجون مرکب (8)

یہ جو سردیاں ہیں ناں' جو مجھ پر اور آپ پر یکساں گزر رہی ہیں تو یہ کچھ مجھے اچھی نہیں لگتیں.....ہمیشہ کی بات نہیں کر رہا۔ آجکل اچھی نہیں لگتیں۔ اصل میں میں ابتک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کون سا موسم اچھا ہے اور کون سا برا۔ گرمیوں میں مجھے سردیاں اچھی لگتی ہیں اور سردیوں میں گرمیاں۔ لیکن قدرت کے اصول کچھ اس قدر سخت اور بے اصولے ہیں کہ سردیوں کے موسم کو اور ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور گرمیوں کو اور دہکا دیتے ہیں اور چونکہ قدرت سے جھگڑا نہیں کیا جا سکتا' اس لیے میں نے موسموں کا اور اپنا دل خوش کرنے کے لیے چند سہارے وضع کر رکھے ہیں جنھیں خوش خط حروف میں کتابت کروا کے اپنے کمرے میں لٹکا رکھا ہے۔ مثلاً موسم سرما کی خوبیوں کے سلسلے میں یہ تسلیاں بڑے کام آتی ہیں کہ:

(1) موسم سرما میں ایک گرم بستر ایک چھوٹا سا لیمپ اور ایک خوبصورت سی کتاب زندگی کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔

(2) اگر کام کرنے کا ارادہ ہو اور نیت نیک ہو تو سردیوں میں کام بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ انسان تھکتا نہیں۔ ہانپتا نہیں۔ اپنے ساتھیوں کو برا بھلا نہیں کہتا۔

(3) سردیوں میں صبح سویرے گرم پانی میں نہانے سے بدن کھل جاتا ہے۔ گرم حمام کے اندر مشکل سے مشکل مسائل خود بخود حل ہونے لگتے ہیں اور اپنی الجھنوں کے جواب مل جاتے ہیں۔

(4) اندر گرم کمرے میں لیٹے لیٹے سردیوں کی بارش کی آواز روح کی موسیقی کا سامان بہم کرتی ہے۔ کھڑکی سے باہر کی سیل دیکھ کر اندر کمرے کی خشکی اور گرمی کا لطف دو چند ہو جاتا ہے اور انسانی برتری کی عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔

(5) اگر آپ کے کمرے میں آتش دان ہے اور اس کے قریب شیشم اور کیکر کی کٹی ہوئی سوکھی لکڑیوں کے گنوپڑے ہیں اور آپ کے پاس ایک اچھا سا پرانا گاؤن ہے اور سامنے آتش دان میں سرخ نارنجی اور نیلی آگ جل رہی ہے تو سردیوں سے اعلیٰ موسم اور کوئی نہیں۔

(6) انسان تھکا ہارا دفتر سے آئے۔ کپڑے تبدیل کرے اور اس کو یہ یقین ہو کہ اب کل صبح تک کہیں نہیں جانا تو سردیوں سے بہتر اور کوئی موسم نہیں۔

(7) خوبصورت کپڑے پہننے کا بہترین موسم۔

(8) اعلیٰ قسم کے مرغن کھانے کھانے اور خشک میوے سے لطف اندوز ہونے کا لاجواب موقع۔

گتے کا وہ ٹکڑا جس پر میں نے یہ ملفوظات رقم کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے لٹکا رکھا ہے کل ہوا کی تیزی سے اپنی ڈوری پر گھوم گیا۔ اس کی دوسری جانب نہایت بیہودہ قسم کی بال پوائنٹ میں میری بیوی کے جوابی آٹھ نکات تحریر تھے۔

(1) گرم گرم بستر سے اٹھ کر ٹھنڈے غسل خانے میں جا کر نہانا یا منہ ہاتھ دھونا موسم سرما کی سب سے بڑی لعنت ہے۔

(2) ہر وقت بٹن بند کرتے رہنا اور ڈھلکے ہوئے الاسٹک اوپر کھینچتے رہنا' اپنے ہوں یا بچوں کے' سردیوں کی ایک اضافی ذمے داری ہے۔

(3) لباس میں جرابوں اور ٹوپیوں کا لازمی اضافہ۔

(4) صبح سویرے ٹھنڈی کار کو سٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بس پر جانا اور بس پر واپس آنا۔

(5) گیس' لکڑی اور ایندھن کے بلوں میں اضافہ.....

(6) کھڑکیوں کی جھریوں میں سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں کا خوش دلی سے مقابلہ کرنا۔

(7) آدھی رات کو گرم بستر سے نکل کر یہ دیکھنے جانا کہ بلا واپس آ گیا ہے یا نہیں۔ ڈربے پر ترپال ڈالی ہے یا بھول گئے۔ پھاٹک بند کر لیا تھا یا ویسے ہی کھلا پڑا ہے۔

(8) شادیوں کی بھرمار کا موسم' جس میں کوئی شام آرام و سکون سے گھر پر گزارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جب میں نے ان آٹھ نکات کو دو مرتبہ پڑھ کر اچھی طرح سے سمجھ لیا تو پھر میرے ذہن سے ہر طرح کا موسم اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور خالی خولی حیرت کے میدان میں ایک ہی بات رہ گئی کہ اس دنیا میں جتنا علم ایک طرف کا ہوتا ہے پکھا اتنا ہی طاقتور اور منطقی علم دوسری طرف کا ہوتا ہے۔ اپنے دل کی خواہش کے مطابق یہ لینا ہے یہ لے لو' وہ لینا ہے وہ لے لو..... بات ایک ہی ہے.....

معجون مرکب (9)

اس وقت قائد کا پہلا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اداریے کی یہ چند سطریں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں کی دنیا میں ہم ایک اور رسالے کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں آئے' بلکہ آپ کی خدمت میں ہم ان صفحات کا ایک سائبان لے کر حاضر ہوئے ہیں' جس کی چھاؤں تلے ہم آپ کی باتیں سننے اور آپ کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے اپنی ساری برادری کو جمع کریں گے اور ان کی رائے سے آپ کو روشناس کرائیں گے۔

وطن عزیز سے ہزاروں میل دور اور کئی مہینوں اور سالوں کی نہ سمٹنے والی دوریوں کے اس طرف اب ہم ہی اک دوسرے کے سنگی ساتھی اور ہم ہی ایک دوسرے کے عزیز اور قرابت دار ہیں۔ خدا ہمارے وطن میں بسنے والے خاندانوں اور رشتہ داروں کو سلامت رکھے اور ان کی طرف سے ہمیں ہمیشہ ٹھنڈی ہوائیں آتی رہیں' لیکن اس جگہ پر اس وقت' اب اور آگے چل کر ہم ہی ایک دوسرے کی طاقت اور ہم ہی ایک دوسرے کے بازو ہیں' ہمیں ابھی ایک دوسرے کو اور اچھی طرح سے سمجھنا ہے اور ابھی ایک دوسرے کے اور قریب آنا ہے۔

اپنی دھرتی سے اور اپنی ماں کی گود سے الگ ہو کر انسان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اکھڑا اکھڑا اور گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ زندگی کے نئے تقاضوں سے الجھ کر اپنوں سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات بالکل خاموشی اختیار کر کے بالکل گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں زندگی میں خطرے کے مقام پیدا کر دیتی ہیں اور انسان اپنے زمانے میں کچھ اضافہ کیے بغیر اور اپنے گروہ کو کوئی تحفہ عطا کیے بغیر رخصت ہو جاتا ہے..... لیکن ہم ان لوگوں میں سے نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کے خواہشمند ہیں اور اس منزل پر پہنچنے کی تمنا رکھتے ہیں' جس کی پیشانی پر موٹے حروف میں ''محبت'' لکھا ہے..... ہم اپنا سفر محبت سے شروع کر کے محبت تک پہنچنے کی آرزو لے کر نکلے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس مشن میں کامیاب ہوں گے' ان شاء اللہ!

ایک صحیح اور سچا لیڈر اپنے عوام کی خواہشات اور اپنے عوام کی نیک تمناؤں کا ترجمان ہوتا ہے' اسی طرح ایک خوش اقدام اور خوش ارادہ رسالہ اپنے پڑھنے والوں اور اپنے گروہ کے سوچنے والوں کی آواز ہوتا ہے.....قائد آپ کا استاد نہیں' آپ کی آواز ہے۔ آپ کا سردار نہیں' آپ کا مددگار ہے۔ قائد آپ کا قائد نہیں' آپ کا قاصد ہے۔

معجون مرکب (10)

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہم دونوں اکٹھے ہی گاؤں سے آئے تھے۔ ہم تو میٹرک کے بعد فرسٹ ایئر میں داخل ہو گئے، مگر ناصر خان نے ٹرک اڈے پر کلرکی اختیار کر لی اور ہمارے ایف اے کرنے سے پہلے ایک ٹرک میں آدھے کا حصہ دار ہو گیا۔ پھر اس نے خود ٹرک چلانا شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے دو ٹرکوں کا مالک ہو گیا۔ جب ہم نے اعلیٰ نمبروں پر بی اے پاس کر لیا تو تین جگہ نوکری حاصل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد اپنے دوست ناصر خان کے اڈے پر کلرکی اختیار کر لی۔ ہماری کلرکی اس کے مقابلے میں اس لیے بہتر تھی کہ ہم بی اے پاس کلرک تھے اور وہ اپنے زمانے میں صرف میٹرک پاس کلرک رہا تھا۔ اصل میں ملازمت کسی بھی قسم کی ہو اس کا درجہ کلرکی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ وقت سے پہلے کلرک ہو جاتے ہیں اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد کلرکی اختیار کرتے ہیں۔ وقت گزر جانے کے بعد کلرکی کا بوجھ ذرا کم ہوتا ہے، کیونکہ آگے تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہوتا ہے۔

ناصر خان اپنا کام چھوڑ کر اور اپنے ٹرک فروخت کر کے دوبئی چلا گیا اور ہم نئی نوکری کی تلاش میں اور بھی آگے نکل گئے۔ دس سال بعد جب ناصر خان واپس وطن آیا تو اس نے یہاں آ کر ایک ری رولنگ مل لگا لی اور عمارتوں کے لیے سریا بنانے لگا۔ ہمارا تجربہ چونکہ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ہماری دانش کی شہرت عام ہو گئی تھی، اس لیے ہم نے ناصر خان کی مل میں کلرکی اختیار کر لی اور لوہے کو پگھلتے اور بل کھاتے دیکھنے لگے۔ ناصر خان چونکہ ایک اور پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا، اس لیے اس نے اپنی ری رولنگ مل کا کام ایک منیجر کے حوالے کر دیا، جس کو اس کام کا کئی سال کا تجربہ تھا۔ اس تجربے کی بنا پر اس نے چند مہینوں کے اندر اندر نیلے رنگ کی ایک کار خرید لی۔ ناصر خان کو اپنے منیجر کی تجربہ کاری پر شک گزرا تو اس نے پھر سے اپنی مل میں آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے پھر سے مل میں آ جانے پر ہمارے اور اس کے تعلقات میں نئے سرے سے اضافہ ہوا اور اس نے دو کلرکوں کا کام ہمارے ذمے لگا دیا۔ دو کلرکوں کا کام بھی دراصل ایک کلرک جیسا ہی ہوتا ہے، صرف کام کی چوڑائی بڑھ جاتی ہے، لمبائی اسی قدر رہتی ہے۔ جس طرح دو نالی بندوق بھی ایک نالی

جیسی بندوق ہی ہوتی ہے' فرق صرف نالی کی چوڑائی کا ہوتا ہے۔ جس طرح دو نالی بندوق ایک نالی بندوق کے مقابلے میں زیادہ معزز خیال کی جاتی ہے' اسی طرح دوہری کلرکی سنگل کلرکی کے مقابلے میں زیادہ آنریبل سمجھی جاتی ہے۔ ہم اس وقت ساری ری رولنگ مل میں زیادہ آنریبل سمجھے جاتے تھے' حالانکہ نیلی کار منیجر کے پاس تھی۔

ناصر خان سے منیجر تو اپنی مل سے نہ نکالا جا سکا' البتہ اس نے گاؤں سے اپنا ماموں زاد بھائی بلا کر اس کے سر پر بٹھا دیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی گاؤں میں منیاری کی دکان کرتا تھا' لیکن اس کا کام کچھ اچھا نہیں تھا۔ ناصر خان نے اس کو اپنے منیجر سے دو سو روپیہ زیادہ پر ملازم رکھ لیا۔ ماموں زاد بھائی کا کام صرف منیجر پر نگہ رکھنا تھا اور اس کی کارکردگی سے ناصر خان کو آگاہ کرتے رہنا تھا۔ ماموں زاد نے حق نسبت ادا کر دیا اور منیجر پر ایسی کڑی نگاہ رکھی کہ اس پر بددیانتی کی ساری راہیں بند کر دیں۔ دو مہینے کے اندر اندر ماموں زاد نے منیجر کی نیلی کار خود خرید لی اور اس کو پھر سے سائیکل سوار کر دیا۔

ناصر خان نے جب اپنے ماموں زاد کو نیلی کار میں گھومتے دیکھا تو اس نے اپنی ری رولنگ مل فروخت کر دی اور واپس دوبئی چلا گیا۔ نئے مالک نے سارا اسٹاف تبدیل کر دیا اور ہمیں نوکری سے چھٹی مل گئی۔ اس واقعہ سے میں نے ایسے سبق سیکھے' جنہوں نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔ اول تو یہ کہ کبھی ایسی کلرکی نہ کرو' جس میں آگے چل کر فیکٹری لگانے کا چانس ہو۔ دوم' ماموں زاد بھائی سے کبھی تجارتی اور صنعتی تعلقات نہ رکھو اور سوم یہ کہ نیلی کار کو کبھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دو۔

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں پاکستان کا ایک ادیب ہوں اور اس وقت میری گفتگو کا رخ بھارت کے ادیبوں اور لکھنے والوں کی طرف ہے' چونکہ ہر قوم کا اپنا اپنا سجاؤ اور اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے' اس لیے پاکستان کا ایک عام باشندہ کسی دوسرے کے معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا۔ میں بھی پاکستانی ہونے کی حیثیت سے آپ کے معاملات میں دخل دینے کو وقت ضائع کرنا سمجھتا ہوں لیکن چونکہ آپ نے بالواسطہ مجھ سے سوال کیا ہے۔ اس لیے میں شرافت کے تحت آپ کی بات کا جواب دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

آپ کا ملک بھارت بہت پرانا اور تاریخی ملک ہے میں اس کو پراچین بھارت کے نام سے یاد کرتا ہوں اور اس کی مائی تھولوجی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ میرا پاکستان ایک نیا ملک ہے اور نیا ہونے کی حیثیت سے اس کے تقاضے بھی جدید ہیں۔ ہمیں آزاد ہوئے مشکل سے تیئس سال ہوئے ہیں اور ان تیئس سالوں میں ہم پر ہر طرح کی بلائیں نازل ہو چکی ہیں۔ میں اور میرے دوسرے ہم وطن اپنے پاکستان کی مشکلات' اس کے وسائل' اس کے مسائل اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسے ایک قابل رشک ملک بنانے کے لیے اپنے اپنے میدان میں سرگرم عمل ہیں' آزادی کے دن سے لے کر اس وقت تک پاکستان اپنی صنعت' اپنی معیشت' اپنی زراعت اور تعلیم اور ادب کے معاملے میں بہت آگے نکل چکا ہے اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے بھی غافل نہیں ہے۔ لیکن مجھے ایک کو برملا تسلیم کرنا اور اس کو بے خوف و خطر آپ کے سامنے بیان کرنا ہے کہ آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جو بھارت میں رہتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ بھارت کا ہر باسی تنگی' بھوک' افلاس' بیروزگاری اور مسلسل قحط کے باوجود نہایت خوش قسمت انسان ہے کہ وہ بھارت میں رہتا ہے واقعی بھارت کی قدیم تاریخ اور پراچین اتہاس بہت ہی دلچسپ اور بے حد مزے دار مطالعہ ہے۔

پاکستان میں ہر فرقے اور ہر دین دھرم کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں' مسلمان بھی' بودھ بھی اور عیسائی بھی' پارسی بھی اور آدی باسی بھی لیکن یہاں پر منافق اور ریاکار کوئی نہیں اور چونکہ اس ملک میں منافقت نہیں ہے' اس لیے یہاں کے ہر انسان کی بات سیدھی' سچی اور کڑوی ہوتی ہے۔ میں ٹھیک سے عرض

نہیں کر سکتا کہ آپ صاف اور سیدھی لیکن کڑوی بات کس حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔

اس وقت میں اور آپ گفتگو کے میدان میں ایک دوسرے کے سامنے ہیں اور میں چونکہ منافق نہیں ہوں اس لیے اپنے آپ کو جذباتی طور پر ہندوستان کا شہری یا باشندہ کہہ کر آپ کی قدر و قیمت کم کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جب بھی میرے سامنے آئیں کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئیں۔ آپ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ستمبر 1965ء کی رات کو مجھ پر اور میرے تین بچوں پر جو میرے ساتھ سو رہے تھے' حملہ کیا تھا۔ میں آپ کو اس رعایت اور اس تعلق سے جانتا ہوں اور اس پوزیشن میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میرے سامنے 47ء سے لے کر اب تک کی آپ کی تحریریں اور آپ کے لیڈروں کی تقریریں ہیں جو آپ نے میرے ملک کے متعلق دستاویزی روپ میں ڈھال کر میرے ذہن میں محفوظ کر دی ہیں۔ میں ان کے حوالے سے بول رہا ہوں۔ میرے سامنے کشمیر کی تخریب اور میرے روبرو فرقہ بندی کی تعمیر ہے اور میں ان کے رابطے سے بات کر رہا ہوں۔ میرے کانوں میں احمد آباد اور مہاراشٹر کے معصوم مسلمانوں کی چیخیں ہیں اور میں ان کے ناطے سے بات کر رہا ہوں۔ میں رن کچھ کا قریبی باسی ہوں اور اس قرابت سے خطاب کر رہا ہوں' آپ مجھے میرے مسائل سمجھانے یا مجھے اخلاق کا درس دینے کی کوشش نہ کریں۔ میرا مسئلہ میرا ہے اور میں اسے دنیا کے ہر فرد سے بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کا ملک چونکہ پیپر ٹائیگر ہے اور آپ اس ملک کے پیپر ماشی ادیب ہیں اس لیے آپ زندہ قوم کے مسائل اور اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے ملک کی مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ لون کی پتلی سندھ کی تھاہ نہیں لگا سکتی۔ آپ مجھے میرے بارے میں کیا بتا سکیں گے۔

خوش رہیے اور بھگوان کی دیا کو مان دیجیے کہ آپ بھارت میں رہتے ہیں۔ شکر کیجیے اور اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی ہو سکے ناز کیجیے کہ آپ بھارت کے باشندے ہیں۔ دان دکھشنا کیجیے کہ آپ ایسی دھرتی پر رہتے ہیں جس کے گرد بھارت جیسا کوئی کینہ پرور ہمسایہ نہیں بستا۔ آپ ایسی سرزمین میں آباد ہیں جس کے گرد بھارت جیسا کوئی تخریب کار پڑوسی نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کو نیپال میں برما میں سیلون میں یا پاکستان میں رہنا پڑتا تو آپ کو پتہ چلتا کہ بھارت جیسے ہمسائے کے ساتھ زندگی بسر کرنا کس قدر مشکل اور کٹھن ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا اور پھر دہراتا ہوں کہ بھارت کا ہر باسی تنگی' بھوک' افلاس' بے روزگاری اور مسلسل قحط کے باوجود نہایت خوش قسمت انسان ہے کہ وہ بھارت میں رہتا ہے اور بھارت جیسا تکلیف دہ ایذا رساں اور کشت میں ڈالنے والا ملک اس کا پڑوسی نہیں ہے۔ چونکہ میں منافق نہیں ہوں' اس لیے میرا لہجہ تلخ ہے اور چونکہ میرا لہجہ تلخ ہے اس لیے آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ کہ بھارت آخر کہاں تک اس قدر زیادہ تکلیف دہ پڑوسی اور ایذا دینے والا ہمسایہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے میں کہوں گا مجھ سے نہ پوچھئے بلکہ سفر کیجیے۔ بھارت کے اردگرد کے ملکوں میں رہنے والوں سے ملئے ان سے سوال کیجیے۔ اعداد و شمار اکٹھا کیجیے اور پھر ایک رپورتاژ

شائع کیجیے تا کہ آپ کے ہم وطنوں کی آنکھیں کھلیں کہ ایک ہمسائے کی حیثیت سے دوسرے ملکوں کے باشندے آپ کو کیا سمجھتے ہیں اور ان پر ایک سرکش پڑوسی ملک کی وجہ سے کیا بیت رہی ہے۔

بھارت کے نامور ادیبو! آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یو این او کا کوئی ڈبیٹ ہال ہو یا دنیا کے کسی کونے میں عالمی برادری کا فورم ہو بھارت کھل کر اور ڈٹ کر ہر بات میں پاکستان کی مخالفت کرتا ہے۔ پاکستان کو اپنی بقا کے لیے کسی چیز کی اشد ضرورت ہو بھارت کی سرکار اور بھارتی بیوروکریسی کی ساری مشینری اس ضرورت کی راہ میں خنجر بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پاکستان جب بھی فراغت کا ایک دن گزارنے لگتا ہے تو بھارتی توپوں کے دہانے اعوان شریف' حاجی پیر پاس لاہور اور رن کچھ پر گولہ باری شروع کر دیتے ہیں۔ بھارت کو جب بھی مشرقی پاکستان میں پٹ سن اور چائے کے لہلہاتے خطے نظر آتے ہیں وہ اپنے ہزاروں مسلح گھس بیٹھیے اس سرزمین میں داخل کر دیتا ہے۔

مجھے آپ کے حکمران اور سیاست دان کا یہ عمل پسند ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکستان کا دشمن سمجھتے ہیں اور پاکستان کا دشمن کہتے ہیں اور اس کا عملی ثبوت دیتے ہیں لیکن مجھے آپ کا رویہ پسند نہیں کہ اپنے آپ کو دل میں پاکستان کا دشمن سمجھتے ہوئے بھی آپ میٹھے منہ سے ریاکاری کی باتیں کرتے ہیں اور دوستی کا لباس اوڑھ کر میری طرف رخ کرتے ہیں۔ ادیب میں اور لاکھ خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن وہ جھوٹ نہیں بولتا' آپ اس کام کو آکاش وانی کے کارندوں پر چھوڑ دیجئے کہ جھوٹ سے ان کی روزی بندھی ہے اور اس سے اس کا رزق چلتا ہے۔ آپ میدان میں آئے ہیں تو اپنے فوجیوں اپنے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی طرح مسلح ہو کر آیئے اور میرا اسلام لیجیے۔ میں اور سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن ایک ادیب کو شرمناک حد تک جھوٹا' ریاکار اور دوغلا نہیں دیکھ سکتا۔

خوش رہو اور زندہ رہو تا کہ پاکستان تمہاری نفرت اور تمہاری مخالفت کی آہٹ پا کر چوکس اور بیدار رہے زندہ رہے' سلامت رہے اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہے۔

پاکستان پائندہ باد۔

(ریڈیو پاکستان لاہور)

ستمبر 1965ء کی جنگ.....نشری محاذ

جنابِ والا! ستمبر 65ء کی جنگ میں ملک کے نشری محاذ کی اصل تفصیلات وہی لوگ بہم پہنچا سکتے ہیں جنہوں نے اس محاذ پر ایک سپاہی کی حیثیت سے نبرد آزمائی کی اور ملک کے دفاع میں پاکستان کی بہادر افواج کے پہلو بہ پہلو لڑے۔ میں اس محاذ کا وقائع نگار ضرور کہلا سکتا ہوں۔ اس محاذ کا سپاہی نہیں کیونکہ جن جوانوں اور گرائیوں نے اس میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ان کا رینک بہت اونچا اور مرتبہ بہت بلند ہے۔

چھ ستمبر کی صبح کو جب ریڈیو پاکستان لاہور کے دفتری اوقات کار شروع ہونے میں کوئی دو گھنٹے باقی تھے تو منانواں ٹرانس میٹر سے عادل انجینئر کا فون آیا کہ بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور گرانڈیل توپوں کے آتشیں گولے ہمارے چاروں طرف پھٹ رہے ہیں۔ ایک گولے نے ہماری باؤنڈری وال کا کچھ حصہ گرا دیا ہے اور عین ممکن ہے کہ اگلا گولا ہمارے ٹرانس میٹر پر آ کر گرے یا ہمارے ٹرانس میشن کنٹرول کو ہٹ کر جائے۔ اطلاع دیجیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے..... یہ خبر ریڈیو سٹیشن پر موجود سٹاف کے لیے کچھ زیادہ انوکھی نہ تھی۔ چھمب جوڑیاں پر پاکستانی افواج کا قبضہ ہو چکا تھا اور جموں کٹھوعہ روڈ کٹنے والی تھی۔ پاکستان اور بھارت کے انٹرنیشنل بارڈر پر دشمن کا حملہ گو ایک مشکل بات تھی لیکن بعید از قیاس نہ تھی۔ اس لیے ٹرانس میٹر سے آنے والے ٹیلی فون پر کسی نے تعجب کا اظہار نہ کیا۔ ریجنل انجینئر نے عادل کو پیام بھیجا کہ ٹرانس میٹر اسی طرح چلے گا۔ نشریات پروگرام کے مطابق ہوں گی۔ تم پہلی مجلس کے خاتمے سے پہلے یہاں نہیں پہنچو گے۔ چنانچہ عادل اور ان کے ساتھ عبداللہ میکینک اور منانواں ٹرانس میشن کا دوسرا عملہ گولوں کے لشکاروں میں اپنے کام پر جتا رہا اور نشریات کے ساتھ ساتھ فرسٹ ایڈ کی الماری کھول کر فوری امداد کی چیزیں کونے کی میز پر سجاتا رہا۔

یہ بڑا عجیب دن تھا۔ جیسے آج کا دن یا کل آنے والا دن ہوگا۔ صبح ہلکی پھلکی سردی کی شرمائی شرمائی جھلک، پر کنکنی دھوپ اس کے فوراً بعد تیکھی تیکھی کرنیں اور پھر دھوپ کی شدید تمازت۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اور یہ خبر سارے شہر میں بھتنا بن کر ناچ رہی تھی۔ پاکستان ایئر فورس کے دن اوفور نے شہر پر زور کا پٹاخہ چھوڑا تھا اور ہر گلی محلے کے اندر پردہ دار خواتین کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان نے پاکستان پر چڑھائی کر دی ہے۔

صبح نو ساڑھے نو کے قریب ریڈیو پاکستان کا سارا عملہ اپنے دفتر پہنچ چکا تھا اور لاہور سٹوڈیوز میں آج سے چند مہینے پیشتر کی سی چہل پہل تھی جس دن سٹاف پرانی بلڈنگ سے نئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں منتقل ہوا تھا' ابھی ہم لوگ اچھی طرح سے اپنے کمروں اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے بھی نہ تھے کہ حملہ ہو گیا اور نئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے نشریات کی ابتداء ایک نئے پہلو اور ایک نئے آہنگ سے شروع ہوئی۔ عملے کے لوگ نئی امنگوں اور نئی آرزوؤں کے ساتھ نئی نشرگاہ میں گئے تھے لیکن نئے شیڈول کا آغاز جمالی مینڈھے کے بجائے جلالی جھنکار سے ہوا اور اس نے سارے سٹاف کی رگوں میں نیا خون دوڑا دیا۔ اس وقت ہمارے سٹوڈیوز میں دو تین ترانے موجود تھے جنہیں رن کچھ کی جھڑپ کے دوران تیار کیا گیا تھا۔ دو فلمی ترانے تھے اور ایک معمولی سا گیت تھا جسے آپ کسی حد تک رجزیہ گیت کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ریڈیو پاکسان لاہور کی لائبریری میں بسنت بہار مالا گنجی مارو بھاگ اور طبلے پر آزے چوتالے تو تھے لیکن ترانہ کوئی نہ تھا۔ ایسے موقع پر ترانوں کی سخت ضرورت تھی جس سے دشمن پائمال و خوار اور خوفزدہ کیا جا سکے اور وطن کے لوگوں کو ایک ولولہ تازہ عطا کیا جا سکے۔ ریڈیو پر جس کو جتنی شاعری آتی تھی قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ گانے والوں میں سے جس کو جو سواری ملی ریڈیو سٹیشن پہنچ گیا۔ سازندوں میں سے جس کسی کی طبیعت موزوں تھی کمپوزر کے فرائض بھی سرانجام دینے لگا۔ شام ہونے تک چھ نئے ترانے رقم ہو کر کمپوز ہوئے۔ پھر ریہرسل ہوئے اور پانچ بجے کی خبروں کے دوران فیتہ بند ہو کر تیسری ٹرانس میشن میں چلنے کے قابل ہو گئے۔

اگلے دن صبح سویرے شاعروں' ادیبوں' صحافیوں' کالم نگاروں کے گروہ ریڈیو سٹیشن پہنچ چکے تھے۔ سکیورٹی ایریا پر فوج اور پولیس کا پہرا تھا۔ ہر شخص کے پاس شناختی کارڈ کہاں ہوتا ہے چنانچہ ہر شخص کو بڑے آہنی پھاٹک کے پاس رکنا پڑا۔ پھاٹک پر روکے جانے کی تذلیل ہر شخص پر بڑا ناخوشگوار اثر چھوڑتی ہے اور رکنے والا اور روکنے والے سے اکثر الجھ پڑتا ہے۔ تلخ کلامی نہ بھی ہو تو بھی تلخ کامی کا احساس سارے وجود کو کڑوا اور روح کو کسیلا کر دیتا ہے لیکن ان دنوں اچھے اچھے نازک مزاج شاعر اور بزرگ ادیب اینٹ کھینچ کر سرِراہ بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی شناسا اندر سے یا باہر سے آئے اور ہمیں بلوا لے جائے۔ پھاٹک کھلتا تھا اور بند ہوتا تھا' فن کار شاعر ادیب موسیقار آتے تھے اور جاتے تھے۔ سارے سٹوڈیوز روشن تھے۔ ہر مائیکروفون گرم تھا اور گیارہ ٹیپ ریکارڈوں پر پھرکیاں ایک ساتھ گھوم رہی تھیں۔ ترانے ریکارڈ ہو رہے تھے۔ ریکارڈ ہو کر ان کی کاپیاں بن رہی تھیں۔ کاپیاں دوسرے سٹیشنوں کو روانہ کی جا رہی تھیں اور ہم باری باری سے ہر سٹیشن لگا کر سن رہے تھے۔ اے ہوا کے راہیو بہو تو تیز تر بہو۔ سمندروں کے پانیو!......اے وطن کے سجیلے جوانو......اللہ بسم اللہ میری جگنی......اور ایک گروہ خاموش اور مطمئن آدھے آدھے سگریٹ بجھا کر قمیصوں کی جیب میں ڈال کر ایک بوتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل ہو رہا تھا۔ یہ یہاں کے اناؤنسر تھے جو بار بار اعلان بھی کرتے تھے۔ سلوگن بھی پڑھتے تھے اور سٹوڈیو در سٹوڈیو جا کر گانے والوں کے تلفظ بھی درست کرتے

تھے۔ ایک وہ ایک ادھ جلا سگریٹ اور ایک بے جلد کی پنچیچر فرہنگ عامرہ۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ فضا میں دھوپ کی تکھی تکھی چمپیاں اور دھوپ میں بارود کی کالے نمک جیسی بے معلوم خوشبو بھری تھی۔ سلیم رضا گا رہا تھا۔ پیٹرک ڈھولک بجا رہا تھا۔ کالا ستار چھوڑ کر دھنیں تیار کر رہا تھا۔ مانڈوا اپنے لطیفے سنا رہا تھا۔ حبیب جالب نے آ کر کہا میں تین نظمیں لکھ کر لایا ہوں۔ پڑھنے کے لیے حاضر ہوں۔ ان کی کاپیاں بنانے کے لیے حاضر ہوں۔ کچھ اور خدمت میرے لائق ہو تو وہ کہیے۔ ایک کونے میں احمد ندیم قاسمی اپنا پرانا چرمی تھیلا لیے بیٹھے تھے۔ پھر احسان دانش کی ٹوپی اور ان کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ صوفی تبسم شمس الدین بٹ کو ایک کمنی کشمیری ڈش رشالو کا نسخہ بتا رہے تھے اور اکرم بٹ ستون کے ساتھ لگا خوشامد کر رہا تھا۔ صوفی صاحب جی اگلا مصرعہ لکھ دیو خدا کے لیے اور صوفی صاحب رشالو کی تھالی بیچ ہی میں چھوڑ کر کہہ رہے تھے ''یار صبر کر سائرن وجیا اے۔ منڈے اتے چڑھے اے او ہناں نوں دو دو ہتھ کر آن دے۔'' اور دور کراچی سٹیشن سے شکیل احمد کی آواز آ رہی تھی۔ جام پور جودھ پور بلواڑہ ٗسری نگر اور انبالہ میں ٹھیک ٹھیک نشانوں پر بم گرائے گئے اور طیارے واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔

اس وقت ایک محاذ پر دست بدست جنگ ہو رہی تھی۔ دوسرے پر توپوں کے دہانے ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ ایک محاذ نیلے آسمان میں کھلا تھا اور ایک مٹیلے پانیوں پر طوفان اٹھائے پھرتا تھا اور ان سارے محاذوں کے اردگرد فضاؤں کے دوش پر نشریات کا محاذ کھلا تھا جو رجز خوانی اور حدی خوانی کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا اور دوسرے محاذوں کی پل پل کی خبریں بھی مہیا کرتا تھا۔ اس وقت پاکستان کا ہر فرد اس محاذ سے وابستہ تھا۔ کچھ سننے والے تھے' کچھ سنانے والے لیکن ان سب کی روحوں میں ایک ہی جذبہ کارفرما تھا' وطن کے دفاع اور اپنے پیارے ملک کی بقا اور سالمیت کے لیے سب کچھ لٹا دینے کا جذبہ۔ کبھی کبھی کسی بزرگ کا بڑے محبت بھرے انداز میں ٹیلی فون موصول ہوتا۔ ''کیوں میاں کون صاحب ہیں؟'' جواب ملتا ''جی ریڈیو پاکستان سے بول رہا ہوں۔'' پوچھتے ''کیوں بھائی کچھ کھایا بھی ہے؟'' عرض کرتے ''خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ ہمارے پروگرام سنتے رہیے اور ہماری رہنمائی کرتے رہیے۔'' کینٹین پر عام طور پر چنے کی دال اور توے کی روٹی ہوتی' جس کو جب موقع ملتا دو چار لقمے کھا لیتا' پھر اپنے کام پر ڈٹ جاتا۔ اعجاز بٹالوی اپنی ''آج کی بات'' تیار کرنے میں ضرورت سے زیادہ محنت کرنے کے عادی تھے۔ غور سے بھارتی ریڈیو سنتے۔ نوٹس لیتے۔ اخباروں کو قانونی کتاب کی طرح کھنگالتے۔ پھر ایک ایک کر کے اپنی دلیلیں نوٹ کرتے۔ اور جب مسالا تیار ہو جاتا تو کہتے برادران اس وقت مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ انہی دنوں انہوں نے ڈاکٹر کی ایک نئی نئی اصطلاح سیکھی تھی۔ اس کا استعمال انہیں بڑا مزا دیتا تھا۔ کہتے' دوستو' بھوک کی وجہ سے بلڈ لیول لو ہونے لگا ہے میرا کچھ بندوبست کراؤ۔ دال روٹی ان کے لیے پہلے سے محفوظ کر لی جاتی۔ کھانا کھانے کے بعد کہتے اب تھوڑی سی عیاشی ہو جائے۔ ان کی موٹر کے گلو باکس میں چینی چائے کی ایک خوشبو رنگ ڈبیا ہر وقت موجود رہتی۔ کینٹین میں تازہ پانی ابالا جاتا اور چینی چائے کا دور چلتا۔ جنگ کے دوران اس چائے نے بڑا لطف دیا۔ اس میں خوشبو

بھی تھی‘ گرمی بھی اور ایک پیالی پی لینے کے بعد کام میں بڑا جی لگتا تھا.....آج کی بات ستمبر کی جنگ کا ایک بہت ہی کامیاب پروگرام تھا۔ اس میں جہاں صاحب مضمون دشمن کے دعووں کو بڑے سبھاؤ کے ساتھ دلائل سے کاٹتے تھے‘ وہاں ادائیگی میں بڑے زور سے کام لیتے تھے۔ ان دو چیزوں کے امتزاج نے اس پروگرام میں بڑا نکھار پیدا کر دیا تھا اور لوگ رات کے وقت بڑی دیر تک اس پروگرام کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک اور کامیاب پروگرام تجمل حسین کا شہر نامہ تھا۔ اس پروگرام میں تجمل حسین ہمارے اس محبوب شہر کے شب و روز کی خبریں دیا کرتے تھے‘ جس کے گرد دشمن کے آتشیں گولوں نے آگ اور دھوئیں کا حصار کھڑا کر دیا تھا۔ تجمل حسین کا انداز بھی خوب تھا۔ کبوتر بازوں کے تھڑے سے لے کر صوفیوں کے زائرین تک کی خبریں بہم کرتے اور جنگ کے بارے میں ہر شخص کا ردِعمل بیان کر جاتے۔ ساری تقریر پر ہنسی کی کیفیت غالب رہتی جیسے پڑھتے وقت اس پر مشکل سے ضبط کیا جا رہا ہو اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ان کو اپنی دن بھر کی آوارہ گردی کے دوران کردار بھی ایسے ایسے ملتے تھے جو بھارت کے اندازِ جنگ کے بارے میں بڑے مضحکہ خیز نکات بیان کیا کرتے تھے۔ ستمبر 65ء کی ہر شام مقررہ وقت پر ریڈیو سے ایک جانی پہچانی آواز آتی ”آج ہم نے سوچا چلو برکی کو دیکھ آئیں جہاں اتنا بڑا ایم گرا ہے۔ چنانچہ ہم برکی پہنچے تو ماسٹر جی ٹوٹے ہوئے سکول کی دیوار کے ساتھ لڑکوں سے مہارنی سن رہے تھے.....ادھر آکاش وانی ہر پانچویں منٹ کے بعد اعلان کرتی تھی کہ برکی ہمارے قبضے میں ہے اور وہاں بھارتی جھنڈا گاڑ دیا گیا ہے۔ آکاش وانی کا دن بھر کا چلانا اور شام کو شہر نامہ میں برکی کے حالات تفصیل سے سن چکنے کے بعد سرحد کے اس پار بسنے والے بھی شہر نامہ پر ایمان لے آتے‘ کیونکہ اس میں ایمانداری کے ساتھ تجمل حسین اس حقیقت کا اعتراف کرتے کہ برکی کے مشرقی حصے پر واقعی دشمن کا قبضہ ہے اور نہر کے اِس طرف کوئی نہیں آیا۔ البتہ پیپل سے ادھر ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ لڑکے مہارنی یاد کر رہے تھے۔

ان دو پروگراموں کے بعد رات گئے بھارتی سامعین پر ایک اور ضربِ کلیمی لگتی۔ یہ نصیر انور کا پروگرام ندائے حق تھا جس میں مصنف اور صداکار عقیل احمد اپنے اپنے فن کے خوب خوب جوہر دکھاتے۔ یہ پروگرام آٹھ ستمبر کی شام کو شروع ہوا۔ پہلے اس کا نام ”سچ کہہ دوں اے برہمن“ تھا۔ دو روز تک یہ پروگرام اسی نام سے براڈ کاسٹ ہوتا رہا لیکن پھر ہیڈ کوارٹرز سے برقی پیغام ملا کہ اس نام کو بدل دیا جائے۔ مصنف یہ نام بدلنے پر راضی نہ تھا لیکن محاذ پر ہر کام کمان کے تحت ہوتا ہے۔ حکم ملا تو یہ نام ندائے حق میں تبدیل کر دیا گیا۔ مہاشے جی کی آمد کا بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ہر ایک کو انتظار رہتا۔ بھارت کی مکاری اور دوغلے پن کی اس سے بہتر تصویر شاید نصیر انور کے علاوہ اور کسی سے نہ کھنچ سکتی۔ وہ اپنے مکالموں میں ہندی اور شملہ بھاشا کے الفاظ اس چابکدستی سے سجاتے کہ اے دہلی مہاشے اور بنارس کے چوبے عقیل کی مہاشے کی ادائیگی پر دنگ رہ جاتے۔ اس پروگرام کے بارے میں ہمیں اکثر زبانی اور ٹیلی فون پیام ملتے کہ اس کا وقت تبدیل کر کے اسے سرِشام رکھ دیا جائے کیونکہ مہاشے جی سے ملے بغیر بچے سونا پسند نہیں کرتے۔ بستروں پر کدکڑے مارتے

رہتے ہیں اور گھروں میں ڈسپلن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب جنگ آپ کے گھر کی دہلیز پر لڑی جا رہی ہو اور آتش و آہن کا کھیل آپ کے آنگن میں کھیلا جا رہا ہو اس وقت خوف اور سراسیمگی کے آثار پیدا ہونا لازمی ہیں۔ دلوں کا حال خدا جانتا ہے اور میں کسی کی روح ٹٹول کر کوئی حکم نہیں لگا سکتا لیکن جہاں تک روزمرہ کی زندگی اور آپس کے انسانی رشتوں کا تعلق ہے نشریات کے محاذ پر لڑنے والے سب کے سب نہ صرف بے خوف اور نڈر رہتے' بلکہ کسی حد تک بے فکرے بھی تھے۔ کینٹین پر بٹو کے لک سے لے کر ایراگیج ہاتھیوں کے جفتی کھانے تک کے لطیفے ہوا کرتے تھے۔ سٹوڈیو میں کسی سازندے کے غلط دھن بجا جانے پر فرمائشی قہقہے لگا کرتے اور بڑے بڑے برآمدے میں افواہوں پر بڑے رکیک انداز میں حملے ہوا کرتے۔ یہ نہیں کہ افواہیں سنی نہ جائیں یا ان پر توجہ نہ دی جاتی۔ یہ تو جنگ کے انڈے بچے ہوتے ہیں۔ ان کو تو سنا سینا ہی پڑتا ہے لیکن افواہیں سن کر اوران سے ثانیہ بھر خوفزدہ یا پریشان ہو چکنے کے بعد میر لوگ جب ان پر تبصرہ کرتے تو ادھر ادھر قہقہوں کے فوارے چھوٹ پڑتے اور دور پھاٹک پر گاڑر کے سنتری گردنیں گھما گھما کر ہماری طرف دیکھتے کہ عجب بے فکرے لوگ ہیں۔ لیکن اس بے فکری میں ایک عجیب طرح کا ڈسپلن تھا۔ ہر کام ہر آدمی کے سپرد تھا اور سپرد کرنے والا کوئی آدمی نہ تھا بلکہ وقت تھا۔ ہر کمرے میں ہر سٹوڈیو میں ہر برآمدے اور ہر غلام گردش میں حالات کے تقاضوں کے مطابق کام اس طرح سے ہو رہا تھا جیسے مداری کے منہ سے فیتہ نکل رہا ہو اور اس ساری طلسماتی فضا پر اگر کوئی شخصیت اپنی برتری کے لحاظ سے حاوی تھی تو وہ ملکہ ترنم نور جہاں کی شخصیت تھی۔ نیلی فوکس ویگن کا صبح سویرے وقت مقررہ پر آنا' میڈم کا مسکراتے ہوئے گاڑی سے برآمد ہونا' ہر ایک سے دعا سلام ہر ایک کے حال احوال کی پرسش اور پھر ان کا سٹوڈیو میں چلے جانا' میڈم نور جہاں کے ساتھ ان کا ایک خاص ڈھولک نواز بھی آتا تھا۔ میں ان کا نام نہیں جانتا لیکن انہیں شکل سے خوب پہچانتا ہوں۔ یہ کچھ اس غرے سے ڈھولک بجاتے کہ میڈم کو دھنیں بنانے میں زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ایک کٹے پھٹے کاغذ پر جلدی میں لکھا گیا ترانہ میڈم کے ہاتھ میں ہے۔ اونچی گنگناہٹ میں انہوں نے تان کو ادھر ادھر دو پٹے دیئے ہیں اور پھر مکھڑا کہا ہے۔ ہارمونیم والے نے ساتھ دیا۔ ڈھولک بجانے والے نے ٹکا دھیم دھڑ کر کے کہا میڈم جی ایدھر آ جاؤ۔ انہوں نے مسکرا کر لے ادھر پلٹ دی۔ پھر ڈھولک بجنے لگی۔ ردم قائم ہو گیا۔ ہارمونیم نے آنس بھری اور ملکہ ترنم نے پورے ترانے کو ایک مرتبہ الاپ کر آواز دی کہ ''سازندوں کو بھیجئے' ایک ریہرسل ہو جائے جلدی سے۔ سازندوں نے ریہرسل کی اور سارنگی نے گز اٹھا کر شیشے کی اس طرف اشارہ کیا کہ ٹیپ چڑھائیے جی..... ٹیک''

گھومتے ہوئے فیتے کے رگ و پے میں نقرئی آواز کا طلسم اترنے لگا ''رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو''..... جوں جوں ٹیپ چل رہا ہے فیتہ آگے بڑھ رہا ہے آرٹسٹ کی روح کا حسن اس کے چہرے پر اس کے وجود پر اس کے اردگرد چڑھ کے درختوں میں گھومنے والی دھند بن کر سارے سٹوڈیو میں پھیل رہا ہے۔ کچھ لوگ

ریکارڈنگ روم میں کچھ سٹوڈیو میں کچھ کنٹرول بوتھ میں دم بخود کھڑے نئی دھن سن رہے ہیں۔ چہروں پر عزم ہے آنکھوں میں نمی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ شام کا وقت ہے اور آ کاش وانی سے ایک خوفزدہ نسوانی آواز کہہ رہی ہے ''اس وقت سیالکوٹ سیکٹر میں بڑا بھیانک یدھ ہو رہا ہے اور ٹینکوں کی خونی لڑائی میں ہمارے سینک آگے بڑھ رہے ہیں''.....تھوڑی سی تشویش تھوڑا سا خوف ذرا سا فکر اور قدرے بے چینی ہر ایک نے محسوس کی ہے۔ یہ ساجھی تشویش اور یہ مشترکہ خوف ہماری جامد اور ساکت قومی زندگی کے آنگن میں ٹھٹھناتا ہوا چنچل اور جھنجھناتی ہوئی جھانجھ بن کر گرا ہے اور اس کا ارتعاش ہر محاذ پر یکساں طور پر محسوس کیا جا رہا ہے.....صوفی تبسم نے بڑی ترنگ میں آ کر ''کرنیل نی جرنیل نی'' کے بول لکھے ہیں اور پرچی میڈم کو دے کر کہا ہے'' لے بھئی نورجہاں اس کی دھن بنا۔'' پیٹی والے نے پھر پیٹی کھول لی ہے۔ ڈھولک والے نے ترامپ کی انگلی بجائی ہے۔ دھن بننے لگی ہے اور اوپر سے ہوائی حملے کا سائرن ہو گیا ہے۔ ہم سب بوڑھے برگد تلے چھ فٹ گہری ایل شیپ خندق کی طرف چلے ہیں۔ ایک پروڈیوسر نے بھاگ کر سٹوڈیو کا دروازہ کھولا اور کہا۔ ''میڈیم سائرن بج گیا ہے جلدی سے خندق میں چلیئے۔'' نورجہاں نے مسکرا کر کہا۔ ''بھائی جان جو مزا اسٹوڈیو کی موت میں ہے وہ خندق کی موت میں نہیں۔ اس وقت بول ساتھ دے رہے ہیں۔ دھن اتر رہی ہے۔ ریکارڈنگ کے بعد خندق میں چلیں گے۔'' بات ڈیوٹی روم سے برآمدے میں اور برآمدے سے باہر پھیل گئی ہے۔ خندق کی طرف جانے والے لوٹ آتے ہیں۔ ہوا کے ایک جھونکے نے برگد کا ایک سوکھا پتا توڑ کر فضا میں تیرا دیا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ پتا گلائیڈ کرتا خندق کی کوکھ میں اتر گیا ہے اور اس کے سوا اب خندق میں اور کوئی نہیں ہے۔

پھر ایک آدمی شلوار کرتے میں ملبوس دیوانہ وار ہنستا ہوا آیا اور سازندے کچھ خوفزدہ سے ہو گئے۔ ڈیوٹی روم نے کنٹرول روم میں فون کیا کہ شاعر ایک نئی نظم لکھ کر لایا ہے۔ نظم لمبی ہے ٹیپ پورا لگے گا۔ کنٹرول سے او کے کا سگنل ملا تو شاعر نے مائیک کے سامنے جا کر کہا میری نظم کا عنوان ہے لاہور کو سلام.....یہ قہقہہ زن اپنی نظم ریکارڈ کرا کے چلا گیا تو ایک اور قہقہہ باز آ گیا۔ پیرو مراثی نے ناراض ہو کر کہا'' اللہ دی امان اج ساری ای سنگھاں وچ اوہن گناں فٹ کرائی پھر دے نیں کی گل اے'' ریاض محمود نے پیرو سے کہا۔ ''او خدا کے بندے یہ شاعر ہے نئی نظم لکھ کر لایا ہے۔ اے شکور نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر کہا واہ واہ سرینگر کی بچیاں کیا اوپننگ ہے۔ اعظم خان کاغذ ہاتھ سے اچک کر لے گئے کہ دھن بننے میں دیر ہو جائے گی ٹیپ کی کاپیاں دوسرے سٹیشنوں کو بھی بھیجنی ہیں۔

کلاسیکی راگ گانے والے جو پکے گانے کے سوا دوسرے ہر گانے کو کچا بلکہ پلا سمجھتے ہیں ترانے گانے کے لیے مائیک کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ روشن آرا بیگم صاحبہ لالہ موسیٰ سے تشریف لائیں۔ نزاکت سلامت اور امانت علی فتح علی پہلے سے موجود تھے۔ استاد چھوٹے غلام علی خان زاہدہ پروین شدھ راگوں کے سروں پر ترانوں کی موسیقی اتار رہے تھے اور ان کی آواز چاروں اور گونج رہی تھی۔ آکاش وانی اس محاذ پر بری طرح سے پٹی۔ کچھ ترانے بنانے کی انہوں نے بھی کوشش کی جن میں بیشتر پنجابی کے تھے لیکن ان

میں ولولہ کم اور شور زیادہ تھا۔ ان کی آواز سن کر عالم لوہار اور عنایت حسین بھٹی اپنے تھیٹروں کو کھیتوں میں چھوڑ کر لاہور سٹیشن کی طرف لپکے اور پھر جو وارین جگنیاں اور پے ہمارے سٹوڈیوز سے ابھر کر دشمن کے بام و در سے کھڑ کے تو جالندھر نے اپنے ترانے براڈ کاسٹ کرنے موقوف کر دیئے۔ انہوں نے اپنے کمپیئر پروگراموں میں بار بار کہا کہ پاکستان نے اپنی جنگ جو یانہ فطرت کے پیشِ نظر یہ ترانے ایک سال پہلے سے تیار کرار کھے تھے ورنہ اتنی مختصر سی مدت میں تو کوئی ایک بول بھی ڈھب سے رقم نہیں کر سکتا۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ جس طرح پاکستان ہر محاذ پر اپنے دفاع کے لیے دیوانہ وار ڈٹ گیا تھا اسی طرح ابلاغ کے اس محاذ پر بھی صورِ اسرافیل بن کر گونجنے لگا تھا..... ریڈیو کے اندر اور باہر۔ محاذِ جنگ پر اور اس سے پیچھے کوچہ و بازار کی زندگی میں کھیتوں میں اور کھیتوں سے پرے گاؤں کے باہر کھنڈروں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے لے کر تاریک کوٹھڑیوں میں لیٹے ہوئے دائم المرض انسانوں تک محبت اور سپردگی کا ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اندر کا مقید اور اسیر بندہ مخیر اور مخلص انسان کے روپ میں باہر آ گیا تھا۔ اور وعدہ کیے ہوئے دودھ اور شہد جیسے معاشرے میں جنت کی نہریں بہنے لگی تھیں۔ ہر شخص میں ایک نئے جذبے نے جنم لیا تھا اور یہ جذبہ برداشت کا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات اس قوم میں کہیں نظر نہ آئی تھی۔ بھارتی حملے نے جسمانی برداشت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی برداشت بھی لوگوں میں آپ سے آپ پیدا کر دی تھی۔ کوئی کسی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ تم سچ بولو پورا تولو۔ خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اپنے عزائم بلند کرو۔ مشرقی تہذیب اختیار کرو اور میں بیٹھ کر سگریٹ پیتا ہوں۔ بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن تھا۔ دوسرے کے کام میں دخل دیتا تو داد کی حد تک یا نکتہ سمجھنے کی غرض تک..... بہت سے لوگ طرح طرح کی چیزیں اٹھائے ریڈیو سٹیشن چلے آتے کہ جناب فلاں بس میں کسی کی یہ گھڑی رہ گئی تھی اس کا اعلان کر دیجیے۔ کوئی بٹوہ اٹھائے آ رہا ہے۔ کسی کے پاس اور کوئی قیمتی شے ہے۔ ان لوگوں کو اخباروں کے دفاتر بھیج دیا جاتا۔ ان سترہ دنوں کے وقفے میں نہ کوئی چوری کا پرچہ کٹا۔ نہ مار کٹائی' ہاتھاپائی کی رپورٹ ہوئی نہ جیب کتروں نے کسی پاکٹ پر ہاتھ صاف کیا نہ سرراہ لڑکیوں کے جمگھٹے کو جو سپاہیوں کو سگریٹیں پھل اور مٹھائیاں تقسیم کر رہی تھیں دیکھ کر کسی نے سیٹی بجائی اور دوگانے کا مردانہ بول گایا۔

ہمارے سٹیشن سے مدھم سازوں پر ہو تو تیز تر ہو سمندروں کے پانیوں کا ترانہ بج رہا تھا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ غالباً دس یا ساڑھے دس کا ٹائم۔ صدر ایوب خان نے فائر بندی کا اعلان کیا اور ہم یہ اعلان سن کر اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کرسیوں کو رومال سے جھاڑا اور ان پر بیٹھ گئے۔ وہ دن بھی کچھ ایسا ہی دن تھا گرم گرم دھوپ اور سردیوں کی آمد آمد۔ شام کے ساڑھے چار بجے کلاک بجانے والا ڈیوٹی پر حاضر ہوا تو برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔ ''او بھئی دوستو کسی بجن پیارے نے بس میں اس کمترین کتے کی جیب کاٹ لی۔'' ہم سب نے آگے بڑھ کر اس کی کٹی ہوئی جیب دیکھی اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

اردو اور اس کے مسائل

فرہنگ اصطلاحات

محترمی مہمان خصوصی اور خواتین و حضرات!

میں بے حد خوشی اور بڑے فخر کے ساتھ کہ آپ ہمارے اس چھوٹے سے آڈیٹوریم میں ہماری ایک بہت بڑی کتاب ''فرہنگ اصطلاحات'' کی رونمائی کے لیے تشریف لائے' آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس سپاس گزاری میں اردو بورڈ کے وہ سارے ارکان شامل ہیں جنہوں نے اس کتاب کو وجود میں لانے کے عملی اقدام کیے اور وہ بھی جنہوں نے ہمارے سرپرستوں اور حاکمہ کے ارکان کی صورت میں ہماری رہنمائی فرمائی!

''فرہنگ اصطلاحات'' کے اشاعت پذیر ہونے کی داستان طویل ضرور ہے لیکن کچھ زیادہ دلچسپ نہیں۔ یہ کتاب اے سے لے کر زیڈ تک گیارہ سال آٹھ مہینے نو دن اور بائیس گھنٹوں میں مکمل ہوئی ہے اور اس پر تقریباً اکہتر کارکن مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں کام کرتے رہے ہیں۔ اس وقت آپ کے سامنے اس فرہنگ کی پہلی جلد اپنی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ اگلی جلد انشاء اللہ اسی سال دسمبر سے پہلے اشاعت پذیر ہو جائے گی اور بقیہ دو جلدیں اگلے سال کے خاتمے تک چھپ کر تیار ہو جائیں گی۔

ایک عرصہ سے مترجموں' مولفوں' مصنفوں اور درس گاہوں..... پھر دانش گاہوں' معلموں اور تجربہ گاہوں کے کارکنوں اور اردو رائج کرنے والے اداروں کی طرف سے ایسی فرہنگ کا مطالبہ چلا آ رہا تھا جس میں فنی' تکنیکی اور علمی اصطلاحات کے اردو مترادفات موجود ہوں اور جنہیں وسیع تر اردو کے دامن اظہار میں یوں پھیلایا جائے کہ مغرب کے علوم جدیدہ کے صحیح معنی اردو میں آسانی کے ساتھ ادا ہو سکیں۔ جب آپ اس فرہنگ کو خرید کر اپنے استعمال میں لائیں گے اور ان اصطلاحات کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اردو اصطلاحات نہ تو مشکل ہیں اور نہ ہی پیچیدہ البتہ اجنبی اور نامانوس ضرور ہیں اور اسی اجنبیت کی بنا پر بعض احباب انہیں مشکل' گنجلک' بے معنی اور مضحکہ خیز قرار دے دیتے ہیں۔

اس وقت میرے اور آپ کے لیے ''معاشی تنفویہ'' ایک عجیب سی اور پیچیدہ سی اور مشکل سی اصطلاح ہے جبکہ اس کی متبادل Entero-Anastomosis بڑی آسان' سیدھی اور معصوم سی نرم نظر آتی ہے۔

Amphicarpogenous کیسی آسان اور سادہ سی بات ہے اور اس کا مطلب ''دوثمر بار'' کیسی پیچیدہ اور گھمسن گھیر قسم کی اصطلاح ہے۔ بہت سے لوگوں کو بہت سے لوگوں کو کیا تقریباً سبھی تعلیم یافتہ حضرات کو ''آب عقیم'' ایک انوکھی اور اجنبی سی اصطلاح معلوم ہوتی ہے اور اس کے بالمقابل Aqua Sterilisata بہت ہی اچھی سیدھی صاف شفاف اور آسان اصطلاح دکھائی دیتی ہے..... پرسوں ہمارے ایک ڈاکٹر دوست ٹیلی فون پر جھگڑا کر رہے تھے کہ آپ نے Aqeductus Cereberi کا کیا جناتی ترجمہ کر دیا نہ طالبعلموں کو سمجھ آتا ہے نہ عام لوگوں کے ذہن میں اترتا ہے نہ ہی ہم اس کے تلفظ کو ادا کر سکتے ہیں: قنات دماغ!.....قنات دماغ کیا ہوا بھلا۔ Aqueductus Cereluri کتنی سیدھی سی اور عام فہم سی اور خوش ادا سی نرم تھی اس کو لے کے ''قنات دماغ'' کر دیا لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اردو کی یہ اصطلاحات اپنے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خوف میں مبتلا کرتی تھیں۔(Fear of the unknown) پیدا کرتی تھیں۔ موجود ہوئیں تو اجنبی اور نامانوس ہونے کی بنا پر باعث تحقیر ٹھہریں۔ ابھی ان پر ہنسی آئے گی۔ تھوڑی سی پھبتیاں کسی جائیں گی۔ لیکن جب استعمال ہونے لگیں تو یہی اصطلاحیں عادِ اعظم' ذواضعاف اقل اور واصل باقی نویس کی طرح زبان و بیان کا ایک حصہ بن جائیں گی۔

جناب والا! یہ اصطلاحات پندرہ برس پہلے ہم نے دنیا کے ہر اس گوشے سے اکٹھی کی ہیں جہاں ان پر کسی وقت میں کسی طرح کا بھی کام ہوا تھا۔ ان کا سب سے بڑا حصہ ہمیں انجمن ترقی اردو کی طرف سے ملا۔ اس میں چند رسائل مطبوعہ تھے۔ کچھ ٹائپ کیے ہوئے۔ چند بڑے منجھے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور کچھ پنسل کے لکیرے ہوئے کاغذ تھے۔ یہ سارا مواد میرے بہت ہی پیارے اور بے حد لڑاکے دوست جمیل الدین عالی نے فراہم کیا اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کو کسی صورت میں بھی ضائع ہونے نہیں دوں گا اور فوت ہونے سے پیشتر ایک مرتبہ ضرور چھاپ دوں گا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے دارالترجمہ کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد حاصل کیا۔ ہمارے یہاں کی دانش گاہوں نے جو کام کیا تھا' اس کو بھی اس بڑے ڈھیرے میں شامل کیا۔ کسی نے انفرادی طور پر کچھ تراجم اصطلاحات کے کیے تھے ان سے بھی مسودہ حاصل کیا۔ کچھ تراجم ملتان بلدیہ اور بہاولپور کی ایک انجمن نے کیے تھے وہ بھی فراہم کیے۔

غرضیکہ اصطلاحات کے ضمن میں جو کچھ جہاں سے ملا اسے جمع کیا اور جس طرح سے بھی ہو سکا دبا ہوا اور مٹا ہوا مواد اجاگر کیا.....اب اگلا مرحلہ ان اصلاحات کی چھان پھٹک اور ان کی تصحیح کا تھا جن مسودوں پر صرف انگریزی اصلاحات لکھی تھیں اور آگے جگہ خالی چھوڑی تھی' وہاں ان کے اردو مترادفات درج کرنا تھے۔ جہاں اردو الفاظ' اسماء یا اصطلاحیں یادداشت کے طور پر جمع کی گئی تھیں ان کے آگے انگریزی تلمیحات ٹائپ کرنا تھیں۔ چنانچہ گیارہ پروفیسر' مترجم' ادیب اور قواعد ان ہر روز بورڈ کے دفتر میں جمع کیے جاتے رہے اور ان کی مہربانی سے خالی جگہیں پر ہوتی رہیں۔ ان مہربانوں کو دفتر میں لانے اور لے جانے کے لیے پہلے امیرزادہ

ڈرائیور کی مہربانیاں شامل حال رہیں پھر بابا مشکور صبح و شام اس کارواں کی میری کرتے رہے۔

چار سال کی مدت میں یہ مسودے مکمل ہوئے تو پتہ چلا کہ ابھی اصل کام تو باقی ہے یعنی ان سارے مسودوں کو کارڈوں پر اتار کر ان پر طباعت کی نشانیاں لگا کر انہیں الفبائی تقریب میں لا کر ان کے الگ الگ گٹھے تیار کرنا ہیں۔ اس کام کے لیے اکرام چغتائی اور اشفاق انور کی معیت میں آٹھ نو جوانوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ کام جو بظاہر آسان نظر آتا تھا کافی مشکل اور پیچیدہ نکلا اور اس پر کوئی ڈھائی سال کی مدت صرف ہوئی۔ چونکہ ان کارڈوں کی تصحیح ضروری تھی اس لیے دفتر کے عملے نے انہیں ہینڈلسٹوں کی صورت میں تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ میں داد دیتا ہوں اور سلام کرتا ہوں فیض اللہ صاحب، رزاق صاحب اور جمیل میاں کو جنھوں نے صبح و شام مشینیں چلا کر ہینڈلسٹیں تیار کیں اور اپنے فارغ اوقات میں کام کرنے کے لیے کوئی محنتانہ طلب نہ کیا۔ پھر اشفاق انور، اکرام چغتائی، پروفیسر عاشق محمد اور فضلی صاحب نے ان فہرستوں پر غلطیاں لگانا شروع کیں اور ان کے سوالیہ نشانات کو ماہرین کی مدد سے حل کیا۔

خواتین و حضرات! جب مسودے کی پہلی جلد کا مواد قابل طباعت ہو گیا اور ہم پریس جانے لگے تو اچانک دفتر میں جھگڑا شروع ہو گیا اور دفتر کا عملہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک دھڑا یہ کہتا تھا کہ ڈکشنری ایک مبسوط صورت میں تمام اصطلاحات کو اپنے جلو میں لے کر چار بڑی جلدوں میں شائع ہو اور دوسرا گروہ یہ کہتا تھا اس مسودے میں سے مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے چھانٹ چھانٹ کر 72 موضوعاتی ڈکشنریاں چھاپی جائیں اور ان کو الگ الگ شائع کیا جائے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ 72 ڈکشنریاں خواہ وہ اسی اسی یا سو سو صفحے ہی کی کیوں نہ ہوں ایک ڈکشنری کے مقابلے میں ہر حال میں زیادہ شہرت کا باعث ہوں گی، لوگ زیادہ مرعوب ہوں گے۔ پریس زیادہ جگہ دے گا اور منسٹری زیادہ متاثر ہوگی لیکن پہلا گروہ اس کے مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ہماری واہ واہ تو ضرور ہو جائے گی لیکن ہم اپنے وجود سے اور اپنے چارٹر سے انصاف نہ کر سکیں گے اور ہمارا ضمیر مطمئن نہ ہو سکے گا۔ دوسرے گروہ کے پاس یہ دلیل بھی تھی کہ ہر فن کے مصنف کو اور مولف کو صرف اپنے موضوع کی اصطلاحوں کی ضرورت ہوگی اور وہ ہم چھوٹی چھوٹی گٹکا فرہنگوں میں شائع کر کے ماہرین فن کی بہتر طور پر خدمت کر سکیں گے۔ پہلا گروہ اس دلیل پر اڑا ہوا تھا کہ کسی ایک علم یا کسی ایک فن یا کسی ایک ٹیکنالوجی کا ماہر صرف اپنے علم کے کنوئیں کا ہی مینڈک نہیں ہوتا اس کے علم کی سرحدیں دوسرے علوم میں بھی دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ اس لیے اس فرہنگ کو چھوٹی چھوٹی فرہنگوں میں تقسیم کرنا ماہرین فن کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ہماری میٹنگوں میں یہ گروہ کہا کرتا تھا کہ اگر کسی سب ایڈیٹر کو یونیسکو کے مضمون: The Socio-economic patterns of Educated Society in 3rd world countries کا ترجمہ کرنا ہوگا تو اس کو سوشیالوجی کی اصطلاحات کی بھی ضرورت ہوگی۔ اکنامکس کی بھی، درس و تدریس کی بھی، سیاست کی بھی اور شاید علم الانسان کی بھی۔ پھر وہ کتنی ڈکشنریاں اپنے سامنے رکھ کر اسی ایک مضمون کا ترجمہ کرے گا۔

جناب والا! اس جلد کی اشاعت سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بورڈ کا پہلا دھڑا جیت گیا ہے لیکن اپنی تمام تر شمولیت کے باوصف دوسرے دھڑے کے دل پر بڑا بوجھ ہے اور وہ غمناک بہت ہے۔ لیکن ہم اس کو یقین دلاتے ہیں کہ اس بڑی لغت کے چھپ جانے سے بہت سے دوسرے پبلشر اپنی اپنی پسند کا مواد اس میں سے چھانٹ کر کئی چھوٹی چھوٹی ڈکشنریاں بنا سکیں گے۔ خود ہماری منسٹری کیری کیولم ونگ ہمارے فراہم کردہ مواد میں سے ایف اے اور ایف ایس سی سطح کی ایک چھوٹی لغت تیار کر چکا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم اپنے بورڈ کی پبلسٹی نہیں کرتے اور ہر وقت اپنے ہوم ٹاسک میں کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک اچھا کام اپنا انعام خود ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی قسم کی اشتہار بازی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو کام ہم کو حکومت کی طرف سے، معاشرے کی طرف سے اور ٹیکس دہندہ کی طرف سے دیا گیا ہے اس کو خلوص نیتی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دینا ہمارا بنیادی فرض ہے۔ لیکن اب ہمارے چاروں طرف سے یہ صدائیں بہت اونچی آوازمیں آنے لگی ہیں کہ پبلسٹی کے بغیر کوئی شخص، کوئی ادارہ، کوئی فردِ واحد زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر زندہ رہ بھی جائے تو نیک نامی کی زندگی بسر نہیں کرسکتا..... اب آپ سے کیا پردہ۔

خواتین وحضرات! ہم نے سن انہتر میں اپنی پبلسٹی پر تھوڑی سی توجہ دینا شروع کی تھی تو ہمارے سارے منصوبے ٹھپ ہوکر رہ گئے تھے اور ہم چھ ماہ تک سوائے خود بینی، خودآرائی اور خودفروشی کے اور کچھ کر ہی نہ سکے تھے۔ چنانچہ اپنی اس پبلسٹی کے چکر سے نکل کر ایک بار پھر واپس اپنی سرکس میں آگئے اور ہمت کے سانٹے کھینچ کھینچ کر محنت کے گھوڑے دوڑانے لگے۔

اپنے دفتر کے اس بہت ہی پیارے دھڑے کو مایوسی سے نکالنے اور اسے تھوڑی دیر کے لیے خوش کرنے کے لیے میں اس بورڈ کی اعلیٰ کارکردگی کے چند نمونے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ خود فیصلہ کرسکیں کہ اردو بورڈ کے مٹھی بھر کارکنوں (نا چسنوں سمیت ہم کل گیارہ ہیں) کو کیسی شاباشی ملنی چاہیے، کتنی دیر تک ملنی چاہیے اور اس کی تشہیر کس طرح سے ہونی چاہیے کہ ان کا دل اور بڑھے اور یہ عمل کے میدان میں نئے کوٹ فتح کریں!

جناب والا! ہم وہ واحد سرکاری اشاعتی ادارہ ہیں جو اپنی مطبوعات کو فروخت کرنے اور انہیں ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کے لیے خصوصی تردد کرتے ہیں۔ ہم سب ملازمین بورڈ نے، بلالحاظ افسر اور ماتحت، یہ ایکا کررکھا ہے کہ بجلی، بارش، زلزلہ، چھٹی یا نا چھٹی، دفتر کے وقت میں، یا وقت سے باہر ہر کو اپنی مطبوعہ کھیپ کو ہر حال میں فروخت کرنا ہے اور اپنی قیمت پر فروخت کرنا ہے۔ چنانچہ اس سال یعنی جولائی 83ء سے 30 جون 84ء تک ہم نے اپنی چار لاکھ تریسٹھ ہزار چوالیس روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت کیں.....

یہ بات تو ٹیکس دہندگان کی اطلاع اور تسلی کے لیے ہے لیکن پریس کے نوٹ فرمانے کی بھی ہے۔ دوسری بہت بڑی خوشخبری یہ ہے کہ اردو بورڈ نے اب تک اپنی 164 مطبوعات میں سے 21 کتابوں پر مختلف

نوعیت کے قومی انعامات حاصل کیے ہیں۔

خواتین و حضرات! اس وقت ملک میں کوئی سرکاری یا نجی' نیم سرکاری امدادی۔ شخصی یا اجتماعی پبلشنگ ہاؤس ایسا نہیں ہے جس نے اپنی مطبوعات پر اتنے قومی انعامات حاصل کیے ہوں۔ یہ ہمارا ریکارڈ ہے اور اس میں خدا کے فضل سے ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس اعلان سے میرا مقصد ہماری مطبوعات کے معیار کی خبر دینا ہے۔ اور یہ خبر عوام کے علاوہ ٹیکس دہندگان' وزارت تعلیمات اور پریس کی خصوصی توجہ اور داد کی مستحق ہے۔

خواتین و حضرات! جس عمارت میں اس وقت آپ تشریف فرما ہیں' یہ وفاقی وزارت تعلیمات کی ملکیت ہے جو اردو بورڈ نے خود اپنی آمدن اور اپنی بچت سے تعمیر کی ہے اور اس کے لیے کوئی خصوصی گرانٹ یا کوئی مالی امداد حکومت سے یا کسی اور ادارے سے حاصل نہیں کی۔ جب یہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچی اور بالکل ننگی بوچی تھی اور ہمارا سارا سرمایہ اور جمع جتھہ کھا گئی تھی۔ اس وقت کے وزیر تعلیم اور سیکرٹری صاحب جب معائنے کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے ازراہ شفقت تعمیر کو اختتامی نقوش عطا کرنے کے لیے اس سال منصوبہ جاتی گرانٹ کے بجائے چار لاکھ چوبیس ہزار دو سو بائیس روپے کی رقم عنایت فرمائی تاکہ اس عمارت کی تزئین' پردہ پوشی اور ایئر کنڈیشنگ کا کام اختتام کو پہنچ سکے۔

معزز سامعین! وفاقی وزارت تعلیمات' جس کی ماتحتی میں یہ بورڈ کام کرتا ہے' شروع ہی سے ہمارے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتی رہی ہے۔ گو اس محبت اور شفقت کی ابتدا منسٹری میں ہماری متعلقہ افسر مشرقی پاکستان کی ڈاکٹر فاطمہ صادق صاحبہ سے ہوئی تاہم بعد میں آنے والے تمام افسروں نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ تنویر احمد خان' ڈاکٹر ذکی' رفیق صاحب' مختار بھٹی' ڈاکٹر زمانی' پھر ڈاکٹر حمید شیخ صاحب بڑی دیر تک ہمارا ہاتھ پکڑ کر قدم قدم ہمارے ساتھ چلے اور اب میاں قسیم صاحب ہمیں ہر طرح کی مدد اور ہر قسم کے تعاون سے نوازتے ہیں۔ ڈاکٹر افضل صاحب کے وزیر بن جانے کے بعد ہم کو بہت سی آسانیاں میسر آئیں جن میں سب سے بڑی آسانی ڈاکٹر صاحب سے کسی بھی وقت بالمشافہ بات کرنے اور اپنی مشکلات کھول کر بیان کرنے کی ہے۔ ڈاکٹر افضل چونکہ ''جناب عالی''، ''عزت مآب''، ''تبار'' وغیرہ کی ترکیبوں سے گھبراتے ہیں' اس لیے ان کے ساتھ کام کرنا بڑا آسان ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب آیندہ انتخابات تک ''والا تبار'' بننے کی کوشش نہیں کریں گے کیونکہ ان کی عزت مآب بن جانے سے ہمارے چھوٹے چھوٹے لیکن بہت ہی اہم کام رک جائیں گے۔

معزز خواتین و حضرات! اردو بورڈ کی ''اپنی مدد آپ'' کے تحت تعمیر کردہ اس عمارت میں آپ کی تشریف آوری پر میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور ''اپنی مدد آپ'' کے تسلسل ہی میں عرض کرتا ہوں کہ اپنے آیندہ منصوبوں کی تکمیل اور اپنی اگلی مطبوعات کی طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں اردو بورڈ خود کفیل ہو

گیا ہے اور رواں مالی سال سے ہمیں گرانٹ کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

وفاقی وزارت تعلیمات ہمیں ہر سال اوسطاً پانچ لاکھ روپے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے عنایت فرماتی رہی ہے۔اس میں سے کچھ رقم وزارت مال اپنی مجبوریوں کے تحت سال کے اواخر میں کاٹ بھی لیا کرتی تھی پھر بھی ہم کسی نہ کسی طریق سے اپنے بیشتر منصوبے اللہ سائیں کی مدد سے پورے کرلیا کرتے تھے۔ اب آپ کی دعاؤں سے اور آپ کی نیک تمناؤں سے اور جہاں بھی آپ کو بورڈ کا کوئی کارندہ ملے اسے تھپکی دینے سے ہم انشاءاللہ ایک اور شاندار روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پانچ لاکھ کی یہی گرانٹ جو وزارت ہمیں ہمارے منصوبے کی تکمیل کے لیے عنایت فرماتی رہی ہے۔ وہ کسی اور مفید اور بہت ہی اہم تعلیمی منصوبے پر خرچ کر کے ہماری وزارت کسی اور تعلیمی کمی کو دور کرنے میں کامیاب ہوگی۔ گو فرہنگ اصطلاحات کی اشاعت ایک بہت مہنگا منصوبہ ہے لیکن اس کی اگلی تینوں جلدیں بھی ہم اپنی مدد آپ کے تحت حکومت کی گرانٹ کے بغیر خود شائع کریں گے اور ان کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے اور عام قارئین کے لیے سائنسی موضوعات پر خوبصورت، رنگدار اور آسان کتابیں بھی شائع کریں گے۔ بی ایس سی اور ایم ایس سی کے لیے اردو میں سائنس کی درسی کتابوں کا جو سلسلہ قائم ہے۔ وہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ دعا فرمائیے کہ اگلے پانچ سات سال کے اندر اردو سائنس بورڈ کا بقیہ بوجھ بھی حکومت پر یا ٹیکس ادا کرنے والوں پر نہ رہے اور یہ اپنا سارے کا سارا بوجھ خود اپنے کندھوں پر اٹھانے کے قابل ہو جائے۔ چونکہ فی الحال ہمارے بجٹ کا بوجھ یعنی ہمارے Recovering Expenses بجلی، پانی، تنخواہوں، کرایوں کے اخراجات کا بوجھ وزارت پر ہی باقی رہے گا، اس لیے ہم آپ سے دعا منگوار ہے ہیں کہ ہمیں مکمل خود کفالت کی مثال قائم کرنے کی صلاحیت عطا ہو اور دوسرے نیم سرکاری ادارے بھی اسی عطا کے راستے ہمارے پیارے ملک اور اس کے محبوب معاشرے کو ان بلندیوں پر لے جائیں جن کے وعدے ہم نے لوگوں سے 46ء اور پھر سینتالیس کے شروع میں کیے تھے۔

فرہنگ اصطلاحات کی دوسری جلد ہم دسمبر 84ء کے ختم ہونے سے پہلے منظر عام پر لے آئیں گے اور اگر حالات استوار رہے اور ہم اسی طرح سر ڈال کر کام کرتے رہے تو انشاءاللہ جون 85ء تک ہم اس کی چاروں جلدیں چھاپنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

آخر میں آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مجھے ان اصحاب تک یہ بات بھی پہنچانی ہے جو سائنسی اور فنی مضامین کو اردو میں پڑھانے کے خلاف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ماسوائے انگریزی کے یہ علوم کسی اور زبان میں سکھائے ہی نہیں جاسکتے۔ میں اس بات کا ایمانداری سے اعتراف کرتا ہوں کہ سائنسی علوم کے لیے انگریزی زبان ہی کافی نہیں بلکہ انگریزی کے ساتھ ساتھ کیمسٹری کے علم میں دور تک جانے کے لیے جرمن زبان بھی آنی چاہیے۔ الیکٹرونکس کے لیے جاپانی بھی آنی چاہیے۔ اعلیٰ درجے کی ڈیزائننگ کے اطالوی زبان بھی سیکھنی چاہیے لیکن یہ سب اعلیٰ معیار اور اونچے درجے کے سائنسی علوم کے لیے ہے۔

اس سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے خواص الناس پیدا ہوتے ہیں جو بڑی بڑی تھیوریوں اور کلیوں کے مصنف ہوتے ہیں۔ لیکن کسی ملک یا معاشرے کی ترقی کے لیے عوام الناس کا ان علوم کو جاننا اور ان کی گہرائیوں میں اترنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ہر ملک کے چند بڑے بڑے سائنس دان اور ریاضی دان انگریزی' فرانسیسی' جرمن اور روسی وغیرہ کو آسانی سے اٹھا لیتے ہیں لیکن اسی ملک کے ہزاروں بلکہ لاکھوں مستری' میکینک اور ماہرین فن سوائے اپنی زبان کے اور کچھ نہیں جانتے اور ملکوں کی معیشت تھیوریوں اور کلیوں کو قائم کرنے والوں کے سر پر نہیں چلتی بلکہ ان ماہرین فن کی بدولت پنپتی ہے جو اپنے فن کی باریکیوں میں بہت گہرے اتر جاتے ہیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں بڑے سائنس دانوں کی مدد کرتے ہیں۔

ہمارے پاس اس وقت اعلیٰ درجے کے بی ایس سی اور ایم ایس سی اور سائنس کے پی ایچ ڈی تو بہت ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے والے ماہر مستری اور میکینک کوئی بھی نہیں۔ ہم موٹر گیراج اور سروس سٹیشن کے لاکھوں مستریوں' پنکھا انڈسٹری کے ہزاروں کوائل باندھنے والوں' گوجرانوالہ کے مختلف النوع مشینوں پر کام کرنے والے استادوں' چھاپے خانے کے سینکڑوں مشین مینوں کو آج تک یہ نہیں سمجھا سکے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں یا کر لیتے ہیں تو ایسا ''کرنا'' کیونکر ہوتا ہے اور اس کے پیچھے کونسا اصول کارفرما ہے۔

پی آئی اے کے جمبو جہاز کی سروس کے وقت اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تین سو کارکنوں میں سے چار انجینئر تو بات سمجھتے ہیں لیکن باقی کے 296 فولاد پر حرارت کے عمل کو بالکل نہیں جانتے۔ ہم انہیں اردو میں سینٹل اور ہائی سپیڈ سٹیل اور کاربائیڈ اور ٹنگسٹن کی بابت کھول کر بتانا چاہتے ہیں اسی قدر بتانا چاہتے ہیں جس قدر جانکاری ان کے بڑے صاحب ٹیکسٹائل اور سٹیل کے کارکنوں سے حاصل کر چکے ہیں۔ ہم حیدرآباد کے شیشہ سازوں کو آسان زبان میں وہی باتیں سمجھانا چاہتے ہیں جو ان کے چیف انجینئر پانچ پانچ چھ چھ سال کٹ گلاس تیار کرنے والی فیکٹریوں میں لگا کر سکینڈے نیوین دانش گاہوں سے حاصل کر چکے ہیں۔ الیکٹرونکس کی اردو میں کتابیں شائع کر کے ہم گارمنٹس فیکٹریوں میں کام کرنے والی میٹرک پاس بیبیوں کو یہ علم بھی فراہم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی ساتھی جاپانی لڑکیاں ان سے بہت کم علم رکھتے ہوئے' دنیا کے گوشے گوشے میں جانے والے ٹرانسسٹر' ٹیپ ڈیک' ٹی وی اور وی سی آر خود تیار کرتی ہیں اور خود ہی ڈیزائن کرتی ہیں۔

ہم انگریزی کے جرمن کے فرانسیسی کے روسی کے یا جاپانی کے خلاف نہیں ہیں لیکن ہم اعلیٰ علوم کو خواص تک محدود رکھنے کے خلاف ضرور ہیں۔ علم پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری برہمنوں کے دورِ ستم کی یادگار ہے.....آپ انگریزی میں ضرور علم حاصل کیجیے۔ جرمن میں کیجیے۔ فرانسیسی میں کیجیے لیکن زکوٰۃ کے طور پر یہ حاصل کردہ علم اپنی زبان میں منتقل کر کے ان لوگوں کو بھی عطا فرمایئے جو صرف اپنی زبان سمجھتے ہیں.....

آپ کی آسانی کے لیے ہم نے یہ فرہنگ تیار کی تاکہ آپ کو اپنی زبان میں کتابیں' کتابچے اور

مضمون لکھتے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔ جب تک آپ انگریزی یا کسی غیر ملکی زبان میں پڑھے ہوئے علم کو اپنی زبان میں منتقل نہیں کریں گے۔ لوگ یہی سمجھتے رہیں گے کہ آپ اس علم کی اصل روح کو نہیں سمجھے ہیں اور آپ نے خدانخواستہ کتابیں گھوٹ کر یا مضمون رٹ کر اپنی سائنس کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور آپ اپنی آنے والی نسل کو بھی آپ اسی طرح پرائی اوک سے علم منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

جناب صدر میں ایک بار پھر آپ کا اپنے دفتر کے دونوں دھڑوں اور اپنی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ اپنی مصروفیت کے باوجود حسب وعدہ یہاں تشریف لائے اور ہمارے اس قدیم اور عظیم منصوبے کی اوّلین جلد کی رسم افتتاح ادا کی..... گو آپ کے جہاز کی واپسی اڑان کا وقت قریب ہے پھر بھی میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اردو سائنس بورڈ کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ضرور کچھ کہیے اور ان کو ضرور تھپکی دیجیے کیونکہ انہوں نے بہت اچھا کام کیا ہے اور خود کفالت کی کافی اچھی مثال قائم کی ہے۔

شکریہ!

دفاع اور برقیہ دار ابلاغ

میں یہاں پر میڈیا اور میڈیا کے اثرات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ آپ ابلاغ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور اگر کل تک نہیں جانتے تھے تو آج اس کی پوری جزئیات سے واقف ہو چکے ہیں۔ میرا ذو میسائل چونکہ الیکٹرانک میڈیا کی بستی کا ہے اس لیے میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اس کے جغرافیے سے آپ کو روشناس کرانے کی کوشش کروں گا' خواہ ابتداء میں ہمیں کافی دور تک ایسے ہی بھٹکنا پڑے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں تاریخ انسانی بڑے اصرار کے ساتھ یہ منوانے پر بضد ہے کہ تحریر سے بہت پہلے گفتار موجود تھی اور گفتار سے ہزاروں سال پہلے انسان کے کندھوں پر سر اور سر میں مغز موجود تھا اور آگہی عطا کرنے کے لیے انسان سے انسان بلاواسطہ طور پر مخاطب تھا۔ اس کرۂ ارض پر جتنی بھی تہذیبیں ابھریں ان کی پائیداری کی بنیاد انسانوں کے ربط باہمی کی بنا پر تھی۔ چٹھی پتر یا پروانے اور حکم نامے کی وجہ سے نہیں تھی۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے مذاہب آئے' سب کے پیشواؤں نے لوگوں کو اپنے کلام سے مخاطب کیا اور اپنی بات سے متوجہ کر کے ان کے اندر باہر اردگرد حتیٰ کہ ان کے مابعد میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ ان کے ارشادات' ملفوظات اور احکامات کو بعد میں تحریری اور تصویری صورتوں میں جمع کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا گیا لیکن صرف تحریر اور لکھت آنے والی نسلوں کو اپنی گرفت میں اس طرح سے نہ لے سکی جس طرح صاحب حال اور صاحب واقعہ لوگوں کے اپنے عہد کے لوگ ان کے سائبان تلے آ کر محفوظ و مضبوط ہو گئے تھے۔

افکار و خیالات تحریر کی گرفت میں آ جانے کے باوصف اور کولڈ پرنٹ کی ایجاد کے باوجود استاذ' گرو اور معلم کو عطائے علم نے منبع سے الگ نہ کیا جا سکا۔ علم اور معلوم فراہم کرنے کے لیے ''پرچی'' اور ''چٹھا'' استعمال ضرور ہونے لگا لیکن پرچی اور چٹھے کے اظہار کے لیے فورم اور روسٹرم سے جیتے جاگتے اور بولتے چالتے انسان کو ہٹایا نہ جا سکا۔ کتابیں اخبار رسالے اور پرچے شائع ہونے لگ گئے لیکن بیان کے انسان کا وجود پھر بھی لازمی ٹھہرا۔ درس گاہوں اور دانش کدوں میں نصابی کتابوں کے چبوترے ضرور چن دیئے گئے پر ان

اداروں سے زبانی روایت کو نکالا نہ جا سکے۔ زمانہ بڑی ترقی کر گیا پر Oral tradition کا کوئی بدل مہیا نہ ہو سکا۔

کچھ دردمند صاحبان علم نے علم کو بذریعہ خط و کتابت پھیلانے کا وسیلہ ڈھونڈا لیکن علم حاصل کرنے والوں نے اسے قبول نہ کیا۔ پھر ایک تجربہ اوپن یونیورسٹیوں کا کیا گیا لیکن اس کے سند یافتگان کو وہ مقام نہ مل سکا جو گروروں کے سامنے بیٹھ کر اور ان کا بیان سن کر علم حاصل کرنے والوں کو ملتا ہے..... چھاپے اور چھپائی کی اتنی کامیاب صدیاں گزرنے کے باوجود علم اور معلوم کی فراہمی کے لیے گفتار اور صاحب گفتار سے کنارہ نہ کیا جا سکا۔ تحریر کے وجود میں آ جانے کے باوصف گفتار کی روایت ترک نہ کی جا سکی۔

منادی والا منادی کرتا تو سینکڑوں ہزاروں کا مجمع سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو جاتا۔ اعلانچی اعلان کرتا ملک خدا کا' حکومت بادشاہ سلامت کی' بھلائی رعایا کی اور انصاف ایک رنگ کا۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کوتاہ قد' سیاہ رو اور بدباطن دشمن نے ہمارے سرحدی گاؤں پر حملہ کر کے بستی کو اپنے محاصرے میں لے لیا ہے.....اس اعلانچی کو جب برقی قوت کی امداد حاصل ہوئی تو دوسری جنگ عظیم میں ریڈیو برلن سے اونچی آواز میں پکارا کہ دنیا کے محکوم لوگو! انگریز تمہارا دشمن اور ہٹلر تم کو اسی دشمنی سے نجات دلانے کے لیے میدان میں اترا ہے۔ انگریز کو بھرتی نہ دو اور ظالم کی مدد نہ کرو.....آواز انسان کی تھی۔ سننے والے انسان تھے۔ ادائیگی تلفظ لہجہ' مخرج مانوس اور شناسا سا تھا۔ سننے والے سنانے والے کے قریب آ گئے۔ ہندسہ حرف چھپائی کاغذ۔ سطر اور سرخی غیر مانوس اور غیر آشنا جنس تھی' اس لیے زندہ انسان اس سے متاثر ہونے کے باوجود اس میں پورے طور پر اثر نہ کر سکا۔ یقین کی حدوں کے ارد گرد ہی گھومتا رہا.....ریڈیو برلن سے بی بی سی نے بہت کچھ سیکھا اور سننے والوں کو اپنی بات سنا کر' پہنچا کر ان کے رگ و پے میں رچا کر دہی بی بی سی نے ایک خاص انداز کی آوازوں' لہجوں' لحنوں کا انتخاب کیا اور بیان کے فقروں کی ایسی ساخت رکھی جس پر بے اختیار یقین آئے اور پھر آتا ہی چلا جائے.....

پھر اس نے اپنی بات کو ذہن نشین کرانے کا ایک اور دلآویز انداز اختیار کیا۔ آج شام ذرا غور سے بی بی سی کا پروگرام سنیے گا۔ پہلے خبروں کا خلاصہ' اس میں خصوصی خبر کی خصوصی بندش۔ پھر پوری خبروں میں خصوصی خبر کے مقام کی الاٹمنٹ۔ اردگرد کی خبروں کا قالب تیار کر کے خصوصی خبر کی ذات بندی۔ اس کے بعد سیربین میں پھر اس خصوصی خبر پر سیر حاصل تبصرہ۔ آخر میں ماہرین کی رائے میں اس خبر کی مرکزی مسئلہ کے طور پر پیشکش۔ بی بی سی خبر سناتی نہیں خبر یاد کرا دیتی ہے۔ آپ اپنا اہم ترین کام بھول جائیں گے لیکن سونے سے پیشتر یہ خبر اچھی طرح سے آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی اور آپ کے وجود میں اس کی ایسی اعلیٰ پروگرامنگ ہو گی کہ سوچ دبائے بغیر جھٹ سے ہر وقت موجود ہو گی۔ خودکار کھل جا سم سم کی طرح۔

افسوس یہ کہ معتزلہ جیسے باریک فلسفوں والے مطبوعہ ٹائم نیوز ویک اور وال سٹریٹ جرنل بھی مغرب

کے اور مہاتما بدھ سے لے کر بابا بلھے شاہ کی Oral Tradition بھی ان کی اور ہمارے پاس صرف خفت۔ شرمندگی اور انفعال..... ہم کدھر سے ان کا مقابلہ کریں کہ انہوں نے ہر طرف کی ناکابندی کر رکھی ہے۔

میں یہ بات تو ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ مغلیہ دور میں اور اس کے اردگرد کے شاہی خاندانوں کے زمانے میں فوج کا اور عوام کا کیا تعلق تھا اور ان کے درمیان کیسا رشتہ قائم تھا' البتہ یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزوں نے دیسی فوج کو ان کے اپنے دیسی لوگوں سے علیحدہ کر کے الگ زمان و مکاں میں ان کی وارابندی کر دی تھی اور وہ ایک باپ کی اولاد ہوتے ہوئے دو ایسے الگ الگ گروہ بن گئے تھے جن میں کسی قسم کا ربط باہمی نہیں تھا بلکہ دونوں بہت حد تک ایک دوسرے کو اجنبی سمجھنے لگے تھے۔ یہی کیفیت بیوروکریسی کی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر والوں سے منہ موڑ کر ان سے دور بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کر رہی تھی۔

انگریز بے چارا مجبور تھا اور مشکل میں تھا۔ اس کو اپنے گھر سے ہزاروں میل دور ایسے لوگوں پر حکمرانی کرنے کی مجبوری تھی جو تعداد میں بہت زیادہ تھے اور جن کو دائرہ تسلیم و رضا میں رکھنے کے لیے انہی لوگوں میں سے ایسے منتخب گروہ کو ان پر مامور کرنا تھا جو شکل و صورت میں تو اپنے گھر والوں جیسے تھے لیکن سوچ اور رویے میں مختلف تھے۔ اس سوچ اور رویے کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ عوام الناس کی بستیوں سے دور فوجی چھاؤنیاں بنائی جائیں اور عوام الناس کے گھروں سے دور سول لائنز آباد کی جائیں..... آزادی نصیب ہونے اور پاکستان بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا اور حکومت گوری ایسٹ انڈیا کمپنی سے کالی ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل ہو گئی۔ کالی کمپنی گوری کمپنی سے بھی سخت اور ڈاہڈی ثابت ہوئی۔ اس نے عوام کو عزت نفس کا لارا لگا کر گلیوں اور بازاروں میں اپنے سامنے نچایا اور ان کا دل خوش کر دیا اور جب لوگ خوشی سے لبریز ہو گئے تو تماشا کرنے والوں نے چھاؤنیوں اور سول لائنوں کے دروازے بھیڑ کر دریچوں پر پردے کھینچ لیے۔ درمیان کا رشتہ کٹ گیا۔

سول لائنز والوں سے تو یہ پردہ ہٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ اس طرح سے ان کا تشخص ختم ہوتا ہے البتہ دفاع والے اگر چاہتے تو یہ دیوار برلن آسانی سے گرا سکتے تھے لیکن یہ کامیابی ان کے مقدر میں بھی نہیں تھی۔ وہ نئے ارادے اور نئے ولولے سے آگے بڑھے ضرور لیکن خواہش کے تیزابی مٹکے میں اترتے ہی تحلیل ہو گئے۔ برا ہوا بلکہ بہت ہی برا ہوا۔ ان کے لیے کم عوام الناس کے لیے زیادہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب چھاؤنیوں میں اور عوام الناس کی بستیوں میں جغرافیائی دوری تو کم نہیں ہو سکتی' البتہ دلوں کی دوری کم ہو کر گہری محبت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ جو گلی محلوں میں پلے ہیں اور گلی محلوں کی زندگی سے واقف ہیں' چھتوں' دریچوں' ادھ کھلے دروازوں اور منڈیروں کی محبتوں کے بھید بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ یہاں جغرافیائی بعد کو آواز کے پلوں سے پاٹا جاتا ہے.....

''بھابی جی آج داتا صاحب کب چلنا ہے؟''

''آج نہیں کلثوم بیٹا آج میرے گھٹنے میں درد ہے۔''

''مالش کی وہی والی دوا بھیجوں۔''

''نہیں بیٹا ابھی ہے میرے پاس۔''

☆..........☆☆..........☆

''یہ چق پوری اٹھا کر بات کرو۔''

''اٹھائی تو ہوئی ہے۔''

''خاک اٹھائی ہے چہرہ تو نظر ہی نہیں آتا تمہارا۔''

''آہستہ بولو نیچے اباجی ناشتہ کر رہے ہیں۔''

☆..........☆☆..........☆

''میں نے کہا چاچا جی! شام کو آتے ہوئے میرے لیے ادھ سیر کاغذی بادام لیتے آنا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جی۔''

''ایک پاؤ منقیٰ بھی اعلیٰ درجے کا۔''

''وہ بھی آجائے گا۔''

''تھیلا بھیجوں چاچا جی۔''

''اوجی میرے پاس میری صافی ہوتی ہے بیٹا' آجائے گا سودا۔''

آوازوں' چہروں اور دریچوں کی اس دنیا میں باہمی ارتباط کے ذریعوں کو ولایت والوں نے ابھی ابھی الیکٹرانک میڈیا کا نام دیا ہے جس نے انسانوں کے درمیان جغرافیائی اور فکری فاصلے بڑھ جانے کی بنا پر مانوس آوازوں اور پسندیدہ چہروں کو دریچوں اور دہلیزوں کے اور بھی قریب کر دیا ہے۔

سنہ 65ء کی دفاعی جنگ کے دوران الیکٹرانک میڈیا ہمارے ربط باہمی کا واحد ذریعہ تھا اور عوام اور فوج کی دونوں فورسز اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے لباس میں ایک سی جنگ لڑ رہی تھیں۔

''اے وطن کے سجیلے جوانو.....''

''آدم پور' ہلواڑہ' انبالہ اور پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر دشمن کے طیاروں کو ناکارہ بنا آئے ہیں۔''

''ہم بی آر بی پر کوہ گراں بنے کھڑے ہیں آپ فکر نہ کریں۔''

''لاہور جاگ رہا ہے اور بیس کروڑ آنکھیں تمہاری طرف متوجہ ہیں۔ تم بھی فکر نہ کرنا۔''

''ہم نے کھیم کرن کے مقام پر دشمن کو پسپا کر کے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔''

''اوئے ہدایت بابا ٹیسکل کہاں تے ماری ایسی اعلیٰ دو گھنٹیاں والی۔''

''یہ جی کھیم کرن کے سنسان بازار میں کھڑی تھی بے یار و مددگار صوبیدار صاحب نے کہا لینی ہے تو لے جاؤ۔''

''اوئے وہاں تے ایدھے پرای چلیا آ رہا ایں بدبختا۔ کھیم کرن تے لاہور تک۔''

''بہت رواں چلتی ہے جی۔ آدھا پیڈل مانگتی ہے صرف۔''

سنہ 71ء میں فوج اور عوام کی دنیائے ارتباط میں دھند لکے پیدا ہوئے اور دوری بڑھی۔ پھر جیسور ڈھاکہ، کھلنا اور نرائن گنج کا دفاع کرنے والوں اور اپنی حفاظت کروانے والوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا کردی گئیں۔ پوری طاقت آدھی ہوگئی۔ پھر ایک آدھی دوسری آدھی کی دشمن بن گئی۔ پھر اپنے ہی آدھے ملک کا نام تبدیل ہوگیا۔

وطن کی مضبوط اور موثر دفاع کے لیے فوج اور عوام میں جسمانی اور جغرافیائی دوری کی وجہ سے ذہنی اور روحانی اشتراک اور دفاعی تیاری کے لیے گہری افہام و تفہیم کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک دفاع کرنے والا اور جس کی دفاع کی جائے ایک سر میں ہم آواز نہیں ہوں گے اس وقت تک مشترکہ ملے میں یک سازی نہیں ہوگی۔ ستار کے چھیڑے جانے والے تاروں کے نیچے کچھ خاموش اور چپ چاپ تار بھی ہوتے ہیں جنہیں طربیں کہتے ہیں۔ جب تک بڑے تاروں کی جھنجھناہٹ سے طربوں میں ارتعاش پیدا نہ ہو آہنگ پورا نہیں ہوتا اور جب تک دونوں اپنے اپنے مقام پر ایک ساتھ ہو کر صدا نہ دیں اس وقت تک راگ کی اصل شکل نہیں بنتی۔ یہی حال قومی دفاع کا ہے۔

جن علاقوں میں تعلیم کا چلن عام ہے وہاں بہت حد تک تحریر سے ابلاغ کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن جہاں حرف اٹھانے والے کم ہیں، وہاں صرف سمعی اور بصری اطلاعات سے ہی پیغام واضح ہوگا۔ اس وقت الیکٹرانک میڈیا سمعی اور بصری اطلاعات کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ گو فلم، گراموفون اور ٹیلی فون اس سے ذرا پہلے کی چیزیں ہیں اور وقت پڑنے پر بہت حد تک ابلاغ کی مدد بھی رہی ہیں، لیکن وہ الیکٹرانک میڈیا کے ذیل میں نہیں آتیں۔

تیسری دنیا میں چونکہ الیکٹرانک میڈیا حکومتوں کے کنٹرول میں ہوتا ہے، اس لیے حکومت کی مرضی اور ایما ہی سے صاحبانِ دفاع اور اہالیانِ وطن کے درمیان یہ ذریعہ ابلاغ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت کو منظور نہیں ہوگا تو وہ ان دونوں کے درمیان اشتراک باہمی سے گریز کرے گی اور اس گریز کی متعدد وجوہات پیش بھی کر دے گی۔ اس میں گھبرانے یا فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہماری حکومتوں کی بڑی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ایسے میں ڈیفنس کو اپنی مضبوطی، پائیداری اور بقا کے لیے کچھ ایسے وسائل تلاش کرنے ہوں گے جو پورے کے پورے اس کے اختیار میں ہوں اور جن پر عمل کر کے وہ دفاعی تیاریوں کی پشتیبانی کر سکے۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ فلم کا ہے، جس سے ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔

بھارت ہر سال اپنے یہاں بننے والی سینکڑوں فلموں میں سے بارہ سے پندرہ فلمیں ایسی ضرور بناتا ہے جن کی کہانیاں فوج سے' قومی دفاع سے' فوجی کامیابی سے اور فوجی زندگی کے ارفع آدرشوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ پاکستان میں بھی انہی خطوط پر کام ہوسکتا ہے بشرطیکہ پرائیویٹ سیکٹر میں بننے والی ایسی فلموں پر تفریحی ٹیکس کی چھوٹ دی جائے اور دوسرے چھوٹے موٹے ٹیکسوں سے بھی ان فلموں کو مبرا قرار دیا جائے۔

فوج کے اندر ابلاغ کے ایک خصوصی یونٹ میں ایسے ویڈیو کیسٹس کی تیاری کا ڈول بھی ڈالا جاسکتا ہے' جہاں ڈراموں' فیچروں' تمثیلوں اور خاکوں کے ایسے ویڈیوز تیار کیے جائیں جو دفاع کے بارے میں عوام کو دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کریں اور انہیں مستعدی کے رموز سمجھائیں۔ اسی طرح جوانوں کے حوالے سے ان گھروں اور ان علاقوں کی تمثیلی کہانیاں بھی پیش کی جائیں جہاں سے جوان آتے ہیں۔ اور جن کے یونٹوں میں آجانے کے بعد گراؤں' گھوٹوں' کلے اور بستی میں گہرے خلا پیدا ہو جاتے ہیں.....

یہ مقبول قسم کے ویڈیو کیسٹ ہمارے گھروں میں بھی دیکھے جائیں گے اور یونٹوں کے اندر جوانوں کو بھی دکھائے جائیں گے۔ اس طرح ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے میں بڑی آسانی ہوگی اور ہم ایک دوسرے کو بہت دور سے بھی دیکھ کر بے حد قریب سے پہچان لیا کریں گے۔ جو غلط فہمیاں فوجیوں کے دلوں میں اور جو شکوک شہریوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں یا کبھی ہوتے ہیں وہ قصوں کہانیوں' داستانوں اور ڈراموں کے روپ میں ''ویڈیو وضاحتیں'' بن کر ہر طرح کا ازالہ کرسکیں گی۔

اس کے بعد ایک آسان اور سستا طریقہ آڈیو کیسٹس کی تیاری کا ہے جس پر آئی ایس پی آر اپنے محدود ذرائع کے اندر رہتے ہوئے برسوں سے عمل پیرا ہو کر 23 مارچ کو اپنا پہلا آڈیو کیسٹ مارکیٹ میں لاسکتا ہے۔ اس کیسٹ میں چونکہ ایک فیچر اور ایک مکالمے کے علاوہ بیشتر نغمے' گانے اور ترانے ہوں گے' اس لیے دور دراز گاؤں میں ان کی طلب زیادہ ہوگی۔ چونکہ ہر ٹریکٹر چلانے والا' ٹیوب ویل مستری' بکروال' راج' مزدور اور ٹرک ڈرائیور اپنا کیسٹ پلیئر ہر وقت ساتھ رکھتا ہے۔ اس لیے آئی ایس پی آر کے آڈیو کیسٹ ان کی شاپنگ لسٹ میں سرفہرست ہوں گے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ ان کیسٹس میں ریٹائرڈ صوبیدار اور ان کی صوبیدارنی کے دلچسپ مکالمے ہوں گے اور دفاعِ وطن کے مفید مشورے ہوں گے اور دوسرے اس وجہ سے کہ یہ کیسٹ دوسرے کیسٹوں کے مقابلے میں ارزاں ہوں گے کہ مارکیٹ میں ''نو پرافٹ نو لاس'' کے طور پر ترسیل کیے جائیں گے.....یہی ویڈیو کیسٹ اور آڈیو کیسٹ ٹی وی اور ریڈیو کے طے شدہ دورانیوں میں بھی چلائے جاسکیں گے اور ریڈیو کے فوجی بھائیوں کے پروگرام میں روٹین کی جو شکایت بڑی دیر سے چلی آرہی ہے وہ بھی ان کیسٹوں کے مواد سے بہ آسانی دور ہو جائے گی۔

انسان کو علم اور معلوم عطا کرنے کا طریق پیغمبروں' ولیوں' رشیوں' منیوں کی Oral Tradition

سے شروع ہوا تھا اور ایک ڈیڑھ صدی کولڈ پرنٹ کی حکمرانی کے بعد پھر سے الیکٹرانک میڈیا کے روپ میں ظاہر ہوا ہے جس نے گفتگو کی روایت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ ابلاغیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ابلاغ کی Oral Tradition صرف ناخواندوں اور بے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہی مفید اور موزوں نہیں بلکہ پڑھے لکھے اور بے حد پڑھے لکھے لوگ اس سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو اور زیادہ پسند کرتے ہیں۔

وقت کی تنگی کے پیش نظر آخر میں مجھے صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ ہمارے لوگ ادب میں جس طرح سے فوجی' گرائیں' جوان' پرلیس اور لام وغیرہ کا مذکور ہے اور جو گہرا تعلق فوجی اور غیر فوجی کے درمیان فوک لٹریچر بولیوں میں موجود ہے وہ رابطہ ہمیں آج کے لٹریچر اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع میں نظر نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جس پر فوری غور کی ضرورت ہے۔ تعلق برسوں میں بنتے ہیں اور رشتے صدیوں میں استوار ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی بے توجہی اور لاتعلقی سے یوں گنوا دینا جیسے ہم گنوا رہے ہیں شاید دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ اس انا کو ترک کرنے کے لیے ہمیں ایک اور زاویہ نگاہ سے اپنے حال کا جائزہ لینا ہوگا۔

مقابلے کے امتحان اور قومی زبان

جناب والا! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر ''مقابلے'' اور Competition کے سخت خلاف ہوں اور اسے نسلِ انسانی کے خلاف ایک مہلک ہتھیار تصور کرتا ہوں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کمپی ٹیشن ہمیشہ انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ انسان بہ مقابلہ پتھر' کھمبا' درخت' مینار' گورخر اور کبک دری وغیرہ نہیں ہوتا بلکہ انسان بہ مقابلہ انسان ہوتا ہے۔ اس میں بازی جیت لینے اور جھنڈی لے جانے والا بڑا محترم ٹھہرتا ہے اور شکست خوردہ گروہ پائمال وخوار و پریشان و دردمند رہ کر بقیہ زندگی بسر کرتا ہے اور ساری عمر مجوب سا رہ کر بالآخر گمنامی کے گہرے غار میں اتر جاتا ہے..... لیکن کمپی ٹیشن اور اس کے اجتماعی اور انفرادی نقصانات پر ہم کسی اگلے سیمینار میں بات کریں گے' اس وقت مسئلہ قومی زبان کا ہے۔

(1) کمپی ٹیشن کے امتحانات ایسے ہر بچوں اور شاہین زادوں کو منتخب کرنے کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں جو آگے چل کر مفلوک الحال' بے عقل' بے نوا اور ہارے ہوئے لوگوں کے غول کو اپنی دانشمندی سے اپنی پسندیدہ روش پر چلا سکیں۔

اگر آپ نے امریکن فلمیں دیکھی ہوں تو آپ کو یہ حقیقت سمجھنے میں ذرا آسانی ہوگی کہ بڑے بڑے Raches پر' موٹی موٹی کیلیوں اور پرانی پرانی شہتیریوں کے چوڑے چوڑے باڑوں میں ممیانے اور بلبلانے والی جو بھیڑیں اور بچھیائیں ہوتی ہیں' ان کے درمیان گھوڑے پر سوار ایک کاؤبوائے ہوتا ہے۔ اس کاؤبوائے کے ہاتھ میں رسے کا ایک پھندا ہوتا ہے جسے وہاں کی مقامی بولی میں Lasso کہتے ہیں۔ یہ کاؤبوائے اس Lasso کو اپنے سر کے اوپر لہرا کر اور گھما کر جس گائے یا جس بچھیا یا جس بھیڑ کے گلے میں وہ پھندا ڈالنا چاہے وہ آسانی سے ڈال سکتا ہے۔ دوسرے سارے جانور اس گھومتے ہوئے رسے کے نیچے تھر تھر کانپتے سارے باڑے میں اس طرح سے بھاگتے ہیں جس طرح زلزلے کی گڑگڑاہٹ سن کر چرند پرند وحوش وطیور درندے اور چوپائے سراسیمگی کے عالم میں افتاں وخیزاں جان بچانے کو پرسکون مقام تلاش کرتے ہیں اور

ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر جان دیتے ہیں۔ ان چرندوں پرندوں اور وحوش وطیور کی موت نما گھبراہٹ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ زلزلے کی بولی اور اس کی گڑگڑاہٹ کی زبان نہیں سمجھتے۔ باڑے کے اندر بھاگ بھاگ کر ہلکان ہونے والی گائیں اور بچھیاؤں کے اوسان بھی اسی وجہ سے خطا ہوتے ہیں کہ وہ کاؤبوائے کی بولی نہیں سمجھتیں۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ ان کی اور کاؤبوائے کی زبان ایک نہیں ہوتی۔ کاؤبوائے کے پاس خوفزدہ کرنے کے لیے کچھ آوازیں ہوتی ہیں جو زلزلے کی گڑگڑاہٹ سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے معصوم غول کانپ کانپ کر باڑے کے اندر گھومتے ہیں اور بہت سے کمزور ان جھڑکیوں اور پناخوں اور Lasso کی گھومتی ہوئی شوکر کے سامنے بے حال ہو کر گرتے ہیں اور پھڑک کر مر جاتے ہیں۔

کمپنی نیشن کا کامیاب افسر کاؤبوائے ہوتا ہے جو اپنے ہنر کی بیخ اپنے پھندے کی شوکر اور اپنی بولی کی نا آشنائی کی وجہ سے اپنے علاقے کے لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی بولی کے مختلف ہونے کی بنا پر من و تو کے درمیان فاصلہ قائم رکھتا ہے اور اسی فرق کی بدولت انتظامی امور حسن اور سلیقے کے ساتھ طے کرتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے گزٹوں میں لکھا ہے کہ اگر حاکم اور محکوم کی بولی ایک ہو جائے تو حاکم اور محکوم ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں۔ جب وہ قریب آ جاتے ہیں تو ان میں بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے تو ڈسپلن قائم نہیں رہتا۔ جب ڈسپلن قائم نہیں رہتا تو کاروبار سلطنت ٹھپ ہو جاتا ہے اور جب کاروبار سلطنت ٹھپ ہو جاتا ہے تو اس سے مخلوق خدا کو تکلیف پہنچتی ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ حاکم اور محکوم افسر اور ماتحت.....اور حکومت اور عوام کے درمیان زبان اور بولی ایک سی نہ ہو۔ ان کے درمیان افہام و تفہیم کی راہیں اتنی واضح اور ایسی آسان نہ ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گلگشتیاں کرتے پھریں اور ان کے درمیان کوئی حد ادب باقی نہ رہے۔

جناب والا! مجھے آپ کے موضوع سے اور موضوع کے عنوان سے ہی بنیادی اختلاف ہے.....مقابلے کے امتحانوں میں اگر قومی زبان کو ذریعہ اظہار رکھا جائے گا تو وہ مقابلے کے امتحان نہیں رہیں گے اور اگر ملک کی ''بہتری اور فلاح'' کے لیے مقابلے بازوں اور افسروں کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو پھر قومی زبان کو ان سے اور ان کو قومی زبان سے کم از کم اتنی دور رکھا جانا چاہیے جتنی دور کلاشنکوف کی گولی مار کرتی ہے۔

(2) اس وقت پاکستان میں دو کلچر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک کلچر رہنماؤں کا' دوسرا پیروؤں کا۔ ایک Leaders کا' دوسرا Lead کا.....رہنماؤں کے گروہ نے بڑی دیر سے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ

اپنے گھر میں پیدا ہونے والے چھوٹے رہنماؤں یعنی رہنمازادوں کو اس کلچر سے دور رکھیں گے جو کلچر پیروؤں کا ہے۔ دوسرے کلچر یعنی رہنماؤں کے کلچر کی مضبوط اساس اس بات پر قائم ہے کہ اس کے اظہار اور اس کے اعلان اور اس کے کلام کے لیے ایک ایسی زبان استعمال کی جائے جس کا پیروؤں کو علم نہ ہو۔ ایک ایسی بولی اختیار کی جائے جس کا علم صرف برہموں کو ہو شودروں کو نہ ہو..... چنانچہ اس رہنمائی کلچر کی توانائی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے شہر میں کل پانچ انگلش میڈیم سکول تھے اور اس وقت 263 انگلش میڈیم سکول ہیں۔

مسئلہ کمیشن کے امتحانوں میں ذریعہ اظہار کی تبدیلی کا نہیں' مسئلہ اس ارادے میں تبدیلی کا ہے جس سے ایسی سوچ پیدا ہوئی ہے۔ پھر یہ سوچ بھی ہماری اپنی پیدا کردہ نہیں ہے..... جب 14 اگست 1947ء کی رات کے بارہ بجے گوری ایسٹ انڈیا کمپنی نے پاکستان کی چابیاں کالی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کیں تو اس نے کہا اچھی' مضبوط' مستحکم اور پائیدار حکومت قائم رکھنے کے لیے ان چند باتوں کا خیال رکھنا:

(1) ایک تو مقامی باشندوں کو زیادہ منہ نہ لگانا اور ان سے بے تکلف نہ ہونا۔

(2) دوسرے پولیس اور پٹواری کے ذریعے رعایا کی گردن میں انگوٹھا دیئے رکھنا۔

(3) تیسرے رومن لا کے مقابلے میں کوئی دوسرا قانون اپنے ملک میں رائج نہ ہونے دینا۔

(4) چوتھے ہمارے والے کلچر کو نیٹوز کے کلچر پر حاوی کر کے رکھنا اور اس کی برتری کا لوہا ہر وقت منواتے رہنا۔

(5) اور پانچویں.....اور یہ سو ہاتھ رسہ اور سرے پر گانٹھ والی بات ہے کہ رعایا کی زبان کو اپنی سرکاری' خزانے کی اور عدالت کی زبان نہ بننے دینا۔ اس سے وہ بے تکلف ہو جائیں گے اور خواہی نخواہی امورِ مملکت کے کاموں میں دخل دینے لگیں گے۔ اور یوں حکومت کی باگ ڈور پر تمہاری گرفت کمزور کر دیں گے۔ ہم تمہاری مدد ضرور چاہیں گے لیکن جسمانی طور پر تم سے بہت دور ہو گئے' اس لیے ہمارے واسطے کافی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ تم ہمارے والی زبان کو ہمارے ہی محاورے میں' ہمارے بنائے فارموں کے اندر ہمارے ہی فارمیٹ کے مطابق چلاتے جانا کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔

گوری ایسٹ انڈیا کمپنی نے کہا ہم نے یہ راز دو سو سال کی ریاضت اور سارے دریاؤں کے تنوں پر تپ کر کے حاصل کیا ہے۔ اس کو ضائع نہ ہونے دینا یہی تمہارے طویل قیام

حکومت کا راز بنے گا اور یہی تمہاری برتری کی وجہ قرار دیا جائے گا۔

اب جب تک کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہو جائے اور اس دنیا میں حق حقدار کی طرف رجوع کرنے کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو اس وقت تک سیمینار کر کے یا مقالے لکھ کر یا محض خواہش کر کے غصب شدہ حق واپس نہیں لیا جا سکتا اور وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی سے۔ توبہ توبہ..... یہ کمپنی بڑی ڈاہڈی ہے..... گوری ہو یا کالی ایسٹ انڈیا کمپنی پھر کمپنی بہادر ہے.....

اردو زبان وادب کی ترقی اور ذخیرہ الفاظ میں پاکستانی زبانوں کا کردار وعمل

جناب والا! گو میں دیئے گئے عنوان کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کروں گا اور اپنے بہت ہی مختصر مضمون میں چند ضروری باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا لیکن اگر کہیں کہیں ضرورت کے تحت مجھے عنوان سے گریز کرنا پڑے تو آپ سے معذرت کے ساتھ ابھی سے اس کا اعلان کر دوں گا۔

اس عنوان سے میری پہلی مراجعت تو یہ ہے کہ پاکستانی زبانوں کے کردار وعمل سے ابھی تک اردو زبان اور ادب میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی اور اردو ادب نے اپنے مزاج کی واضح تبدیلی کے باوصف پاکستان کی علاقائی اور منطقائی زندگی کو' کہ وہ فردی ہو یا گروہی' اپنے وجود کا ایک حصہ نہیں بنایا۔ جس طرح اردو زبان نے خاص طور پر اور نثر نے' اور نثر میں سے بھی اردو فکشن نے مغربی فکشن اور فکشن کے انداز کو اپنے وجود کا عضو نہیں بنالیا ہے۔ اس طرح سے اردو نے پاکستان کی دوسری زبانوں کے ادب اور زبان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا..... میرا مطلب ہے ابھی تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ آگے چل کر اس کی طبیعت میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور اپنے فکر کی کھیتی کو یہ دوسری پاکستانی زبانوں سے سیراب کرنے لگے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا' حالانکہ جغرافیائی قربت کی وجہ سے ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں تھا' لیکن زبانوں کی مرضی اپنی ہوتی ہے۔ یہ انسانوں کی طرح لے پالک بچے اتنی آسانی سے گود نہیں لیتیں گود لینا تو ایک طرف یہ ان پر اپنے گھر کے دروازے بھی بڑی مشکل سے کھولتی ہیں کہ کہیں چور سپاہی کھیلنے میں محلے کے دوسرے بچے ان کے بچوں پر اثر انداز ہو جائیں اور ان کی شرافت طعنوں الہنوں کی زد میں آ جاتے۔ لیکن کچھ منسوب الفاظ ایسے من موہنے ہوتے ہیں کہ اصلوں اور خواصوں کی گود سے ہو کر بیگمات کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر اس خاندان کا ایک فرد بن جاتے ہیں..... ماہرین لسانیات نے اس کی کئی تھیوریاں وضع کی ہیں لیکن حتمی طور پر کوئی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

زبان، دانشمند اور ترقی یافتہ قوموں کو بامِ عروج پر لے جانے والی کمند ہے اور ناسمجھ اور کم ترقی یافتہ گرہوں کے لیے فتنے اور فساد کا باعث ہے..... ہمارا ملک اس اعتبار سے بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ یہاں کے دانشمندی اور ترقی یافتہ گروہ اپنی اپنی زبانوں کو محبت اور یگانگت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تنفر یا کراہت کے لیے نہیں۔ یہی وجہ ہے جس کے کارن ہمارے ملک کی زبانیں اپنے اپنے انداز میں ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں۔ لیکن یہ ترقی ایک محدود انداز کی ہے۔ اور ترقی جب حدوں کے اندر محبوس ہو جائے تو پھر ترقی نہیں رہتی کچھ اور بن جاتی ہے۔

میں ایک ادیب ہونے کے رشتے سے اپنی پرانی بات کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے ملک کے ادب کو مزید صحت مند اور نرداہ (پنجابی) اور سری ہونے کے لیے ہر زبان سے بھر پور استفادہ کرنا ہوگا یہ کلیہ صرف اردو کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ہمارے ملک کی دوسری زبانیں بھی شامل ہیں اور نہیں تو کم از کم Vocabulary یعنی ذخیرہ الفاظ کی حد تک ملک کے سارے باشندوں کو ان الفاظ و معانی سے ضرور روشناس کرانا چاہیے جو ان کی اپنی بولی کی قدیم خلاؤں کو پر کر سکیں۔

میرا مطلب ہے کہ ہماری صوبائی اور علاقائی زبانیں ایک دوسری کے ذخیرہ الفاظ کو اپنا مال سمجھ کر آزادانہ طور پر استعمال کریں اور یہاں کی ہر شے کو اپنی ہی سمجھیں..... ایک زمانے میں اردو میں یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کسی سے اجازت طلب کیے بغیر بے دریغ اپنے استعمال میں لے آتی تھی لیکن اب کئی سال سے اس کی بھی یہ صلاحیت ماند پڑ گئی ہے اور وہ سمیٹنے کے بجائے خود سمٹنے لگی ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو نے اور یہاں کی دوسری زبانوں نے اپنے یہاں انگریزی کے ذخیرہ الفاظ کی دل کھول کر آبادکاری کی ہے اور گفتگو میں تو اپنی زبان کا ڈھانچہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے لیکن یہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ میں انگریزی کے زبردست حامیوں میں سے ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ حفظ مراتب کا بھی زبردست قائل ہوں۔ اپنی ماؤں ماسیوں کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کو آنٹی بنانے کے لیے تیار نہیں۔ میرے پاس میرا اپنا گھر ہے اپنا خاندان ہے اپنا پروار ہے اور میں اس کے ساتھ رہ کر ترقی کر سکتا ہوں اور اسی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہوں۔

معزز خواتین و حضرات! اگر کہیں میں اردو کا ادیب یا صحافی ہوتا تو صوبائی زبانوں سے بغیر پوچھے اردو میں آنے والی کل کے لیے ''صبحانے'' کا لفظ ضرور لے لیتا تاکہ آنے والی کل اور جانے والی کل کے درمیان کوئی جھگڑا نہ رہتا۔

ہمارے پاس سوکھے میوے کے لیے کوئی خاص لفظ نہیں ہے لیکن سوکھے میوے والوں کے پاس پشتو کا ''بکوا'' ہے..... وہ دبلا پتلا شیر کے لک والا کوہستانی بکوا منڈی میں کام کرتا تھا اور روز میرے گھر کے آگے سے گزرتا تھا۔

''سری''انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جب وہ بازی جیت لے۔ فتح مندی حاصل کر لے اور برتری اور برتری کی ترنگ میں ہو..... بیوروکریسی کی سری آ گے اس کی ایک بھی نہ چلی اور وہ اسلام آباد سے خالی ہاتھ واپس لوٹ آیا۔

اسی طرح..... بہادر خان کی موت کے بعد اس کی زندگی کلوچ کی مانند ہو کر رہ گئی۔ بے مصرف اور بے کار۔ نہ کوئی اسے چاہتا تھا نہ کوئی اس پر توجہ دیتا تھا..... کلوچ پشتو زبان میں اس روٹی کو کہتے ہیں جو تنور میں لگاتے ہی گرم دیوار سے چھوٹ کر نیچے جا گرے اور اس پر کوئلے راکھ بھوبل چپٹ جائے اور وہ بدہیئت سی ہو کر اوپر سے جل جائے' اندر سے کچی رہے اور کسی بھی کام نہ آ سکے۔

ہم اردو میں جس کو'' عمارتی لکڑی فراہم کرنے والا درخت'' کہتے ہیں سندھی میں اس درخت کو ''باہن'' کہتے ہیں اور یہ ایک ٹیکنیکل ٹرم کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

بلوچی میں ''دوراجی'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو مقبول عام بنانے کے لیے ہر ایک کا خیر خواہ بنا پھرتا ہو اور ہر حلقے میں پسندیدہ بننے کا خواہش مند ہو۔ مقبول نام کا مقبول تھا اور دوراجی ہونے کی وجہ سے دلوں میں گھر نہ کر سکا تھا۔ اس کی نیت خدمت کی نہیں تھی۔ لوگوں میں ہر دلعزیز ہونے کی تھی۔

''بس یہ اس کا کمال تھا کہ ہر شخص اس کے کمار کی لپیٹ میں آ جاتا اور آرزوؤں کی پینگ میں لمبے جھلارے لینے لگتا۔ محبت کے معاملے میں وہ بڑی پکی تھی۔ صرف نظروں سے پھرنے کا علم جانتی تھی۔

کمار بلوچی زبان میں لفٹ کرانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ محبت کی توجہ دینے کے لیے ا مشرق کی عورتوں نے اپنی زندگیاں دھلیارے کے اندر ہی گزار دیں۔

(دھلیار امویشی کے گلے کا وہ رسہ ہوتا ہے جو اس کی تھوتھنی پر بھی کس کے باندھ دیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ اپنا سر اوپر نہیں اٹھا سکتا۔)

سردار نے کہا کہ دیکھو اس کو اس طرح سے مارو کہ بدن پر لاس نہ پڑے۔ لاس پنجابی میں بدن پر کوڑے یا چھڑی کے نشان کو کہتے ہیں۔

آپ کے ٹی وی نیوز کاسٹر تو بڑی آسانی سے ایسے الفاظ کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ہماری زبانوں میں پہلے سے موجود ہیں اور جن کے لیے موسم کا حال بیان کرنے والے لمبے لمبے فقرے جوڑ کر مفہوم ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً شمالی علاقوں میں مزید برف باری کی توقع ہے۔ برف باری سے پہلے تیز پھاندا اسی طرح سے چلتا رہے گا اور بہت ممکن ہے اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جائے..... اور تیسری دنیا کے سارے ملکوں کو اپنی زندگی کوڈے ہو کر گزارنی پڑتی ہے..... اور یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ویت نام میں امریکہ کی طرح اب روس بھی افغانستان کے کھوبے میں پھنس گیا ہے۔

ڈوزئی: لوری کی ایک قسم ہے جو بچے کو جاگتے میں سنائی جاتی ہے۔ اس سے بچے کو بہلانا مقصود ہوتا

ہے۔ یہ ایک قسم کا مقفٰی بیان ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ کی حرکات کے ساتھ خاص انداز میں کیا جاتا ہے۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی کو انگریزی کی ڈوزئی سنا رہی تھی:

Twinkle, twinkle lillte star

How I wonder what you are

Up above the world so hight

Like a diamond in the sky

ہمارے یہاں صوفی تبسم نے اردو ڈوزئی کی اصلی داغ بیل ڈالی۔ گو ان سے پہلے حفیظ جالندھری بھی بچوں کے لیے کمال کی نظمیں اور گیت لکھ چکے تھے۔

''سکستھ سینس'' کے لیے ہمارے پاس ایک ہی لفظ ہے اور وہ ہے تر بھاؤ۔ یہ کشف سے نیچے اور دانش سے اوپر کی بات ہے: جس طرح کھوجی اپنے تر بھاؤ سے رسہ گیر کا راستہ معلوم کر لیتے ہیں' اسی طرح عورتیں بھی تر بھاؤ کے زور پر اپنے خاوندوں کا رخ اور ان کی میلان طبع معلوم کر لیتی ہیں۔

خواتین وحضرات! میں کوئی شاعر ادیب یا سکالر نہیں ہوں کہ اس موضوع پر آپ کے برابر چل سکوں۔ میں تو ایک متجسس سا طالب علم ہوں اور تجسس کے زور پر بہت سے موضوعات کو ادھر ادھر سے ٹھونکتا رہتا ہوں۔ اپنی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ سے لطف اندوز ہوتے وقت یہ چند الفاظ تھے جو مجھے یاد رہ گئے اور جن کا میں نے سرسری طور پر آپ کے سامنے ذکر کر دیا۔ ان کے تلفظ کے لیے اور ان کے مخرج کی صحیح ادائیگی نہ کر سکنے کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں جب یہ الفاظ ہماری دوسری زبانوں کا یا اردو کا حصہ بنیں گے تو ان کا تلفظ مختلف ہوگا اور کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ میرا اب تھا۔

اس وقت جس طرح سے انگریزی زبان' خاص طور پر امریکی انگریزی' غیر زبانوں کے الفاظ اور غیر انگریزی معاشرتوں کے اسلوب اپنے اندر کھینچ رہی ہے اگر اردو بھی اپنے ملک کی دوسری زبانوں سے فوری استفادہ کرے تو یہ ایک بہت ہی موثر اور مفید زبان بن کر ابلاغ کے بہت سے مسائل حل کر سکتی ہے اور یوں اپنے لٹریچر کو ان پڑھ عوام کے لیے بھی مفید بنا سکتی ہے جو چوپالوں اور حجروں میں بیٹھ کر صرف Oral Tratdition کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں۔

جناب والا! جس طرح میں نے اپنی بات کے شروع میں عرض کیا تھا کہ ابھی تک اردو زبان وادب نے پاکستان کی دوسری زبانوں سے استفادہ نہیں کیا' اس طرح میں یہ بات آخر میں پھر دہراتا ہوں کہ ماسوائے ابلاغ کی زبان کے جس نے علاقائی اور منطقائی زبانوں کے الفاظ اور لہجہ کو بڑے سجاؤ کے ساتھ اپنے صحن خانہ میں جگہ دی ہے اور کہیں اس کے آثار کم ہی نظر آتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں بالخصوص اور اخبار کے کالموں میں بالعموم آپ کو قصر اردو کے دالانوں میں علاقائی پچی کاری کے کچھ نمونے ضرور مل

جائیں گے لیکن وہ بھی اتنے زیادہ نہیں کہ ہم ان پر انحصار کر کے یہ کہہ سکیں کہ ہماری اردو میں علاقائی زبانوں کے پانیوں کا عمل جاری ہے اور اس زبان کے دھارے کا رنگ بتدریج تبدیل ہو رہا ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی بدولی بھی نہیں کہ ہماری زبانوں میں پہلے کے مقابلے میں تفاوت پیدا ہو گئی ہو..... آپ کو یہ سن کر حیرانی بھی ہوگی' خوشی بھی ہوگی اور پھر آخر میں دکھ بھی کہ پاکستان کی زبانیں کروٹیں بدل بدل کر اور اپنی گزرگاہوں میں تبدیلیاں پیدا کر کے ایک دوسری کے قریب آ رہی ہیں۔ کچھ تجارتی اغراض کی وجہ سے' کچھ باہمی نقل مکانی کی بنا پر' کچھ کیسٹوں' گیتوں' عرسوں' فقیروں کے زور پر اور کچھ غیر ملکوں میں یکجا محنت مزدوری کی بنا پر.....لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ جہاں زبانیں اپنے نیچرل کورس پر ایک دوسری کے قریب آ رہی ہیں وہاں ایک ہی خطے اور ایک کی جغرافیائی ماحول میں رہنے والے انسان ایک دوسرے سے ٹوٹنے اور ایک دوسرے سے الگ ہونے کے لیے ہر طرح کے اَن نیچرل کورس اختیار کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی ادیبوں اور زبان دانوں کی توجہ کا مستحق ہے اور اس میں بھی اپنی اپنی زبان میں بہت کچھ سوچا' سمجھا اور لکھا جا سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان چینی زبان ہے۔ کیونکہ اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی ہے جسے دنیا کی دس فیصد آبادی بولتی ہے اور جسے دنیا کی بتیس مختلف قومیں کہ جن کی یہ قومی بولی نہیں ہے' سمجھتی بھی ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ تیسری دنیا کے بہت سے ملک جن میں بہت سے گروہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی سالمیت اور یکجہتی کی بنیاد بھی انگریزی زبان پر ہی قائم ہے لیکن ایسی ہر دلعزیزی کے باوجود کینیڈا کے فرانسیسی نژاد لوگ اور اٹلی کے باشندے نہ صرف انگریزی بولنے سے اجتناب کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بہت سوں کو اگر یہ زبان آتی بھی ہو تو بھی جان بوجھ کر اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

لیکن معزز حاضرین دنیا اس تیزی سے سمٹ رہی ہے کہ بہت جلد یہ کرۂ ارض آپ کے پائیں باغ میں منتقل ہونے والا ہے۔ اس وقت آپ کے صحن خانہ میں جب اتنے سارے لوگوں کو آپس میں ہم کلام ہونے کی ضرورت پڑے گی تو وہ کون سی زبان کا سہارا لیں گے۔ اس پر دانش مند لوگوں نے بہت پہلے غور کر کے بین الاقوامی رابطے کی ایک زبان ایجاد کی اور اس کا نام ''اسپرانتو'' رکھا۔ یہ بہت ہی کمال کی زبان ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ سیکھی جا سکتی ہے لیکن مصنوعی ہونے کے ناتے یہ ایک ایسی کمزور زبان ہے جس کی صحت شروع ہی سے کمزور رہی اور پورے سو سال گزر جانے کے بعد اس کے صرف ایک لاکھ جاننے والے پیدا ہو سکے ہیں۔

لیکن جوں جوں دنیا میں باہمی تعلقات بہتر ہوں گے اور لوگ ایک دوسرے سے قریبی ربط پیدا کرنا چاہیں گے.....(صرف پڑھے لکھے دانشور' تاجر' کھلاڑی اور سائنس دان ہی نہیں).....بلکہ عام لوگ: اللہ دیئے' اللہ دتے اور اللہ ڈوائے بھی ربط باہمی اور ''گل بات'' کے خواہش مند ہوں گے تو ایک ''دھرت بولی'' یا

Linguaterra ضرور پیدا ہو کر رہے گی۔ میرا خیال ہے انگریزی کا اس میں کافی بڑا حصہ ہوگا لیکن دوسری زبانوں کے الفاظ محاورے مثالیں اور گرامر بھی اس کی بنیاد میں شامل ہوگی۔

دنیا کے سارے باشندوں کو اپنی اپنی بولیوں کے علاوہ اسے بھی سیکھنا پڑے گا اور کسی شخص کو کسی خاص خطہ زمین یا خاص ملک یا خاص لہجے یا خاص ٹکسال کا ہونے کی بنا پر فوقیت نہیں ہوگی.....اور محض ایک زبان کی وجہ سے انسانیت کے کنبے میں ایسی محبت اور یگانگت پیدا ہو جائے گی جو آج تک لاکھوں ہزاروں وعظوں خطبوں ناصحانہ تقریروں اور بھگتوں صوفیوں کی عرض گزارشوں سے بھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ خواتین و حضرات! یہ ایک توجہ طلب موضوع ہے۔ جس پر آپ ہی مل ملا کر اور آپس میں سر جوڑ کر کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے تو اس وقت ایک Lay Man کی سی بات کی ہے۔ مسئلے کی تہہ تک پہنچنا تو آپ لوگوں کا منصب ہے۔

اس وقت میں نے پاکستان میں بولی جانے والی تقریباً ایک سو بائیس زبانوں میں سے چند ایک کے ذخیرۂ الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ اگلی مرتبہ پھر ملاقات ہوگی تو کھوار بلتی شنا بروشسکی اور گوجری کے قیمتی ذخیروں کا بھی ذکر کروں گا۔ میرا ایمان ہے کہ Communication کے عام ہونے اور ابلاغ کے واضح ہونے سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں ان کے درمیان ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کا مستقبل سا جھا ہو جاتا ہے اور ان کے دکھ اور خوشیاں ایک ہی تار میں پروئے جاتے ہیں۔

رسم الخط

پاکستان دنیا کا وہ واحد خوش قسمت ملک ہے جس کا ہر باشندہ (پڑھا لکھا یا بے پڑھا) ہر سوال کا جواب جانتا ہے اور ہر صورت حال سے اچھی طرح سے باخبر ہے۔ آپ کسی بھی احوال واقعی کے بارے میں کسی بھی پاکستانی سے کوئی سا بھی سوال کر لیجیے وہ آپ کو اس کا فوری اور حتمی جواب نکال کر آپ کے ہاتھ میں دے دے گا اور توقع کرے گا کہ آپ اس نتیجے کو صحیح اور آخری تسلیم کریں کیونکہ خود اس نے اس نتیجے کو صحیح اور آخری مانا ہوا ہے۔ گاڑی کے نچلے درجے کے سفر سے لے کر درسگاہی ایکسلانس کے سیمیناروں تک آپ کو اس رویے کے مظاہر عام ملیں گے اور آپ کو خوشی ہوگی کہ کم از کم دنیا میں ایک ملک تو ایسا ہے جہاں کوئی بھی شخص یہ کہتا نہیں ملتا کہ "مجھے افسوس ہے اس موضوع کے بارے میں میں کچھ زیادہ نہیں جانتا' کیونکہ یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ البتہ آپ کا سوال بے توجہ طلب۔ میں اسے کسی متعلقہ ماہر کی خدمت میں پیش کروں گا اور اس سے معلومات حاصل کر کے آپ کو عرض کر دوں گا۔"

ہمارے یہاں جب نسخ (عربی رسم الخط) کو سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی کا ذریعہ بنایا گیا اور تمام درسی کتابیں اس رسم الخط میں شائع کی گئیں تو اردو والوں اور اردو جاننے والوں کو حسب عادت یہ بات بہت گراں گزری کہ یہ سب کچھ نستعلیق کے معتبر وجود اور نستعلیق کی پر وقار شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے کیا گیا ہے کیونکہ نسخ کی ترویج سے اردو زبان ان پاپولر ہوگی اور اردو دشمنوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا' اس لیے نسخ کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے دکن کے حضور نظام بھی ایک ایسی ہی سازش کر چکے ہیں اور انہیں ہم نے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا' اس لیے ایک بار پھر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کوشش کو بھی ہم مملکت خداداد میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

اصل میں نسخ کو (لوہے کے چھاپے کو) رائج کرنے کی تین بڑی وجہیں اور تین بڑی ضرورتیں تھیں:

(1) اردو اپنی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے دوسری پاکستانی زبانوں کے رسم الخط سے قریب تر ہو

جائے اوران زبانوں کے خانوادے میں اردو کی شکل و شباہت اپنے ارکان خانہ جیسی رہے اور وہ ان کے درمیانہ بیگانہ نظر نہ آئے۔

(2) اردو اپنے رسم الخط کے اعتبار سے عرب ممالک اور دنیائے اسلام کے لیے ایک مانوس زبان ٹھہرے اور حروف کی شناخت زبان کی آموزش کے طویل اور پیچیدہ مرحلے میں داخل نہ ہو۔ (جس طرح ایک انگریزی جاننے والے کے لیے جرمن' فرانسیسی' اطالوی یا ہسپانوی نامانوس رسم الخط نہیں ہے لیکن روسی رسم الخط بالکل اجنبی ہے' اسی طرح عربی جاننے والوں کے لیے اردو نامانوس رسم الخط نہ رہے۔)

(3) اس وقت انسان کمپیوٹر کی دنیا میں داخل ہو رہا تھا اور ہمارا تقاضا یہ تھا کہ عربی کے ساتھ ساتھ اردو کمپیوٹر بھی تیار ہو جائے جس کی قیمت چند ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ لوگوں کو ذاتی کمپیوٹر خریدنے کی آسانی ہو اور طالبعلم اسے اسی طرح استعمال کر سکیں جس طرح پہلے وہ جیومیٹری بکس اور بعد میں کیلکولیٹر استعمال کرتے آئے ہیں' چنانچہ آرزو تھی کہ عربی کے کمپیوٹروں میں چند کلیدوں کا اضافہ کر کے انہیں اردو کمپیوٹر کے تقاضوں کے مطابق بنالیا جائے۔

(4) اور چوتھی اور سب سے اہم بات ''نسخ'' اختیار کرنے میں یہ مضمر تھی کہ اس سے ہمارے ملک کی شرح خواندگی ایک دم سے دوگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی.....ہمارے گاؤں' دیہوں' قصبوں اور گوٹھوں میں ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ قرآن ناظرہ پڑھے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اردو کی چند آوازیں نے ڈھے کھے گھے وغیرہ سمجھا کر اوران کی نشانیاں بتلا کر آن واحد میں اردو خواں بنایا جا سکتا تھا۔ ایسے خواندہ لوگ اور نہیں تو شہر آ کر سڑکوں کے نام اور دکانوں کے سائن بورڈ آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ عام اعلان اور ضروری نوٹس بھی اٹھا لیتے اور آہستہ آہستہ ان میں سے کئی اخبار بینی کی طرف بھی مائل ہو جاتے لیکن ایسے نہ ہو سکا۔ شاید ہم لاشعوری طور پر یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ ہماری طرح سے کوئی اور بھی لکھنا پڑھنا سیکھ جائے۔ جلد سیکھ جائے اور آسانی سے سیکھ جائے۔

چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ نسخ کی پڑھائی کو سکولوں کالجوں سے نکال دیا گیا اور اس کی جگہ پھر وہی پرانا نولکشوری رسم الخط رائج کر دیا گیا۔ دلیل اس کے جواز میں یہ دی گئی کہ چونکہ اس رسم الخط کو اختیار کرنے میں بچوں کی لکھائی میں بدخطی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے' اس لیے اس رسم الخط کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ایک ذرا سے واہمے کی بنیاد پر اتنے خوش آیند کام کو ترک کر دیا گیا لیکن بات محض واہمے کی ہی نہیں تھی' اس سے کاروباری لوگوں کا مفاد بھی وابستہ تھا۔

کاروباری لوگ بڑے اچھے' شفیق' بے ضرر اور مسکراتے سے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کبھی جھگڑا نہیں

کرتے' لڑائی مول نہیں لیتے برا بھلا نہیں کہتے' بس پیچھے سے مین سوئچ آف کر دیتے ہیں' چونکہ ان کی تربیت شروع ہی اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ اپنے ذاتی' عارضی اور موجود نفع کی خاطر مستقبل کے بڑے اور اجتماعی نفع کو قربان کر دیا جائے' اس لیے وہ اپنی تربیت کے ہاتھوں بے بس ہوتے ہیں' ورنہ ان میں وہ ساری خوبیاں موجود ہوتی ہیں جو متین' وضعدار' مرنجاں مرنج اشراف کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان نستعلیق غرض مندوں نے اردو عربی کی لسانی شباہت ختم کر کے پاکستان کو دنیائے اسلام سے کافی دور کھڑا کر دیا۔

رہی بات نسخ کی لکھائی کی تو اس کا ایک سیدھا سادا طے شدہ فارمولا ہے کہ چھاپہ نسخ میں ہوگا اور ہاتھ کی لکھائی شکستہ تحریر میں ہوگی۔ کششوں والی تعلیق کے قریب' جس طرح انگریزی کا چھاپہ (ملاحظہ فرمائیے ڈان' نیشن' پاکستان ٹائمز' ٹائم میگزین' نیوز ویک) مختلف ہوتا ہے اور ہاتھ کی تحریر ایک اور قسم کی ہوتی ہے (ملاحظہ فرمائیے سرکاری مسل' ہائی کورٹ کے دستی نوٹ' محبوب کے نام انگریزی میں لکھا ہوا دستی رقعہ' آٹوگراف پر دی گئی انگریزی تحریر) اسی طرح نسخ کی چھپائی ہاتھ کی تحریر سے مختلف ہوگی۔ ٹائپ میں چھپا ہوا Yours Faithfully اور طرح کا ہوتا ہے اور ہاتھ سے لکھا ہوا Yours faithfully ایک دوسرے انداز کا ہوتا ہے۔ یہی بات نسخ (اردو کا لوہے کا چھاپہ) چاہتا ہے کہ میں چھپوں تو انگریزی کے چھاپے کے انداز میں اور لکھا جاؤں تو انگریزی کی دستی تحریر کے چلن میں لیکن ہمارے یہاں ایسا نہ ہوسکا کیونکہ یہاں ہر شخص ہر صورتحال کے بارے میں دوسرے سے بہتر جانتا ہے اور ''بہتر جاننے والوں'' کی تعداد اور آواز ہمارے یہاں ماہرین پر ہمیشہ بھاری ہوتی ہے۔

لیکن اب شاید نسخ کی طرف لوٹنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کی راہ میں ملکی اور غیر ملکی بڑے بڑے منافعے حائل ہو چکے ہیں اور ان کو عبور کرنا یا ان کے نیچے سرنگ لگا کر منزل تک پہنچنا ایک ناممکن الحصول مرحلہ بن گیا ہے۔

اردو کے موجودہ خوبصورت' خوش نما' خود آرا' اور الگ تھلگ ''نستعلیق'' کے قائم رہنے کی صورت میں اردو اور پاکستانی زبانیں اپنے مطالب' مفاہیم اور مزاج میں قریب تر ہونے کے باوصف صوری طور پر ایک دوسری سے الگ الگ ہی رہیں گی اور ان کے درمیان مضمون ایک ہونے کے باوجود فاصلے بڑھتے رہیں گے۔

دنیائے عرب کے لوگ اردو میں نسخ کو اپنا ہی رسم الخط جان کر اس کی طرف یگانگت سے متوجہ ہو سکتے تھے لیکن اب یوں نہیں ہوگا..... نستعلیق کی موجودگی سے اردو کی نالکشوری حیثیت میں اضافہ نہ ہوگا لیکن اس کے الازہری ناتے میں بڑا بعد پیدا ہو جائے گا۔

پھر..... نستعلیق کے ہوتے ہوئے قرآن ناظرہ پڑھے لوگ اس وقت تک خواندہ نہیں کہلا سکیں گے جب تک کہ وہ نستعلیق کا رسم الخط نہ سیکھ لیں اور اس کی باقاعدہ آموزش نہ کر لیں۔

مگر یہ سب کچھ کہہ گزرنے کے بعد جب میں اپنے خیالات کا جائزہ لیتا ہوں تو ان میں بھی قطعیت

کا کلف محسوس کرتا ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی طور پر چھان پھٹک کر تجزیہ کیا جائے کہ مستقبل کے تقاضوں کے پیشِ نظر ہمیں دونوں میں سے کون سا رسم الخط اختیار کرنا چاہیے اور کس میں ہمارا فائدہ ہے..... یہ جمہوری عہد ہے اور اس میں فائدے کی راہیں تلاش کر چکنے کے بعد بھی اعلان کیا جا سکتا ہے کہ ہم انہیں اختیار نہیں کریں گے۔ لیکن نفع بخش راہوں کو تلاش کیا جانا اجتماعی بقا کے لیے از بس ضروری ہے۔ دیکھئے ناں' ہم ملکی فلاح اور اجتماعی منفعت کے لیے کالا باغ ڈیم کی ضرورت اور اہمیت کو اچھی طرح سے سمجھ چکے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ ہم اسے بنائیں گے نہیں۔ اسی طرح رسم الخط کے معاملے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فائدہ تو نسخ میں ہے لیکن ہم اسے اپنائیں گے نہیں۔

عالمی اردو کانفرنس ملتان (اردو میں سائنسی تعلیم)

یہ مضمون میں آپ کی خدمت میں ایک پبلشر کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جہاں فضل و دانش کا ذکر تو نہ ہوگا البتہ ایسی عملی اشارت ضرور میسر ہوگی جس سے آپ اب تک ناآشنا رہے ہیں۔ یہاں میں ان عملی مشکلات کا ذکر کروں گا جو ایک ایسے ناشر کی راہ میں حائل ہوئی ہیں جس نے اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر اب تک سب سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔

اردو میں سائنس کی کتابیں تیار کرنے اور تیار کروانے میں سب سے بڑی مشکل اس بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہم سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے کہ سائنس کی تعلیم انگریزی زبان کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں بالعموم اور اردو میں بالخصوص دی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک عام پڑھا لکھا آدمی بڑی ایمانداری کے ساتھ گھر کے اندر اور گھر سے باہر ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ انگریزی زبان ہی تانبے کی وہ موصل ہے جس سے سائنس کا کرنٹ دور تک پہنچ سکتا ہے۔ اس عام پڑھے لکھے سے میری مراد بی اے پاس اور کبھی کبھی ایم اے اور ایم ایس سی پاس نیک دل سرکاری افسر' بافراغت سیاستدان' کامیاب تاجر اور بے فکر بچہ جاگیردار سے ہے جو اپنی سوچ میں سو فیصد مخلص اور اپنے مشاہدے میں پوری طرح سے دیانت دار ہے۔

51ء میں جب میں پہلی مرتبہ اٹلی پہنچا اور روم یونیورسٹی میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہاں سائنس جیسے ضروری مضامین بھی اطالوی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور روم یونیورسٹی کے سائنس کے استادوں کو سوائے اطالوی کے اور کوئی زبان نہ آتی تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی مہینے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ گئی کہ چونکہ اس ملک میں سائنس اطالوی زبان میں پڑھائی جاتی ہے اسی وجہ سے یہاں کی فیئٹ گاڑی کا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔ اگر کہیں یہاں بھی سائنس کی تعلیم انگریزی یا امریکی زبان میں ہوتی تو یہاں کی گاڑی بھی Six seater یا ویگن نما ہوتی.....

آج سے چند سال قبل ہمارے ساہیوال کے ایک ڈپٹی کمشنر کو یہ سن کر بہت ہی حیرت ہوئی کہ جرمنی

میں سائنس جیسا مضمون بھی جرمنی زبان میں پڑھایا جاتا ہے حالانکہ جرمن لوگ کافی دلیر اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کے نائب تحصیلدار نے بڑے ادب سے کہا' سرکار اسی وجہ سے تو جرمن جنگ ہار گیا۔ اگر اس نے سائنس کا علم سائنس کی اصل زبان میں پڑھا ہوتا تو کبھی بھی شکست نہ کھاتا اور اس وقت ساری دنیا پر راج کر رہا ہوتا.....

پچھلے سال جب ہم کوپن ہیگن میں تھے تو ہم نے ڈنمارک کی چیز (پنیر) حریص بچوں کی طرح کھانی شروع کیں اور اپنے سات روزہ قیام میں چیز کی مختلف اقسام کے ساتھ ہی سوکھی روٹی کھاتے رہے۔ بانو قدسیہ کے لیے ڈینش ادیب دور دور سے "چیز" کے تحفے لے کر آتے رہے اور اپنے خلوص کا اظہار کرتے رہے۔ کوپن ہیگن میں بانو کی عید ہوگئی اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ڈنمارک سے بڑھ کر مزیدار پنیر دنیا کا کوئی اور ملک بنا ہی نہیں سکتا۔ اسی شوق میں انہوں نے ڈنمارک کی چیز فیکٹری دیکھنے کا ارادہ کیا تو مقامی ادیبوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ' منٹوں سیکنڈوں میں چیز فیکٹری پہنچا دیا۔ بڑی بڑی مشینیں اونچے اونچے کولڈ سٹور' تیز تیز کمپریسروں کی گھر گھر چک چک آوازیں اور لیبارٹری میں ممل کیمیائی کے ماہر مرد عورتوں کے اجتماع نے بانو قدسیہ کو کچھ پریشان سا کر دیا۔ دوران گفتگو جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اتنے سارے کیسٹ اور ٹیکنالوجسٹ انگریزی بالکل نہیں جانتے تو انہوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ میں بھی حیران تھی کہ ڈینش چیز سے کھٹی کھٹی سی بو کیوں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اردو میں سائنس کی کتابیں تیار کرنے اور تیار کروانے میں سب سے بڑی مشکل اس بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہم سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے کہ انگریزی کے علاوہ سائنس کی تعلیم دنیا کی کسی اور زبان میں دی ہی نہیں جاسکتی۔ اس نظریے کے برعکس جو اصحاب سائنس کے علوم کو ملکی یا قومی زبان میں منتقل کرنے کے حق میں ہیں' ان کا رویہ بھی بڑا غیر سائنسی' بے حد جذباتی اور کافی حد تک شاعرانہ ہے۔ وہ بجائے اپنے عمل سے قائل کرنے کے لفظی بحث میں الجھ کر قائل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور جس کام کو اب تک بہت آگے پہنچ جانا چاہیے تھا' وہ ابھی تک اپنی ابتدائی منازل کی الجھنوں میں گرفتار چلا آتا ہے۔ یہ حضرات اس سیدھے سادھے بزرگ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا خیال ہے کہ اونٹ کی کوہان پر پلستر باندھنے سے اس کی کمر کا قب دور ہوسکتا ہے۔ کاش یہ یقین والے لوگ انجمن آرائی کے بجائے سائنسی کتابوں اور مسودوں کی تیاری پر زیادہ توجہ دے کر نئے نئے علوم سے اردو کو اور اردو جاننے والوں کو آشنا کر سکتے۔ لیکن ایسے ہو نہیں رہا کہ اس کی بھی بہت سی وجہیں ہیں۔

اردو میں سائنسی اور فنی کتابیں لکھنے والے مناسب اصطلاحات کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی رکے ہوئے ہیں لیکن یہ ایسے ہی ہے جیسے گھر کا دروازہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے کوئی اپنا قد بڑھانا روک دے۔ یہ عذر اپنی جگہ پر کسی حد تک جائز بھی تھا لیکن اب ہم نے دو ہزار صفحات پر مشتمل تین حدوں میں "لغات اصطلاحات" شائع کر دی ہے جو یکم جنوری کے بعد دوپہر لاہور کے کتب فروشوں کے پاس اور سات جنوری تک دوسرے

بڑے شہروں کے کتب خانوں میں پہنچ جائے گی۔

پہلی ایک عام سیدھی سادی سامنے کی وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اردو میں چونکہ سائنس کی مخصوص Technical Terms موجود نہیں ہیں اس لیے اس زبان میں سائنسی مواد فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حد تک یہ وجہ معقول، منطقی اور جائز نظر آتی ہے اور ایک عام پڑھے لکھے انسان کو متاثر کرنے کے لیے بظاہر کافی مضبوط دکھائی دیتی ہے مگر حقیقت میں یوں نہیں ہے۔ جو لوگ سائنسی موضوعات پر اردو میں لکھتے ہیں وہ اپنی تحریر میں بلا تکلف اردو کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور ان کے آگے قارئین کی آسانی کے لیے ان کے انگریزی مترادفات بھی درج کرتے جاتے ہیں۔ چھاپتے وقت ہم نے بھی اس چلن کا خاص خیال رکھا لیکن نکتہ چینیوں نے اس پر بھی یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ جب انگریزی کی ایک طے شدہ اصطلاح اپنے صحیح تک سک کے ساتھ دنیا کے ہر گوشے میں انجمن آراء ہے تو اردو میں اس کا ترجمہ کیا جانا کیا ضرور ہے؟ وہی ٹرم اردو رسم الخط میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے اور ہر کوئی اسے آسانی کے ساتھ اٹھا سکتا ہے۔ جب سٹیشن ریڈیو، موٹر، ٹیلی ویژن، ڈیپ فریزر، ٹریفک، یونٹ، ہسپتال جیسے ہزار ہا الفاظ ہمارے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن چکے ہیں تو انگریزی کی سائنسی اصطلاحات کیوں نہیں بن سکتیں۔ بات معقول تھی اور تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا سو کر لیا گیا لیکن یہ دعویٰ جب لیبارٹری کے اندر لے جایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ صاحبان قال کا دعویٰ ہے جنہیں حقیقت حال سے آگاہی نہیں۔

دیکھئے! لفظ کرسٹل تو آسانی سے اردو میں لکھا جا سکتا ہے اس کی املا بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ دیکھنے میں بھی خوبصورت نظر آتا ہے لیکن جب اس کی کرسٹلائزیشن ہوتی ہے اور آگے چل کر جب اس کو کرسٹلی فیکیشن کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے تو اس کی شکل وصورت میں سو سو بل پڑنے لگتے ہیں پھر جب اردو میں Crystalloluminiscence لکھنا پڑتا ہے تو ہر صاحب نظر رک کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ہمارے کاتب کو ایک مسودے میں چار بار یہ لفظ اردو املا میں لکھنا پڑا تو وہ مسودہ واپس کر گیا اور دو گولی ایسپرو گرم چائے کے ساتھ لے کر گہری نیند سو گیا..... تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ جو لوگ سائنسی اصطلاحات کو من وعن اردو میں لے لینے پر اصرار کرتے ہیں وہ نہ سائنس سے واقف ہیں نہ اصول اصطلاحات سے اور نہ اردو زبان سے۔

اس کے بعد ایک گروہ ان معزز لوگوں کا ہے جو سائنسی اصطلاحات کے اردو ترجموں پر نہ صرف ہنستے ہیں بلکہ سائنس اور اردو کے عبرتناک انجام کی خبر ایک ساتھ دیتے ہیں۔ ان حضرات نے انگریزی سائنسی اصطلاحات کے اردو ترجموں کو دیکھا پرکھا تو نہیں ہوتا لیکن ایک مثال کا سانٹا پکڑ کر عامتہ الناس کو خواب خرگوش سے جگانے کا فریضہ سرانجام دیا کرتے ہیں۔ انہیں اردو اصطلاحات کے کئی لاکھ ترجموں میں سے صرف دو کے نام یاد ہوتے ہیں۔ ایک آلہ مکبر الصوت دوسرا مقیاس الحرارت۔ اس کے بعد ان کی ہر طرح کی دلیل خاتمے کو

پہنچتی ہے۔

جب ہم نے تین جلدوں میں سائنسی فرہنگ اصطلاحات شائع کی تو اس حلقے میں ہاہا کار مچ گئی کہ اردو اصطلاحات انگریزی اصطلاحات سے بھی مشکل، پیچیدہ اور دقیق ہیں اور ان کو تحریر اور تقریر کی زبان میں کھپانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ تقریباً سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ آسان ترین انگریزی اصطلاحات کو چھوڑ کر خواہ مخواہ عربی، فارسی زدہ اصطلاحات کو اپنانے کا ڈول ڈالا گیا ہے، جو ہم کسی بھی صورت میں قبول کرنے پر تیار نہیں.....

معترضین نے کہا کہ "برقی مقناؤ" کیسا بے ہنگم، بے معنی اور بھاری بھرکم لفظ ہے جس کی ادائیگی بچے تو ایک طرف بڑے بھی آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے جبکہ اس کے مقابلے میں انگریزی کا کیسا آسان، سادہ، عام فہم اور ہلکا پھلکا لفظ Electromagnetisation موجود ہے.....ایک صاحب نے فون کیا کہ آپ نے Monomerosomatous کا کیا جناتی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے کہا، ڈکشنری اس وقت سامنے موجود نہیں، اس لیے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا، میں خود عرض کیے دیتا ہوں۔ آپ کی ڈکشنری میرے ہاتھ میں ہے اور میں تین روز سے اپنا خون کھولائے بیٹھا ہوں۔ آپ نے Monomerosomatous کا اردو ترجمہ "یک جزی" کیا ہے۔ اب بتایئے یک جزی کبھی سائنٹفک ٹرم بن سکتی ہے! میں نے کہا، سر کیوں نہیں۔ فرمانے لگے، اس قدر سادہ آسان اور بازاری ٹرم جس کا مطلب ایک جلد ساز بھی سمجھتا ہو کبھی سائنٹفک ٹرم نہیں بن سکتی۔ سائنس ایک معزز اور معتبر علم ہے۔ آپ دو دو ٹکے کے ڈرامے لکھنے والے اس کی ہیئت اور اس کے تبحر کو کیا سمجھیں۔ "یک جزی" جیسی لاغر ٹرم نکال کر اس کی جگہ کوئی سائنسی ٹرم لائیں ورنہ چھوڑ دیں یہ کام اور استعفیٰ دے کر گھر تشریف لے جائیں۔ پہلے ہی ہم نے آپ کو بڑے سال برداشت کیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ عرض کرتا انہوں نے فون بند کر دیا۔

ابھی چند روز پیشتر ایک صاحب دفتر تشریف لائے اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں کہنے لگے، اشفاق صاحب یہ جو آپ نے Metamorphosis کا ترجمہ "کایا بدلی" کیا ہے تو کس قدر الجھانے والا اور غیر مانوس سا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ اس کی جگہ Metamorphosis ہی رہنے دیا جاتا۔ میں نے کہا، Metamorphosis کی املا اردو میں ذرا مشکل سی ہو جاتی اور کچھ غیر مانوس سی نظر آتی۔ بولے بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میم سے مے/ ٹ الف نامیٹا اور میم واؤ رے۔ مور۔ اور فسز = ف سین زززز......ز......

میں نے کہا، سر اردو تحریر میں لکھا ہوا اچھا نہ لگتا۔ کہنے لگا، واہ ایسا آسان اور خوبصورت لفظ اردو میں اچھا نہ لگے۔ آپ کمال کرتے ہیں۔ اردو کو Enrich کیجیے۔ اردو کا دامن وسیع کیجیے۔ اس میں Metamorphosis جیسے الفاظ.....لایئے لایئے.....آپ کی اردو کو اس کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا، سر! آپ کا تعلق سائنس سے ہے یا لٹریچر سے۔ کہنے لگے، میرا تعلق ان دونوں میں

سے کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ میں تو کھاریاں میں ٹھیکے دار ہوں۔ میں نے آٹھویں جماعت میں پڑھائی چھوڑ کر ٹھیکیداری شروع کر دی تھی۔ ان دنوں کھاریاں چھاؤنی بن رہی تھی۔ اب بڑا خدا کا فضل ہے۔ آپ رکیں ناں کبھی اسلام آباد جاتے ہوئے اور Metamorphosis کا لفظ ضرور اردو میں داخل کر کے آئیں۔ مجھے تو یہ لفظ بہت ہی اچھا لگا۔ اردو کو وسیع کیجیے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیجیے۔ املا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس میں تبدیلی کر کے انگریزی کے اچھے اچھے اور موٹے موٹے الفاظ اردو میں ضرور داخل کیجیے۔ آپ کی اردو کو اس کی ضرورت ہے۔

اس طویل تمہید سے میرا مقصد آپ کو اس حقیقت کے قریب تر لانا ہے کہ سائنس کی تعلیم' مذہبی اخلاقی معاشرتی اور جغرافیائی تعلیم کی طرح اپنی زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔ کسی دوسری زبان میں نہیں۔ کسی اور زبان کے ذریعے فراہم کی ہوئی سائنسی تعلیم سائنس پڑھانے کے تو کام آ سکتی ہے سائنس پھیلانے' سائنسی عمل عام کرنے میں مدد نہیں دے سکتی۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ پچھلے پینتالیس چھیالیس برس میں ہم سائنس کے بہترین استاد اور پروفیسر تو پیدا کر سکے ہیں لیکن سائنس دان اور اعلیٰ ٹیکنالوجسٹ پیدا نہیں کر سکے۔ ہمارے یہاں سائنس کے بہت سے استادوں نے بڑے بڑے پیچیدہ علوم میں ڈاکٹریٹ تو حاصل کیے ہیں لیکن اس سے ان کے ملک کو یا ان کی رقوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ اصل میں سائنس دان اور ٹیکنالوجسٹ جب تک لیبارٹری اور معمل کے اندر بسیرا نہ کرے سائنس دان نہیں بن سکتا اور لیبارٹری میں بسیرا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دماغ یکسوئی کے ساتھ مسئلہ کی کھوج میں لگا رہے اور یکسوئی کے ساتھ مسئلہ کی کھوج اور منزل کا سراغ اپنی زبان ہی میں ملتا ہے۔ کسی اور زبان کی گرامر کے نکات اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہنے سے اصل مباحث گم ہو جاتے ہیں اور منزل بالکل سامنے ہونے کے باوصف دسترس سے دور رہتی ہے۔

انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ اظہار نہ بنا کر لیکن اس کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر جن ملکوں نے ہماری نظروں کے سامنے ترقی کی ہے ان میں جاپان' کوریا اور تائیوان وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہاں کے دانش مندوں نے اپنی ساری قوم کو انگریزی پڑھنے پر نہیں لگایا بلکہ ایک مخصوص گروہ کو اس کام پر مامور کیا ہے۔ دانش گاہوں اور درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم ملکی زبانیں ہیں اور تحقیق و تفتیش کا سارا کام انہی زبانوں میں ہوتا ہے۔ صرف اپنی آسانی کے لیے انہوں نے ہندسے اور ان کے ساتھ سائنسی اور ریاضیاتی سمبل البتہ انٹرنیشنل یا انگریزی والے اختیار کر لیے ہیں' باقی سب کچھ اپنی زبان میں ہے۔

چند سال پیشتر میں ان کے طریق کار کا قریب سے مطالعہ کرنے کے لیے جاپان گیا تو پتہ چلا کہ وہاں پر ہر بڑے شہر میں ایک دارالترجمہ اور ادارۂ فنون و علم قسم کا دفتر قائم ہے جہاں چاق و چوبند مترجموں کا ایک خردمند اور روشن فکر گروہ ہر وقت سرگرم عمل ہے۔ جاپانی حکومت کی طرف سے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں

ایسے جاپانی دانشور بھیجے جاتے ہیں جو وہاں شائع ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتابیں' کتابچے' پمفلٹ' مونوگراف' درس پارے روز کے روز خرید کر متعلقہ دارالترجمہ میں بھجواتے رہتے ہیں۔ جونہی یہ مواد ان اداروں میں پہنچتا ہے مترجمین اس کا خلاصہ جاپانی میں تیار کر کے فوراً سائیکلوسٹائل کرواتے ہیں اور پھر یہ سائیکلوسٹائل نقلیں ان اداروں میں ''سپیڈی پوسٹ'' سے بھجوادی جاتی ہیں جہاں متعلقہ موضوعات پر یا مصنوعات پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔ پرانی' تجربہ یافتہ' کلاسیکی جاپانی کاریگری پر نئی غیرملکی جانکاری کا اضافہ ایک نئے روپ میں ابھرتا ہے اور جاپانی مصنوعات دھڑادھڑ منڈیوں میں پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اگر ایسا ہو سکے کہ پاکستان کے دانشمند نوجوان اور بااستعداد کاریگر اپنی ملکی زبان میں فنی تعلیم حاصل کر کے مختلف فیکٹریوں' کارخانوں' فنی اداروں اور معلموں میں مصروف عمل ہوں اور ان کاریگروں کو تواتر کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے سے نئی ایجادات اختراعات اور مفروضات کا تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو علم ان کی اپنی زبان میں ان تک پہنچ رہا ہو اور وہ اس مواد کو اپنے تجربات کی روشنی میں چھان پھٹک کر اپنی مصنوعات اور اپنی اختراعات کو ایک نیا رخ دے رہے ہوں۔ زندگی کے رشتے سے سائنس کا عمل جاری ہو اور سائنسی ثقافت کی شکل میں پھیل رہی ہو تو کس قدر اچھا ہو..... لیکن اگر ایسا ہو سکے تو!!

لیکن ہم ایسا کر نہیں سکتے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہمارے سیانے ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں کہ سائنس کی تعلیم سوائے انگریزی کے اور کسی زبان میں دی ہی نہیں جا سکتی۔

آج سے کوئی چار سو برس پہلے دنیا کا مشہور سائنس دان نیوٹن بھی اسی خیال کا حامل تھا کہ سائنس کی تعلیم سوائے لاطینی زبان کے اور کسی زبان میں دی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کا خیال تھا کہ سائنسی اور ریاضیاتی موضوعات کے لیے انگریزی زبان نہ صرف ناقص ہے بلکہ وہ سائنس کے دقیق مسائل کی کسی بھی صورت میں متحمل نہیں ہو سکتی' چنانچہ اس نے' اسی فلسفے کے پیش نظر' بہ امر مجبوری' اپنی ساری کتابیں لاطینی میں لکھیں اور اسی زبان میں شائع کیں۔

میں نیوٹن کا سا دماغ اور اس جیسا خیال رکھنے والے اپنے ہم وطنوں سے جھگڑا تو نہیں کر سکتا' البتہ ایک درخواست اور چھوٹی سی عرض داشت پیش کرنے کی جرأت ضرور کر سکتا ہوں کہ ''اصلی اور وڈھی'' سائنس کو تو بھلے آپ انگریزی میں ہی رہنے دیں لیکن ٹیکنالوجی کے بنیادی اصولوں اور اس میں در آنے والی نئی نئی ایجادات اور اختراعات کو اردو میں منتقل کرنے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ لوگ جو نسلوں سے اپنے اپنے پیشے اور اپنی اپنی حرفت کے ساتھ وابستہ ہیں' وہ متعلقہ موضوعات میں ہونے والی نئی ایجادوں اور نئے رویوں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

اس وقت سیالکوٹ کے علاقے میں کھیلوں کا سامان بنانے والے کاریگر اردو زبان میں لینکس اور سنتھیٹک ربڑ اور چسپیدوں یعنی Adhesives کی تفصیلات اور ان کے فارمولے جاننے کے لیے تڑپ

رہے ہیں۔ گوجرانوالہ کے کاریگر اردو زبان میں فولاد پر عمل حرارت' منی موٹرز کی آرمیچر وائنڈنگ' بلینڈرز' چاپرز اور جوسر وغیرہ کے بلیو پرنٹ اور آڈیو ہیڈز کی تفصیلات اردو زبان میں جاننے کے بڑی دیر سے خواہش مند ہیں۔ اسی طرح گجرات' وزیر آباد میں میڈیکل مشینیں (Medical equipment) بنانے کو کچھ صاحب نظر اور تجربہ کار مستری موجود ہیں لیکن وہ تمام معلوماتی مواد اردو میں مانگتے ہیں۔

پھر ہمارے لاہور میں کچھ ایسے مڈل پاس اور انڈر میٹرک کاریگر موجود ہیں جو الٹرا سانک اور لیزر مشینوں کی کارکردگی اور کارگزاری کو اپنے خاندانی تجربے اور موروثی دانش کے زور پر سمجھے تو بیٹھے ہیں لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اردو میں ایسے لٹریچر کے متمنی ہیں جو ان کو متعلقہ مشینوں کے بنیادی اصولوں سے آشنا کر کے ان کی سوچ کو صاد کرے یا اس کا بطلان کرے لیکن اردو میں ایسا لٹریچر کہیں بھی دستیاب نہیں۔ انگریزی کی اعلیٰ پائے کی کتابیں درسگاہوں اور دانش گاہوں میں ضرور موجود ہیں لیکن وہاں کے استاد اور طالب علم صرف تھیوری جانتے ہیں۔ ان میں نہ تو مستریانہ صلاحیت موجود ہے نہ ہی انہوں نے کبھی ہاتھ سے کوئی کام کیا ہے۔ ڈگریاں ان کے پاس اعلیٰ درجے کی موجود ہیں۔ یہاں کی بھی اور باہر کی بھی! اور علم بھی ان کے پاس پورا ہے اور وہ لوگ ہیں بھی لائق لیکن خیر نہیں پڑ رہی۔ نہ خود کو نہ گھر والوں کو نہ ہم وطنوں کو۔

فرض کیجیے تجربے کے طور پر اگر ہم اردو میں سائنس کی تعلیم بہم کر کے اس کے نتائج دیکھنے کے متمنی ہیں تو ہمیں ایک لیبارٹری ٹیسٹ سے گزرنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں اس کام کی ابتدا ہمارا میزبان شہر کر سکتا ہے۔ اگر اس کانفرنس کے بعد ڈی سی صاحب اپنے محدود ذرائع میں رہ کر یہاں ایک دارالترجمہ کی بنا ڈال سکیں اور اس دارالترجمہ میں چھ سات وقف وفا اور فدائی قسم کے مترجمین جمع کر سکیں تو یہ اکیلا مرکز سارے ملک کی تکنیکی طلب اور فنی معلومات پوری کرنے کو اسے جاپان' کوریا' تائیوان کی نہج پر ڈال سکتا ہے۔

ملتان کا دارالترجمہ دنیا بھر میں ہونے والی نئی نئی اختراعات' ایجادات اور عملی دریافتوں کے اردو ترجمے' ڈایاگراموں' عملی نسخوں' فارمولوں اور ٹیکنیکل نقشوں کی صورت میں سائیکلوسٹائل اور فوٹو کاپی کر کے ان اداروں کے کاریگروں کو بھجوا سکتا ہے جو انگریزی زبان سے ناآشنائی کی بنا پر ابھی تک اپنے اپنے فنون کی پہلی سیڑھی پر ہی بیٹھے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ عمل کی دنیا سے وابستہ یہ کاریگر اور تجربہ کار لوگ اپنے جدی علوم کو نئی دریافتوں کا پیوند لگا کر دنیائے سائنس میں انقلابی قدم اٹھا سکتے ہیں اور اپنی بدیہہ سازیوں سے ساری دنیا کو مستفید کر سکتے ہیں۔ کسی درسگاہ' دانش گاہ' وزارت یا کسی کج سیاست کو مشکل میں ڈالے بغیر اس ادارے کی ایک سالہ کارکردگی سے بڑا واضح اور عملی ثبوت مل جائے گا کہ اردو زبان میں فنی اور تکنیکی آموزش ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ارفع سائنس کا علم عطا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کیا جا سکتا ہے تو کس قدر اور نہیں عطا کیا جا سکتا تو کیوں نہیں!

میں نے اس کام کے لیے ملتان کو یوں منتخب کیا ہے کہ سائیں اور سائنسٹ دونوں ہی توجہ اور

انہماک کے طالب اور اپنی رو کے بھگت ہوتے ہیں اور ان کی اساس صرف مشاہدے اور مراقبت پر ہوتی ہے۔ ملتان اگر سائیں پیدا کر سکتا ہے تو سائنس دان پیدا کرنے کا مقام بھی یہی ہے۔ کسی بڑی درگاہ سے ایک دارالترجمہ لیبارٹری جیسی اور رسمی طور پر وابستہ کر دیجئے ابن سینا، جابر بن حیان، البیرونی اور ابن الہیثم خود بخود پیدا ہونے لگیں گے اور ہمارے علوم کی گم شدہ کنجی صدیوں کے ڈھیر سے پھر برآمد ہو جائے گی۔

شکریہ!

ٹی وی ماہنامہ.....جنوری 85ء

دنیا کا سب سے پیچیدہ مسئلہ حق اور حقیقت کو جاننے اور سچ کو اس کے اصلی روپ میں پہچاننے کا ہے اور ادب اس تحقیق و تفتیش میں تب سے مصروف عمل ہے جب سے اس کا وجود قائم ہے۔ علم اور معلم اور تعلیم کے عہد میں تو سچائی کو پہنچنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا لیکن جب سے علم کا رشتہ معلم سے ٹوٹا ہے اور اس کا منبع اطلاع قرار پایا اور جب سے تعلیم کا سلسلہ علم سے ٹوٹ کر معلومات سے جڑا اور صرف انفارمیشن کو اور انفارمیشن کی ذخیرہ اندوزی کو علم کہا جانے لگا' اس وقت سے حق کو اور حقیقت کو کوڑ کباڑ سے الگ کر کے پرکھنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے.....اب ادب جھوٹ سچ میں فرق تلاش کرنے اور انفارمیشن کے روز افزوں انبار سے سچ کا دھاگا ڈھونڈ نکالنے کے بجائے خود انفارمیشن کا اور اشتہار و اطلاع کا دست نگر ہو کر رہ گیا ہے اور اپنی اپنی پسند کی انفارمیشن کے ڈھیر پر پنجے جما کر اور جان لڑا کر حق اور ناحق کی جنگ لڑ رہا ہے۔

دراصل سچائی کی حدیں ہمارے علم اور ہمارے ادراک سے بہت دور کی چیز ہیں' کیونکہ جتنا بھی ہم جان جاتے ہیں یا جتنی بھی جانکاری ہم حاصل کر لیتے ہیں اس سے کہیں زیادہ علم ''بے جانا'' رہ جاتا ہے.....پھر جتنا کچھ ہم جاننے لگتے ہیں یا جان جاتے ہیں وہ ضروری نہیں کہ سب سچ ہی ہو یا حق اور حقیقت پر مبنی ہو۔ ہم چونکہ محض اپنے احساس یا اپنی حسیات اور اپنے Sence Organs کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں' اس لیے ہماری سچائی حسیات کی کارکردگی تک محدود رہتی ہے۔ نابیناؤں کو رنگ اور روشنی کا علم حاصل ہی نہیں ہو پاتا اور بہروں کی بستی میں 'سُر کی سچائی کا ایک بھی آشنا نہیں ملتا۔

لیکن ادب اس سچائی کی تلاش کا نام ہے جو ظاہر سے پرے باطن کی کھوج بھی ہے یا موجود سے الگ ناموجود کی جستجو بھی ہے۔ ادب نہ تو خالی اطلاع اور نہ ہی محض وجدان ۔ یہ نہ صرف انفارمیشن ہے اور نہ تمام انسپریشن ۔ یہ احساسات اور فہم کے ایک ساتھ یا قدم بہ قدم چلنے کا نام ہے' جس طرح فرمایا گیا ہے کہ ملا دیئے گئے میں دو سمندر جو باہم ملتے ہیں اور ان دونوں میں پردہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کر سکتے! گویا جہاں حد سے کسی قسم کا بھی تجاوز ہوتا ہے وہاں ''خیر'' ختم ہو جاتا ہے اور ''غیر'' اس کی جگہ لے لیتا ہے یعنی جب ادب غیر

کے قبضے میں چلا جاتا ہے تو صرف اطلاع فراہم کرنے لگتا ہے اور اپنے عہد کو اور اپنے معاشرے کو Information Oriented Society بنا دیتا ہے۔

یہ عہد بڑے عجیب تضاد کا عہد ہے کہ جھوٹا شخص سچ کی اطلاع دے رہا ہے اور ظالم محبت کے گیت گا رہا ہے..... دنیا کی دونوں بڑی طاقتیں اپنے اپنے مقام پر سچ کا اعلان کر رہی ہیں اور خود جھوٹی ہیں۔ حق کی اطلاع دے رہی ہیں اور خود کاذب ہیں۔ دنیا کو محبت' امن' آشتی' صلح جوئی اور بقائے باہمی کی تلقین کر رہی ہیں اور خود جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مصروف کیا میدان جنگ میں گھٹنوں کے بل ہو کر اپنی اپنی ماچسیں تھام کر ''شر'' کرنے ہی والی ہیں..... یہ بڑے عجیب تضاد کا عہد ہے اور اس کا مطالعہ بڑا ہی دلچسپ ہے اور اس عہد کی زندگی بڑی ہی یادگار زندگی ہے۔

آج کے ماہنامے میں ایک مذاکرہ کچھ اسی قسم کے موضوع پر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ پھر ایک اور مذاکرہ ہے ''شعر اور موسیقی کا معنوی ربط''

گئے سال یعنی 1984ء کی شاعری تنقید اور افسانے ناول کے جیلانی کامران' سراج منیر اور ڈاکٹر سلیم اختر گن او گن گنوائیں گے اور اس بار در رسال کا جائزہ لیں گے۔

پھر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی ایک کتاب ''شعور اور لاشعور کا شاعر..... غالب!'' پر اپنا تبصرہ پیش کریں گے۔

اور ندیم قاسمی صاحب کی نظم ان کی زبانی سنیے.....اور ایک تازہ غزل اقبال ساجد کی ملاحظہ فرمائیے۔

''ہوائے تازہ'' کے عنوان سے عباس تابش کی غزل اور زاہد مسعود کی نظم سنیے۔

اور پھر ہمارے دو بہت ہی پیارے بچھڑے ہوئے ساتھیوں اور بھول بھلا جانے والے شاعروں مختار صدیقی اور شمیم کی نظمیں ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ہم نے ان کو کتنی جلدی کس محنت سے بھلا دیا ہے۔

اردو ذریعہ تعلیم.....اہمیت اورافادیت

جناب والا! میں آپ سے وہ باتیں کہہ کر آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا جو آپ پہلے سے جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ابلاغ کے لیے یا تدریس کے لیے اپنی قومی یا اپنی مادری زبان ہی بہتر اور واحد ذریعہ ہوتی ہے اور یہ کہ جو بات اپنی زبان میں سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہے وہ غیر زبان کے ذریعے ذہن نشین نہیں کرائی جاسکتی.....اور یہ کہ ذہن کے اخذ کرنے کا عمل اپنی بیشتر قوت غیر زبان کی باریکیوں اور اس کے تاروپود کی بنت کو سمجھنے پر لگا دیتا ہے اور وہ اصل مسئلہ کو اپنی گرفت میں لینے سے محروم رہ جاتا ہے.....

یہ بات بھی آپ ماضی کے مشاہدے سے معلوم کر چکے ہیں کہ کوئی شخص کسی غیر ملکی زبان کو اس حد تک اپنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ اس زبان کی ادبی تاریخ میں اس کا نام درج ہو گیا ہو اور اس کی کتابیں سکولوں اور کالجوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جانے لگی ہوں۔

جناب والا! دنیا کے ہر ملک کا باشندہ اپنی بولی بولتا ہے۔ اپنے غم و غصہ کا اظہار اپنی زبان میں کرتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے لیے اپنی بولی کا سہارا لیتا ہے لیکن پاکستان دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جہاں محبت' نفرت' تجارت' حکومت' عیش و عشرت' پلاننگ اور فیملی پلاننگ انگریزی میں کی جاتی ہے.....

میں انگریزی زبان کے مخالفوں میں سے نہیں ہوں' جس طرح میں دنیا کے ہر فرد سے' خواہ وہ کسی علاقے اور منطقے سے تعلق رکھتا ہو پیار کرتا ہوں اسی طرح اس کی بولی اور اس کے طرز زندگی کا بھی احترام کرتا ہوں۔ میرے لیے انگریزی' فرانسیسی' جرمن' اطالوی' چینی' روسی زبانیں اتنی ہی پیاری ہیں جس قدر اردو' پنجابی' سندھی' بلوچی' پشتو' شنا' بروشسکی وغیرہ۔

کوئی سمجھدار انسان کسی دوسری زبان سے کس طرح نفرت کر سکتا ہے جب کہ خود اس کی زبان کا سارا عمل دوسری زبانوں کے سے ملتا ہے۔ بولنے میں آپ کے منہ کے اندر ہوا کا دباؤ ایک خاص طریق سے پیدا کر کے ہونٹوں کے باہر ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ باہر کی ہوا ہونٹوں' دانتوں اور زبان کی مدد سے ایک مخصوص طریق پر اندر کھینچتے ہیں۔ لکھنے کے معاملے میں آڑے ترچھے گول بیضوی دائروں کے نشانات بناتے

ہیں اور ان علامتوں کو ایک تسلسل عطا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی ہر زبان بولنے والا کرتا ہے۔ پھر جھگڑا کس بات کا رہا۔

کوئی جھگڑا نہیں.....لیکن پھر بھی جھگڑا ہوتا ہے اور ایسی ایسی خوفناک صورتیں اختیار کر لیتا ہے کہ ملک کٹ جاتے ہیں۔ گروہ بٹ جاتے ہیں اور افراد بٹ جاتے ہیں.....زبان دراصل بولی اور لکھی جانے والی شے کا نام نہیں بلکہ ایک طرزِ زیست اور اندازِ زندگی کا نام ہے۔ اگر ایک ملک میں ایک قسم کے طرزِ زندگی اور ایک نوعیت کے اندازِ زیست کا عمل جاری ہے تو وہ ملک اور وہ قوم اقتصادی اونچ نیچ جیسے خوفناک نزاع کے باوجود سالمیت کی بنیاد پر قائم رہتی ہے اور اگر اس کے اندر طرزِ زندگی کے نمونے جدا جدا ہیں تو پھر اس کے کٹنے پھٹنے کے امکانات اور مواقع عام ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پاکستان میں اس وقت اندازِ زیست کے دو مختلف نمونے موجود ہیں۔ ملک کی بہت بڑی بلکہ بہت ہی بڑی اکثریت جو میری دانست میں ترانوے چورانوے فیصد کے قریب ہے' اپنی پرانی تہذیب' اصل ثقافت اور اپنے علاقے کی ماحولیات کے مطابق ایک طرح کے طرزِ زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ دوسرا گروہ جو چھ سات فیصد سے زیادہ نہیں' غیر ملکی یا مغربی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے اور اسی کو اعلیٰ زندگی کا معیار سمجھتا ہے۔ یہ دونوں گروہ بڑے شریف بڑے مخلص اور بے حد محبِ وطن ہیں' دونوں ہی اپنے وطن کو خوشحال' فارغ البال اور مضبوط مستحکم دیکھنے کے متمنی ہیں۔ فرق صرف ان کے اندازِ فکر میں ہے' جذبے میں نہیں.....

پہلا گروہ' جو بہت ہی بڑی اکثریت پر مشتمل ہے' نارمل نیچرل' صاحبِ برداشت اور مستقل مزاج افراد پر مشتمل ہے۔ دوسرا گروہ خوفزدہ' لرزہ براندام اور عدم تحفظ کے وبائی مرض میں مبتلا ہے۔ یہ گروہ بہت اچھا' کھاتا پیتا' صاحبِ قوت اور صاحبِ حکومت لوگوں کا گروہ ہے لیکن اس کی رہائش آسیب زدہ مقام پر جہاں سیکورٹی کے بھوت نے ان کے دن کا آرام اور راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اپنے آپ کو قوت اور استقامت عطا کرنے کے لیے اور خوف کے اس نفسیاتی مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ گروہ مضبوط اور طاقتور قوموں کا لباس پہن کر ان کی زبان بول کر اور ان کے طرزِ بود و باش کو اختیار کر کے خود کو محفوظ اور پھر کسی قدر توانا اور پھر کافی حد تک فرزانہ سمجھ کر زندگی گزارنے کی سعی میں مصروف ہے۔ یہ گروہ اس قدر بھولا اور سادہ لوح ہے کہ غیر ملکی طاقتور قوموں کا پس خوردہ پہچھوڑ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس میں ان جیسی طاقت آ گئی ہے۔ آنے لگی ہے اور اب وہ کوے سے ہنس بنتا جا رہا ہے.....

مختصر یہ کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں کا اندازِ زندگی اختیار کر کے خود کو ترقی یافتہ سمجھنے لگتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس کے ملک کا دوسرا اکثریتی گروہ بھی ترقی کرنے کے لیے وہی راہ اختیار کرے جو اس نے کر رکھی ہے.....چنانچہ غیروں کی ترقی میں مقامنت حصہ بنانے کے لیے اس کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ

اس غیر کی زبان کوفوراً اختیار کرلیا جائے۔ جو ترقی کی منازل تیزی سے طے کررہا ہے۔ آ گہی کی حد تک تو یہ زبان بڑا فائدہ دیتی ہے لیکن اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی راہ میں سب سے زیادہ یہی مزاحمت کرنے لگتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ کام کرنے والا نوالہ غیر کا عادی ہو جاتا ہے اسے Spoon fieding کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ ایک ایسی بے عملی کا شکار ہو جاتا ہے جسے آپ آسانی کے ساتھ تساہل کا نام دے سکتے ہیں گو وہ خود اس کو ہرگز تساہل نہیں سمجھتا کیونکہ ہر وقت پڑھتے رہنے اور اخذ کرنے اور نوٹس تیار کرنے والا شخص اپنے آپ کو کبھی بھی بے عمل نہیں سمجھتا۔

میڈیکل کالج کے کورس کی مثال.....

ویٹرنری کالج کے کورس کی مثال.....

الیکٹرانکس انجینئر کے ریکارڈ ٹھیک کرنے کی مثال.....

یہاں آپ کے ذہن میں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوگا کہ اس بے عملی کا اردو یا انگریزی سے کیا تعلق۔ جو شخص ریسرچ نہیں کرنا چاہتا وہ چاہے اردو ذریعہ سے پڑھا ہو چاہے انگریزی میڈیم سے ریسرچ نہیں کرے گا۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں' لیکن میں نے شروع میں عرض کیا کہ اردو صرف زبان ہی کا نام نہیں اور کسی ملک کی زبان صرف زبان ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندازِ زندگی کی اساس ہوتی ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ پچھلے بتیس برس میں ہم سائنس کے بہترین استاد اور پروفیسر تو پیدا کر سکے ہیں لیکن سائنس دان اور ٹیکنالوجسٹ ایک بھی پیدا نہیں کر سکے۔

ہمارے یہاں کے بہت سے استادوں نے بڑے بڑے پیچیدہ علوم میں ڈاکٹریٹ تو حاصل کیے ہیں لیکن اس سے ان کے ملک یا ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ وہ صاحب مال تو بن گئے ہیں لیکن ان میں صاحب حال ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ایک ذمہ دار' دیانت دار اور مستعد پوسٹ مین کی طرح علم کے پیکٹ تو بانٹتے رہے ہیں لیکن اپنی طرف سے' اپنی پیدا کردہ کوئی سوغات عطا نہیں کر سکے۔ کھلاڑی اور سورما جب تک میدان میں نہ اترے وہ رزم آرا نہیں کہلاتا۔ سائنس دان اور ٹیکنالوجسٹ جب تک لیبارٹری اور تجربہ گاہ میں بسیرا نہ کرے سائنس دان نہیں کہلا سکتا۔ اور لیبارٹری میں بسیرا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دماغ یکسوئی کے ساتھ مسئلہ کی کھوج میں لگا رہے۔

غیر زبان کی گرامر کے نکات اور اس کے ذخیرہ الفاظ کی تلاش میں سرگرداں نہ رہے۔ دوسروں کے مشاہدات اور تجربات کا علم ضرور رکھے لیکن اپنی راہوں میں خود اجالا کرے۔ مانگے کی روشنی کا محتاج نہ رہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تعلیم اپنی زبان میں ہو' سوچا اپنی زبان میں جائے' لیبارٹری کا روزنامچہ اپنی زبان میں لکھا جائے اور ذرائع اپنے تقاضوں کے مطابق مقامی استعمال کیے جائیں۔

غیر ملکی زبان پڑھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے پر بڑی عمر اور بڑی قوت صرف ہو جاتی ہے۔

میں نے خود بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ انگریزی سیکھی ہے۔ اس میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی ہے۔ دفتری اور معاشی اور معاشرتی کام بلا تکلف نپٹا لیتا ہوں لیکن عمر کے اس حصے میں پہنچ کر جب پچھلے ہفتے میں نے اپنی انگریزی کا ایماندارانہ جائزہ لیا تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ میری انگریزی تقریباً ویسی ہی ہے جیسے الالوکھیت کا جمن اپنے سمدھی بدھن کو اپنے ہاتھ سے کارڈ لکھ رہا ہو۔ اس میں نوکی کے شعر تو بہت ہوں لیکن اصل بات بدھن تک نہ پہنچ رہی ہو۔

اردو زبان کے ذریعہ تعلیم بننے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں موجود ہیں:

1- سب سے بڑی رکاوٹ ان خوفزدہ اور لرزہ براندام سادہ لوح اور نیک لوگوں کی ہے جو صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ اردو زبان سائنسی اور فنی علوم کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی اور اگر اس کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تو ہر چیز کھنڈت میں پڑ جائے گی اور ہم ترقی کی منازل طے نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سوچ بہت حد تک نیوٹن سے ملتی ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے جب نیوٹن نے کشش ثقل کو دریافت کیا اور قوانین نیوٹن قائم کیے تو اس نے اعلان کیا کہ میں اس عظیم دریافت کو بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے قلمبند ضرور کروں گا اور آنے والی نسلوں کے لیے دستاویزی صورت میں ضرور چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن یہ سب کچھ لکھوں گا لاطینی میں کیونکہ انگریزی زبان سائنسی موضوع کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کے ذخیرہ الفاظ اور اس کی صرف ونحو میں اتنی جان نہیں ہے کہ اس عظیم تھیوری کو وضاحت کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر سکے۔

2- دوسری وجہ اردو کے ذریعہ تعلیم نہ بن سکنے کی یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ زبان ذریعہ تعلیم بن گئی تو پھر دفتری زبان بھی اردو ہو جائے گی اور اگر دفتری زبان اردو ہو گئی تو پھر یہ سارے عوام اور نتھو خیرے جو اردو میں عرضی وغیرہ لکھ کر اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں وہ دفتروں کے نزدیک آ جائیں گے۔ ہر معاملے میں خاص طور پر امور مملکت اور رموز سلطنت میں اپنی رائے دیتے پھریں گے۔ ہماری ان دستاویزوں کو جو اردو میں چھپیں گی۔ پڑھ کر ہماری کارکردگی پر نکتہ چینی کرنے لگیں گے اور ہم جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں پھر ہم کو عوام کے نمائندوں کی صورت میں کام کرنا پڑے گا۔

3- تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے روزمرہ کے معاملات نپٹانے کے لیے اپنی زبان کو اختیار کر لیا تو مہذب اور ترقی یافتہ قومیں ہم پر ہنسیں گی جس طرح پہلے وہ حرم اور موذن اور زنانہ وغیرہ پر پھبتیاں کستی رہی ہیں اسی طرح اردو پر بھی طنز کرے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کی آرزو اور ان کے حکم کے مطابق ان کی زبان کو ہی اپنائے رکھیں تاکہ جب وہ ہم پر ثقافتی یلغار کرنا چاہیں تو ان کو آسانی ہو اور ہم ان کے مطبوعہ اور نشریہ پیغامات حقیقت میں احکامات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

4- اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اپنی زبان اختیار کرنے سے ہم مہذب اور ترقی یافتہ دنیا سے کٹ جائیں گے اور ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے اور اگر انگریزی کی وجہ سے ہم نے اب تک جو حیرت انگیز ترقی کی ہے جو جو ایجادات اور اختراعات کی ہیں اور جس سے ساری دنیا انگشت بدنداں ہے' وہ کیفیت باقی نہ رہے گی۔

5- اور پانچویں وجہ یہ کہ ہماری وہ نالائق پود جو محض انگریزی بولنے انگریزی بودوباش اختیار کرنے اور ولایتی طرز زیست کو اپنانے کی وجہ سے اعلیٰ مقاموں پر متمکن ہے' ان کی جگہ صحیح معنوں میں لائق ذہین اور محنتی نوجوان آ جائیں گے۔

یہ اور ایسی اور کئی ظاہر اور پوشیدہ وجہیں جن سے آپ ملاقاتوں اور مباحثوں میں دوچار ہوتے رہتے ہیں اردو کے ذریعہ تعلیم بننے کی راہ میں حائل ہیں۔

اور جو کہیں ایسا دن طلوع ہو کہ اردو ذریعہ تعلیم بنے اور قومی زبان دفتر کی زبان بن جائے تو وہ دن ہماری قومی زندگی کا پہلا دن ہوگا جس دن ذہنی غلامی کا جوا نیچے گرنے کو پہلی مرتبہ کھسکے گا۔ ذہنی غلامی کے اندر پہلا قدم رکھنے کا لمحہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب برصغیر کی کسی دانش گاہ یا کسی درسگاہ میں کسی طالب علم کا دیہاتی باپ پہلی مرتبہ اس سے ملنے آیا تھا تو اس نے دوستوں سے کہا تھا کہ ہمارے گاؤں سے ہمارا ملازم آیا ہے۔

اردو کو ذریعہ تعلیم اور اس کے دفتری زبان بننے کا سب سے بڑا فائدہ علاقائی زبانوں کو ہوگا جو اس وقت شدید بے توجہی کا شکار ہیں۔ اردو کے اپنا مقام حاصل کرنے کے بعد وہ ساری طاقت' سارا سرمایہ اور ساری توجہ ان زبانوں کی ترویج اور ترقی پر صرف ہوگی جو ان علاقوں کے لوگوں کو دل و جان سے پیاری ہیں۔ اردو ان کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا کام دے گی اور وہ ربط باہمی جو ہمارے ملک کے لوگوں کو اس وقت ذہن کی بدولت حاصل ہے' زبان کی دوری سے اور بھی گھٹتا چلا جائے گا۔ ممکن ہے بہت سے اصحاب کو اس مفروضے سے اختلاف ہو لیکن میں جذباتی بات نہیں کر رہا سائنٹفک بنیاد پر استوار حقیقت عرض کر رہا ہوں۔

اور جناب والا! ایسی حقیقتوں کا جائزہ لینے کے لیے یا تو بہت سی مجالس مکالمہ قائم کی جائیں جہاں کسی خوف' سیاست یا لالچ کے بغیر ان مفروضوں کو جانچا جائے اور علمی اور منطقی طریق پر ان کی چھان پھٹک کی جائے۔ یا پھر بسم اللہ کر کے گیئر بدل دیا جائے اور رفتار ملاحظہ کر لی جائے۔ یہ اکا دکا مضمون اور کبھی کبھار کی اردو کانفرنس اپنی انا کی تسکین تو کر دیتی ہیں لیکن اس طرح گاڑی آگے نہیں چلتی۔ گاڑی آگے چلانے کے لیے انجن کا سا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ اپنا پیٹ تو آگ اور انگاروں سے بھرتا ہے اور ڈبوں کو ٹھنڈے ٹھنڈے منزل کی طرف لیے جاتا ہے..... شکریہ۔

کلچر اور ثقافت

''کلچر کی بھٹی''

اب کلچر، ملکی غیر ملکی ایک Steel پگھلانے والی بھٹی ہے جو کوئی اس کے پاس جاتا ہے گرم لوہے پر ٹھنڈی بوند کی طرح اڑ جاتا ہے..... یہ نہیں کہ اچھی کہانیاں تخلیق نہیں کی جا رہیں۔ یہ نہیں کہ اچھی نظم اچھی غزل لکھی نہیں جا رہی۔ یہ بات بھی نہیں کہ مرد عورت ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں اور مکمل طور پر بوڑھے لوگوں سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ وضاحت طلب بات صرف یہ ہے کہ اتنے سارے بھس کو کون اور کیسے علیحدہ کیا جائے۔ شناخت کرنے والے کون ہوں اور شناخت کرنے کے بعد اسے اصلی دل پر رکھنے والے کہاں سے آئیں؟

مسئلہ صرف مذہب کا ہو.....تو مذہب کی تعلیم اب زیادہ مل رہی ہے۔ مسئلہ عورت مرد کا ہو.....تو اب تعلیم عام ہے اور سمجھ بوجھ بڑھی ہے۔ مسئلہ بوڑھوں کا ہو، مسئلہ سیکس کا ہو تو اب بھی دیہاتی لوگ اس عذاب سے بچے ہوئے ہیں۔

پھر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں چونکیل جانور کی طرح دشت کی طرف بھاگ جانا چاہتا ہے۔ شاید مسئلہ صرف وقت کا ہے کلچر کا نہیں۔ وقت جو تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اور جب وقت کا پہیہ تیز رو ہو تو اس کے ساتھ ان گنت قومیں ان گنت کلچر خود بخود سمت بھول جاتے ہیں۔ پہلے زمانے کا انسان ایک دوسرے سے Competition کرتا تھا، اب وہ ٹیلی ویژن سے، میک اپ کے سامان سے، نائٹ کلب سے، فلم سے، پورنوگرافی سے، نئی تہذیب سے، اپنے آپ سے اور جانے کس کس سے اندر باہر لڑ رہا ہے۔ ہراول کو شکست دیتا ہے تو قلب میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ایسی چومکھی لڑائی میں اپنے کلچر سے محبت کرنے والے کے اوسان خطا نہیں ہوئے وہ صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرنا بھول گیا ہے۔ وہ کچھ ایسا بے وسا یا ہو گیا ہے کہ Get rich quick برادری کے ساتھ اس کا بھی جی چاہتا ہے کہ میرے مزار پر جو بھی دیئے جلانے ہیں میری موت سے پہلے جلا دینا۔ مجھے جو بھی نذرانہ

عقیدت پیش رنا ہے میرے مرنے سے پہلے دے دینا۔ کون جانے تب تک حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔
غالبا مسئلہ وقت کا بھی نہیں..... کامیابی کا ہے۔ جو Bitch Goddess Success کی توام بہن ہے۔ پرانا کلچر اور اس سے وابستہ شخص ناکام ہے۔ نئی ثقافت کا پروردہ کامیاب ہے اسے روزی کی سہولت شہرت اور کامیابی کی دیوی جلدی درشن دیتی ہے۔

ہمارا قومی تشخص (تہذیب وثقافت)

خواتین وحضرات میں آپ سے معافی چاہوں گا کہ اصل موضوع سے مجھے تھوڑا سا انحراف کرنا پڑے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ بات جس کی توقع آپ لے کر بیٹھے ہیں وہ اس انداز میں آپ تک نہ پہنچ سکے جس طرح سے آپ نے اس کا خاکہ ذہن میں مرتب کیا ہے۔

لیکن کسی صورت میں بھی اس موضوع کو آپ کے دائرہ خیال سے نکلنے نہیں دوں گا اور ایک چھوٹا سے ہوم ٹاسک ایک مشق آپ کے لیے فراہم کروں گا جس پر عمل پیرا ہو کر آپ یقیناً تشخص کے بارے میں خواہ اس کے کتنے بھی پہلو نکلتے ہوں۔ تہذیب وثقافت کا پہلو ہو دین کا اعتقاد کا' اس کا مسئلہ خود آسانی سے حل کر لیا کریں گے۔

اصل میں کلچر اور روایت کی وضاحت ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے' یہ ریاضی کے سوال کی طرح حل نہیں کیا جا سکتا۔ کم سے کم میں سمجھتا ہوں مغرب کے مفکروں اور دانشوروں سے تو اس کی تعریف ہو نہیں سکی۔ اب تک انہوں نے اس کی تقریباً ایک سو چھیاسٹھ تعریفیں کی ہیں۔ لیکن اس میں نہ تو ان کی تسلی ہوئی اور نہ ان کے سائلوں کی جنہوں نے ان سے یہ سوال کیا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کی جو اس کے بارے میں کچھ زیادہ جاننا چاہتے تھے' تاریخ کے ماہر ہیں' معاشریات دان ہیں' علم الانسان کے انتھروپولوجسٹ ہیں اور آثار قدیمہ سے شغف رکھنے والے ادیب' نفسیات دان' شماریات کے ماہر' ان سب نے کوشش کی لیکن ان کی باقاعدہ ڈیفی نیشن ان سے بن نہ سکی۔ سب نے اپنی اپنی تعریف بڑے سوچ بچار کے بعد آگے بڑھائی لیکن تشفی نہیں ہوتی۔ اب چونکہ وقت کم ہے میں آپ کو ان کا ایک خلاصہ بھی پیش نہیں کر سکتا.... لیکن ایک دو تعریفیں میں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔

مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کلچر اپنے وسیع تر معنوں میں اپنے انداز زندگی کے اس پیچ در پیچ اور حلقہ در حلقہ معاملات کا نام ہے' جس کے اندر علم' اعتقاد' آرٹ' اخلاق' قانون' رسم ورواج' صلاحیتیں' عادتیں' انداز اور وہ سب کچھ آ جاتا ہے جو ایک انسان کو کسی سوسائٹی کا فرد بننے کے لیے ہے اور سوسائٹی کا قابل قبول فرد بننے کے

لیے درکار ہوتا ہے۔ ایک اور فرانسیسی ہیں وہ صاحب کہتے ہیں کہ کلچر ایک گروہ کے تمام اجتماعی عادات کے مظاہر کا نام ہے اور یہ فرد کے اس ردعمل کی ترجمانی کرتا ہے' جو گروہ کی طے شدہ عادت سے یا بڑا پیچیدہ ہے..... گروہ کی طے شدہ ایک عادت ہے اس سے اثر پذیر ہو کر آشکار ہوتا ہے۔ صاف' واضح عیاں ہوتا ہے۔

ان عادات سے یعنی جو اجتماعی عادات ہیں' ان سے تقویت پا کر انسانی کوشش کے جو ثمرات ہوتے ہیں انسانی کوشش کے اس سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں' وہ کلچر کے دائرے میں آتے ہیں۔ تین چار پانچ اور ایسی ہی ہیں' لیکن ذرا وہ آپ کو پریشان کریں گے' ایک آخری مجھ سے ضرور سن لیجیے آسان لفظوں میں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک انتھرو پولوجسٹ کسی گروہ یا قبیلے کا وہ سارا انداز زیست جس کو وہاں کا سماجی یا علاقائی ماحول یا جغرافیائی گروہ پیش یا وہاں کی زمین کے حالات طے کر دیں وہ کلچر کہلاتا ہے..... تو ایسی صورتوں میں اور ان تعریفوں کی روشنی میں خاص طور پر ایسی ڈیفی نیشن کے پیش نظر ایک بڑے کلچر ایریا کی ایک سیریز جو ہوتی ہے ان ڈیفی نیشنوں کے پیش نظر بڑے کلچر ایریا کی بہت بڑے علاقائی جو ثقافتی علاقہ ہوتا ہے اس کی۔ وہ اقلیت کو اکثر ذاتی ذراتی اٹیمیڈیٹ کرتی رہتی اور شرمندہ اس کو کرتی ہے کہ دیکھو تمہاری اور ہماری ثقافت ایک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ ہم ایک ہی علاقے میں رہتے ہیں جغرافیائی ماحول ایک سا ہے' آب و ہوا ایک جیسی ہے۔ ہم ایک جیسے ہیں اور ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ اور چھوٹا گروہ بیچارا بڑا خفیف اور منفعل ہوتا ہے اور ہاتھ ملتے ہوئے ہاں جی ہاں جی کرنے پر مجبور ہو جاتا حالانکہ اس کی ثقافت اس چھوٹے گروہ کی بنیادی طور پر اس اکثریتی گروہ سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ بڑا میں دعویٰ کر رہا ہوں لیکن میں اس کی آپ کو دلیل دوں گا۔ ان میں جزئیات یکساں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ظاہر شکل وصورت ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ لباس ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ کھانے ان کے ایک جیسے ہو سکتے ہیں' زبان بھی ایک جیسی بولتے ہیں۔ گانے بھی ایک جیسے گاتے ہیں۔ حرکات وسکنات ہیں طرز تکلم ہیں۔ سب کچھ ہیں۔

لیکن ان کا بنیادی فرق جو ہوتا ہے۔ ثقافت کا وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

اب میں آپ کو' کیوں کہ میں بہت جلدی میں ہوں اور وقت انہوں نے کم دیا ہے۔ آپ کو ثقافت اور تہذیب کے بارے میں اپنی تعریف بتاتا ہوں۔ جو میں نے سوچ کر آج تک چھپا کر رکھی تھی اور میں کسی کو بتاتا نہیں تھا لیکن آپ واقعی بڑے خوش قسمت ہیں لیکن اس وعدے پر یہ بتا رہا ہوں کہ آپ اور کسی کو نہ بتائیں کیونکہ انور صاحب میں نے بڑی محنت سے تیار کی ہے تو اس کو اختیار کرنے سے۔ آپ اس پر توجہ فرمائیں گے اور آپ بہت سی بھول بھلیوں سے نکل جائیں گے اور آپ کسی اکثریتی گروہ سے' جو اپنی ثقافت کو اچھا کہتا ہے یا بھلا کہتا ہے' اس سے زیادہ شرمندہ اور خجل نہیں ہوں۔

ایک بات یاد رکھیے کہ تہذیب وثقافت اور کلچرل Segregation کا دارومدار علم' آرٹ' اخلاق' قانون' رسم ورواج' صلاحیت' عادات' حرکات وسکنات جیسا کہ میں نے آپ کو گنوایا ہے۔ ان پر بالکل نہیں

ہے۔ یہ تو اس کے ظاہر ہیں۔ اس کی بنیاد نہیں بنتے۔ کلچر کا سارا دارومدار اس کی ساری بنیاد۔ اس کی ساری فاؤنڈیشن اس کی ساری اساس اس کے اعتقادات پر ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے! اس بات کو اس کے اعتقادات اس کے Gear پر کسی قسم کا بھی Out Fit ہو Aborigines جو ہیں افریقہ کے رہنے والے۔ یا مکینز جو ہیں آپ کے آسٹریلیا کے ان کا ایک Out Fit ہے۔ اور ان کے کلچر کا دارومدار۔ کس قسم کا فٹ ہے۔ اس سے ہماری بحث نہیں کبھی ہوا کرتی۔ ایک اور قوم ہے۔ اس کا اپنا فٹ ہے اچھا۔ جب یہ ہو جاتی ہے بات کہ میں جیسا ابھی عرض کر رہا تھا کہ اسی کلچر ایریا میں جب دو مختلف اعتقادات کے گروہ ہوں گے ناں۔ تو ان کے کلچر بھی جداگانہ ہوں گے۔ میں نے پہلے عرض کیا کہ زبان ایک ہو سکتی ہے۔ بیان ان کا ایک ہو سکتا ہے۔ لباس شباہت کے باوجود ان کے طرزِ زندگی میں نمایاں فرق ہوگا۔ زندگی کا ٹوٹل پیٹرن جو ہے۔

اب میں آپ کو اعتقادات کو پہچاننے اور ان کے جاننے اور ان کے آنکنے کا ایک بہت مزیدار گر بتاتا ہوں۔ یہی بات میں کہتا تھا کہ چھپا کے رکھی ہوئی ہے لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اور اس سے واضح فرق کرنے کا ایک میں آپ کو ایسا میٹر دوں گا جس سے آپ کو یہ پتہ چل سکے کہ یہ اعتقاد ایسی ہے کہ ڈی سی اور یہ زمینی حس ہے یا افلاکی۔ یہ تو پتہ چل جانا چاہیے۔ ازل سے لے کر آج تک انسان کے ذہن میں چند بنیادی سوال اٹھے ہیں۔ ہمیشہ سے میلاد آدم سے لے کر اب تک اس میں پڑھے لکھے ہونے کا، عقلمند ہونے کا فلسفی ہونے کا کوئی کیونکہ انسان جو ہے یہ بنیادی طور پر ایک مذہبی جانور ہے۔ دیکھئے آپ نے کتنی ڈیفنس سنی ہوگی اس کی کہ حیوان ناطق ہے۔ ہنسنے والا لیکن یہ مذہبی جانور ہے۔ کوئی دنیا کی اور مخلوق جو ہے اپنے اور نیچر کے قدرت کے ریلیشن کے بارے میں غور نہیں کرتی۔ بلا ہے گیدڑ ہے بھیڑیا ہے شیر ہے ہاتھی ہے وہ کبھی بیٹھ کر ہاتھی نہیں سوچتا کہ میرا اور اس درخت کا دن اور سورج کا۔ آگے بڑھنے کا کیا رشتہ ہے۔ لیکن ایک Pggmy جو ہے۔ جو ایک بالکل بے چارہ جاہل ننگا جو ہے۔ افریقہ کا رہنے والا وہ بھی ڈرتا ہے۔ سوچتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے دیکھتا ہے کڑکتی ہوئی کو سمندروں کو دریاؤں کو تو وہ اپنا اور نیچر کا ایک رشتہ ڈیولپ کرتا ہے۔ اس رشتے کو وہ پورے اعتقاد اور پورے ایقان کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کے رسم و رواج زندگی موت مرنا جینا اس اعتقاد کے ساتھ ہوا۔ جب وہ اعتقاد اس کا پختہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے اوپر اس کا کلچر جو ہے جو اس کی ثقافت ہے اس کی بنیاد آپ سے آپ بننے لگتی ہے۔ ان سے غلطی یہ ہوئی ہے ہمارے ولایت والوں سے جن کا بڑا رعب ہے۔ آپ ہر اور اب نکال دینا چاہیے ذہنوں سے بڑے معاملات میں وہ اچھے ہیں ہم ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ کئی معاملات میں ہم بہتر چیزیں سوچ سکتے ہیں۔ کوئی جھگڑا نہیں ان سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ وہ زندہ قوموں کو زندہ انسانوں کو زندہ گروہوں کو جانچ کر اور ان کا پتہ لگا کر اس کے کلچر کو ڈیفائین تعریف کرتے رہے۔ میں جو آپ سے عرض کروں گا۔ وہ بات اس سے مختلف ہے۔ کلچر کا پھیلاؤ اتنا بڑا ہے کہ وہ اس ایک چھوٹی زندگی پر جس میں کہ انسان رہتا ہے سمٹ نہیں جاتا۔ اچھا اب میں یہ کہہ رہا تھا کہ

ازل سے لے کر آج تک جو انسان ہے اس کے ذہن میں چند بنیادی سوال ضرور اٹھتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ اور ان سوالوں کے جو جوابات ہیں' ان پر جو انسان کے تمدن کی بنیاد رکھی گئی تھی جس میں جس نے جو جواب دے لیا' جو سوچ لیا اس کے اوپر اس کی بنیاد قائم ہے اور اسی سوچ کے مطابق وہ آگے بڑھتا' پھلتا اور پھولتا ہے۔ مثلاً سوال کیا ہوتے ہیں جب انسان بیٹھ جائے دنیا کے کسی خطے میں ہو اور کسی عہد میں وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کا آغاز کیا ہے؟ کیسے ہوئی ہوگی شروع؟

دوسرا سوال اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

اور تیسرا سوال یقین سے ہے کہ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟ یا موت کے بعد ختم بالخیر اور ختم شد اور ذرا پ سین۔ یہ ضرور سوچتا ہے انسان۔ ہر ایک نے سوچا ہے۔ اب تو تو ڈا کومنٹری صورت میں ان کے جوابات ہمارے پاس موجود ہیں اور چوتھا یہ کہ اگر کوئی اور زندگی ہے تو کیا اس کے لیے کوئی تیاری کی جا سکتی ہے؟ اس زندگی کے خاتمے پر کوئی سزا و جزا ہے۔ کیا یہ زندگی بغیر آڈٹ کے گزر جائے گی کہ آڈٹ آبجیکشن ہونا ہے اس کے اوپر؟ یہ ہر آدمی ضرور سوچتا ہے۔ اب جو بھی گروہ اس کے جو جواب متعین کرے گا اور ان جوابات پر جس طرح سے قائم رہے گا اس کے مطابق اس کا کلچر جو ہے وہ ڈھلتا چلا جائے گا۔

یہ بڑے کام کی نہایت قیمتی بات ہے۔ اس کو یاد رکھیے اور پورے چیلنج کے ساتھ۔ ویسٹ کو چیلنج کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں۔ اب جو گروہ یا جو قوم یا جو جماعت ان سوالوں کا ایک سا جواب دے وہ ایک تمدن اور ایک تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اور جو گروہ یا جو قوم ان سوالوں کا مختلف جواب دے وہ ایک الگ تمدن اور الگ تہذیب سے منسلک ہوگی اور دونوں قومیں دونوں گروہ ایک ہی زمین پر ایک ہی علاقے میں ہوتے ہوئے ایک ہی جغرافیائی ماحول میں زندگی بسر کرے گی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش خوش رہ سکیں گے۔ بہت اچھے ان کے تعلقات ہوں گے لیکن ان کے علم ان کے آرٹ ان کے اخلاق ان کے رسوم و رواج ان کی عادتوں میں واضح فرق ہوگا۔ وہ جو عرض کیا کہ Manisfitation جو ہیں ان کے مظاہرات ہیں وہ تبدیل ہو جائیں گے۔

اگر ایک گروہ مثال کے طور پر حیات بعد از ممات موت کے بعد زندگی کا قائل ہے اور کتاب حساب پر اور سزا و جزا پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک گروہ مثلاً ایسا بھی ہے۔

اور ایک دوسرا گروہ اسی سرزمین' اسی دھرتی پر اسی جگہ۔ پر اسی ماحول میں زندہ ہے اور وہ آواگون اور زندگی کے چولا بدلنے پر اور بار بار آنے پر یقین کرتا ہے اور تیسرا اسی زمین پر اسی جگہ پر رہتا ہے اور بدنی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ جو ہماری حسی زندگی ہے اور اس کے بعد اندھیرا اور خاتمہ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ڈی کمپوزیشن ہوگئی باڈی کی تو تصور ختم فنش۔ اچھا تو ان تینوں کی ثقافت میں واضح فرق ہوگا۔ خواہ یہ تینوں ایک محدود سی جگہ میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتے ہوں۔ یہ فرق ہوگا۔ ان کی جغرافیائی قربت' ان کے لباس' ان کی زبان اور کسی حد تک ان کے حرکات و سکنات میں اشتراک پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی

ثقافتوں کا بنیادی فرق اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

دیکھئے جیسے جامن اور آم کے پیڑ ہیں ناں؟ یہ ایک ہی قطعہ زمین پر ہوتے ہیں۔ ایک سے پانی سے سیراب ہوتے ہیں ایک سی نمی چوستے ہیں ایک سی فضا میں وہ لہلہاتے جھومتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ الگ الگ پیڑ رہتے ہیں۔ اسی طرح ان بنیادی سوالوں کا جدا جدا حل نکالنے والے الگ الگ رہیں گے۔ اوپر کی شاخیں جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے بھی ملتی رہیں گی۔ آم کی اور جامن کی۔ نیچے ان کی جڑیں ایک دوسرے میں گڈمڈ بھی ہوتی جائیں گی لیکن ان کی جو آئی ڈینٹٹی ہے وہ اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ جامن کو جامن لگے گا اور آم کو آم لگتا رہے گا حالانکہ بہت قریب ہیں اور ان کی شناخت دور سے ہوتی رہے گی۔

دیکھئے یورپ کے مختلف ممالک یا یورپ کے مختلف گروہ خواہ وہ جمہوری ہوں۔ یہ بات ذرا غور سے سنیے گا۔ خواہ وہ جمہوری ہوں خواہ فاسیسی ہوں۔ سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی ہوں۔ مختلف اپنے ذہن میں لائیے یورپ کو ایسٹ یورپین کنٹریز کو بھی ذہن میں رکھیے۔ ویسٹ یورپین کنٹریز کو بھی سامنے رکھیے۔ فرانس' پولینڈ' اٹلی' بلجیم' ہالینڈ' ڈنمارک کو بھی ذہن میں رکھیے۔ خواہ یہ جمہوری طرز اختیار کی ہو زندگی میں خواہ انہوں نے فاسیسی کی ہو۔ سرمایہ دار ہوں اشتراکی ہوں۔ کاریگر اور دستکار ہوں یا پروفیسر اور دانشور ہوں اگر وہ میرے بتائے ہوئے سوالوں کا یہ جو میں نے آپ سے عرض کیے ہیں ابھی ایک سا جواب نکالیں گے تو پھر ان کا کلچر ایک جیسا ہوگا۔ ان کے کوئی پولیٹیکل وہ اثر انداز نہیں ہوگی بات۔ ان کی سوچ ان کا کام کرنا' لوہار ہونا یا پروفیسر ہونا۔ اگر انہوں نے ان سوالوں کا جو میں نے آپ سے عرض کیے۔ میں جواب ایک سا نکالا ہوگا۔ وہ صرف ایک ہی اعتقاد سے بندھے ہوں گے کہ مادی ترقی کی پرستش کی جانی چاہیے۔ یورپ میں یہی چیز ہے اور اس سے فائدہ بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے بڑے فائدے پہنچے ہیں۔ تیز تیز ہوائی جہاز چل رہے ہیں۔ ڈاک تار ٹیلکس چل رہا ہے۔ ریڈیو چل رہا ہے۔ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ یہ ان کی زندگی کی اساس ہے اور مادی ترقی کی پرستش کی جانی چاہیے۔ اس زندگی کو آسان بنانا چاہیے۔ گروہ کے اندر مزید آسائشیں پیدا کرنی چاہئے۔ فطرت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور ہر بات میں عملی افادیت پریکٹیکل یوٹیلیٹی جو ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تو ان کا کلچر ایک جیسا ہوگا۔

کیونکہ ان کے میٹریل Gaim جو ہیں ان کی بنیادی ریکوائرمنٹ ہیں۔ اسی طرح اگر ایشیا کے مختلف ممالک الگ الگ دھرم رکھنے والے۔ ان کا دھرم بھی بالکل الگ ہو اور ان کا اعتقاد ان سوالوں کا ایک جیسا جواب مہیا کرے گا اگر۔ دوئم ان کے مختلف ہیں لیکن جواب ان سوالوں کا ایک سا مہیا کرے گا تو وہ برما یا سیلون میں نیپال میں بھوٹان میں انڈیا میں ہندومت سے تعلق رکھتے ہوں۔ جین مت سے بدھ مت میں بنے ہوئے ہوں۔ اس کے باوجود ایک ہی تہذیب اور ایک ہی ثقافت کے علمبردار ہوں گے کیونکہ انہوں نے ان بنیادی سوالوں کا جواب ایک ہی نکالا ہے۔

آیا خیال شریف میں؛ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ روح ہوتی نہیں ہے چولا بدلتی رہتی ہے۔ نئے نئے روپ اور نئے نئے جسموں میں آتی رہتی ہے۔ ان چکروں میں جزا وسزا کا مسئلہ حل ہوتا رہتا ہے اور کسی کے سامنے حاضر ہو کر اپنی ساری زندگی کا آڈٹ نہیں کرانا پڑتا تو ان کی تہذیب یہ ہے۔ پاکستان کے رہنے والوں نے مجموعی طور پر مل کر ان سوالوں کا جواب بالکل مختلف طریق پر دیا ہے۔ ہم نے خود یا ہمارے بڑوں نے۔ یہ ہم کو عطا کیا ایک ہی ہے کہ یہ دنیا اور یہ کائنات یہ بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بنی اور بغیر چلانے والے کے نہیں چلا۔ یہ انہوں نے اپنا جواب نکالا۔ اب ہم یہ نہیں کہتے کہ کون سا اچھا کیا برا۔ ہم اختلاف بتا رہے ہیں۔ پھر انسان کے لیے جو کچھ فراہم کیا گیا ہے اور جس قدر فراوانی سے فراہم کیا گیا ہے۔ فرض کیجیے سب سے قیمتی شے جو آکسیجن ہے اگر ہم کسی فیکٹری کو یہ ٹھیکہ دے دیں پاکستان والے کو کہ ساڑھے آٹھ کروڑ آدمی کے لیے ہمیں آکسیجن فراہم کریں تو کسی کا پتہ نوٹا ہوگا' کوئی رشوت لے رہے ہوں گے' کسی امیر آدمی کو آکسیجن مل گئی کسی کو نہیں ملی۔ لیکن قدرت اللہ نے جس فراوانی سے انسان کو عطا کیا ہے تو یقین نہیں آتا کہ انسان کی زندگی بے مقصد ہے۔ ایسے نہیں۔ اوا وا آئی نہیں چل رہا ہے۔ کوئی اس کا مقصد ہے۔

پھر ہم کائنات کو دیکھتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ جزوی حیثیت سے نہیں یہ کلی حیثیت سے مکمل ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ Dove Lail کیا ہوا ہے۔ پھر یہ جو کچھ اتنا عطا ہوا ہے اور اتنی بڑی گرامین ایڈ ہر لمحہ ملتی ہے تو اس کے استعمال کا حساب کتاب بھی ہوگا۔ اور جب حساب کتاب ہوگا تو اس کے لیے تیاری بھی لازمی ہے اور جب اس کے لیے تیاری لازمی ہے تو اس کے لیے ایک ٹیوٹر بھی ہوگا اور جب ٹیوٹر مل گیا تو اس کے بنائے ہوئے نوٹس پر بھی عمل کرنا ہوگا۔ ورنہ پاس ہونا مشکل ہے۔ آپ تو اسٹوڈنٹس ہیں' جانتے ہیں کہ کتنا قیمتی اور کتنا پیارا ہوتا ہے ٹیوٹر۔ اور اس کے نوٹس کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے جوابات ہماری گروہی زندگی کے چاک کے اوپر ہماری ثقافت کی کوزہ گری کرتے ہیں چاک جو ہے نا کمہار کا۔ وہ بنیاد جس کلی کے اوپر یہ گھومتا ہے' وہ ان ہی حوالوں کے اوپر ہے اور ہم دوسری تہذیب ثقافت اور دوسرے گروہ سے ممتاز اور ممیز ہوتے رہتے ہیں۔ خواہ ہم کپڑے ویسے ہی پہنیں' بولی وہی بولیں' گانا ویسا ہی گالیں۔ لیکن ہمارے اندر وہ جو ان سوالوں کا جواب ہمارا اپنا پن آف لائف جو ہے ویسا ہی بنتا ہے ایک مختلف رہے گا۔ یہاں آپ پوچھیں گے کہ اگر ان سوالوں کا جواب یہ جو ہم نے نکالے ہیں کوئی اور گروہ بالکل ویسا ہی نکالے' جیسا ہم پاکستانیوں نے نکالا ہے یا ہمارے بڑوں نے نکالا ہے تو اس گروہ کی اور ہمارے گروہ کی ثقافت پھر تو ایک جیسی ہوگی اور ہم تہذیبی اعتبار سے ان سے منسلک ہوں گے۔

خواہ وہ گروہ علاقائی طور پر یا جغرافیائی طور پر ہم سے دور ہی کیوں نہ ہو۔ تو میں پھر عرض کروں گا جیسے کہ میں نے مثال دی کہ جس طرح آم کا پیڑ اپنی ظاہری صورت میں ملتان میں اور طرح کا ہوتا ہے اور افریقہ میں اور انداز کا۔ جاوا میں اس کا قد اور طرح کا ہوتا ہے۔ برما میں چھوٹے پتوں کا ہوگا۔ لیکن اس کی

انگلیت' اس کی شناخت' اس کا قد' اس کا گیٹ اور اس کی چھب جو ہے مقامی ماحول کے مطابق اور مقامی فضا کے مطابق ہوگی لیکن بنیادی طور پر ہوگا وہ آم ہی کا پیڑ۔

پاکستانی گروہ کی شناخت' خواہ وہ اپنے ملک میں ہوں یا لندن میں۔ کینیڈا میں ہو امریکہ میں ہو دوسرے گروہوں سے مختلف ہوگی۔ اور اس کا تشخص اس کی شناخت اپنی ہوگی لیکن' لیکن یہ بہت بڑا ہے لیکن اور بہت اہم ہے۔ اس وقت تک اس کا تشخص قائم رہے گا۔ جب تک کہ وہ ان سوالوں کا جن کا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا' وہی حل نکالتا رہے گا جو اس کو دوسرے گروہوں سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے یا الگ کرتا ہے۔ دیکھئے ناں جوں ہی اس نے مرعوب ہو کر خجل ہو کر یا شرمندہ ہو کر یا کسی اور وجہ سے مجوب ہو کر ان سوالوں کا جواب کسی دوسرے گروہ کے مطابق دینا شروع کیا تو اس کی آرذینٹی ختم ہو جائے گی۔ پھر اس کی شناخت معدوم ہو جائے گی اور پھر وہ اس گروہ کا ایک فرد بن جائے گا۔

حضرت عمرؓ سے حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی کہ اس وقت سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں' جناب آپ اپنا لباس ذرا بہتر کر لیجیے۔ یعنی ان کا مطلب یہ تھا۔ یعنی ان سوالوں کے جواب میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیجیے۔ ذرا سی ڈیویشن فرما لیجیے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا' ابوعبیدہؓ دنیا میں ہم سے اور تم سے زیادہ ذلیل اور بے وقعت اور ہم سے کمتر اور کوئی نہ تھا۔ اللہ نے اسلام کے ذریعے ہم کو عزت عطا کی ہے۔ اب اگر اللہ کے سوا کسی اور ذریعے سے یا کسی اور راہ سے تم عزت کے طالب ہو گئے تو اللہ تم کو ذلیل کرے گا اور اس ذلت سے کبھی نکل نہ سکو گے۔

یہ میں نے آپ کو مثال دی کہ اس پٹین سے نکلنے سے کیا نقصان پہنچتا ہے۔ پاکستانی تشخص اور پاکستانی شناخت کو ڈیٹرمن کر دیں۔ ایک واضح حد بندی کرنے کے لیے میں ایک بہت لمبا چکر کاٹ کر اب اصل مسئلے کی طرف آیا ہوں اور اس مسئلے پر مزید غور کرنا جو ہے میرا کام نہیں ہے۔ یہ آپ کا کام ہے کیونکہ ایک اچھے اسکول ماسٹر کی طرح آپ لوگوں کی راہیں آسان کر دی ہیں۔ میں آپ کی ڈیٹیلز نہیں عرض کروں گا' اس لیے کہ آپ بہت اچھے ہیں اور جب میں نے آپ کی راہیں آسان کر دی ہیں تو پھر میں آپ کے لیے ویسے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

ایک کم بتیس

جب میں میٹرک کرنے کے بعد اپنے ضلع کے بڑے کالج میں داخل ہوا تھا تو میرے منہ میں بتیس کے بجائے صرف اکتیس دانت تھے اور سامنے کے دو دانتوں کے درمیان پھیلی ہوئی جھری آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھی۔ اب تو خیر اس منہ سے کوئی درجن بھر دانت مثیلی اور قدآوارڈاڑھوں سمیت رخصت ہو چکے ہیں لیکن اس وقت ساری کلاس میں غالباً میں ہی ایک نوجوان ایسا تھا جس کے منہ میں طے شدہ دانتوں سے ایک دانت کم تھا۔

ہمارے قصبے میں جنوری کی دس گیارہ بارہ اور تیرہ تاریخ کو ایک بہت بڑا میلہ لگا کرتا تھا جس میں دور دراز کے یاتری شرکت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس میلے کی شان بڑھانے کو یا اس میلے کی شان سے فائدہ اٹھانے کو سرکار انگلیشہ نے اس کے ساتھ مویشیوں کی ایک بہت بڑی منڈی کا اضافہ کر دیا تھا اور یوں یوں ہفتے پر مشتمل یہ میلہ دو ہفتے کی طویل مدت پر پھیل جاتا تھا۔

اس میلے میں برصغیر کے علاوہ سری لنکا' برما' رنگون اور چین کے دستکار بھی شرکت کرتے تھے جو ریڑھیوں' سائیکلوں' گاڑیوں' پتھر تھیلوں پر اپنا سامان بیچا کرتے۔ ایشیا کے سب سے بڑے سرکس اپنے بارہ بارہ ہاتھیوں اور بیس بیس ببر شیروں کے ساتھ مقابلے پر پڑے جماتے تھے اور گورے کمشنر' اینگلو ڈپٹی کمشنر اور دیسی تحصیل دار صاحب سے انعام حاصل کرتے تھے۔ چلتے پھرتے چڑیا گھر..... موت کے گولے..... جادو کے پٹارے..... مذہب تبدیل کرنے والے پادری اور پانچ من آگمدر اٹھانے والے پہلوانوں کی ٹکڑیاں جگہ جگہ نظر آتی تھیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اور اس کی کھڑکی سے کہنی باہر نکال کر میں نے اپنا پہلا Ariel Photo اسی میلے میں کھنچوایا تھا۔

جتنی دیر یہ میلہ رہتا ہمارا سکول قانونی طور پر کھلا مگر حاضری کے لحاظ سے بند رہتا۔ ماسٹر صاحبان سے اکثر ملاقاتیں زندہ ناچ گانے والے شامیانوں کے نیچے ہوتیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب بنگال کی شہرۂ آفاق رنگ ماسٹرنی رُکما بائی کا انٹرویو انگریزی میں لیتے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ ہر رات سرکس

شو دیکھنے کے بعد ہر صبح رنگ ماسٹرنی کا انٹرویو کیا کرتے جو اٹھارہ ببر شیروں کو رنگ میں لا کر باری باری ان پر سواری کیا کرتی۔

جب میں نویں جماعت میں تھا تو اس میلے میں ایک سی شے کا اضافہ ہوا۔ ایک بہت ہی خوبصورت ریل گاڑی کے ڈبے کی شکل میں بنے ہوئے سٹال میں دھاری دار تھری پیس سوٹ پہنے اور لمبا کالا ٹوپ لگائے ایک قد آور انگریز کھڑا مسکرایا کرتا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے لوگوں کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلاتا اور بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے زنبور کو ہوا میں لہراتا۔ ریل کے اسی ڈبے پر رنگ برنگے خوبصورت گتے لگے تھے جن پر مختلف زبانوں میں لکھا تھا "دانت بغیر تکلیف کے اکھاڑے جاتے ہیں" بہت سے بوڑھے جاٹ اور پرانی وضع کے دیہاتی ایک ایک اٹھنی دے کر سٹال کے اندر سٹول پر جا بیٹھتے اور گورا ٹھنڈی پھوار کی ایک پچکاری مار کر ان کا دانت ایک ہی جھٹکے سے باہر نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا کرتا..... تین دن تک تو یہ تماشا میں نے بڑے غور سے اور شوق سے دیکھا لیکن چوتھے دن مجھ سے رہا نہ گیا اور اپنی ماں سے بڑی مشکلوں کے بعد حاصل کی ہوئی اٹھنی گورے کے ہاتھ میں تھما کر اس کے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا کون سے دانت میں درد ہوتا ہے تو میں نے اپنے صحت مند دانتوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے اس کے فن کا کمال دیکھنے لگا۔ جب اس نے ٹھنڈی پھوار ڈال کر میرا دانت سن کیا اور اسے اپنے زنبور سے ٹھکور کر دیکھا تو میں نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس نے پھوار کی پچکاری ایک طرف رکھ دی اور ایک لمبی سوئی والی سرنج اٹھا کر میرے مسوڑھوں میں کڑوی سی دوا کا ایک ٹیکہ لگا دیا۔ پھر اس نے گراموفون میں نئے سرے سے چابی بھری اور انگریزی بینڈ کے میوزک کا توا مخمل کے لٹو سے صاف کر کے باجہ چلا دیا۔ ریکارڈ کے ختم ہوتے ہی وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور ایک مرتبہ پھر زنبور کے ساتھ میرے دانت کو ٹھکور کر دیکھا۔ اب کی بار میں نے جھرجھری نہ لی۔ پھر اس نے زنبور کی آہنی ڈنڈی ڈال کر ایک ہی جھٹکے میں میرا دانت نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ میں نے اس کے کمال فن کے سامنے اپنی عقیدت کا سر جھکا دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر اور دو دانتوں کے درمیان نئے درزے میں روئی کا بڑا سا پھنبہ پھنسوا کر خوش خوش گھر آ گیا۔

مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آ سکی کہ مجھے دیکھ کر پہلے میری ماں روئی کیوں اور پھر اس نے اپنا سلیپر اتار کر میری مرمت کیوں شروع کر دی..... میں حیران تھا کہ میری اتنی شفیق ماں جو ہماری بیماری کے دوران رات بھر ہمارے سرہانے بیٹھ کر جاگتی رہتی تھی۔ آج اس قدر بے رحم کیوں ہو گئی تھی۔

میری ماں اور میں تب یہ نہ سمجھ پائے تھے کہ ثقافت کے نئے پانی اسی طرح دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں اور راتوں رات چڑھ آنے والے سیلاب کی طرح بہت کچھ بہا لے جاتے ہیں اور نئی ترغیبات کے انبار یوں لگاتے ہیں کہ اس خام مواد سے نئی ثقافت کے محل مینارے اسارے جاتے ہیں..... پرانی نسل اس کوشش میں مبتلا رہتی ہے کہ پرانے محل، پل، باغ باقی رہ جائیں.....نئی نسل کدال پھاوڑے لے کر

ڈھاتے جاتے ہیں.....اسارے رہیں.....اسی تبدیلی اکھاڑ پچھاڑ سے تبدیلی آتی ہے نئے پانی پرانے دریا میں شامل ہوتے.....

یہاں میں وضاحت کرتا چلوں ثقافت اچھی یا بری نہیں ہوتی' صرف Traditional اور نوخیز ہوتی ہے۔ کچھ لوگ پرانی ثقافت کی پراگندگی سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور کچھ پرامید..... کچھ تبدیلی پر آمادہ ہوتے ہیں اور کچھ گریزاں لیکن تبدیلی راتوں کو روند پر نکلنے والے چیتے کی طرح پھرتی ہے.....شکار پر آمادہ اور خود شکار بن جانے کے آسیب سے خوفزدہ.....

نئی ثقافت

پتہ نہیں آپ بھی میری طرح سے کسی بڑے شہر میں رہتے ہیں یا نہیں لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ ہمارے یہاں جو نوادرات کی دکانیں ہیں وہ آپ کے شہر میں بھی ضرور ہوں گی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ انہیں کباڑیے کہہ کر پکارتے ہوں گے۔ جوں جوں آپ کے یہاں علم عام ہوگا اور آپ کے ہم شہری ثقافت سے آراستہ ہوتے جائیں گے' آپ کباڑ خانوں کو Antique Shops کا نام دینے پر بھی مجبور ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں جس طرح خلیفہ علم کی روشنی میں ہیئر ڈریسر کہلانے لگتا ہے اسی طرح کباڑیا 'نوادرات فروش بن جاتا ہے اور اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس وقت ہمارے یہاں نوادرات کی دکانوں میں دو چیزیں بہت مقبول ہیں اور ان کو خریدنے یا کم از کم دیکھنے کے لیے دور دور کے لوگ چلے آتے ہیں اور اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ ان میں ایک شے سوڈا واٹر کی بوتل ہے جس کے اندر شیشے کی ایک گولی بوتل کے گلے میں ایک جھری پر آگے پیچھے بلا کرتی ہے۔

ہمارے زمانے میں سوڈا واٹر کی پہلی بوتلیں رائج تھیں اور گیس کے زور پر ان کی شیشے کی گولی خود بخود ابھر کر بوتل کے منہ میں ڈٹ جایا کرتی تھی۔ نیچے سے گیس کا دباؤ' اوپر بوتل کے منہ میں ربڑ کے چھلے کا چپکاؤ اس گولی کو نہ باہر نکلنے دیتا تھا نہ نیچے گرنے دیتا تھا۔ میرا بیٹا ایسی ہی ایک بوتل 70 روپے میں خرید کر لے آیا ہے اور اس کے ساتھی بوتل کے اندر پلتی ہوئی گولی کو دیکھ کر حیران بھی ہوتے ہیں اور خوش بھی۔ وہ سب مل کر یہ بوتل میرے پاس لائے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ اس کے اندر لیمونیڈ سوڈا واٹر کس طرح سے بند ہو سکتا ہے اور بھری ہوئی بوتل بغیر چھلکے کس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائی جا سکتی ہے۔

میں کوئی گھنٹہ بھر تک ان کو سمجھاتا رہا لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی آگہی اور آشنائی کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ اُس روز مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی بڈھا ہو گیا ہوں اور اب مجھ میں سمجھانے کی قوت باقی نہیں رہی۔

پرانا مال اور پرانی چیزیں فروخت کرنے والی ان دکانوں پر آپ کو وہ پرانے قلم بھی مل جائیں گے

جن میں ذرا پر سے سیاہی پڑتی ہے اور جن کی نب چڑھانے میں کم از کم سو چوڑیاں چڑھائی جاتی تھیں پھر بھی روشنائی لیک ہو کر انگلیوں اور انگوٹھے پر سیاہی کے کھیت پھیلا دیتی تھیں۔

یہاں آپ کو وہ میز کرسیاں بھی نظر آئیں گی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تصویروں میں دکھائی دیا کرتی ہیں جن پر ایک گورا بیٹھا سگار پی رہا ہوتا ہے اور دیسی بیرا اس کے سامنے گلاس تھامے کھڑا ہوتا ہے لیکن آپ ان کرسیوں پر بیٹھ نہیں سکتے صرف ان کو دیکھ سکتے ہیں کیونکہ اب وہ زیادہ سے زیادہ آپ کی نظر کا بوجھ ہی سہار سکتی ہیں۔

پھر ان دکانوں میں کبھی کبھی وہ موٹے موٹے ریکارڈ بھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں جن کو عرف عام میں توا کہا جاتا تھا اور جو صرف 78 کی سپیڈ پر چلتا تھا۔ ان ریکارڈوں سے جو آواز نکلتی ہے وہ سمجھ میں تو نہیں آتی البتہ گانے والے کا نام ضرور صاف سنائی دے جاتا ہے جو آخر میں جلدی سے اپنے صوتی دستخط کیا کرتا تھا کہ میرا نام بھائی چھیلا پٹیالے والا مشہور گویا۔ لیکن یہ توا جو اپنے زمانے میں چودہ آنے کا ملتا تھا اب پچیس روپے سے کم میں دستیاب نہیں ہوتا۔ لوگ زیادہ تر یہ توے گھر لے جا کر ان سے اپنے میوزک روم کی دیواریں مزین کرتے ہیں اور جب ان سے جی بھر جاتا ہے تو پھر بارہ بارہ آنے کے حساب سے کباڑیے کو فروخت کر دیتے ہیں۔

پرسوں میری منجھلی بہو نوادرات کی اسی دکان سے شیشے کا وہ فیڈر خرید لائی جس کے دونوں طرف سوراخ ہوا کرتے تھے اور جس کی شکل پانی پر بیٹھی ہوئی مرغابی کی سی ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر انہی فیڈروں کا دودھ پی کر یہاں تک پہنچے ہیں اور انہی کی بدولت زندگی سے ہمارا رشتہ قائم رہا ہے لیکن یہ فیڈر ماں کا نعم البدل کبھی بھی ثابت نہیں ہو سکے۔ انہیں بچے کے ہاتھ میں چھوڑ کر مائیں پرے نہیں جا سکتی تھیں بلکہ اس کا ایک سرا تھام کر انہیں ضرورت کے مطابق اٹھاتی بٹھاتی رہتی تھیں۔ آجکل کے فیڈر مائیں بچے کے ہاتھ میں دے کر شاپنگ کرنے چلی جاتی ہیں۔ بچہ اسی سے دودھ بھی پیتا ہے اور اسے گیند کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ جب چاہے آسانی کے ساتھ منہ سے نکال کر پل بھر کو رو بھی سکتا ہے اور باہر جا کر ماں کی راہ بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس بوتل کے اندر دودھ نہیں ہوتا فارمولا ہوتا ہے۔ دوسری طرف بھی بچہ نہیں ہوتا۔ ایک فارمولا ہی ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ماں کا جوڑ نہیں ہوتا..... میری بہو نے ہنس کر کہا اس بوتل سے بچے کو دودھ کیسے پلاتے تھے' اس کے تو دونوں ہی منہ کھلے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا اس زمانے کی ماؤں کو دودھ پلانے اور لوری دینے کے سوا اور کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ دو موہوں والے فیڈر کو آسانی سے سنبھال لیتی تھی ان کے وجود کے بھی منہ کھلے ہوتے تھے ایک دودھ پلانے والا منہ دوسرا لوری دینے والا مونہہ!

روایتی معاشرہ

میں آپ سے کیا کہوں کہ میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ نہیں کیونکہ میں ایک روایتی ثقافت کا نمائندہ ہوں۔ میں ماضی کا ایک کانٹوں بھرا کیکر ہوں اور آپ مستقبل کے سرسبز و شاداب سرو سمن ہیں۔ آپ کے ساتھ میری اور میرے ساتھیوں کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی جب میں آپ کو پی آئی اے کا پائجامہ اور اے شیپ کا کرتا پہنے اور اپنے دفتر کی پڑوسن ربیکا کا باندھا ہوا جوڑا ننھے سے سر پر اٹھائے دیکھتا ہوں تو مجھے دوسرے بزرگوں کی طرح گراں نہیں گزرتا۔ آپ کی روح تازہ اور آپ کا یقین محکم ہے کیونکہ اب بھی آپ کے اس لباس پر جب کبھی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں تو میں دور سے دیکھتا ہوں کہ اذان کے وقت آپ کے ہاتھ بے اختیار اپنی اوڑھنیوں پر جاتے ہیں اور آپ اپنا سر ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس وقت مجھے ایسے خاردار کیکر میں بھی امید کے پیلے پیلے پھول نمودار ہونے لگتے ہیں اور ان کی بھینی بھینی خوشبو دور دور تک پھیلنے لگتی ہے..... جب تک آپ کے کندھوں پر اوڑھنیاں موجود ہیں میں آپ سے مایوس نہیں ہوں اور جب تک میرا اپنا سر ننگا ہے اور میں اپنا لباس اتار کر ولایتی ملبوس پہن چکا ہوں میرے پاس اپنے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہیں.....

بڑے برسوں کی بات ہے آپ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ میری ماں اور میری خالہ بھی اس طرح میک اپ کیا کرتی تھیں۔ ہمارے ملک میں سنگر مشین نئی نئی آئی تھی جس گولی کا دھاگا اس میں چلتا تھا، اس میں سرخ رنگ کا ایک گول سا لیبل گولی کے اندر پھنسایا ہوتا تھا۔ اس لیبل کا رنگ کچا ہوا کرتا تھا اور میری والدہ اور کراچی والی خالہ کپڑے سینے سے پہلے اس لیبل کو نکال کر ذرا سا لب لگا کر اسے اپنے ہونٹوں پر ملا کرتی تھیں۔ اس سے ان کے ہونٹ لال یاقوت ایسے ہو جاتے تھے اور بے چارہ لیبل اپنا سارا رنگ چھوڑ کر سفید کاغذ کا ایک ٹکا سا رہ جاتا تھا۔ اس وقت میری ماں اور خالہ بڑی پیاری لگا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہماری نوکرانی سرداراں نے دھاگے کی دو گولیاں چرائی تھیں جو اس کے کرتے کی پہلو والی جیب سے برآمد ہو گئی تھیں۔ میری ماں نے اسے کپاس کی چھڑی سے مارا تھا اور میں نے تختی لکھتے ہوئے یہ سارا ڈرامہ اپنی آنکھوں

سے دیکھا تھا اور اس کا میرے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔

.....ہمارے یہاں اکثر ریڈیو پر ٹیلی ویژن پر اور دوسری مجلسوں میں مردوں اور عورتوں کے درمیان مباحثے ہوا کرتے ہیں کہ عورت کو معاشرے میں وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اس کا پیدائشی حق ہے اور اسے وہ درجہ نہیں دیا جا رہا ہے جس کے لیے وہ وجود میں آئی ہے۔ میں نہایت عاجزی سے اور خلوص نیتی سے عرض کروں گا کہ اپنا حق جھولی پھیلا کر یا بھک منگوں کی طرح دوسروں کو زچ کر کے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تو منوایا جاتا ہے۔

میں مردوں کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ایک عام مشاہدے کی بات کرتا ہوں کہ مجلسی زندگی میں جب مرد لوگ یک جا ہو جاتے ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع بڑا رنگا رنگ اور بڑا انفرمیشن زدہ ہوتا ہے۔ اس میں عام ہلکی پھلکی باتیں بھی ہوتی ہیں اور اپنے اور اپنے گردوپیش کے متعلق نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ اس میں لطیف اشارے بھی ہوتے ہیں اور سوچ کی گہری لہریں بھی ہوتی ہیں۔ یہی وہ سوچ ہے اور یہی وہ احساس ہے جس نے مردوں کو عورتوں پر فوقیت دے رکھی ہے اور یہی وہ طرزِ زیست ہے جس کی بنا پر وہ برتری کا تصور پیش کرتے ہیں.....

عورت انفرمیشن کی جگہ رابطوں کی زبان بن جاتی ہے اسی لیے مجلسی زندگی میں کمتر محسوس کرتی ہے۔ یہ بھی ثقافت ہی کی ایک کروٹ ہے جب عورت اپنے منفرد مقام پر فائز ہوا اور اس کی حیثیت معاشرے اور گھر میں قابلِ احترام ہو۔ آپ کو شہر میں ایسے رکشا نظر آئیں گے جن پر لکھا ہوگا "ماں کی دعا" تو سمجھ لیجیے یہاں ایک روایتی معاشرہ قائم ہے اور خاندان کی شکل Extended family کی ہے.....معاشرے میں عورت اور خاص کر ماں کے لیے عزت اور تقدس کی کمی نہیں۔

جہاں آپ کو عورت گھر میں Boss نظر آئے چیک وہ لکھ کر دے۔ فیصلے وہی صادر فرمائے اور منوائے۔ کار کی چابی اس کے پرس سے برآمد ہو۔ محفلوں میں وہ گفتگو پر حاوی ہو۔ دوستوں کا انتخاب عورت کرے تو پہچان لیجیے کہ اس معاشرے اور گھر کی ثقافت پرانی نہیں.....خاندان یقیناً سمٹ کر مرکزی گھرانے میں بدل چکا ہوگا اور مرد اور عورت کے رول ادل بدل چکے ہوں گے.....یہ ثقافت ہو سکتا ہے صنعتی انقلاب کی پیداوار ہو۔ یہ بھی ممکن ہے عورت چادر اور چار دیواری سے گھبرا کر اپنے لیے مردانہ حقوق کی طالب بنی ہو..... وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن ایسے معاشرے میں نئی ثقافت کا پانی بڑے جوش سے پرانے ثقافتی دریا میں شامل ہو رہا ہوتا ہے۔

پچھلے زمانے کی ثقافت میں مرد اور عورت کو بچپن سے اپنے اپنے Biological رول کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ بیٹے کو چوٹ لگنے پر رونے کی اجازت نہ تھی۔ شام کے اندھیروں میں اسے بازار بھیجا جاتا تھا۔ سودا سلف خریدنے کے لیے ٹوکری اسے پکڑائی جاتی تھی۔ مرگ شادی میں وہ باپ کے ساتھ شامل کیا جاتا۔

ماں کو کچھ بیٹے سے دشمنی نہ تھی۔ وہ اسے اپنی آیندہ زندگی میں کواموِن بننے کی تربیت بچپن سے دیتی تھی۔

بیٹے کو نو عمری میں علم ہوتا کہ باپ کے مرنے پر وہی بہنوں کی شادی کرے گا' ماں کو سنبھالے گا اور چھوٹے بھائیوں کو زندگی کے راستے پر لگائے گا..... بیٹی کو خدمت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایثار اور قربانی ان کی تربیت کا بنیادی حصہ تھا۔ اگر بیٹی گھر والوں کو روٹیاں پکا کر کھلاتی اور بعد میں کھانا کھاتی تو یہ ظلم یا ترجیحات کا معاملہ نہیں تھا۔ باپ اور بھائیوں کی سیوا میں مگن بیٹی یا بہن مظلوم نہیں تھی۔ وہ اپنے حیاتیاتی رول کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔ اس ایثار اور قربانی سے سسرال والوں کی خدمت یا شوہر کی باندی بننا مقصود نہ تھا بلکہ ننھے بچے کی بے لوث خدمت کے لیے تیار کرنا تھا۔ صدیوں سے ماں باپ کو علم تھا کہ شوہر اور سسرال والے تو پھر بھی سمجھ جائیں گے لیکن راتوں کو جاگے بغیر دن رات خدمت لیے بنا بچہ نہیں پل سکتا..... بیٹی پر ایک دن اچانک خدمت کا پہاڑ نہ ٹوٹے۔ شروع سے اسے خدمت کے قابل بنایا جاتا تھا۔

مرد کی سعی اور طور کی تھی کہ وہ روزی کے لیے بیرونی زندگی کی اونچ نیچ کو برداشت کر نا سیکھتا۔ عورت بچے سے وابستہ ہو کر گھر' اقدار اور انسانیت کے مستقبل کی ضامن ٹھہرتی۔ پرانی ثقافت میں مرد اور عورت کے رول Defined تھے..... اور دونوں گھریلو زندگی کو باہمی میل جول سے نپٹاتے تھے۔ نئے کلچر میں مرد اور عورت کے رول Defined نہیں ہیں۔ ان دونوں میں Co-operation کے بجائے مقابلہ کی صورت پیدا ہو گئی.....

پراپرٹی' دولت' ملازمت' آزادی ان سب کی طرف اب عورت بھی ان ہی حریص نگاہوں سے دیکھتی ہے جیسے پہلے مرد دیکھا کرتا تھا..... مغرب نے شہری اور دیہاتی معاشرے میں نئی ثقافت کے چلن کو فرداً فرداً اور گروہ در گروہ پھیلا دیا ہے اور اب نئی سوچ کے آگے پرانی تعلیم و تربیت منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔

مشرق کے تعلیم یافتہ گھرانوں میں عورت اور مرد کے تعلقات پر جس طرح مغربی ثقافت اثر انداز ہوتی ہے' اس کے اثرات تو واضح ہیں لیکن عمر رسیدہ افراد اور نوجوان نسل کے مابین جو سرد جنگ چل پڑی ہے وہ بھی مشرقی ثقافت کے لیے واقعتاً بہت نئی چیز ہے۔ گو ابھی یہ ثقافتی مسئلہ اپنے پورے قد کو نہیں پہنچا۔

کلچر اور معاشرہ

آپ کے نقطہ نظر سے ابھی ابھی جب میں نے نگاہ ڈالی تو مجھے اچانک یوں لگا جیسے میں کلچر کا غلط مطلب سمجھ گیا ہوں اور بالکل ہی الٹ نتائج اخذ کرنے بیٹھا ہوں اور آپ کی توقعات سے بھٹک کر ایک ایسی وادی میں جا نکلا ہوں جہاں چرنے چگنے کی شرفا کو اجازت نہیں ہے اور جس میں اترنے والے کے استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ کیونکہ نئی ثقافت والے اتنی جلدی لوٹا نہیں کرتے اور اب مجھ سے بھی لوٹا نہیں جاتا تھا یا کم از کم اتنی تیزی سے لوٹا نہیں جاتا تھا جس تیزی سے درخت کے ایک ٹہنے سے چھلانگ مارنے والا لنگور دوسرے ٹہنے پر ہاتھ نہ پڑنے سے فضا کے اندر ہی چک پھیری لے کر واپس آ جاتا ہے۔

کچھ نئی ثقافت کے دلدادہ نوجوانوں نے مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ ہمیں اپنے معاشرے میں عمر رسیدہ افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہر وقت مستعد رہنا چاہیے۔ یونیسکو نے سن چوراسی کو بڈھوں کا سال قرار دیا ہے اور نوجوانوں سے توقع کی ہے کہ وہ کم از کم اس سال میں عمر رسیدہ لوگوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آئیں گے اور ان کی تیرہ و تار زندگیوں میں اپنے حسن سلوک کے چراغ روشن کریں گے.....

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر ہماری زندگیوں میں یو این او اور یونیسکو جیسے ادارے نہ ہوتے یا ہمیں رومن لاء کی روشنی نصیب نہ ہوئی ہوتی اور ہمیں مغربی جمہوریت کا سہارا نہ ملا ہوتا یا پھر اگر ہمیں مغربی ثقافت کی روشنی نصیب نہ ہوتی تو ہماری زندگی کس قدر بے نور، بے سہارا اور بے کیف ہوتی.....

سن چوراسی کی برکت سے سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی کہ ہمارے درمیان ایک کمیونٹی عمر رسیدہ لوگوں کی بھی ہے اور اس کی طرف خصوصی توجہ دی جانے کی ضرورت ہے، جس طرح ایک زمانے میں انگریز کے حکم سے شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کو خصوصی مراعات دی جاتی تھیں، اسی طرح یونیسکو کی تجویز پر ہم عمر رسیدوں کو بھی خصوصی توجہ ملنے لگے گی اور ان کے لیے بھی ہر جگہ نشستیں مخصوص ہونے لگیں گی.....لیکن مشرقی ثقافت میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص تو اصل زندگی ہی بزرگوں کی ہے۔ باقی

عرض مصنف

لے کر کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی مغربی ممالک
کے لوگ تو ان کے طفیل زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ سے
میں جب وہاں کے صحافیوں سے اور دانشوروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور وہ پاکستان میں مظلوم و مقہور طبقہ نسواں
کی زندگیوں پر خون کے آنسو روتے ہیں تو میں ان سے ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اصل وجہ
صحیح برتری اور خالص محبوبیت تو صرف بزرگوں کے حصے کی چیز ہے اور ان میں سے سب سے اونچا درجہ خواتین
کا ہے۔ ہمارے ملک کا کلچر دراصل ابھی تک Matriarchal ہے اور یہاں کوئی کام عورتوں کی مرضی منشا اور
ان کی Sanction کے بغیر نہیں ہوتا۔ خاص طور پر ماں کی Sanction کے بغیر تو ہمارے یہاں کسی کام کا کوئی
تصور ہی نہیں۔ آپ نے مرا اخباری انٹرویو میں پڑھا ہوگا اور ریڈیو ٹی وی پر مشاہیر کے ساتھ گفتگو میں اکثر سنا
ہوگا کہ جناب یہ سب کچھ میرے بزرگوں خاص طور پر میری والدہ کی دعاؤں کا اثر ہے جو میں اس مقام پر پہنچ
گیا ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر اصل کا بالکل معمولی انسان ہوں اور میری اپنی صلاحیت صفر کے

برابر ہے۔
یہ صرف لکھنے یا کہنے کی باتیں نہیں ہیں۔ لوگ ان پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر ان کا سو فیصد ایمان
ہے۔ پھر یہ تعلق یک طرفہ نہیں ہے۔ بزرگ لوگ بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ اسی والہانہ انداز میں مبتلائے
محبت ہیں جس طرح نوجوان عقیدت میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے کلچر کی یہ ایک مخصوص خوشبو ہے اور یہ خوشبو
اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک اس مٹی پر لگاتار بچھ کر اس کی مضبوط کارپٹنگ نہیں ہو جاتی۔
پچھلے سے پچھلے سال ہم ہنزہ گئے تو آپ عمر عماد اور مسعود کو تو جانتے ہی ہیں وہ سب سے پہلے وہاں
کے عمر رسیدہ لوگوں کو تلاش کرنے لگے جن کے بارے میں انہوں نے انگریزی اور امریکی رسالوں کے قصے
کہانیوں میں پڑھا تھا۔ وہاں کے تار بابو نے ہمیں ایک بڈھی اماں سے ملوایا جس کی عمر اٹھانوے سال کی تھی
اور جس کے تین بیٹے اس کی نظروں کے سامنے فوت ہو چکے تھے۔ اماں نے کہا "کیا بتاؤں بچو! میرا آخری بیٹا
تو تم لوگوں کے آنے سے ڈھائی مہینے پہلے مرا ہے۔" عمر نے پوچھا۔ "اس کی کتنی عمر تھی اماں۔" اماں نے آنسو
پونچھ کر کہا۔ "اکہتر سال اور چار مہینے کا تھا جب وہ فوت ہوا ہے۔ اچھا بھلا تھا بس اس کو نظر ہی کھا گئی۔"
"اچھا تو پھر؟" عماد نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تو تم اکیلی ہوگی اماں۔"
"خدا نہ کرے۔ اللہ وہ دن نہ لائے۔" اماں نے چمک کر کہا۔ "میرا سب سے چھوٹا، خدا اس کو رہتی
دنیا تک سلامت رکھے، وہ سامنے کھیت میں کام کر رہا ہے اس لال گائے کے پیچھے۔"
ہم سب نے مڑ کر دیکھا۔ ایک سفید داڑھی اور سفید بھنوؤں والا بزرگ لال گائے کے پاس بیٹھا
کھیت کی نلائی کر رہا تھا۔
اماں رونے لگی اور اپنے پلو سے ناک پونچھنے لگی۔ ہم سب کو اپنی اپنی جگہ پر اس سوال جواب سے
ذرا شرمندگی سی ہوئی اور ہم وہاں سے کھسکنے لگے تو اماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "بچو! میرے اس بیٹے کے

لیے دعا کرنا۔ اس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ رات کو کھوں کھوں کرتا رہتا ہے۔ اٹھتا ہے تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا ہے۔ دور دیکھنا ہو تو دونوں آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا سائبان بنا کر دیکھتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے اس سب سے چھوٹے بچے کو اچھی طرح سے پال پوس نہیں سکوں گی اور اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اس کی غور و پرداخت نہیں کر سکوں گی۔"

پھر وہ قدرے بلند آواز میں رونے لگی اور اپنی زبان میں نوحہ سا کرنے لگی جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ اے خدا مجھے معاف کرنا اور میرا مواخذہ نہ کرنا کہ میں اپنے چھوٹے بیٹے کو اس توجہ سے نہیں پال سکی جس توجہ سے میں نے اپنے بڑے بیٹوں کی پرورش کی تھی۔

خدا کی قسم یہ سیاستدان اور حکمران تو ایسے ہی مارے مارے پھرتے ہیں۔ پاکستان میں جو مزا نانا یا دادا بن کر آتا ہے وہ مزا ایکسی لینسی یا یوئر ہائی نس یا عزت مآب بن کر بھی نہیں ملتا۔

ایک سردیوں میں ہم بابا فرید کے عرس پر حاضر تھے۔ تو ساتھ والے قبرستان میں سبزی ترکاری کترتے وقت بڑے بزرگوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری ہوگئی۔ ان کی آپس کی نوک جھوک سے نوجوان بھی مزا لے رہے تھے اور محفل پر ایک عجیب طرح کی سادگی اور ستھرگی کی مفاہمت پھیلی ہوئی تھی، جس طرح دیگوں میں پکنے والی دھلی ہوئی رسد پر کچی ململ کی چادریں پھیلی ہوتی ہیں۔ بادام کی گریاں چھیلنے والے بانوے پچانوے سالہ بابے نور سمند کو دوسرے بزرگ مذاق کر رہے تھے کہ اس نے ساری زندگی سوائے بوڑھا ہونے کے اور کوئی خاص کام نہیں کیا۔ نوجوان اس فقرے بازی سے خوش ہو رہے تھے اور کبوتروں کی طرح گٹک رہے تھے۔ بابے نور سمند نے اپنی تھالی پر ہاتھ روک کر کہا۔ "اوئے کتیو! میں کوئی ایسے تو نہیں بوڑھا ہو گیا بے دھیانے میں۔ مجھے اس رتبے پر آنے میں پانچ اوپر پورے نوے سال لگے ہیں۔ کوئی مخول ہے۔"

ایک نوجوان نے الا اللہ کر کے بابے نور سمند کو تھبہ بھر کر اس کی تالی سمیت گود میں اٹھا لیا اور دوسرے نے آگے بڑھ کر اس کی رانوں میں سر دے کر اس کو کندھوں پر بٹھا لیا۔ تین ڈھول والوں نے اٹھ کر ایک ساتھ ڈنکے کی چوٹ لگا دی۔ لوگوں نے بابے نور سمند کے گرد دھمال ڈالنی شروع کر دی اور بابا کندھوں پر چڑھا ہوا باداموں کی رکابی ہاتھ میں تھامے ایک ہی رٹ لگا رہا تھا "اوئے سور و میرے بدام ڈل گئے اوئے کتیو میری پگ کھل گئی۔ اوئے کوئی حیا کرو..... بس کرو..... اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر تردد کے آثار بھی تھے کہ یہ دھمال جلدی ختم نہ ہو جائے اور نوجوان مجھے جلدی پھر زمین پر نہ اتار دیں۔ ابھی تک ہماری ثقافت کا یہ پہلو نمایاں ہے لیکن بدلتے وقت کے ساتھ اس کی لمبی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔

آپ کے شہر لاہور سے قریب ضلع شیخوپورہ میں ایک چھوٹا سا بہت ہی خوبصورت گاؤں ہے۔ ڈھاباں سنگھ والا۔ سٹیشن پر اتر کر پیدل یا گھوڑے پر نو میل اندر جانا پڑتا ہے۔ ہم سن چھیالیس میں سائیکلوں پر

لاؤڈ سپیکر اور ایمپلی فائر باندھ کر ملت کا پاسبان ہے محمد علی جناح گاتے ہوئے ادھر جایا کرتے تھے۔ اس گاؤں کا چودھری بہت ہی شریف النفس نوجوان تھا' جو اپنے والد کی اچانک موت پر ایف سی کالج کی تھرڈ ایئر کلاس سے اٹھ کر اپنی موروثی چودھراہٹ کی گدی پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ نوجوان بہت ہی افسردہ اور ملول رہتا تھا اور کوئی غم اس کو اندر ہی اندر کھائے چلا جاتا تھا۔ ایک روز ہمارے اصرار پر اس نے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم خاندانی لوگ ہیں اور اس گاؤں کے دوسرے سارے لوگ بھی نسل اور رتبے کے اعتبار سے اصل کے خاص جانگلی ہیں۔ وہ جانگلی جن کے آباؤ اجداد نے سکندر اعظم کے ساتھ جنگ کی تھی اور اس کو کاری زخم لگایا تھا۔ لیکن اب ہم میں وہ بات نہیں رہی۔ ہمارے گاؤں میں لوگ تپدق سے بھی مرتے ہیں۔ نمونئے سے بھی اور لڑائیوں میں پھٹ لگ جانے سے بھی۔ لیکن ہمارے گاؤں میں آج تک کوئی شخص بھی ہارٹ اٹیک سے فوت نہیں ہوا اور یہ ہمارے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ اور شہروں کے معززین اکثر ہارٹ اٹیک سے فوت ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ابھی تک وہی پرانی بیماریاں چل رہی ہیں۔

بابا نوح کے زمانے کی اور ہمارے گاؤں نے کوئی ترقی نہیں کی..... اس زمانے میں ہارٹ اٹیک کی بیماری نئی نئی نکلی تھی اور اس کا اخباروں میں بڑا تذکرہ تھا۔ پھر ماناں والے کے سکھ سرداروں میں بھی تین موتیں ہارٹ اٹیک سے ہوگئی تھیں جن میں سے ایک عورت بھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارا تھرڈ ایئر والا چودھری اور بھی پریشان رہنے لگا تھا۔ ہم نے اس کو بڑی تسلی دی کہ ایک نہ ایک دن انشاءاللہ یہاں بھی لوگ ہارٹ اٹیک سے فوت ہونے لگیں گے لیکن اس کی تشفی نہ ہوتی اور وہ ہماری یقین دہانی کو طفل تسلی سمجھتا رہا..... میرا مطلب ہے کہ آج تک تو ہمارے یہاں بزرگوں کا احترام اور بڑوں کی عزت ہماری ثقافتی زندگی کا ایسا جزو بنی ہوئی ہے کہ جس کے بارے میں ہم Concious نہیں ہیں اور وہ اپنا فنکشن اسی طرح سے کر رہی ہے جس طرح اس وقت ہمارے بدن کے اندر جگر اور گردے کام کر رہے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں کہ ایک نہایت ہی اہم حیات بخش اور حیات افزا کام اپنی حیثیت اور اپنی اہمیت جتائے بغیر ہمارے وجود کے اندر باقاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے..... لیکن آج کے بعد کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔

اگر یونیسکو کے کہنے پر 1984ء کو سال بڈھا گان قرار دے دیا گیا ہے اور اس کو زور و شور سے منانا شروع کر دیا تو مجھے یقین ہے کہ تھرڈ ایئر والے نوجوان چودھری ضرور یہ بات سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہمارے لیے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں بوڑھوں کے ساتھ احترام اور عقیدت کے ساتھ پیش آیا جائے جبکہ مغرب جیسے تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ملکوں میں بوڑھوں کو اپنے سے پرے رکھ کر ایک مظلوم اور مجبور کمیونٹی کے طور پر ان سے مربیانہ انداز میں پیش آیا جاتا ہے۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے گاہے بگاہے جلسے وغیرہ کرائے جاتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کسی نے یہ پرچہ لگا دیا کہ اگر اپنے ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا فروغ چاہتے ہو تو سارے بڈھوں کو چولستان میں کیمپ لگا کر وہاں منتقل کر دو تو پھر سارے پاکستان میں تین دن

کے اندر اندر کوئی بڑھا نہیں ملے گا۔ اور چولستان میں کیمپ بھی نہیں لگے گا۔

اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی ہمیں اپنی ہر شے سے عزیز ہے اور اس کے لیے ہم ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ بزرگ تو بزرگ اس کے لیے ہم اپنے بچوں کی قربانی دینے کو بھی تیار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے زندگی اور موت زنِ نفم ــــــ سووزیاں جو کچھ بھی ہے وہ یورپین اور یونیسکو اور بیرپاوروں کے قبضہ قدرت میں ہے اور ہم ان کی مرضی اور ایما کے بغیر اپنی پسند کا ٹک تک نہیں پہن سکتے۔ پھر میں کس طرح سے عرض کروں کہ بزرگوں کے ساتھ ہمارا رویہ اور اس سلسلے میں ہماری ذمہ داریاں کیسی ہونی چاہئیں جو وہ ادھر والے کہہ دیں گے وہی ہمارا رویہ ہوگا۔ جو وہ ڈال دیں گے وہی ہماری ذمہ داری ہوگی اور جس طرف وہ اشارہ کردیں گے ادھر ہی ہم چلتے رہیں گے۔

سائنس ہو یا معاشرہ ثقافت ہو یا اخلاقی قدریں اب ہم مسئلے کو مغربی عینک سے دیکھنے کے لیے تیار ہیں۔ ٹیکنالوجی سے لے کر کلچر تک تمام گائیڈ بکس وہیں سے آتی ہیں اور ہم بدلتے وقت اور بدلتے کلچر میں مغرب کی طرف منہ کر کے ہی لبیک لبیک پکارتے ہیں۔

تعلیم و تعلم کی اسلامی نہج اور ذرائع ابلاغ

ہمارے یہاں ذرائع ابلاغ کے واضح اور بین ادارے چار ہیں۔

1۔ ریڈیو

2۔ ٹیلی ویژن/فلم/ویڈیو کیسٹ

3۔ اخبار

4۔ ادب

ریڈیو

ان ذرائع ابلاغ میں ریڈیو کی روایت ہمارے ملک کی کافی پرانی روایت ہے اور ایک سرکاری ادارہ ہونے کی حیثیت سے اس کی کارکردگی بہت حد تک درست، ہموار اور ہماری ملکی اقدار کے مطابق ہے۔ ریڈیو کی نشریات میں تفریحی پروگرام بھی شامل ہیں اور معلوماتی' اخلاقی اور دینی بھی۔ اس ذریعہ اظہار کو اگر کمیشن کوئی تجویز دے گا تو ریڈیو آسانی سے اور خندہ پیشانی سے اسے قبول کرے گا۔ اگر ریڈیو کو اس کی نشریات میں کمیشن کسی کجی کی نشاندہی کرے گا تو ریڈیو اس کو درست کرنے کی اس لیے کوشش کرے گا کہ یہ اس کی روایت کا ایک حصہ ہے۔

1۔ اس وقت فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ ریڈیو پاکستان پر (غروب آفتاب سے پہلے) ایک تعلیمی چینل شروع کیا جائے گا جو ہر طرح کی تدریس کے لیے وقف ہو۔

2۔ ریڈیو پروگراموں کو موثر اور فعال بنانے کے نامور ادیبوں' معلموں' دینی عالموں اور سائنس دانوں کے پینل بنا کر ان سے خصوصی پروگرام کروائے جائیں۔ ایسے خصوصی پروگراموں کے لیے خصوصی فنڈز مہیا کیے جائیں۔

3۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی مقامی تجارتی اداروں سے بنے بنائے فنی' علمی' دینی اور

اخلاقی پروگرام حاصل کیے جائیں اور انہیں ریڈیو پر نشر کیا جائے۔ (ان پروگراموں کو Package Programs کہتے ہیں اور دنیا بھر کے ریڈیو سٹیشن ان کو باہر کے ریکارڈنگ سٹوڈیوز سے اپنی ڈیمانڈ کے مطابق بنواتے ہیں۔)

ٹیلی ویژن+فلم+ویڈیو کیسٹ

PTV بھی ایک سرکاری ادارہ ہے جو ریڈیو کے مقابلے میں کم عمر ہے۔ یہ ادارہ ایک ایسے وقت میں قائم ہوا جب ہماری اقدار تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس وجہ سے یہ ادارہ اب تک اپنی کوئی روایت قائم نہیں کر سکا۔ بدلتی ہوئی حکومتوں کے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ٹی وی کا رخ بھی تبدیل ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی شاید اسی طرح سے ہوتا رہے گا۔

اگر کمیشن PTV پر کوئی رائے' کوئی تجویز یا کوئی حکم عائد کرے گا تو TV طوعاً و کرہاً اسے مان تو لے گا لیکن اندر سے خوش نہیں ہوگا۔ وہ ایسے حکم کو یا ایسی تجویز کو پسند نہیں کرے گا۔ یہ ناپسندیدگی اس کے سارے پروگراموں پر حاوی رہے گی۔ گو سارے پروگرام حکم کے مطابق چل رہے ہوں گے۔

PTV کے سارے کارندے متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ فوری ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ بھی ایک عام پڑھے لکھے شخص کی طرح یہی سوچتے ہیں کہ ترقی' مغربی طرز فکر' مغربی انداز بود و باش اور روزمرہ مسائل کی طرف مغربی طریقے کی پیش قدمی کا نام ہے۔ PTV کے پیش کاروں کے ذہن میں یہ سوچ چونکہ زیادہ گہری ہے۔ اس لیے وہ مشرقی اقدار اور اسلامی طرز حیات اپنانے سے خوفزدہ ہیں۔ ویسے یہ لوگ بڑے شریف' بہت محنتی' محب وطن اور انسان دوست اشخاص ہیں اور ہر وقت ملک کی بہتری کے خواہاں ہیں لیکن وہ ملک کی بہتری ان خطوط پر نہیں سمجھتے جن پر ہمارا کمشن چل رہا ہے۔

PTV اپنی تمام تر کوشش کے باوصف ایسے پروگرام نہ بنا سکے گا جس میں اس Conviction کا اظہار ہو کہ اپنے دین' اپنی تہذیب اور اپنے کلچر پر قائم رہ کر بھی ترقی کی جا سکتی ہے۔

PTV کو البتہ یہ تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں کہ:

1- PTV اپنی نشریات میں سائنسی' فنی اور زرعی علوم کے معلوماتی پروگراموں میں اضافہ کرے اور ان کا تناسب موجودہ تناسب سے دوگنا کرے۔

2- PTV اپنے پروگراموں میں Brains Trust کا ایسا پروگرام شروع کرے جس کا معزز پینل نئی نسل کے الجھیلے سوالوں کے جواب فراہم کرے۔ وہ سوال جوان کو ہر سطح پر خائف بھی کر رہے ہیں اور ان کو مایوس و عقیم بھی بنا رہے ہیں۔

3- PTV پر لازم ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں لکھے جانے والے مواد کی از خود

نشاندہی کر کے نئی نسل کو ان کے مدلل جوابوں سے لیس کرے۔ ان کا حوصلہ بڑھائے اور ان کو اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ ہونے کی دلدل سے نکالے۔ اس کام کے لیے پھر ایک معزز پینل کی ضرورت ہوگی جس کے اراکین خوش گفتار' خوش کردار' کشادہ دل' کشادہ نظر اور جھلاہٹ کے بغیر ہونے چاہئیں۔ (میرے خیال میں پورے ملک سے ایسے نو دس افراد نکال لینا کوئی مشکل بات نہیں)

4- PTV پر اسلام کی عظمت رفتہ کے نشان ایک سیریز کی صورت میں دستاویزی طور پر دکھلائے جائیں تاکہ اسلامی تاریخ کا اس کے صحیح تناظر میں مشاہدہ کیا جا سکے۔

5- آج کا اسلام اور آج کا مسلمان اپنے گرد و پیش کو کس طرح سے آسانیاں فراہم کر رہا ہے' اس کو بھی دستاویزی صورت میں پیش کیا جانا ضروری ہے۔

ویڈیو کیسٹ

ہماری معاشرتی زندگی پر بری طرح سے اثر انداز ہوئے ہیں۔ ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ ان میں ہر طرح کا مواد ہمارے گھروں میں رات کے وقت جمع ہو جاتا ہے اور اگلی رات اسی طرح کا اور مواد آ جاتا ہے۔ اسے ہمارے معاشرے سے یا ہمارے گھروں سے باہر نکالنا ممکن نہیں لیکن اسی مواد کے اندر صحت مند مواد آسانی سے داخل کیا جا سکتا ہے۔ ویڈیو پروگرام بنانے والے تجارتی اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے منصوبوں میں ایسے پروگراموں کا بھی خیال رکھیں کہ جو اسلامی تعلیم کو ماڈرن ذہن میں اتارنے کے لیے مدد و معاون ثابت ہو سکیں۔ حکومت خود ویڈیو پروگرام بنانے کا ایک خصوصی ادارہ قائم کر سکتی ہے۔ اصلاحی اور رفاحی ادارے ایسے خصوصی اداروں کے قیام میں بھی مدد دے سکتے ہیں۔

اخبار

اخبار...... مضبوط' طاقتور' خود مختار مالی ادارے ہیں اور ہر حکومت ان کو ''قدر'' کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہی اپنی بقاء کا راز سمجھتی ہے۔ اخبار نہ تو کمشن کی تجاویز کو مشتہر کرنے پر مجبور کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی اس سمت سفر میں ان کو کمشن کے ساتھ چلنے پر راغب کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اخبارات معصوم قسم کے تجارتی ادارے ہیں۔ وہ واعظ یا ناصح بن کر کسی کو روکتے ٹوکتے نہیں۔ اپنا وقت نہیں ضائع کرتے۔ وہ اپنی ٹریڈ کے ساتھ ہی وابستہ رہتے ہیں جس طرح سیون اپ یا کوکا کولا کو اپنی تجارت سے کام ہے' اسی طرح اخبارات کا معاملہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اخبارات کی جنس تجارت مختلف نوعیت کی ہے اور اس سے بارہا یہی دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ مخلوق خدا کی بہتری کے لیے عام کی جا رہی ہے لیکن شاید ایسی کوئی بات نہیں!

پھر اخبارات آزادیٔ تحریر اور آزادیٔ تقریر کے علمبردار ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ اپنی گفتار میں یا اپنی رفتار میں یا اپنے کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرے۔ اس معاملے میں وہ ہر فرد کو آزاد سمجھے۔ اس لیے وہ خود بھی کسی قسم کی پابندی خواہ وہ مشن ہی کی درخواست ہی کیوں نہ ہو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ اخبارات کی Good Wishes ہی مشن کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوں گی۔

ادب

ادب کو ان معنوں میں ذریعہ ابلاغ کے طور پر نہیں لیا جا سکتا کہ اس کی گرفت ایک محدود طبقے پر ہوتی ہے اور وہ طبقہ اپنے دائرہ عمل میں کچھ ایسا فعال نہیں ہوتا لیکن ہمارے یہاں اتفاق سے ڈائجسٹ قسم کے رسالوں کی اشاعت سے پڑھنے والوں کا ایک کثیر طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ ریڈیو/ ٹی وی/ ویڈیو سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ابھی تک Cold Print سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

ڈائجسٹ کے مالک اور ایڈیٹر متوسط طبقے کے لوگ ہیں اور ماننے والے لوگ ہیں۔ ان کی اقدار ابھی دینی ہیں اور یہ حضرات انگریزی مواد کا اندھا دھند ترجمہ کرنے کے باوصف مغربی تہذیب' اس کی گرفت اور اس کی علمی یلغار سے پسپا نہیں ہو سکے۔

1۔ یہ اپنے رسالوں میں افسانوی انداز اپنا کر مشن کی تجاویز سمو سکتے ہیں۔

2۔ اپنے رسالوں کا ایک حصہ اسلامی تعلیمات کے لیے وقف کر سکتے ہیں۔ (اسلامی تاریخ کے لیے تو انہوں نے ایک حصہ پہلے سے وقف کر رکھا ہے)

3۔ اپنے افسانوی ادب کے ذریعے توہمات کی بیخ کنی کر سکتے ہیں اور اصنام خیالی اور اصنام ذاتی پر ضرب کاری لگا سکتے ہیں۔

4۔ خواتین خانہ کی روحانی اور دینی قوت کی تجدید نو کر سکتے ہیں۔

جناب والا! یہ بالکل ابتدائی باتیں تھیں اور ذرائع ابلاغ کے موٹے موٹے خدوخال تھے جو میں نے بیان کر دیئے۔ ان سے آپ پہلے ہی سے واقف ہیں۔ یہ کاغذ محض آپ کی سوچ کے Starting Point کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ جب آپ اس پر غور فرمانے لگیں گے تو اصل اور صحیح راہیں سامنے آئیں گی اور جب ان راہوں کو ایک ایک کر کے پرکھا جائے گا تو پھر مطلوبہ صورت احوال واضح ہو گی۔

مجھے یقین ہے کہ معزز اراکین ان پر غور فرما کر ذرائع ابلاغ جیسے اہم اور بلوان ساتھی کو اپنے ساتھ ملانے اور اس سے خیر کثیر کا کام لینے کی ضرور کوئی راہ ڈھونڈ لیں گے۔

معاشرے میں نوجوان کا کردار (بحیثیت ادیب کے)

یوں تو معاشرے میں ہر کردار کی ادائی مشکل کام ہے لیکن نوجوان کا رول ادا کرنا تو خاص طور پر مشکل ہے کہ جتنے مضبوط کندھے ہوں گے اسی قدر بوجھ پڑے گا۔ جتنی ذات طاقتور ہوگی اتنی ہی منزلیں اوپر اٹھائی جائیں گی۔ جس طرح معاشرے میں نوجوان کا رول مشکل ہے' ٹھیک اسی طرح گروہ میں ادیب کا رول اس سے بھی مشکل ہے۔

(1) ڈاکٹر' وکیل' انجینئر' دکاندار' مزدور' کارخانہ دار ایک مخصوص اور متعلقہ گروہ کا بوجھ اٹھا کر چلتا ہے۔ ادیب کو سب کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ (بچے' بوڑھے' جوان' کمزور' شہ زور' ظالم' مظلوم) عورت مرد انسان جانور' حیوانات' جمادات' نباتات۔

ڈاکٹر بیماریوں سے متعلق' وکیل دعویداروں سے' دکاندار گاہکوں سے' مزدور کارخانہ دار سے' کارخانہ دار دولت سے جتنے اصلاح لینے والوں سے لیکن ادیب ان تمام چیزوں سے وابستہ ہے اور ان کا بوجھ اٹھاتا ہے جو آسمانوں سے نیچے اور زمین کے اوپر موجود ہیں۔

(2) زمین و آسمان کے علاوہ ایک دنیا تصوری ہے۔ ادیب اس دنیا کا ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ اس دنیا کے سارے فرائض ادیب ہی انجام دیتا ہے اور وہی دے سکتا ہے۔ دھوبی' نائی' حجام' حکام' افسر' دفتری بابو' فوجی' چپڑاسی' پروڈیوسر' اناؤنسر' طالب علم' استاد وغیرہ وغیرہ (معاشرے کو حسن عطا کرتا ہے' خوش قسمتی کا سامان مہیا کرتا ہے)

(3) ادیب معاشرے کو ذہنی اور اخلاقی طور پر سنبھال کے رکھتا ہے۔ جس طرح ولایت کے اخبار ولایت کے لوگوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کرتے ہیں' ادیب ان کو حوصلہ دیتا ہے اور ان کی امید بندھاتا ہے۔ ادیب انسانوں میں Hope کی پھلواری اگاتا ہے اور ان کو تقویت عطا کرتا ہے۔ انسانوں کو رحمت سے اور شفقت سے اور شفاعت سے آشنا کراتا ہے۔

یہی اس کا سب سے بڑا رول ہے اور اسی وجہ سے وہ سب کا محبوب ٹھہرتا ہے۔ وہ خالی اپنے

معاشرے کی عکاسی ہی نہیں کرتا' اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ خوفناک' دلدوز اور تکلیف دہ مناظر بھی پیش کرتا ہے لیکن ان سے تحریک پیدا نہیں ہوتی (اگر ہو تو وہ کمزور ادیب ہے)

آپ جب ادیب بننے کے لیے اپنا ارادہ پختہ کرلیں تو سب سے پہلے یہ غور فرمالیں کہ۔

☆ جو کچھ میں لکھوں گا اس کی حیثیت نعرے کی تو نہیں ہوگی۔

☆ جو کچھ میں لکھوں گا وہ صحافت سے مختلف ہوگا ناں۔

☆ جو کچھ میں کہوں گا وہ میرا حال ہوگا ناں...... یعنی مجھ پر سے کیفیت گزری ہوگی۔

☆ جو کچھ میں بیان کروں گا' وہ سچ ہوگا۔ سچ ہمیشہ اپنے بارے میں بولا جاتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں سچ کا اظہار کرنے سے غدر مچ جاتا ہے۔ پھر سب لوگ ایک دوسرے کے بارے میں سچ بولنا شروع کردیتے ہیں اور ایسے سچ کے اندر مظلوم آواز دب کر رہ جاتی ہے۔

☆ آخر میں آپ کو سب سے مشکل کام یہ سوچنا ہوگا اور فیصلہ کرنا ہوگا کہ میں اپنی انا کا اظہار کس قدر کروں گا اور ادب کس حد تک پیدا کروں گا۔

"پانی کہاں مر رہا ہے"

1۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے لے کر اب تک ان دعوؤں اور وعدوں پر عمل کیوں نہ ہو سکا جو قیام پاکستان سے پہلے برصغیر کے مسلمانوں سے کیے گئے تھے۔

(الف) کیا وہ دعوے (یا وعدے) محض (Hoax) تھے اور ان کے پیچھے خلوص نہیں تھا؟

(ب) کیا دعویداروں کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ مشکل کام ہے اور ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے گا؟

(ج) کیا دعویدار چھوٹے، کمزور اور بودے لوگ تھے؟

(د) کیا دوسرے عوامل ان کی راہ میں حائل ہو گئے۔ مثلاً ہندوستان کا رویہ مغرب کی ناراضگی ایک نئی اسلامی ریاست کے وجود پر غیر مسلم دنیا کی ناپسندیدگی وغیرہ وغیرہ۔

2۔ پچھلے بتیس سال سے عنان حکومت پڑھے لکھے طبقے کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس میں اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی تھا اور خصوصی اداروں کے تربیت یافتہ اعلیٰ سرکاری افسر بھی تھے۔ سیاسیات، اقتصادیات اور معدنیات کے ماہرین بھی تھے اور استاد، پروفیسر، وکیل، حکیم اور فلسفی بھی تھے ...... ان کی جہانبانی سے پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا؟

(الف) کیا ہمیں اپنے نوے فیصد جاہل طبقے کو اس قسم کی تعلیم دے کر اس قسم کے افراد میں ڈھالنا چاہیے۔ مزید سکول، کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ کھولنی چاہئیں؟

(ب) اس وقت معاشرتی، معاشی اور اجتماعی زندگی جس گرداب کی پکڑ میں آیا چاہتی ہے، وہ جہل کی وجہ سے ہے یا علم کی وجہ سے؟

(ج) کیا جہالت ہماری بربادی کا سبب ہے؟

(د) کیا ملا ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہے؟

(ہ) کیا پردے کی وجہ سے ہم پستی کی طرف جا رہے ہیں؟

3۔ گزشتہ بتیس سالوں میں پانی کہاں مرتا رہا ہے اور ہم بنیادی خرابی کا قلع قمع کرنے کے بجائے

کن فروعی منصوبوں میں پڑے رہے ہیں۔ آج اس خرابی کی نشاندہی کا دن ہے اور پاکستانیوں کو یقین ہے کہ صرف استاد اور پروفیسر اور معلم ہی اس بیماری کا علاج دریافت کر سکتے ہیں کیونکہ اجتماعی خرابیوں کی تشخیص کی صلاحیت خدا نے انہی لوگوں کو دی ہے۔

ایک ایسی راہ عمل تعین کی جائے جسے چھوٹے بڑے امیر غریب جاہل عالم آسانی سے (یا طوعاً و کرہاً) اپنا کر تعمیر نو کی طرف اولین قدم اٹھا سکیں۔

نوٹ: یہ موضوع حوالہ (ٹرمز آف ریفرنس) ارادتاً اردو زبان میں تیار کیا گیا ہے تاکہ اپنی ذات، اپنی سوچ اور اپنی مشکلوں کے حوالے سے بات چیت کی جا سکے۔ انگریزی زبان میں ایسے موضوعات پر ولایتی مضمون کا ریڈی میڈ مواد کثیر مقدار میں مل جاتا ہے لیکن اس سے ستم زدہ کی توجہ اپنے ''حال'' سے مختلف ہو کر زبان و بیان کی خوبیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم اردو میں بات کرنے پر مجبور ہیں تاکہ ہم لمحہ بہ لمحہ اپنی ذات کے ساتھ وابستہ رہیں۔

سائنسی معاشرے میں ادب کی ضرورت

انسان جب بھی کسی ضرورت کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی جزئیات پر غور کرتا ہے تو گھوم پھر کر زندگی کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور زندگی ایسی کمال کی شے ہے کہ یہ نہ تو اندر ہے اور نہ ہی باہر نہ اسے اندرونی کہا جا سکتا ہے نہ بیرونی۔ اصل میں یہ دونوں ہی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے اندر پر توجہ کرتا ہے تو صرف مرکز سے متعارف ہوتا ہے اور Periphesy سے دور ہو جاتا ہے اور اگر Periphesy میں انہماک کرتا ہے تو مرکز سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور ظلم کی بات یہ ہے کہ کائنات میں آج تک کوئی اندر ایسا نہیں جس کا باہر نہ ہو اور کوئی باہر ایسا نہیں جس نے اندر کو نہ گھیر رکھا ہو۔ زندگی اندر اور باہر دونوں کے مجموعے کی تشکیل ہے اور دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔ سائنس باہر کی جستجو اور انسان کے ماحول کی تحقیق و تفتیش کا نام ہے اور ادب انسان کے اندر کی پیمائش اور اندر کی خلا نوردی کی داستان ہے۔ سائنس مادے کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور ادب مادے کے خالق سے۔ سائنس فطرت کے ساتھ وابستہ ہے اور ادب فاطر کے ساتھ۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کی تلاش کے دو رخ ہیں اور ان کو الگ الگ خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ جس طرح اندر داخل ہونے والی سانس اور باہر نکلنے والی سانس سانس ہی رہتی ہے اور اس کی لمبائی کو فیتے سے ماپ کر دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور اس کے الگ الگ نام نہیں رکھے جا سکتے۔ اسی طرح زندگی کی اکائی کو ٹکڑوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ وہ ایک ہی رہتی ہے ہوا کی طرح کہ جس کا نہ کوئی اندر ہے نہ باہر ہے۔ نہ خلوت ہے نہ جلوت ہے بلکہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہوا واحد ہے واحد متکلم واحد خاموش۔

غلطی وہاں ہوتی ہے جب زندگی کی وسیع کائنات کے ایک حصے کو پوری زندگی سمجھ کر فرمان جاری کر دیئے جاتے ہیں اور باقی کی ساری وسعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت ساری انسانیت اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے اور اس نے اپنے آگے بڑھنے کے سارے راستے سریا اور سیمنٹ کے موٹے بنکر بنا کر خود ہی بند کر دیئے ہیں۔ اس خود یاجوجی اور خود ماجوجی کی بنیاد اس روز رکھی گئی جب انسان نے مادے کی تحقیق اور طبعی دنیا کی تفتیش کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں اور اپنے اندر کی جستجو

میں اترنے سے محروم ہو گیا۔ دراصل انسان کو انسان سے زیادہ اور کسی بھی چیز کو اہمیت نہیں دینی چاہیے تھی اور اسے اپنی تحقیق کی ابتدا انسان سے ہی کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور خود کو ایک ایسے چکر میں ڈال لیا جس سے نکلنے کی اب بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حیرانی کی بات ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان اب بھی مادے اور بے جان چیزوں کی تحقیق میں لگے ہوئے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وہ مادے کی ایٹمی ساخت سے تو واقفیت حاصل کر چکے ہیں لیکن روح کی ایٹمی ساخت کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ ایسے سائنس دان سائنس کی دنیا کے کٹ حجت اور تنگ نظر ملا ہیں جو سائنس کی فرسودہ روایت سے بندھے ہیں۔ یہ وہ تنگ نظر، تھڑ دلے اور کمزور قسم کے لوگ ہیں جو ہیں تو لکیر کے فقیر لیکن خود کو روشن خیال اور ترقی پسند سائنس دان سمجھتے ہیں۔ ان ورد وظیفہ جلی ہو یا خفی طاقت کے لفظ کے گرد گھومتا ہے اور اس کی ساری توجہ طاقت کے حصول پر لگی ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ انسان اپنے ہی کمالات اور اپنی ہی کامیابی کے سامنے تھر تھر کانپ رہا ہے اور اس کو جان بچانے کے لیے کوئی محفوظ مقام نظر نہیں آ رہا۔ انسان کو اُس کی اپنی طاقتوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اسے اپنے وجود کے محفوظ قلعے میں اترنے کا کھل جا سم سم یاد نہیں آ رہا کھل جا سم سم کا یہ زینہ حیات کے مرکز میں اترتا ہے اور زندگی کے اندر اور باہر کو سانس کی طرح ملاتا ہے اور یہی وہ سانس ہے جسے سائنس نے مادے کے ہاتھ گروی رکھ کر بڑا ہی مہنگا سودا کر لیا ہے۔ آپ میری اس بات کو اپنی ڈائری میں نوٹ فرما لیجیے کہ سائنس اگر آئندہ ہزاروں سال بھی کوشش کرے تو بھی وہ انسان کے لیے امن، سلامتی اور آنند کا پیغام نہیں لا سکے گی۔ وہ انسان کو ایک بھی انسانی قدر عطا نہیں کر سکے گی۔ اس کی صحیح معنوں میں کبھی بھی خدمت نہیں کر سکے گی۔ ابھی جب میں نے آپ سے یہ بات کہی آپ کے ذہن میں اعلیٰ درجے کے ذرائع نقل و حمل آرام دینے والے Gadgets، اینٹی بائیوٹکس دوائیں۔ زندہ رکھنے کے سہارے اور عمر دراز کرنے کی گولیاں ضرور گھومی ہوں گی۔ میرے ذہن میں بھی گھومتی ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر تو اور بھی تیزی سے گھومتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ انسان کے سکون، آنند اور عرفان کا سامان نہیں ہے۔ سائنس ہمارے لیے آسائش اور آسودگی کا سامان ضرور مہیا کرتی ہے۔ ہم اس کو گھٹنوں کے بل ہو کر ہاتھ باندھ کر اور ناک رگڑ کر حاصل بھی کرتے ہیں اور سائنس کا تہہ دل سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں اور اس آسائش کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے ہماری مشکلات بھی دور ہو جاتی ہیں۔ ہم دکھ، درد اور مشقت کے چکر سے باہر بھی نکل آتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے ہم اس آسائش اور آسودگی کے عادی ہو کر پھر دکھی ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ دکھی، روگی سوگی غم ناک! پہلے سے زیادہ مظلوم، مقہور اور درماندہ۔ سائنس زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دکھوں پر ڈھکنا رکھ سکتی ہے۔ ان کو دور نہیں کر سکتی۔ اس میں سائنس بچاری کا کوئی قصور نہیں جو کوئی بھی زندگی کی باہر کی سائیڈ پر ہوگا، وہ باہر سے مین ہول کا ڈھکنا ہی رکھ سکے گا اور جو اندر ہوگا۔ وہ گٹر میں بیٹھ کر اندر کی گند بلا دور کرنے لگے گا۔ اندر والے کو ڈھکنا نصیب نہ ہوگا کہ باہر سے آنے والی غلاظت کو روک سکے اور باہر والے کو نیچے اترنے

کی استطاعت نہ ہوگی کہ اندر کی خرابیوں کا اُپائے کر سکے۔

یہاں میں ادب کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ ادب خاص میری دکان کا مال ہے اور اس کی بے جا تعریف کر کے میں اپنی اور اپنے مال کی بے قدری کرنا نہیں چاہتا جو سسری سائنس کو لگی ہے' وہی ادب کو لگی ہے جس طرح سائنس صرف باہر کے سانس کو سانس مانتی ہے اسی طرح ادب صرف اندر کے سانس کو سانس کہتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر دونوں ٹھیک ہیں لیکن دونوں ہی غلط ہیں۔ جب تک ان دونوں کے درمیان گہرا اور اٹوٹ رابطہ پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کی حالت مزید خراب ہوتی جائے گی اور وہ جلد ہی اجتماعی خودکشی کے اعلان پر مجبور ہو جائے گا لیکن اگر نبیوں کی طرح جانچ تول میں پڑ کر دیکھیں تو ادب آپ کو "ون اپ" نظر آئے گا۔ سائنس جہاں انسان کو انسان سے دور کرتی ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت جنگی آلات کا تصور نہیں ہے بلکہ میں ان مفید ایجادوں کو نگاہ میں رکھ کر بات کر رہا ہوں جو انسان کی خدمت کے لیے وقف ہیں اور جنہوں نے انسان کو مشقت کی تنگنی سے اتار کر ہر طرح کی محتاجی سے آزاد کر دیا ہے۔ اس قدر آزاد کہ انسان کو دوسرے انسان کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ سائنس نے انسان کو ایسی خودمختاری عطا کر دی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اور اپنی جنس کی مخلوق سے بے نیاز ہو گیا ہے۔

ادب سائنس کے مقابلے میں شیخی خورا' خود آرا' خود پرست اور نمائش کا مارا ہوا ہے۔ اس نچنیا کو اپنا آپ دکھانے اور اپنی بات سنانے کے لیے محفل سجانی پڑتی ہے۔ قبیلہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ محفل لوگوں سے بنتی ہے۔ قبیلہ انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے۔ ادب انسانوں کے درمیان انسانوں کے متعلق انسانوں کی بات کرنے کا نام ہے۔ ادب ایک ہی ڈالی پر بیٹھ کر میں میں کرنے کا نام ہے۔ سائنس ایک دوسرے سے دور رہ کر ٹیلکس پیغام بھجوانے کا کام ہے۔ ادب کاغذی گھاٹ پر قطار اندر قطار دھوبیوں کی چھوا چھو ہے۔ سائنس لانڈرومیٹ کے اندر چلتی رکتی واشنگ مشینوں کی سسکیاں ہیں۔ ادب میری ماں میری خالہ میری پھپھی کے طعنے اُلہنے گھرکیاں اور دھکے دھپے ہیں۔ سائنس میرے نادیدہ بوس کا حکم نامہ ہے۔ ادب میرے ان پڑھ بیٹ مین کے آنسو ہیں جو وہ مجھے میری ہی بیساکھیاں پکڑاتے وقت منہ پھرا کر گراتا ہے۔ سائنس میری دور افتادہ بیوی کی لونگ ڈسٹنس کال ہے۔ ادب مجھے رنگدار شوخ اور بھڑ کیلے کپڑے پہنا کر مجمع میں تھیا تھیا نچواتا ہے۔ سائنس مجھے سپیشل کیئر وارڈ میں رکھ کر نووزیٹرز کا لیبل میرے ماتھے پر چپکاتی ہے۔ ادب اجتماعی بیماریوں اور لوک روگ کا نام ہے۔ سائنس بیالیسویں فلور پر الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر ذاتی بیماری پر آنسو بہانے کا نام ہے۔ ادب' بندے ہی بندے لوگ ہی لوگ انسان ہی انسان ہے۔ سائنس خاموشی' شرافت' دوری' منہ بندی' نقش بہ دیواری ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تقابلی مطالعے سے یہی پتہ چلا ہے کہ فی الحال ادب "ون اپ" ہے کہ نہ تو یہ نیچر کے ساتھ جھگڑتا ہے' نہ اس پر حملہ کرتا ہے' نہ تسخیر کائنات کے پروگرام بناتا ہے اور نہ ہی مظاہر

فطرت پر فوج کشی کرتا ہے۔ یہ نامعلوم کو جاننے کا ایک ذریعہ اور شعور کائنات میں داخل ہونے کا ابتدائی زینہ ہے۔ سائنس نیچر کو فتح کرنے کے لیے ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو رہی ہے۔ اب نیچر سے گہری دوستی کرنے کو اپنے تعارف کا ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھ رہا ہے۔ دنیا کی بلند ترین شخصیتیں انسانوں کے درمیان رابطے پیدا کرنے کے لیے آتی ہیں اور انسان کو شعور کائنات کے ساتھ داخل کرنے کے رموز بتا کر جاتی ہیں۔ یہی انسان کا مقصد اور یہی اس کا منتہائے مقصود ہے۔ اس سلسلے میں میری بات چھوڑیے اور ایک سائنس دان کا چھوٹا سا خط سن لیجیے۔ پتہ نہیں یہ سائنس دان آپ کی نظروں میں کچھ حیثیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ میں تو اس کو سائنس دان ہی سمجھتا ہوں کیونکہ اس کا نام انگریزی انسائیکلو پیڈیا میں سے سائنس دانوں کے ذیل ہی میں آتا ہے۔ لکھتا ہے:

ہمارے دور میں سائنس نے کمال کی ترقی کی ہے اور یہ دور ہے جس پر ہر شخص بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ سائنس نے ہر شعبہ زندگی میں ایک نیا شعور پیدا کر دیا ہے اور ساری انسانیت کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے لیکن ایک بات پلے باندھ کے رکھنے کی ہے کہ یہ سارا علم یہ ساری سائنس اور یہ کمال کی فنی مہارت انسان کو خوشیوں مسرتوں اور راحتوں سے ہمکنار نہیں کر سکے گی۔ اس کو اشرف المخلوقات کے درجے پر نہیں پہنچا سکے گی اور اس کو آسانیاں عطا نہیں کر سکے گی۔ جب تک یہ دنیا اور اس کے رہنے والے متفقہ طور پر ان لوگوں کو سائنس دانوں' موجدوں اور فنی ماہروں سے بلند مقام نہیں دیں گے جنہوں نے دین کو اخلاقی اصولوں' اعلیٰ انسانی قدروں اور روح کے چاندنوں سے روشناس کرا کے حق کی روشنی پھیلائی۔ جب تک انسانوں کے ان عظیم محسنوں کا دل سے مان آدر نہیں کیا جائے گا۔ انسان کو آسانیاں عطا نہیں ہوں گی اور وہ کبھی بھی لبریٹ نہیں ہو سکے گا۔

یہ سائنس دان لکھتا ہے کہ اس وقت ساری دنیا پر جو احسان پیغمبروں کے ہیں ان کے مقابلے میں سارے سائنس دانوں کی ساری کوششیں مل کر بھی ایک ذرے کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں ایک سائنس دان کی حیثیت سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر انسانیت کو حفاظت' سکون اور طمانیت سے اور عزت و وقار کے ساتھ اشرف المخلوقات بن کر اس زمین پر بسنا ہے تو اسے پیغمبروں کے فرمان پر اور ان کے احکام پر چلنا ہی پڑے گا۔ ایسا نہ ہو سکا تو پھر اس دنیا کے لیے بڑی مشکل پڑ جائے گی۔

پتہ نہیں ایسا فرسودہ بیان سن کر آپ اس شخص کو سائنس دان سمجھیں گے بھی یا نہیں لیکن میں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اس شخص کا نام آئن سٹائن ہے اور یہ خط اُس نے جرمنی کے ایک دکھی انسان کے استفسار پر لکھا تھا۔ انسانیت کے ان عظیم ترین محسنوں کے بیان ادب کے سب سے اونچے درجے پر آتے ہیں اور ان کو احسن القصص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسانیت کے ان کرم فرماؤں کا سب سے بڑا کرم یہی تھا کہ یہ لوگوں کو آسانیاں عطا فرماتے تھے اور پھر ان آسانیوں کو تقسیم کرنے کا شرف بھی عطا فرماتے تھے۔

اشفاق احمد

گڈریا، ایک محبت سو افسانے، وداع جنگ، ایک ہی بولی، صُبحانے فسانے، توتا کہانی، بند گلی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمان سرائے، من چلے کا سودا، بابا صاحبا، سفر در سفر، اُچے بُرج لاہور دے، ٹاہلی تھلے، حسرت تعمیر، جنگ بجنگ، زاویہ، سفرمینا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدہ، شاہلا کوٹ، کھیل تماشا، گلدان، کھٹیا وٹیا، دھینگا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا، عرض مصنف،

بانو قدسیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آسے پاسے، دوسرا قدم، آدھی بات، دست بستہ، حوّا کے نام، سورج مکھی، پیا نام کا دیا، آتش زیر پا، امر بیل، بازگشت، مرد ابریشم، سامانِ وجود، ایک دن، پُروا، موم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تمثیل، فٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابل ذکر، کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ،

Rs. 600.00

www.sang-e-meel.com